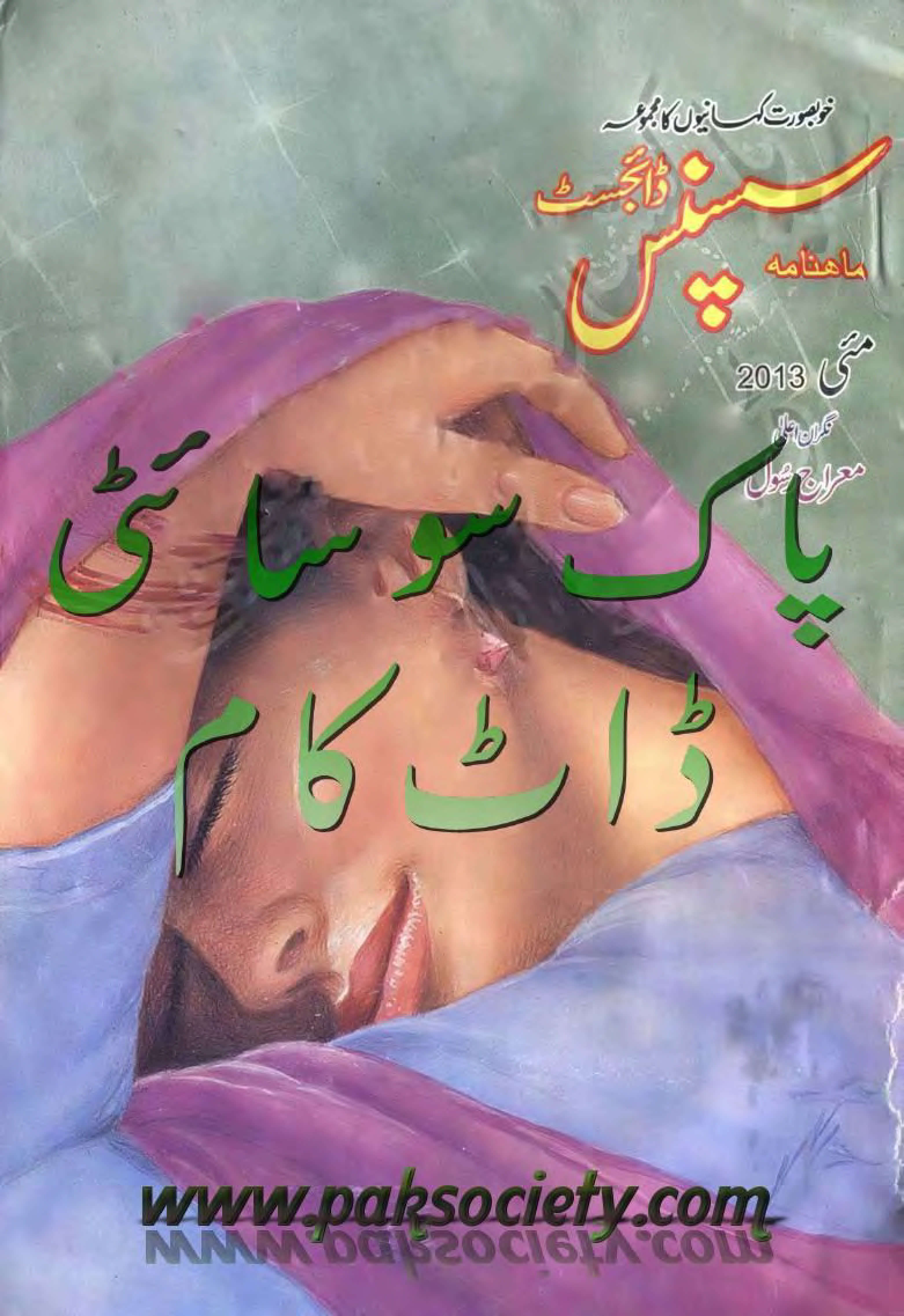

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

CPNE
MEMBER APNS

11 — انشائیہ — جون ایلیا
تاریخ اور وقت کے درمیان لمحات گزارنے والے ایک حساس دل کا ماجرا

12 — آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت، قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

20 — چراغِ رفتہ — ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

53 — برائے کاروبار — کاشف زبیر
زندگی کو کھیل تماشا سمجھنے والوں کا انوکھا روپ

68 — کشکول — انوار صدیقی
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

91 — دوسرا رُخ — ثمر عباس
ایک جابر عاشق کی محبت اور مجبور حسینہ کی وفاؤں کا قصہ

99 — معصومہ — اسما قادری
قدرت کے ستم کا نشانہ بننے والی حسینہ کا عجیب انتقام

112 — مرچ مسالا — مرزا امجد بیگ
عدالت کے کٹہرے میں انصاف سے معمور وکالت کی کرشمہ سازیاں

137 — نشان — سلیم انور
نشانیاں مٹانے والے ایک مکار چور کی بے وقوفی

140 — محفلِ شعر و سخن — قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

143 — ستمگر — منظر امام
انتخابات کا کھیل، گندگی اور مداری کا دلچسپ تماشا

152 — مسافر — ناصر ملک
گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

193 — فوٹو البم — بابر نعیم
بے جان تصویروں سے جاندار ثبوت کا حصول

195 — تکمیل — تنویر ریاض
فن کے تقاضے نبھانے والے ایک سنگدل مصور کا تصور

203 — معصوم ولی — ضیا تسنیم بلگرامی
ولادت سے قبل ہی ولایت کی سعادت پانے والی شخصیت کا ماجرا

217 — بھول — ش م جمیل
بے وجہ خون کی ہولی کھیلنے والے سنگدلوں کا قصہ

227 — ناسور — ڈاکٹر شیر شاہ سید
دلگداز احساسات کو جنم دیتی ایک پرفکر تحریر

232 — گر قبول افتد — محی الدین نواب
قیمتی لمحات گنوا کر سرابوں کا تعاقب کرنے والے چند عقلمندوں کی روداد

جلد 43 • شمارہ 05 مئی 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

انشائیہ

جون ایلیا

لبِ مہران

لبِ مہرانِ مہرباں اس بار یہ میری تیسری یا چوتھی شام ہے۔ میں نے لبِ مہرانِ مہرباں اپنی نوجوانی اور جوانی کی کتنی ہی حسین ترین اور سنگین ترین شامیں گزارا ہیں۔ جذبوں کی سرشاری اور تہ داری اور آرزوؤں کی تشنہ کامی اور شکستہ حالی کے کتنے ہی دور بسر کیے ہیں۔

میں نے کسی بھی دریا کے ساحلوں پر خوابوں اور سرابوں کے اتنے سکھ نہیں پائے اور اتنے دکھ نہیں اٹھائے جتنے سکھ اور دکھ مہران کے ساحلوں پر پائے ہیں اور اٹھائے ہیں۔ جانے کیوں اس بار میں نے یہاں وہ حالت خیزی اور کیفیت انگیزی نہیں پائی جو میرے خیال کو سیراب اور شاداب کیا کرتی تھی اور ہاں میرے ملال کو بھی...... ملال کو بھی......؟

ہاں ملال کو بھی۔ خیال ہی نہیں ملال بھی سیرابی اور شادابی چاہتا ہے۔ یہ کچھ یوں کہ احساسِ ذات کی ساری حالتیں رسد چاہتی ہیں۔ اندر اور باہر کی رسد۔ سو خیال ہو یا ملال دونوں کو اندر اور باہر کی رسد چاہیے۔ اس بار لبِ مہران میری نسل کے وہ قلندر اور وہ شوریدہ سر میرے ساتھ نہیں ہیں جو اپنے لبوں پر سندھی اور اردو شاعری کے سروں کو آباد کر کے میرے ساتھ رقص کیا کرتے تھے۔ ہم یہاں کتنی دھومیں مچایا کرتے تھے۔ ہم پر یہاں کیا کیا حالتیں طاری ہوتی تھیں اور کیا کیا عالم گزرتے تھے۔ اپنا ایک شعر یاد آیا۔

دکھائیں کیا تمہیں داغوں کی لالہ انگیزی　　گزر گئیں وہ بہاریں وہ فصل ہی نہ رہی

میرے امروہے کے ایک بزرگ غلام ہمدانی مصحفی نے کہا ہے۔

بادِ ایام بے قراریِ دل　　وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

عجب زمانہ تھا۔ ہم اپنی حالتوں اور اپنے عالموں میں مشتاقی اور حضوری اور دوری کے کتنے ہی معرکے سر کیا کرتے تھے۔ سرکشی اور سرشوری کی اک عجب ماجرا پروری تھی جو ہمیں لمحہ لمحہ پُرحال رکھتی تھی۔ ہم شوقِ انقلاب میں ہر مزاحم سے جا ٹکرایا کرتے تھے۔ کوئی نہیں تھا جو ہمارے شعلہ زن نعروں کو دبا سکتا اور ہمارے ہونٹوں کے انگاروں کو بجھا سکتا۔ مگر اب ہمارے شعلہ زن نعرے سیاست کی سنگینی نے دبا دیے ہیں۔ ہمارے ہونٹوں کے انگارے راکھ کر دیے گئے ہیں اور ہم ہیں کہ ہمیں اپنے زیاں اور اپنے زوال کا کوئی غم نہیں ہے۔

کوئی غم نہیں ہے! جون ایلیا یہ کیوں نہیں کہتے کہ کوئی احساس نہیں ہے۔

ہاں مُیاد دلانے والے تو نے مجھے صحیح بات یاد دلائی۔ ہاں ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی احساس نہیں ہے۔ حسن حمیدی تو زیرِ خاک سوتے ہیں۔ میں کراچی کی طرف رخ کر کے کہتا ہوں کہ اے شیخ قبلہ، اے شیخ ایاز! ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی احساس نہیں ہے۔ کوئی بھی احساس۔ ہم اب وہ نہیں رہے جو تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا گیا ہے۔ ہمیں بانٹ دیا گیا ہے۔

مہران بہہ رہا ہے، لبِ مہران کی شام بہہ رہی ہے اور میں اداس ہوں اور بہت پُراحساس ہوں۔ مجھے سرِشام ایک شعر بہت یاد آتا ہے، جو میرے افسانہ آفریں بھائی معراج رسول کے شہر میں کہا گیا تھا۔

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں　　چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

کراچی، لاہور، دلی اور لکھنؤ کے شاعرو! اگر تم شام پر ایسا حالت انگیز شعر کہہ دو تو قبلہ و کعبہ میاں باوا میر تقی میر کی قسم میں شعر کہنا چھوڑ دوں...... کیوں میرے ستو...! میں غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح؟

خیال آفریں شام کا مہران بہہ رہا ہے۔ ماضی سے مستقبل کی طرف، اپنے منبع سے اپنی منزل کی طرف۔ اور میں اپنی ایک خاص حالتِ انس کے ساتھ اس کی خدمت میں کورنش بجالاتا ہوں اور تاریخ اور وقت میں ایک گہرا سانس لیتا ہوں۔ اور پھر مجھے اچانک یہ احساس ہوا ہے کہ سندھی بولنے والا ایک ذہین اور شائستہ نوجوان مانی سنجرانی جو اردو میں شعر کہتا ہے، میرے ساتھ ہے اور میں ایک عجیب بات محسوس کر رہا ہوں۔ اور وہ یہ کہ جیسے مہران، گنگا اور جمنا کی وادی میں بہہ رہا ہے۔ یا جیسے گنگا اور جمنا دونوں بہ یک وقت مہران کی وادی میں بہہ رہے ہیں۔

اور اے مانی سنجرانی! تو لبِ مہران میری ایک خاص بات سن اور اپنا سر دھن۔ اور وہ بات یہ ہے کہ مہران کو سنسکرت میں سندھو کہا گیا ہے، یونانی میں سنتھوس اور لاطینی میں سنڈس۔ ہم پاکستانی اور ہندوستانی پنجاب، کشمیر، دلی، اترپردیش اور بہار سے سندھ کی طرف ہجرت کرنے والے شمالی سرزمینوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سندھو ہمارا سب سے عظیم اور قدیم پیش رو ہے جو شمال سے نکل کر یہاں آیا ہے۔ وہ تبت کی برفانی چٹانوں سے نکلا اور اس نے سندھ کی مثلث نما شمالی سرزمین کو اپنی تہذیب پرور گزرگاہ بنایا۔ وہ بھی ہجرت زدہ ہے اور ہم اور تم بھی ہجرت زدہ ہیں۔ مانی اتم سامیوں کی سرزمین سے بلوچستان آئے تھے اور وہاں سے سندھ آ گئے اور میں سامیوں کی سرزمین سے روانہ ہو کر پنجاب کے علاقے میں آیا اور وہاں سے وادیِ گنگ و جمن کی طرف چلا گیا اور وہاں سے یہاں آ گیا۔ جو جہاں بھی ہے وہ کہیں اور سے ہجرت کر کے آیا ہے۔ مگر سندھو کی ہجرت ہر لمحہ جاری ہے۔ آؤ ہم سب اس ہجرت کو اپنا رشتہ بنا لیں، تاریخ اور زمانوں میں پھلنے پھولنے والا رشتہ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ کے خط

عزیز قارئین!

السلام علیکم!

مزدور کی نمائندگی کا مہینا مئی...... 2013ء کا شمارہ موسم کی گرما گرمی اور انتخابات کی سرگرمی کے سنگ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یوں تو سیاست کا بازار بھی گرم ہے اور عوام کا دماغ بھی مگر حالات کا تقاضا ہے کہ ٹھنڈے دل و دماغ سے فیصلہ کیا جائے اور اچھے نتائج کی توقع رکھی جائے...... اور اس تبدیلی کا امکان اسی وقت ممکن ہے جب ووٹ اور نوٹ میں کسی قسم کا کوئی قریبی تعلق نہ رہے۔ اگرچہ شفاف انتخابات کا عمل محض دیوانے کا خواب ہی سہی مگر...... پیوستہ رہ شجر سے امید بہار کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے اور ضرورت بھی کہ ہر پاکستانی کھوکھلی جذباتیت کو چھوڑ کر...... رنگ و نسل اور ذات برادری سے بالاتر ہو کر اپنے اس حق کا استعمال کرے اور ایک بہترین پارلیمنٹ منتخب کرے۔ بات ہو رہی ہے سرکار کی تو جاننا چاہتے ہیں کہ پاکستان کے کس سرکاری اسکول میں تعلیم واقعی مفت ہے......؟ سرکاری اہلکار جس دھاندلی اور دیدہ دلیری سے کورسز اور دیگر اخراجات کے نام پر پیسے وصول کر رہے ہیں اس سے بے شمار والدین نہ صرف پریشان ہیں بلکہ طالب علم بھی مایوس نظر آتے ہیں۔ سرکار کو اس حوالے سے کھوکھلے نعروں سے ہٹ کر قابل قدر اور قابل بھروسا اقدامات کرنے چاہئیں...... اگر اس ملک میں علم کا حصول اس قدر اذیت ناک اور مشکل ترین کر دیا جائے گا تو غریب اور متوسط طبقہ سونے اور چاندی کے زیور کی طرح تعلیم کے زیور سے بھی محروم ہو جائے گا۔ ایک خوش آئند بات جو نظر آ رہی ہے وہ یہ کہ آج کل جہاں جہاں سے چیف جسٹس کا گزر ہو رہا ہے وہاں وہاں ملک نکھرتا اور سنورتا محسوس ہو رہا ہے۔ توقع ہے کہ آنے والے دنوں میں محکمۂ تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی جائے۔ اچھی امید رکھتے ہوئے اب ہم چلتے ہیں اپنی اس منفرد پارلیمنٹ کی جانب جہاں مثالی امن و سکون اور محبت و یگانگت ہے۔

✠ ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل، نسووال کھوکھرانی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''مجلس سسپنسیہ میں اگرچہ نو وارد تو نہیں ہوں۔ لیکن گزشتہ حاضری جو کہ چند سال قبل تھی، میں ڈکٹیٹر ثانی کے دور مبارکہ کی وجہ سے ''مشرف بہ بلیک لسٹ'' ہی ہو سکا تھا۔ اب پھر گستاخی جان و یرانی کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ ایمان قوی ہے کہ عزیزی ماہا ایمان کے بے ایمان اور بے تکے ارشادات سے جگہ بچی تو ہم بھی طرم خان ہوں گے۔ سرورق حسینہ ڈی ہائی ڈریشن، لو بلڈ پریشر اور جنرل ویک نس کی مریضہ دکھائی دیتی ہیں ذاکر انکل! اس کو فوڈ سپلیمنٹس اور ڈرپس وٹنی وٹامن دیں۔ ویسے آپس کی بات ہے اس کو شرمندگی کس بات کی تھی؟ کریموں، پوڈروں اور صابنوں کے اشتہارات اچھے لگے...... لیکن صرف 500 سالہ تصویر العین کو...... بقول توصیف احمد کے عمار کشف...... زندہ باد...... ویسے خط چھپنے کی خوشی کو ٹانی سے تشبیہ زیادتی ہے۔ کچھ آف ککول صاحب! تبصرہ خوب تھا۔ قدرت نیازی! حصول تعلیم کی مثلث میں بچے، والدین اور اساتذہ شامل ہوتے ہیں۔ کسی ایک کی کوتاہی نسل مستقبل کا بیڑا غرق کر دیتی ہے۔ ابرار وارث! اس دفعہ آپ کے لیے چوڑیاں حاضر ہیں...... کہاں...... جی ہاں...... سرورق پر۔ مسٹر گورکانی! آپ کی ڈیوٹی آج کل کس قبرستان میں ہے؟ ہمایوں سعید مستری صاحب! کم از کم آج کل ہر ''سیاست دان'' سچ بول رہا ہے...... لیکن صرف اپنے حریف کے بارے میں۔ اور ہاں، FSC کے بعد یا تو آدمی کے بال جھڑ جاتے ہیں یا پھر اس کو 6 نمبر کی عینک لگ جاتی ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ شیشہ دیکھ لیں۔ احسان سحر! صحرا کے جہاز اونٹ کو ہمایوں سعید راج گیر سے تشبیہ دینا واقعی فریق اول کی انسلٹ ہے اور اس نے ہتک عزت کا دعویٰ کرنا میری ہی منت سماجت پر ترک کیا ہے۔ ڈاکٹر جعفر کی فرمائش اگر قابل عمل ہو تو پورا کرنے میں حرج نہیں۔ حسنین ہاشمی اور شاہد عمران! آپ کے ساتھ میرا پیارا دوست سید عمران علی شاہ آف نسووال 302 میں قید ہے۔ کیا اس سے ملاقات ہوئی کبھی؟ پس پردہ میں خیزران کا کردار خوب رہا۔ اکثر اموی اور عباسی خلیفہ اسلام کے نام پر دھبا ہیں۔ جنہوں نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کیا۔ ڈی آئی جی کا کشکول میڈم روبی نے آنکو پس کی زندگی کی معتبر گواہی پر پھر سے خالی کر دیا۔ فرحین راحیلہ کے دم سے یکدم انگلش میڈیم ہو گئی۔ کنول کا پھول بے موسم مرجھا گیا۔ مس ڈکسن حیرت انگیز مستقبل شناس نظر آئی۔ شہریار میڈم کی فرمائش پر کئی ایک چوپادانوں کا مسافر بنا اور حسب منشا انعام سے لطف اندوز ہوا۔ دو نمبر پیروں پر محترمی ناصر ملک کے موقف کی پرزور تائید کرتا ہوں۔ حرف آخر کے طور پر عارف نے اپنی سچی محبت نبھاتے ہوئے یاسمین جیسی شکستہ گڑیا کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ ایچ اقبال کی کہانی میں بے شک چند جھول تھے لیکن ایک پیغام آموز کہانی تھی۔ تھانیدار کی تھانیداری فسادِ جہل میں خوب چمکی جب اس نے معصوم جیدے کے قاتلوں کو پابند سلاسل کیا۔ میرے خیال ناقص میں نواز اور وحید سے زیادہ اعجاز قصور وار تھا۔ گوشہ ولایت میں شیخ المشائخ حضرت عبداللہؒ کے واقعات سن کر ایمان تازہ ہوا۔ محمد الیاس کی اندھیر نگری دادی اماں کی نصیحتوں پر مشتمل کتاب لگی۔ بنت حوا پر ابوجہلی ظلم و ستم ہمارے معاشرے کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے جس کو ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے شاخسانہ میں پیش کیا۔ کیا ماں، بہن، بیوی اور بیٹی صرف قربانی کے لیے بنی ہے؟''
(اتنے دلچسپ تبصرے کا شکریہ)

✠ حسیب احمد، کرک سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''اپریل کا شمارہ کافی تاخیر کے بعد 21 مارچ کو اسٹال پر جگمگاتا ہوا نظر آیا۔ سرورق کی دوشیزہ بہت پیارے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ پھر سیدھی انٹری ماری خطوط میں۔ لیکن میرا خط ردی کی ٹوکری میں تھا۔ آنٹی آپ خوامخواہ میرا خط شائع نہیں کرتیں۔ پھر کہتی ہیں کہ غصہ صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ صدارت کی کرسی پر محمد عمار کشف براجمان تھے مبارکاں بھائی۔ ککول صاحب دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ بزرگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ہمایوں بھائی ابھار میں بھی آپ کا دل اداس ہے۔ تو پھر وہ کون سا موسم ہے جس میں آپ ہشاش بشاش رہتے ہیں۔ حسنین ہاشمی صاحب اگر آپ بے گناہ ہیں تو انشاء اللہ آپ کو ضرور رہائی مل جائے گی۔ قیصر بھائی سالگرہ کی مبارک باد دینے کا شکریہ۔ ماہا ایمان جی آپ الیکشن میں کس کے ساتھ ہیں۔ سعدیہ بخاری صاحبہ لگتا ہے کہ آپ کو اپنے آپ پر بھروسا نہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی کامیابی شہریار کی منتظر تھی اس نے پہلے خانزادی کو بچایا اور پھر سیمو اور اماں کو صحیح سلامت میڈم کی کھوٹی تک لے آیا۔ شہریار اور حیدر خان کے درمیان ڈیٹنگ کا مزہ آئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی پس پردہ پسند آئی۔ خیزران واقعی بڑی چالاک عورت تھی۔ اپنے شوہر مہدی کو انگلی پر نچاتی تھی۔ ہادی بہت ہی لالچی تھا۔ کاشف زبیر کی قرض منفرد تحریر تھی۔ جارج نے اچھا گیم کھیلا لیکن پھر بھی مارس نے الٹا اس کی چال اس پر چلا دی۔ کشکول کی یہ قسط مجھے بے حد پسند آئی۔ اگر بگ باس زندہ ہوتے۔ تو یقیناً مقابلہ ست ہوتا۔ ملک صاحب کی فساد جہل سنسنی خیز داستان تھی۔ اعجاز نے اپنے ہی بھتیجے کو قتل کر ڈالا۔ شہر برباد دھول میں افغانی کی کہانی سن کر افغانیوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ مریم کے خان کی گھر کا بھوت ایک رومانٹک کہانی تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحبہ کی شیخ المشائخ میں عبداللہ کا واقعہ پڑھا۔ اس ولی کا واقعہ مجھے بے حد پسند آیا۔ ایچ اقبال کی شکستہ گڑیا بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ اسی کو کہتے ہیں پیار۔ عارف نے یاسمین کی حقیقت جاننے کے بعد بھی یاسمین کو قبول کیا۔ ڈاکٹر جعفر صاحب سسپنس کے وہ قارئین بھی ہیں جو 1972ء سے لے کر اب تک شمارہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ کیا کریں گے، میرے چچا بھی 1972ء سے لے کر اب تک صرف قسط وار کہانیاں پڑھ رہے ہیں یہ تو سراسر ظلم ہے۔''

✠ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے چلے آ رہے ہیں ''عرض یہ ہے کہ پہلے بھی ایک خط لکھ چکا ہوں آپ نے شائع نہیں کیا۔ اپریل کا سسپنس میرے ہاتھوں میں ہے ٹائٹل بہت خوب صورت اور دل کو اچھا لگا۔ ذاکر انکل کے ہاتھوں میں جادو ہے، سسپنس سے دل و جان سے محبت ہے اور مرتے دم تک رہے گی تبصروں میں ماہا ایمان اور قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ بہت اچھا لگا، باقی قارئین کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں کشکول اور مسافر پڑھی ہیں۔ یہ سلسلے وار کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ ایکشن سے بھرپور اور تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سسپنس اور اس کے اسٹاف کو کروڑوں برس لمبی عمر دے۔'' (آمین)

✠ بابر عباس، بگیانہ روڈ، کھاریاں سے چلے آ رہے ہیں ''سرجی سسپنس کا نیا شمارہ ماہ اپریل کی شکل میں ہاتھ میں ہے اور اس بار سسپنس سسرالی شہر لاہور سے خریدا۔ سرورق کی چڑیل دیکھ کر منہ کڑوا سا ہو گیا لمبی ناک لمبے دانت بوڑھے بوڑھے ہاتھ قہقہہ لگانے کا انداز ایسا جیسے ابھی کھانسی ہو جائے گی۔ جون ایلیا صاحب کا انداز زبردست تھا۔ اس بار کرسی صدارت پر ایک بار پھر محمد عمار کشف آف کوٹلہ اور علی خان دماغ کی چولیں ہلا دینے والا تبصرے لے کر حاضر تھے۔ بیٹا عمار تمہارا تبصرہ پڑھنے کے لیے بندے کو آدھی رات کو اٹھ کر نہار منہ خمیرہ گاؤزبان کھانا چاہیے یا پھر وہ کتاب ڈھونڈنی پڑے گی جس سے تم اتنے اوکھے اوکھے لفظ تلاش کر کے لکھتے ہو۔ عزیزم بندے کو اپنی عمر کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ بہرکیف خط زبردست تھا۔ ادریس بھائی ٹائٹل گرل اس لیے گہری سوچ میں گم تھی کہ وہ آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رمضان پاشا بھائی آپ اگر تاریخی کہانی پر تبصرہ نہیں کر سکتے تھے تو بھائی میرے بارے میں تبصرہ کر دیتے۔ قیصر اقبال صاحب ارے بھائی صنف نازک کے بارے میں ایسا نہیں کہتے۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب چل پڑھا کے بارے میں کیا خیال ہے، آپ ایسا کریں محفل کے تمام ساتھیوں کو پڑھانا شروع کر دیں۔ ابرار وارث صاحب آپ آغا فرید احمد خان کو مس کرتے ہیں، آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے وہ مس نہیں۔ ماہا ایمان جی اپنے حسنین عباس بلوچ صاحب مجھ سے آپ کا نمبر مانگ رہے تھے مگر افسوس میرے پاس آپ کا نمبر نہیں ہے۔ آغا فرید بھائی آپ کی کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ تفسیر عباس بابر بھائی آپ کہاں غائب ہیں غالباً بھابی نے پابندی لگا دی ہے۔ حسنین ہاشمی، حافظ عمران، عاصم اقبال جسپال اور قیصر اعوان بھئی آپ سب کو اللہ تعالیٰ رہائی نصیب فرمائے (آمین) ساجدہ راجا صاحبہ آپ تو ابھی سے شکوہ و شکایت کرنے لگی ہیں بھئی ہمت سے کام لیں، دیکھ لیں۔ 70 سال عمر ہے مگر پھر بھی کبھی کچھ نہیں کہا۔ احسان سحر بھائی بڑا عرصہ ہوا رابطہ کیے ہوئے جان عزیز کہاں غائب ہو۔ ارے ارے محمد ہمایوں سعید، سعدیہ بخاری کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم مر گئے ہیں۔ آئندہ خیال کرنا۔ کہانیاں حسب حال سب سے اچھی تھیں ان کی تعریف کرنا سورج کو آگ دکھلانے والی بات تھی۔'' (بہت

قارئین کے لیے اہم اعلان

ملک بھر میں ادارے کے ماہنامے مندرجہ ذیل تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

٭ سسپنس ڈائجسٹ: 17 تاریخ ٭ ماہنامہ پاکیزہ: 24 تاریخ

٭ ماہنامہ سرگزشت: 28 تاریخ ٭ جاسوسی ڈائجسٹ: 03 تاریخ

مذکورہ بالا تاریخوں پر پرچے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں رابطہ کریں

ثمر عباس: 0301-2454188

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوب...... گویا کہانیوں پر تبصرہ صاف گول)

❋ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، تحصیل کروڑ، لیہ سے تشریف لائے ہیں ”جب سسپنس اپنی خاص ادا سے وارد ہوا اور جی کھل اٹھا۔ ٹائٹل حسینہ کافی تیاری کے ساتھ آئیں۔ یہ حسینائیں ہنستے ہوئے آنکھیں کیوں بند کرلیتی ہیں؟ دلچسپ تبصرے کے ساتھ محمد عمار کشف کرسی صدارت پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے مبارکباد۔ سرا حسنین ہاشمی آپ نے فرمایا کہ آپ بے گناہ ہیں ایسا ہے تو پریشان مت ہوں سب سے بڑا منصف سب دیکھ رہا ہے۔ خدا آپ کے والد صاحب کو صحت کاملہ اور لمبی زندگی عطا فرمائے (آمین) مسٹر ڈب صاحب نام کا مطلب بتادیں یا پورا نام۔ کہانیوں میں آتے ہیں پہلے مسافر کی طرف۔ اس بار شہرے کے اندر کا ہیرو باہر نظر آیا۔ یارن خان کا کردار حیران کن طور پر برا تھا۔ میڈم کے ماں، باپ کو چھڑوا کر شہریار نے میڈم کا دل جیت لیا۔ کشکول میں لیاقت حسین کا ماں سے بہت فاصلے پر ہونے کے باوجود ہدایات لینا عجیب لگا۔ دشنو اور لوچن آپس میں جھگڑا کررہے ہیں۔ اس مرتبہ جو کہانی ٹاپ پر رہی وہ تھی اندھیر نگری، ماں کا بیٹے کے لیے تکلیفیں سہنا اور بیٹے کا ماں کے نقش قدم پر چلنا بڑا زبردست تھا۔ ماں بڑا لاجواب رشتہ ہے۔ شکستہ گڑیا یاسمین اور عارف کی کہانی تھی تو ایک روایتی داستان مگر...... ایچ اقبال کے قلم نے اسے ایک نئے ڈگر اور انداز سے سنوارا اور عارف نے بھی پھر عورت کی مجبوری کو سمجھا اور اسے اپنا لیا۔ جون ایلیا نے بہت پہلے اندازہ لگا لیا تھا جو حالات آج کل چل رہے ہیں۔ جہالت، افلاس، غربت کا دردناک عذاب۔ سسپنس مزہ دے گیا، خدا کرے سسپنس اسی طرح مسکراتا رہے۔“ (آمین)

❋ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں ”اپریل کا سسپنس 17 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ مہ جبینہ بے ساختہ مسکرا رہی ہے۔ اندر انشائیہ میں علم و حکمت کے موتی چنے۔ پاکستان کے عوام کو بھی اللہ نے ہر مصیبت اور پریشانی میں ثابت قدم رہنے کی خداداد صلاحیت دی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہو عوام ہر جگہ اپنے افلاس کو کاندھوں پر اٹھائے زندگی کے گام پر رواں دواں ہے، غریب کا ہمیشہ سے استحصال ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اپنی محفل میں بھی زبردست گہما گہمی ہے۔ سرفہرست عمار کشف تھے۔ خوب صورت تبصرے پر مبارک باد۔ سامنے اپنا نامہ بھی نظر آیا بہت شکریہ۔ ملتان کے ڈاکٹر جعفر کی اچھی تجویز ہے۔ پرانی کہانیاں بھی سسپنس کے صفحات پر لکھی جائیں تو نئے پڑھنے والے لطف اندوز ہوں گے۔ باہر کی کہانیاں کم کردی جائیں۔ سسپنس و دیگر ڈائجسٹ میں اسیران قفس کے بھی بیشتر نامے ہوتے ہیں۔ اللہ کرے ان کو قید و بند کی تاریکیوں سے جلد سے جلد نجات ملے (آمین) اپنی محفل سے نکل کر مسافر کے قافلے میں شریک ہوئے قسط دلچسپ تر ہوتی جارہی ہے اور ہیرو شہریار چھایا ہوا ہے۔ دوسرا مقبول عام سلسلہ کشکول شروع کیا۔ شیخ حامد پھر منظر عام پر آگیا ہے۔ اس کے بعد تاریخ کے روشناس ڈاکٹر ساجد امجد کی پس پردہ پڑھی جہاں ہارون رشید جیسے عادل بادشاہ کے حالات و واقعات سے آگاہی ہوئی۔ ہارون رشید کے عدل کے بہت سے قصے مشہور ہیں وہ صحیح معنوں میں رعایا کا سچا بہی خواہ تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تاج و تخت کے حصول میں سازشیں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔ ان سازشوں سے خونی رشتے بھی ریت کی دیوار کی طرح ہٹا دیے جاتے ہیں۔ قرض میں خطرناک ڈاکو پکڑے گئے اور شاہین کو رینا جیسا انعام ملا۔ اندھیر نگری نے اپنا پیغام دیا۔ پس منظر میں مصنفہ ڈولوریس نے اپنی حاضر دماغی سے اپنی جان بچالی۔ محفل شعر و سخن میں بھی معیاری شعر پسند آئے۔ ڈاکٹر عبدالرب کی شاخسانہ بھی پسند آئی۔ شہر برباد بھی افغانستان کے پس منظر پر تھی، آخری رسم بھی اچھی رہی جس میں ایک بیوی نے ڈاکٹر کی بتائی ہوئی آخری تاریخ کے مطابق تدفین کے سارے انتظامات کرلیے تھے مگر جب شوہر کو ہشاش بشاش آتے دیکھا تو سارا پروگرام چوپٹ ہونے کی وجہ سے شوہر کو منہ پر تکیہ رکھ کر ماردیا۔ شیخ المشائخ نے بھی روح کو ایمان کی روشنی سے منور کیا مگر بھوت نے کافی محظوظ کیا۔ آخری صفحات پر ایچ اقبال کی شکستہ گڑیا آخری صفحات کی خوب صورت کہانی تھی۔“

❋ محمد جاوید شبیر بربرہ، علی پور، مظفر گڑھ سے محفل کی زینت بنے ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ سے کافی عرصے سے یارانہ ہے۔ اب اس کے دربار میں آکے کیا تعریف کریں۔ ہماری تو دلی دعا ہے کہ ملک میں ایسے حکمران آئیں جو ملک کی ترقی کے لیے کام کریں ملک سے دہشت گردی، غربت کا خاتمہ کریں اور ہمارا، ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ ایسے لوگوں کو ووٹ دیں جو اپنے ملک پاکستان کے لیے مخلص ہوں۔ ایک روسی شہری سے ملاقات ہوئی ان دنوں روس میں الیکشن کا زور تھا۔ اس نے بتایا کہ میرا سگا بھائی بھی امیدوار ہے۔ بھائی کے لیے میری جان تک حاضر ہے لیکن میں بھائی کو ووٹ نہیں دوں گا اس کے مدمقابل کو ووٹ دوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے بھائی سے زیادہ وہ قابل ہے اور اپنے ملک کی خدمت کرسکتا ہے۔ انکل اگر ہم سب ایسی سوچ رکھیں تو ہمارا ملک دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرسکتا ہے۔ محمد عمار کا تبصرہ واقعی جاندار تھا۔ ڈاکٹر جعفر علی صاحب کی بات کی تائید کرتے ہیں، پرانی قسط وار کہانیاں ضرور شائع کریں لیکن سسپنس کے ابتدائی دور کی ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی پس پردہ تاریخی کہانی پر بھی، بہت سے مصنف تاریخی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن جو کمال ڈاکٹر صاحب کا ہے وہ کسی کا بھی نہیں ہے۔ ایک پُرزور فرمائش ہے کہ ہمارے محبوب سینئر لکھاریوں کی تصویریں بھی شائع کریں مجھے یاد پڑتا ہے کہ کافی عرصہ پہلے بھی سسپنس یا جاسوسی میں آپ نے شائع کی تھیں۔ کشکول اب کچھ کچھ بور ہوتی جارہی ہے اس کے مدمقابل ناصر ملک صاحب کی مسافر کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔ ناصر ملک صاحب کو جنوبی پنجاب کے شہر تو شہر گاؤں سے بھی کافی آشنائی ہے، کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ یہ خود مظفر گڑھ کے آس پاس رہتے ہیں۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔

❋ زویا اعجاز، لاہور سے محفل میں چلی آرہی ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ کے ساتھ میری رفاقت تیرہ سال پرانی ہے مگر تبصرہ پہلی بار لکھ رہی ہوں (خوش آمدید) اس ماہ کا شمارہ حسب معمول انیس تاریخ کو ملا، ٹائٹل کو دیکھتے ہی دل سے بے اختیار تعریفی کلمات برآمد ہوئے۔ بے حد شاندار اور راحت بخش ٹائٹل تھا۔ تبصرہ لکھنے کا بنیادی مقصد یہ رائے دینا ہے کہ طاہر جاوید مغل کے پرانے ناول اگر دوبارہ شائع کیے جائیں تو بہت سے قارئین کی دلی مراد برآئے گی۔ توقع ہے اس تجویز کو خاطر خواہ توجہ ملے گی۔ کہانیوں کی اگر بات کی جائے تو اس ماہ کی بہترین تحریر اندھیر نگری تھی۔ ہمارے بنیادی

معاشرتی مسائل غربت، بے روزگاری اور حلال و حرام کے تصور کا احاطہ کرتی یہ کاوش لاجواب تھی۔ ڈائیلاگ بھی بے حد تیکھے تھے۔ دوسرے نمبر پر شہر برباد کی دھول رہی۔ بین الاقوامی المیہ کو بیان کرتی یہ تحریر دل کو گداز کرگئی۔ رب العزت ذلت اور غلامی کی زندگی سے سب کو محفوظ رکھے۔ مترجم کہانیوں میں قرض، گھر کا بھوت اور آخری رسم پسند آئیں۔ سلسلہ وار کہانیوں میں کشکول بہترین جارہی ہے۔ اس ماہ کہانی کا اختتام بہت سسنی خیز تھا۔ آئندہ قسط کا بے تابی سے انتظار رہے گا۔ مسافر حسب معمول اغوا اور اغوا کی ڈگر پر چل رہی ہے۔ شہریار کو پے در پے اتفاقات سے ملنے والی کامیابیاں بالکل متاثر نہیں کرتیں۔ کہانی جمود کا شکار ہے۔ سونے پر سہاگہ میڈم کی حرکات کوفت میں مبتلا کردیتی ہیں۔ شکستہ گڑیا کا پلاٹ بھی پرانا تھا نام کے برعکس کہانی غیر متاثر کن تھی۔ اس موضوع پر صد، بار قصہ لکھا جاچکا ہے۔ ملک صفدر حیات کی یادداشت پر مبنی کہانی اچھی رہی۔ مگر یہ حقیقت پردہ نشین ہی رہی کہ جیدا کس کا بیٹا تھا۔ تاریخی کہانی اسی موضوع پر پہلے بھی لکھی جاچکی ہے۔ مجموعی طور پر اپریل کا شمارہ اچھا رہا۔ توقع ہے کہ محفل میں جگہ دی جائے گی تاکہ آئندہ بھی شرکت کرسکوں۔“ (دیکھیے جگہ مل گئی۔ اب شرکت لازمی ہے)

❋ احسان سحر، زادے خیلانوالہ سے تشریف لارہے ہیں ”اپریل کا سدا بہار سسپنس 16 کو گلاب کے پھول کی طرح خوشبو بکھیرتا ہوا میرے ہاتھوں کی زینت بنا۔ ہر طرف بہار کی آمد ہے...... پھولوں کی خوشبو بکھر رہی ہے۔ یہ موسم بہت ہی مختصر ہوتا ہے لیکن اس چھوٹے اور مختصر موسم میں اتنی فرحت بخشی کا احساس ہوتا ہے کہ انسان سال بھر کی تمام تلخیاں بھول جاتا ہے۔ ٹائٹل کی طرف مسکرا کر دیکھا تو صنف نازک ہماری ہی طرح مسکرا رہی تھی شاید ہمارے حسن اور مسکراہٹ سے شرما کر چہرہ گلابی دوسری طرف کرلیا۔ اس دفعہ عمار کشف سعدیہ بخاری کے چھوڑے ہوئے جھولے میں جھولتے نظر آئے اور منہ میں فیڈر لیے قلقاریاں مار رہے تھے مبارک ہو، اچھے موسم میں...... بہت زیادہ تعریفیں بھی صنف نازک کی مت کیا کرو، اندھے ہوجاؤ گے...... قیصر اقبال بھی رم جھم کی طرح برستے رہے۔ قدرت اللہ نے آخر میں صحیح نشان دہی کی، بیوی نے جلالت کو دشمن کیوں قرار دیا تھا، اس کی وضاحت نہ ہوسکی۔ ماما ایمان کا تبصرہ بھی اچھا رہا...... سعدیہ بخاری اب تو لاسٹ پر نظر آئیں پل میں تولہ پل میں ماشہ والی بات ہوئی۔ ڈاکٹر جعفر علی کی بات سے ہم سو فیصد متفق ہیں...... خاص کر اگر قسط وار کہانیاں دوبارہ شروع ہوجاتیں جن میں طالوت، اندھیر نگری، دیوتا، موت کے سوداگر، شکاری، سنگل اسٹوریز میں بند مٹھی، درندہ، اسم اعظم، پل صراط، ماسٹر مائنڈ، ماسٹر منتی اور پرانی ممتا تھیں۔ جون ایلیا مرحوم کا انشائیہ پڑھا ”اندازہ“ تو احساس ہوا کہ ہم ہمیشہ اندازہ ہی لگاتے رہیں گے۔ قرض نے کافی متاثر کیا۔ خاص کر دنیا کی عقل مندی جس نے بروقت فیصلہ کرتے ہوئے مارس کو بھیج کر نہ صرف اپنی جان بچائی بلکہ سونا بھی حاصل کرلیا۔ کشکول مگرمچھ کی واپسی ہوئی اور آتے ہی اپنی خباثت پھیلانا شروع کردی کنول اور اس کی ماں کی جان گئی افسوس ہوا۔ اندھیر نگری میں ایک ممتا کی قربانی اور معصوم ذہنیت کی عکس بندی کی گئی جو اچھی لگی، آج کے دور میں حرام حلال کی تمیز بھی کھوگئی ہے۔ ملک صفدر حیات فساد جھل لے کر حاضر ہوئے۔ واقعی فساد فساد ہی ہوتا ہے۔ ننھے چہرے کی ہلاکت کافی افسردہ کرگئی۔ پس منظر تنویر ریاض اچھی لگی، سبق آموز، ایش واقعی اسی کا مستحق تھا جیسا اس کے ساتھ ہوا۔ شاخسانہ ڈاکٹر صاحب سندھ کی تہذیب کو اجاگر کرتے نظر آئے۔ مسافر میں پہلے والی بات نہیں رہی، صرف ختم ہونے کے چند آخری سطور میں کوئی نیا ڈراما چلا کر تجسس چھوڑا اور پھر وہی بورنگ انداز اگلی قسط میں شروع ہوگیا۔ شہر برباد کی دھول وہی ہمارے موجودہ حالات کی عکس بندی جسے لفظوں میں بیان کرتے ہوئے بھی اذیت ہوتی ہے۔ ایمان افروز سلسلہ کافی متاثر کن رہا۔ مریم کے خان پُراسرار انداز میں آئیں۔ آخری صفحات کی زینت شکستہ گڑیا بنی۔ خوب صورت انداز کی اسٹوری نے کافی مسحور کیے رکھا، محبت چیز ہی ایسی ہے ہوجائے تو یہ نہیں دیکھتی کہ آگے کون ہے...... بزدل سے بزدل انسان کو بھی شیر دل بنادیتی ہے۔ پتا نہیں انسانوں کو آخر دولت کی اتنی ہوس کیوں ہے جو رشتوں کا تقدس بھی بھول کر معصوم عزتوں کو پامال کردیتے ہیں۔ سسپنس اچھا لگا۔“ (تبصرے کا شکریہ۔ کہانی کے لیے مزید انتظار کرنا ہوگا)

❋ محمد تقی عباس، قیدی سزائے موت، سینٹرل جیل، میانوالی سے محفل میں پرانے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہوئے ہیں ”24 تاریخ کو پرچہ ملا جس کا بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ٹائٹل گرل کو دیکھا وہ بہت پریشان تھی، اس کی پریشانی دیکھ کر ہم اپنی پریشانی بھول گئے۔ کرسی پر سسٹر سعدیہ بخاری جی تشریف فرما تھی۔ مبارک ہو سسٹر اس کے بعد میرا بہت برا حال ہوا کیونکہ آپ نے میرا خط شائع نہیں کیا، میں آپ سے بہت ناراض ہوں (اسی لیے آپ کا یہ تبصرہ شائع ہورہا ہے) تصویر انجمن سسٹر ناراضگی معاف کہیں آپ ویمپائر تو نہیں ہیں، اتنی عمر تو ان کی ہوتی ہے، سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ ہیرو ماچس کو اتنا جلدی مارنا اچھا نہیں لگا۔ مسافر بہت اچھی جارہی ہے، کچھ حاسدوں کی بری نظر اس پر لگی ہوئی ہے، اللہ خیر کرے۔ کشکول کو انوار صدیقی ختم کردیں تو بہت اچھا ہوگا۔ زندگی نام ہے جیسے واقعات حقیقت سے بہت دور ہوتے ہیں۔ مدفن بھی اچھی لگی لالچ کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ محمد خواجہ، بابر شہزادہ، طاہرہ یاسمین کا انتخاب اچھا لگا۔ تمام قارئین سے گزارش ہے کہ ہم سب اسیران کے لیے دعا کیا کریں، اس کا اجر اللہ تعالیٰ دے گا۔“ (اللہ آپ سب کو جلد رہائی عطا فرمائے۔ آمین)

❋ طاہرہ یاسمین، ماڑی لک، ضلع سرگودھا سے چلی آرہی ہیں ”اس ماہ کا شمارہ توقع سے کچھ پہلے ہی مل گیا۔ 18 مارچ کی شام کو، پھر کیا تھا سب کام کاج چھوڑ کر لالٹین کی روشنی میں سسپنس کھولا بجلی بند تھی اور بجلی آنے کا انتظار بہت جان لیوا۔ ٹائٹل پر حسینہ آنکھیں بند کیے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے خیالوں میں تومی بھیا کے خیالوں میں کھوئی نظر آئی۔ خطوط کی محفل میں اپنا خط نہ پاکر کچھ مایوسی ہوئی، پھر سسپنس ملنے کی خوشی میں سب بھول بھال کر محمد عمار کشف کو کرسی صدارت پر پایا۔ بھیا مبارک ہو نگران صدر بننے پر۔ مجھے ڈاکٹر جعفر علی سے بالکل اتفاق نہیں کہ پرانی کہانیاں پھر سے سسپنس میں شامل ہوں۔ حسنین ہاشمی، جیل گوجرانوالہ آپ کا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا قسم سے میں جانتی ہوں، بے گناہی کا درد اور پھر اس کی بلاوجہ سزا انسان جیتے جی مرجاتا ہے۔ میری دل سے دعا ہے میرے بھائی کہ آپ آزاد ہوجائیں اور اصل مجرم کیفر کردار کو پہنچے۔ حافظ عمران شاہد، خدا آپ کی پریشانیاں بھی دور

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرے آپ حافظ ہو اس کا اجر خدا آپ کو اسی دنیا میں دے گا، انشاء اللہ۔ عاصم اقبال جیل، شعر اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ماہا ایمان ڈیئر اس دفعہ تو لگتا ہے آپ نے کافی غصے میں خط لکھا۔ ڈیئر محفل کے کسی دوست کی بات کا برا مت مانا کرو، چار دن کی زندگی ہے سب کو معاف کر کے اچھی اچھی باتیں لکھا کرو، یہ لو میرے ہاتھ سے ٹھنڈی کھیر کھاؤ اور دماغ ٹھنڈا رکھو۔ سعدیہ بخاری، میری پیاری کیوٹ دوست، آپ کی اس بات پر بہت ہنسی آئی، جو آپ نے ہمایوں سعید کو وظیفہ لکھا بہ ظاہر تو یہ اچھی دعا اور اچھا وظیفہ ہے، اس ماہ کا سب سے بیسٹ تبصرہ حسنین ہاشمی کا تھا۔ شعروں میں محمد یونس فریادی، عبدالغفور خان خٹک، محمد اقبال، کورنگی اور الطاف حسین کے اشعار اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی مسافر، اینڈ بھی ہو گیا اور یوں لگا جیسے ابھی تو شروع کی تھی۔ کشکول پڑھی اب تو پکا یقین ہو گیا کہ آکٹوپس زندہ ہے اور بے چاری کنول کو مزید عذاب بھگتنا ہے۔ کہانی کے اینڈ میں فرحین صاحبہ غائب ہو گئیں۔ گھر کا بھوت، آخری رسم اچھی تحریریں تھیں، فساد جبل، ملک صاحب کی سب سے بہترین کہانی تھی۔ کافی دن تک ذہن پر چھائی رہے گی۔ اندھیر نگری، شاخسانہ بھی اچھی لگی، آخری رسم کے انجام نے چونکا دیا۔ میر بنا سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اپنے شوہر کو یوں ابدی نیند سلا دے گی۔ شکستہ گڑیا، ایچ اقبال کی تحریر ہو اور پسند نہ آئے ناممکن، اس ماہ کی نمبرون تحریر ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر تو رسالے کے پیسے ہی پورے ہو گئے۔‘‘

✠ **رمضان پاشا،** گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ’’اس بار خط لکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، کراچی کے حالات ہی ایسے ہیں کہ کسی قسم کی خوش فعلی کے لیے دل راضی نہ ہو رہا تھا۔ اس ماہ کا سرورق بالکل اچھا نہیں لگا۔ انشائیہ میں جون صاحب کا اندازہ سو فیصد درست اور آپ کا اداریہ حسب حال اور حسب ضرورت تھا، کیا خوب اداریہ تھا...... (شکریہ) خطوط کی محفل میں اول نمبر آنے والے محمد عمار کشف محفل میں پہلی بار تشریف لائے ہیں اور آتے ہی کرسی صدارت پر براجمان ہو گئے، نہ الیکشن نہ سلیکشن، بہر حال تبصرہ اچھا تھا، مبارکباد! قیصر اقبال گچہ، بھائی میں اتنا پرانا تو نہیں جو آپ نے مجھے آثار قدیمہ کی چیز گردانا، میں تو اسی صدی کا بندہ ہوں۔ ماہا ایمان آپ نے شادی کے لڈو کا ذکر کیا ہے، کس کی شادی کے لڈو؟ دیگر تبصروں میں قدرت اللہ نیازی، ماہا ایمان، ہمایوں سعید، احسان سحر کے تبصرے اچھے لگے۔ معرکہ آرا کہانی قرض میں وافر تعداد میں ڈزوز اور دھیں پٹاس ہو گیں، خوب لطف آیا۔ اندھیر نگری اس موضوع پر کئی قلم کاروں نے کہانی لکھی ہیں لیکن زیر نظر کہانی کچھ کچھ ندرت لیے ہوئے تھی، کردار بھی منفرد تھے، اس لیے کہانی اچھی لگی۔ بٹ صاحب کی کہانی فساد جبل میں تجسس اور سنسنی کچھ زیادہ ہی ٹھونسی ہوئی تھی، اس لیے لطف بھی زیادہ ہی آیا۔ پس منظر کیا خوب کہانی تھی، اختتام چونکا دینے والا تھا۔ شاخسانہ، بھٹی صاحب ہمیشہ اسی موضوع پر لکھتے ہیں، لیکن ان کی تازہ کہانی میں تجسس اور کچھ پراسراریت بھی تھی اس لیے کہانی بور نہیں لگی۔ اس دفعہ کشکول اور مسافر میں تجسس اور سسپنس کچھ زیادہ ہی بھر دیا گیا ہے اس لیے مزہ بھی دوبالا ہو گیا۔ شہر برباد کی دھول یہ نہ صرف کہانی ہے بلکہ ایک بھرپور معلوماتی مضمون بھی ہے۔ آخری رسم اتنی مختصر اور اتنی دلچسپ کہانی، واہ آخر میں چونکنا پڑ گیا۔ گھر کا بھوت بھوت پریت کی کہانیاں تو بہت پڑھ رکھی ہیں مگر ایسے منفرد بھوت کہانی پہلی بار پڑھنے کو ملی ہے۔ شکستہ گڑیا، آہا ایچ اقبال صاحب آئے ہیں کافی عرصے بعد اور آتے ہی اپنی پرانی جگہ پر قابض ہو گئے یعنی آخری صفحات پر، کہانی بہت شاندار اور جاندار تھی، خوب مزہ آیا۔ اشعار کی محفل میں ریاض بٹ کا انتخاب پسند آیا۔ غلام علی کا چناؤ بھی اچھا تھا، سب سے بڑھ کر دل میں کھب جانے والا قطع تھا ماہا ایمان کا۔‘‘

✠ **توصیف احمد،** پٹھان کالونی، کراچی سے چلے آ رہے ہیں ’’اس بار سرورق کی حسینہ چوڑیوں کی نمائش کرتی نظر آئیں۔ لیکن پس منظر میں نیلے آسمان پر ہلکے بادل بڑا رومان پرور ماحول پیش کر رہے تھے۔ اداریے میں جس آمر کی نشاندہی کی گئی تھی اس بارے میں شاید ابھی تک ہم نے سنجیدگی سے سوچا بھی نہیں تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر سب سے زیادہ خطرہ بچوں کے تابناک مستقبل کے حوالے سے ہے لیکن ہمارے یہ مستقبل کے معمار انتہائی غیر محفوظ حالات میں تعلیم کا سلسلہ کیسے جاری رکھ سکیں گے؟ یقیناً یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ دعا ہے کہ آئندہ حکومت ہمارے معاشی و معاشرتی استحکام کا باعث بنے۔ محمد عمار کشف راج گدی مبارک ہو۔ لیکن تھوڑی سی روشنی اس بات پر بھی ڈالیے کہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی عبدالحق صاحب کا زمانہ تو بہت پہلے گزر چکا ہے، کیا آپ رات کو خواب میں ان سے مشکل الفاظ سیکھنے کے لیے کوئی خصوصی پیریڈ وغیرہ لیتے ہیں۔ ادریس احمد خان پلیز آپ بتائیے کہ آپ کب ملک صاحب اور بیگ صاحب کی کہانیوں پر لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر تبصرہ کرنے والے ہیں، کیونکہ اس ماہ ہم سب قارئین مل کر پوری یکجہتی کے ساتھ خط نہ بھیج کر آپ کے لیے جگہ خالی کرتے والے ہیں۔ ہمایوں سعید جب سے آپ نے عبدالرؤف، عدم صاحب کو یہ کہا ہے کہ جب آپ عدم ہیں تو ہر ماہ دستیاب کیسے ہوتے ہیں؟ تب سے لے کر اب تک عدم، عدم ہی ہیں۔ حسنین ہاشمی بقول مرزا امجد بیگ صاحب اگر آپ بے گناہ ہیں تو آپ کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سمیت تمام بے گناہ اسیران کو جلد از جلد آزاد فضائیں نصیب فرمائے (آمین) ماہا جی آپ سعدیہ بخاری کی کامیابی پر کچھ زیادہ ہی خوش ہو گئیں حالانکہ بڑھاپے میں حد سے زیادہ خوشی یا غم ہارٹ اٹیک کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر جعفر صاحب جہاں تک پرانی کہانیوں کی دوبارہ اشاعت کا سوال ہے۔ تو میں صرف تاریخی کہانیوں اور ملک صاحب بشمول بیگ صاحب کی کہانیوں کے، آپ کا پورا پورا ساتھ دوں گا جبکہ دیگر کہانیوں خصوصاً سلسلہ وار کہانیوں کو تو کم از کم میں قطعاً برداشت نہیں کروں گا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پس پردہ سے استفادہ کیا۔ لیکن خیزران کی تاریخ میں اس سے پہلے بھی دو بار پڑھ چکا ہوں۔ ملک صاحب کی فساد جبل میں معصوم جیدا کو قتل کروانے والے ماموں اعجاز کے لیے تو شاید پھانسی کی سزا بھی کم پڑ جاتی۔ آخری رسم میں میرینا نے اپنے شوہر ولبر کی جان لے کر اسکرپٹ کو پورا کیا۔ کترنوں میں صفحہ نمبر 285 پر محمد جاوید بلوچ علی پوری بھی آپ نے تو کمال کر دیا۔ واہ۔ محفل شعر و سخن میں طاہرہ یاسمین ایک بار پھر سب پر بازی لے گئیں۔‘‘

✠ **محمد ہمایوں سعید،** بنوں سے تشریف لائے ہیں ’’عمار برادر! آپ زندہ ہیں؟ شکر ہے۔ اف کتنا روئے تھے ہم۔ احسان میاں کتنی دفعہ کہا ہے کہ ایسا تبصرہ مت لکھو کہ کسی زمیندار کے منشی لگو۔ قیصر اقبال صاحب! جب آپ مرچیں چبا چبا کر میرا نام لیتے ہیں اور زہر کے ڈرم میں تیر ڈبو ڈبو کر

میری جانب پھینکتے ہیں تو نہ جانے کیوں مجھے ایک انوکھی سی خوشی ملتی ہے۔ پلیز یہ عمل جاری رکھیے۔ توصیف برادر! پیارے نبی کا پیارا نام اگر نام کا حصہ بن جائے تو پھر بھلا کسی دوسرے نام کی کیا ضرورت؟ ایک ہی قطار میں حسنین، شاہد، عاصم اور قیصر اعوان برادر کے خطوط پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ ڈیئر برادرز! بس اتنا کہوں گا کہ اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط رکھیے اور پوری شدت سے اسی سے مانگیے، یقیناً وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ماہا صاحبہ کا سارا تبصرہ ان وضاحتوں پر مشتمل تھا کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ محترمہ اتنا تو سوچیے کہ پانچویں دہائی کے سفر پر گامزن سسپنس کی تاریخ میں کسی بھی صنف نازک کی شناخت کو اتنا بڑا ایشو نہیں بنایا گیا اور آپ حق پہ ہیں تو آپ کو بلاوجہ وضاحتیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سعدیہ صاحبہ! نہ جانے آپ یمنی جی کی کس حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر جعفر علی کی بات سے ہم اتفاق کرتے ہیں لیکن قسط وار نہیں آخری صفحات پہ بھی کہانیاں اور جاسوسی کے سرورق کے رنگ دوبارہ شائع کیے جائیں تو بہت اچھا لگے گا اور کاشف زبیر کا سچا رشتہ اور مریم کے خان کی کہانی دشمن جاں سب سے پہلے شائع کیجیے۔ سب سے پہلے ملک صفدر حیات کے شاندار کیس کا مطالعہ کیا۔ ہمیشہ کی طرح ملک صاحب سے عقیدت بڑھ گئی۔ آخری صفحات پہ بھی کہانی شکستہ گڑیا اپنی سست رفتاری اور کمزور مکالموں کی وجہ سے کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ عارف کی محبت اور اس پہ استقامت متاثر کن تھی۔ یاسمین کی سوچ غلط تھی۔ محبت اگر ان باتوں کی پروا کرے تو وہ محبت تو نہ رہی۔ مریم کے خان کی کہانی گھر کا بھوت بھی دلچسپ رہی۔ سندھ دھرتی کی دل دہلا دینے والی کہانیوں کے خالق ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی کہانی شاخسانہ بہت اچھی رہی۔ نہ جانے انسان کب سمجھے گا اور دل سے تسلیم کرے گا کہ اس کے رزق کی ذمے داری اس ہستی نے لی ہے جو کسی کا محتاج نہیں۔‘‘ (آپ کا تفصیلی خط ملا...... آپ نے جس جانب توجہ دلائی ہے، یہ واقعی ایک کوتاہی ہوئی ہے۔ آئندہ مزید احتیاط برتی جائے گی۔ آپ کی رائے مصنف تک پہنچائی جا رہی ہے۔ ہم آپ کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں)

✠ **رضوان تنولی کریڑوی،** اورنگی ٹاؤن کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ’’15 مارچ کی ایک سوگوار شام میں بے رحم قاتلوں نے میرے کزن تفسیر احمد کو شہید کر دیا، پڑھنے والوں سے دعا کی اپیل۔ سرورق پر ایک عجیب الخلقت بندریا ٹائپ کی مخلوق کو بند آنکھوں کھلے منہ اول فول پوز میں دیکھا۔ مزید دلفریب نظاروں کی آس لیے صفحے پلٹتے ہوئے جون ایلیا مرحوم کے انشائیہ اندازہ کا مطالعہ کیا، ایلیا جی کا لفظ لفظ، سطر سطر ہمارے سماج، افلاس کے دور جہالت پہ ماتم کناں ہے ہمارا دولت مند طبقہ یہ بات بھول گیا ہے کفن کی جیب نہیں ہوتی۔ افراتفری، نفسا نفسی کے اس ماحول میں میرے لیے واحد تفریح سسپنس ہے اور مسلسل تبصرہ نہ کرنے کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ میں ان تمام قاری ساتھیوں کا ممنون اور شکر گزار ہوں جو مجھے سراہتے ہیں اور وہ ساتھی جو مجھے رگڑا دینے کے چکر میں یا میری ٹانگیں کھینچنے میں مصروف ہیں ان سے عرض کروں گا، میرا دل دریا ہے۔ محفل خط کی گل و گلزار محفل میں، خوشنما پھولوں کے خوب صورت گلدستے میں عمار کشف سرخ گلاب کے مانند کھلے کھلائے نمایاں مقام پر میر محفل کے منصب پر براجمان نظر آئے، وزیر با تدبیر قیصر اقبال کا تبصرہ بھی بہت عمدہ رہا، ایم زاکم علی گورجانی کو محفل میں خوش آمدید۔ توصیف جی اپنے ہمایوں سعید پہلے کسی جولیٹ کے چکر میں پڑ کے رومیو کہلائے پھر عشق نے تھوڑی ترقی کی تو حضرت کسی رانی کے خواب دیکھتے ہوئے راج بن گئے اب موصوف کا اگلا ہدف کیا ہوگا یہ اللہ کو خبر، حسنین ہاشمی کو پوری محفل میں صرف سعدیہ بخاری کا تبصرہ دل کو بھایا واہ واہ، بے نا حیرت کی بات۔ قیصر اعوان ساری لڑکیاں ہمایوں کو بھائی بنانا چاہتی ہیں مگر اپنے ہمایوں؟ چھوڑیے رو دیں گے کستوری لگا کے۔ ماہا ایمان کو یوں کہنا چاہیے تھا حلقہ یاراں میں داخل ہوتے ہیں جہاں خواتین کے سر کے بالوں میں جوؤں کی بھرمار، طعنے کوسنوں کی یلغار، چٹنوں کی جھنکار، صنف نازک کی زبان دو دھار تلوار۔ نہ جانے کتنوں کا بیڑا پار کر گئی، سعدیہ بخاری کی سونگھنے کی حس لاجواب ہے محترمہ کو محفل میں جھاڑی کی خوشبو آنے لگی ہے، کیا آپ اس سے پہلے والے جنم میں بکری تھیں کستوری لگا کے۔ کہانیوں کی ابتدا اپنی محبوب تحریر ڈاکٹر ساجد کی پس پردہ سے کی، سگی بر کی خیزران وغیرہ اپنے عہد کے فتنے تھے اور ظالم کی رسی ایک وقت تک دراز رہتی ہے اس کے بعد ظالم اور ظلم دونوں قدرت کے لپیٹے میں آ جاتے ہیں، ناصر ملک کی مسافر پوری آب و تاب سے ہمکنار رہی ہے، شہریار جرأت اور بہادری سے شہزادی اسما کو یارن خان کے شکنجے سے نکال لانے میں کامیاب رہا۔ انوار صدیقی کی کشکول میں اب وہ شروع جیسا مزہ نہیں رہا، کہانی میں لیاقت اور رنگ زیب کا کردار کچھ بہتر ہے اس کے علاوہ کشکول سسپنس کے اوراق کے قابل نہیں۔ عرض کروں گا کہ طاہر جاوید مغل یا اقلیم علیم سے سسپنس میں کوئی قسط وار سلسلہ لکھوایا جائے۔‘‘ (آپ کی فرمائش پہنچا دی ہے)

✠ **اعجاز احمد راحیل،** ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ’’ماہ اپریل کا دیدہ زیب شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ اپنے تنہا ہونے کا احساس کچھ پل کے لیے عنقا ہو چکا ہے۔ اگر کچھ لمحے کسی اپنے کے سنگ گزر جائیں تو یقیناً وہی حاصل زندگی ہوتے ہیں۔ سرورق پر موجود ماہا ایمان صاحبہ کی شرمیلی سی مسکراہٹ اس بات کی غماز ہے کہ موصوفہ کی یقیناً کوئی چوری پکڑی گئی ہے۔ صاحب قلم جون ایلیا کا اندازہ اچھا لگا، آپ کا پر فکر اداریہ سوچوں میں تغیر کی کامیاب کوشش لگا یقیناً ابھی کچھ لمحے باقی ہیں سنبھلنے کے لیے...... صدر محفل بہت ہی عزیز محمد عمار کشف کو مبارک باد۔ ڈیئر بلاشبہ آپ کا تبصرہ آپ کی اعلیٰ ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے...... محمد قیصر اقبال گچہ صاحب کے تبصرے اور جوابات نے بے حد مسرور کیا۔ بہت ہی قابل احترام ہستی محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ لگا۔ برادر آپ کا ماہا ایمان کے بارے میں کیا گیا تجزیہ اچھا لگا۔ اپنے بہت ہی پیارے بھائی ہمایوں سعید کا بے لاگ تبصرہ اچھا لگا۔ ڈیئر آپ کا تبصرہ پڑھ کر کچھ پل خوشگوار گزر جاتے ہیں۔ سعدیہ صاحبہ کو آپ کا دیا گیا جواب اچھا لگا۔ احسان سحر صاحب آپ کی اس سوچ پر خاصی حیرت ہوئی کہ آپ کو انسان اور اونٹ میں بھی تمیز کرنا نہیں آتی۔ ڈاکٹر جعفر علی کی رائے اور تعریف اچھی لگی۔ اپنے اسیر بھائیوں حسنین ہاشمی، حافظ شاہد عمران، عاصم اقبال جپال، قیصر اعوان صاحب کے تبصرے پسند آئے۔ دعا گو ہوں اللہ آپ سب کے حال پر رحم فرمائے (آمین) حافظ آباد سے محترمہ ماہا ایمان صاحبہ بھی یقیناً یہ بتانے کی کوشش میں ہیں کہ ’’وہ بھی دن تھے جب ہم جن تھے‘‘ بہر حال تفسیر بھائی کو سفارش کر دی ہے کہ وہ آپ کو درشن کروا دیں۔ سعدیہ بخاری صاحبہ کا پر بہار تبصرہ اچھا لگا۔ سعدیہ جی برادر ہمایوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سعید کو آپ نے جو وظیفہ بتایا لگتا ہے اس کی عامل ہیں۔ مسٹر ڈب کلاں کا تبصرہ بہت عمدہ لگا۔ ڈیئر MR اب تو محترمہ سعدیہ بخاری صاحبہ کی عمر اللہ کرنے کی ہے، دلہن بننے کی نہیں...... توصیف احمد اینڈ محترمہ ساجدہ راجا کے تبصرے اچھے لگے۔ ناصر ملک کا مسافر اپنی منزل کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے۔ شہریار مجموعی طور پر موجودہ قسط میں کامیاب رہا۔ میڈم شکیلہ اور شہریار کے رومانس بھرے لمحات دل میں نئی امنگیں جگا دیتے ہیں۔ کشکول زبردست جا رہی ہے۔ کرنل احتشام، اورنگ زیب، لیاقت علی وغیرہ کا کردار خاصا جاندار ہے۔ موجودہ قسط کا سنسنی خیز اینڈ اگلے شمارے کی تڑپ بڑھا گیا۔ ابتدائی صفحات پر موجود پس پردہ تاریخی حیثیت کو منوانے میں کامیاب رہی۔ بے شک انسان ہمیشہ اپنوں ہی کی بے اعتنائیوں کا شکار ہوا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید کی داستان زیست پُراثر رہی۔ بھٹی صاحب کی شاخسانہ دھرتی سندھ کے رسم و رواجوں کی عکاسی کرتی بہترین اسٹوری لگی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی انتہائی اہم و نازک موضوع پر لکھی گئی شہر برباد کی دھول غور و فکر کے در وا کر گئی۔ یوسف شیرانی کی آخری رسم اچھی لگی یقیناً کچھ کام اپنے وقت پر اچھے لگتے ہیں۔ سلسلہ اولیا میں سے شیخ المشائخ جذبۂ ایمان کو جوان کر گئی۔ بے شک اولیائے کرام انبیا کے وارث ہیں۔ فساد جہل پراثر و پر عبرت ثابت ہوئی۔ مریم کے خان کی محبت کی انتہا کو چھوتی تحریر گھر کا بھوت بہترین لگی۔ بے شک کوئی اپنے چاہنے والوں کو کسی اور کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔ کاشف زبیر کی قرض مزہ دے گئی، بلاشبہ انسان اگر کچھ کرنے پہ آ جائے تو کچھ بھی ناممکن نہیں واقعی کچھ قرض چکانے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ رینا نے اپنے باپ کا بدلہ بڑی دانش مندی سے لیا۔ چاہتوں، محبتوں میں گندھی آخری صفحات پر موجود شکستہ گڑیا عصر حاضر کے لٹیروں کے لیے بہترین اصلاح ہے۔ مجبوریوں کی اسیر یاسمین کی محبت اور انوکھا کردار اچھا لگا۔ محفل شعر و سخن میں طاہرہ یاسمین، ماہا ایمان، محمد اقبال، کراچی، محمد قدرت اللہ نیازی اور نرگس علی کے انتخاب اچھے لگے۔“

✠ **ابرار وارث**، درآباد سندیلیانوالی سے محفل میں چلے آ رہے ہیں ”ماہ اپریل کا شمارہ اپنی تمام تر جلوہ خیزی کے ساتھ 18 مارچ کو ایک خوشگوار جھونکے کی شکل ہمیں آ ملا۔ ہمارے شہر میں اتنا جلدی! حسب معمول سرورق جاذب نظر رہی تھا۔ دوشیزہ کے پس منظر میں بنائے گئے خاکے خوب صورت تھے۔ محفل میں پہنچے، محفل کی نمائندگی بھائی عمار کشف دے رہے تھے، اس قدر tough تبصرہ خیر مبارک ہو۔ قیصر اقبال کچہ آپ کے چہرے پر مریم کے خان کی کہانی پڑھ کر جو جھریاں آئی تھیں، امید ہے اس دفعہ مریم جی نے وہ کافی حد تک ختم کر دی ہوں گی۔ ہمایوں سعید اداس دل کے ساتھ انٹری دے رہے تھے، بھائی آپ کی باتیں بہت سچی ہیں لیکن کون جواب دے۔ ساجدہ راجا کی ساری باتیں درست تھیں لیکن ہمیں تو امید ہی رکھنی چاہیے۔ بھائی حسنین ہماری تو تہ دل سے دعا ہے کہ اللہ آپ کو جلد سے جلد اس کال کوٹھری سے نجات عطا فرمائے۔ ماہا ایمان جی کا تبصرہ کافی جاندار تھا، پڑھ کر بہت لطف اٹھایا، خاص کر ہمایوں سعید اور قدرت اللہ کے بارے میں تو انہوں نے خوب کہا۔ سعدیہ بخاری جی پچھلی دفعہ آپ پہلے نمبر پر تھیں، اس دفعہ اینڈ پر آ گئیں میرے خیال میں سسپنس وہ کر دکھاتا ہے جو کسی کے گمان میں نہیں ہوتا۔ مسٹر ڈب کلاں ذرا اپنے نام کی تشریح تو کریں پلیز ارے یہ کیا پورے شمارے میں صرف دو بہنیں باقی کہاں کھو گئیں (جی جناب...... یہ تو لمحہ فکریہ ہے صنف نازک کے لیے) حسب معمول سب سے پہلے اسٹارٹ مسافر سے کیا۔ شہرا اکیلا ہونے کے باوجود اتنا کچھ کر گیا واقعی اس دفعہ کہانی کی قسط نے کافی زبردست موڑ لیا۔ اینڈ والی بات ذرا پسند نہیں آئی بلکہ یہاں غزالہ ہوتی تو اور بات تھی اس کے بعد آخری صفحات کی طرف بڑھے، کہانی شروع سے لے کر اینڈ تک پڑھی ختم بھی ہو گئی لیکن کوئی مزہ نہیں آیا۔ کافی دن پہلے ایک کہانی آئی تھی، وحشت تنہائی شاید نجمہ مودی کی تھی اس کے بعد کوئی جاندار کہانی نہیں ملی۔ محمد الیاس صاحب کی اندھیر نگری کافی حد تک Best لگی مہدی علی کی باتوں نے بہت محظوظ کیا۔ اس کے بعد شہر دھول کی کہانی بھی ایک اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ مریم کے خان نے اس دفعہ حد کر دی ایک جن لاکر وہ بھی جوان اور خوب صورت اور بے گناہ اور مستزاد یہ کہ میری جب چاہتی اس سے باتیں کرتی لیکن پھر بھی ایک بہت پیاری تحریر تھی۔ اس دفعہ پہلے نمبر پر کہانی کاشف زبیر کی قرض لگی، بہت خوب صورت کہانی تھی۔ رینا کی عقلمندی اور دور اندیشی واقعی اسی لائق ہی تھی کہ شائن اس سے مرعوب ہو گیا تھا۔ ایک خط ڈاکٹر جعفر علی کا تھا جس کے متعلق میری رائے تو یہی ہے کہ پلیز 80 کی دہائی والی 90 کی دہائی والی اور 2000 تک کی کہانیاں آپ وقتاً فوقتاً لگاتے ہی رہیں کیونکہ جب بھی کوئی پرانا شمارہ ہاتھ لگتا ہے تو اس کی تحریروں اور آج کی تحاریر میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے پلیز میری گزارش تو یہی ہے کہ اس طرف ضرور توجہ دیں، خاص کر کاشف زبیر، محی الدین نواب، اسما قادری، مریم کے خان اور احمد اقبال کی کہانیاں لازمی انٹر کریں، بہت مہربانی ہو گی چاہے وہ پرانی ہی کیوں نہ ہوں۔“ (آپ کی رائے قابل غور ہے)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، جکیم ٹاؤن، خانیوال سے تشریف لائے ہیں ”ماہ اپریل کا موسم بہار حسینہ سرورق پر بھی اثر انداز نظر آیا، بے طرح ہنستی حسینہ کی آنکھیں بند جبکہ باچھیں کانوں کو چھونے کی کوشش میں مصروف نظر آئیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا پاکستانی قوم کی برداشت کا اندازہ لگانے میں مصروف کار نظر آئے۔ اداریہ حالات حاضرہ پر مختصر نظر ثابت ہوا۔ محمد عمار کشف سعدیہ بخاری کو دھکیل کر کرسی صدارت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ اپنے پرتکلف تبصرے کے ساتھ دیگر قارئین کا امتحان لیتے نظر آئے۔ رمضان پاشا! جناب یہ نوک جھوک ہوتی ہے تضحیک نہیں، اسے سنجیدگی سے نہ لیا کریں۔ ابرار وارث اور ایم زاکم علی گور چانی! محفل میں خوش آمدید۔ توصیف احمد ہمایوں سعید نے راج کا دم چھلا ہٹا کر محمد ہمایوں سعید کے نام سے تبصرہ بھیجنا شروع کیا ہے جو ایک خوب صورت تبدیلی ہے۔ ڈاکٹر جعفر علی! آپ پرانی سلسلہ وار کہانیاں کتابی شکل میں مارکیٹ سے خرید کر پڑھ سکتے ہیں، سسپنس میں دوبارہ شائع کرنا ضروری نہیں۔ ساجدہ راجا! آپ کی دھمکی کارگر رہی۔ ہماری دعا ہے کہ ہم جلد آپ کی تحریر سسپنس میں پڑھیں۔ حسنین ہاشمی! اللہ آپ لوگوں کی صلح کروا دے اور آپ جلد آزاد فضاؤں میں سسپنس کے لیے تبصرے تحریر کر سکیں۔ آمین۔ حافظ شاہد عمران! ابھی سعدیہ بخاری کی کیا مجال کہ ماہا ایمان کو للکارے؟ بھینس کے سر پر طبلہ بیٹھ بھی جائے تو بھینس کا کیا بگاڑے گی؟ مسٹر ڈب کلاں! جناب اپنا انسانی نام بھی بتا دیں، مہربانی

ہو گی۔ سب سے پہلے کشکول کی نئی قسط پڑھی، ہر بار کہانی اپنے سحر میں ایسا جکڑتی ہے کہ نان اسٹاپ چلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ باقی آئندہ کا اسپیڈ بریکر آ جاتا ہے۔ مسافر میں شہریار غیر متوقع کامیابی سمیٹ لایا تاہم پروین کی بازیابی تاحال دور از مکان نظر آئی۔ محمد الیاس اندھیر نگری لے کر آئے۔ احمد دین المعروف آفاق احمد ماں کی تعلیم و تربیت سے ایک اچھا انسان بنا تو مہدی علی بھی ایک ہیرا ثابت ہوا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایک اچھی ماں ایک اچھی قوم کی ضامن ہوتی ہے۔ محمد الیاس نے غربت کے شرمناک پہلو بہترین طریقے سے اجاگر کیے۔ تنویر ریاض پس منظر کے ساتھ تشریف لائے۔ ڈولوریس نے اپنے بچاؤ کے لیے ایش کو اوپر پہنچا دیا جو اس کا بروقت درست فیصلہ تھا۔ ڈاکٹر عبد الرب بھٹی کی شاخسانہ صدیوں پرانی سنگین رسم و رواج پر مبنی تھی۔ آخری رسم کی تیاری میں مصروف میرینا کو پڑھ کر ہی دل نے کہا ولبر کی خیر نہیں وہ بیماری سے تو نہیں مرے گا البتہ میرینا سے نہیں بچ پائے گا ہر کام کی منصوبہ بندی قبل از وقت کرنا کبھی کبھار ایسی صورت حال بھی پیدا کر دیتا ہے۔ گھر کا بھوت تخیلاتی کہانی ثابت ہوئی تاہم جان نے عاشق مزاج بھوت ایڈم سے جان چھڑا ہی لی۔ ایچ اقبال کی شکستہ گڑیا نفس و زر پرستی کے اسیروں کی روداد تھی جب انسان نفس و زر پرستی کی پستیوں میں اترتا ہے تو وہ خود کو اپنے ہر عمل میں جائز گردانتا ہے ایسے ہی معاشروں میں الماس نادر اور نجیب خان جیسے کردار پرورش پاتے ہیں اگر بے جا تنقید نہ سمجھا جائے تو مصنف کی ایک منطقی غلطی کا ذکر ہو جائے؟ جب کنور شمشاد، رانی بیگم کے زیر تسلط تھا تو پہلے جائداد عارف کے نام کروانے اور یاسمین کی اس سے شادی پھر عارف کو بلیک میل کرنے کا منصوبہ؟ یہ سارا کھٹ راگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی، رانی بیگم کنور شمشاد کو بھی تو بلیک میل کر کے رقم بٹور سکتی تھی۔ تیمور احمد، ماہا ایمان اور ایچ شاہد عمران کی رباعیات خوب تھیں، کترنیں کافی کم مقدار میں تھیں۔“

✠ **محمد جاوید خان**، نامعلوم مقام سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں ”کئی برسوں بعد محفل دوستاں میں آنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ (اس بات پر خوش آمدید کہا جائے یا ناراضی کا اظہار کیا جائے...... کیوں دوستو!) یوں تو ہمیشہ سے ہی سسپنس کی کہانیاں معیاری اور منفرد ہوتی ہیں۔ خاص کر تاریخی کہانیوں پر ہمایوں بگرامی صاحب اور ڈاکٹر ساجد امجد کو عبور حاصل ہے۔ اس کے بعد بیگ صاحب اور صفدر حیات کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ سال گزشتہ کی جتنی بھی تحریریں میں نے پڑھیں تمام کی تمام ہٹ رہیں۔ چاہے وہ مختصر کہانیاں ہوں سب اچھی لگیں لیکن جو سب سے زیادہ دل کو بھائی ان کی فہرست کچھ یوں ہے۔ سودے بازی، آتش نادیدہ، اچھوتی محبت طاہر جاوید مغل کی تحریر، دوراہا، وحشت تنہائی نجمہ مودی کی تحریر بہت زبردست لگیں اور احمد اقبال کی تحریر جارحست ایک چوراہا سپر ڈوپر ہٹ رہی۔ نواب صاحب کی تحریر ہو اور میں نہ پڑھوں یہ ہو نہیں سکتا۔ ایکشن اور پراسراریت سے بھرپور سلسلہ کشکول اور سچائی کی داستان مسافر یہ دونوں سلسلے بہت کامیابی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔“

✠ **تصویر العین**، اوکاڑہ سٹی سے محفل میں آئی ہیں ”سسپنس کا ٹائٹل واقعی زبردست تھا۔ ٹائٹل گرل کی مسکراہٹ دیکھ کر یقین آ گیا کہ بہار آئی ہے۔ کشکول میں صرف لیاقت حسین کا ایکشن ہی مزہ دیتا ہے۔ مسافر میں یہ شہریار آخر میڈم کے چنگل سے نکل کیوں نہیں جاتا۔ شہریار نے اسما کو یارن خان کی قید سے آزاد کروا کر اچھا کیا مگر کاش وہ اسما کو میڈم کے حوالے ہی نہ کرتا۔ خطوط کی محفل میں پہلا خط محمد عمار کشف کا تھا تبصرہ اچھا تھا مگر اسے آسان اردو میں لکھتے تو اچھا تھا۔ قیصر اقبال کچہ اگر عدنان یوسف کو میرے دنیا میں آنے کا علم ہو بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا؟ ویسے اینٹیں رکھنے سے ہمایوں سعید راج کی چھٹی نہیں ہر یہ بنتا تھا۔ رمضان پاشا اس بار آپ کا تبصرہ اچھا نہیں لگا صرف اسٹوریز پر تبصرہ، دوستوں پر کچھ بھی نہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی اگر حسنین بلوچ واقعی رہا ہو گئے ہیں تو بڑی زبردست خبر ہے۔ ابرار وارث کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ ایم زاکم علی گور چانی محفل میں خوش آمدید۔ آئندہ بھی آتے رہیے گا۔ توصیف احمد طاہرہ یاسمین کے لیے دل کا دروازہ کھول دیا۔ محمد ہمایوں سعید محفل میں سب سے زبردست تبصرہ آپ کا تھا اس بار۔ آپ کے بعض الفاظ اور جملوں نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ احسان سحر خوش ہو جاؤ کہ اس بار قدرت اللہ نیازی اپنے تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ میں ڈاکٹر جعفر علی سے ایگری کرتی ہوں مگر میری خواہش ہے کہ پرانی قسط وار کہانیوں میں سب سے پہلے مجاہد اور سرکش شروع کی جائے۔ حسنین ہاشمی آپ کے بارے میں پڑھ کر بہت دکھ ہوا آپ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں اور آپ کے ماں باپ کا آپ کو جیل میں دیکھ کر کیا حال ہو گا۔ کہتے ہیں نا کہ انسان اپنے دوستوں کی صحبت سے ہی پہچانا جاتا ہے لہٰذا برے دوستوں سے بچنا چاہیے۔ حافظ شاہد عمران آپ کو مقصود الحسن طاہر کو اتنا برا تو نہیں کہنا چاہیے تھا کہ رحمان ملک سے ہی ملا دیا۔ بہت افسوس کی بات ہے۔ قیصر اعوان ہماری دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمران حیدر کو مکمل صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ آمین۔ ماہا ایمان آپ کے خط پر تبصرہ نہیں کروں گی۔ آپ کو پڑھ کر ہمیشہ تفسیر عباس بھائی یاد آ جاتے ہیں پتا نہیں وہ محفل میں شریک کیوں نہیں ہو رہے۔ کترنوں میں محمد جاوید بلوچ، عدنان یوسف کی مزاحیات بہت اچھی لگیں ایک اور بہت اچھی تھی مگر اس پر نہ کوئی عنوان تھا، نہ ہی کوئی نام ڈالڈا کے حوالے سے تھی۔ محفل شعر و سخن میں قیصر اعوان، ایم زاکم علی خان کی چوائس اچھی لگی، پلیز ذرا قینچی کم ہی چلایے گا۔“ (یہ تو مجبوراً چلانا پڑتی ہے)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

مقصود الحسن طاہر چتولی، قصور۔ محمد ارشاد تبسم، اوکاڑہ۔ فوجی صابر علی، نامعلوم۔ سارہ، کراچی۔ فائزہ، مری روڈ، راولپنڈی۔ سعدیہ بخاری، اٹک۔ ماریہ فاروق، چمن۔ عذرا بتول، نامعلوم۔ انجم ساحلی، لاہور۔ چوہدری عاصم اقبال جسپال، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ ظفر علی، حیدرآباد۔ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاولپور۔ قیصر اقبال کچہ، کلول بھکر۔ ثمینہ حبیب، مری آباد، کوئٹہ۔ طاہرہ گلزار، کراچی۔ محمد جاوید، علی پور۔ حافظ محمد عرفان، سرگودھا۔ ایم افضل کھرل، ننکانہ صاحب

WWW.PAKSOCIETY.COM

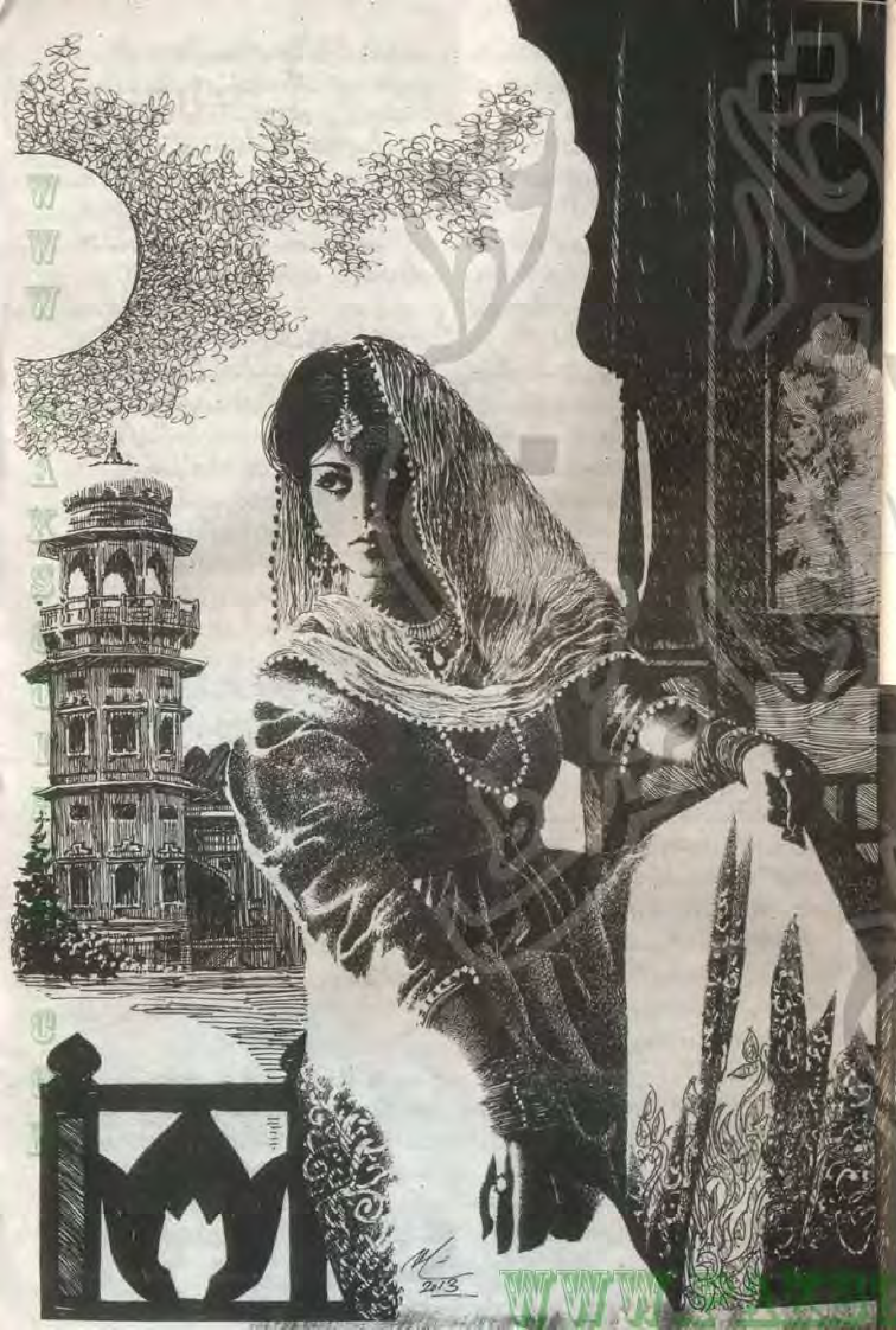

چراغ رفتہ

ڈاکٹر ساجد امجد

ایام کی گردش رفتہ رفتہ عمر بیتنے کی نشانی ہے مگر... مقدر گردش میں آجائے تو بادشاہ ہو یا فقیر... حالات و واقعات کا یہ بھنور ایک الگ ہی داستان تخلیق کرتا ہے۔ محبت کا تاج محل تعمیر کرنے کے بعد "شاہجہاں" مسلسل محبت کی اسیری میں رہا... یہی محبت روپ بدل بدل کر دل کا امتحان بھی لیتی رہی... اپنے ہی جگر گوشوں کے ہاتھوں لہو رلاتی رہی... کیا کیا جائے کہ تاج و تخت کی یہی روایت رہی ہے... محلوں کی دیواریں سازشوں کے پھلنے پھولنے کی بہترین جگہ ثابت ہوئی ہیں۔ جن دیواروں کے درمیان معصوم شہزادوں نے اپنا بچپن پھولوں کے مانند گزارا، وہی درودیوار آزمائش پر تل گئے۔ داراشکوہ... شاہجہاں کا سب سے لاڈلا بیٹا... کیا خبر تھی نازونعم میں پلنے والا یہ شہزادہ اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں یوں ذلت ورسوائی کی گہری کھائی میں گرے گا کہ جو ہاتھ جواہر لٹاتے تھے آج شرم سے اپنا چہرہ بھی چھپا نہیں پا رہے... گویا ثابت ہوگیا کہ دولت سے تعیشات تو خریدے جاسکتے ہیں مگر دانائی نہیں... اور دانا مصاحبت مقدر والوں کو ہی ملا کرتی ہے۔ تقدیر نے جسے شہزادہ بنا کر پیدا کیا، قدرت نے اسے فقیر بنا دیا... یہی اوپر والے کا کرشمہ ہے، یہی اس کا میزان اور یہی انسان کی حقیقت ہے کہ اسے آنے والے وقت کا کچھ علم نہیں ہوتا، وہ بس حال میں مگن رہتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

WWW.PAKSOCIETY.COM

قندھار کی مہم سے واپسی ہوئی تھی مگر کس طرح ہوئی تھی۔ شہزادے کی رکاب میں نہ وہ جلیل الشان منصب دار تھے جن کے نقاروں کی دھمک سے زمین دہلتی تھی اور نہ جڑاؤ چھتروں والے مشہور زمانہ ہاتھی تھے۔ فقط نیم روشن بازار تھے جو شہزادے کے گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج رہے تھے۔ قندھار سے نامراد واپسی کی خبریں تھیں جو اس کے گھوڑے کی رکاب تھامے آگے آگے چل رہی تھیں۔

''ارے میاں، دارا قندھار کے کسی قلعے کی ایک اینٹ تک حاصل نہ کرسکا۔''

''سنا ہے خان کلاں معظم خاں جیسے جلیل الشان سپہ سالار اپنی پوری فوجوں کے ساتھ کاٹ کر پھینک دیے گئے۔''

''اور تو اور مہابت خان شہزادے سے ناخوش ہو کر کابل چلا گیا۔''

''قندھار کی مہم دارا کے سپرد کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اس کے لیے تو اورنگ زیب موزوں تھا۔''

''ایک مرتبہ وہ بھی ناکام ہوچکا ہے۔''

''دوبارہ پھر اسی کو موقع ملنا چاہیے تھا۔''

''وہ تو دکن میں مصروف تھا۔''

''خیر بادشاہوں کی باتیں بادشاہ جانیں ہمیں کیا۔''

ان افواہوں کی سلامی لیتے ہوئے وہ لاہوری دروازے سے گزرا۔ قلعہ معلیٰ میں پہنچتے ہی نوبت خانے کے دروازے پر اترا اور پاپیادہ دولت خانہ خاص کی طرف چلا۔

اسے اطلاع دی گئی کہ شاہ جہاں مثمن برج میں تشریف فرما ہے۔

زنگی خواجہ سراؤں نے اسے دیکھتے ہی تلواریں زمین کی پیشانی سے لگادیں۔ وہ اندر چلا گیا۔ فانوس اپنی مدھم روشنی بکھیر رہا تھا۔ باپ کا چہرہ سامنے تھا لیکن آنکھیں بند تھیں۔ خواب ناز کھڑا پہرا دے رہا تھا۔ اس نازک وقت میں بھی اسے بیدار کرنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ شہزادے نے باپ کے قدموں کو بوسہ دیا اور الٹے قدموں لوٹ آیا۔

❁❁❁

''ہمیں قندھار سے اورنگ زیب کا لوٹنا یاد ہے۔'' بوڑھے شہنشاہ شاہجہاں نے گاؤ تکیے سے پشت لگائی اور کشمیری شال گھٹنوں پر ڈال کر کہنا شروع کیا۔ ''اونٹوں کی قطاروں کے پیچھے ''طبل'' شور مچا رہے تھے۔ نشان کے ہاتھیوں پر اورنگ زیب کے علم لہرا رہے تھے۔ شجاعوں کے پرے تھے۔ ننگی تلواریں لٹکائے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایرانی اور بدخشانی کنیزوں کے چھکڑے ان گھوڑوں کے پیچھے تھے۔ ایسے سپہ سالار وہ اپنے ساتھ لوٹا کر لایا تھا جن کے صرف نام کی دہشت سے قلعے فتح ہوجایا کرتے تھے۔ توپوں اور خزانوں کا سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ دارا اس طرح واپس آیا ہے کہ توپیں ساتھ نہیں۔ طوغ و علم ہمراہ نہیں۔ امرا کی پرچھائیاں تک اپنے ساتھ نہ لاسکا۔ ایسی شکست تو کبھی کسی ولی عہد کو نصیب نہیں ہوئی۔ کیا کتابوں کے شوق نے اسے بزدل بنادیا ہے۔ کیا املوں اور نجومیوں کی صحبت نے اسے ناکارہ کردیا ہے؟''

''ظل سبحانی! دارا شکوہ سے بلا کر پوچھا تو جائے کہ اس کے ساتھ وہاں کیا بیتی۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ شہزادے نے جاتے ہی تین اطراف کے قلعوں کو فتح کرلیا تھا۔'' سعد اللہ خاں وزیراعظم نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

''اس کے بعد سازشیں اس کے دربار میں رقص کرنے لگیں۔ قندھار کی ہر کنیز اس پر حلال کردی گئی۔'' شاہجہاں نے اسے ٹوکا۔

''یہ باتیں تحقیق طلب ہیں حضور!'' اورنگ زیب کے وکیل نواب عیسیٰ بیگ نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

''کیا یہ بھی غلط ہے کہ ایک چالاک شعبدہ باز کو اس نے دربار میں جگہ دی۔ اس شعبدہ باز نے اسے یقین دلایا کہ وہ جنات کے ذریعے قلعے فتح کرالے گا۔ داراشکوہ اسی کے دام میں پھنس گیا۔ ظاہری اسباب سے غافل ہوگیا اور جب موقع آیا تو وقت گزر چکا تھا۔ اپنی تمام سپاہ کٹوا کر واپس آگیا۔''

امرا نے بہت کوشش کی کہ شہزادے کی طرف سے بادشاہ کا دل صاف کردیں لیکن بادشاہ کی برہمی نے کسی کی بات نہ مانی شہزادہ معتوب ہوگیا۔ بادشاہ نے آئندہ اس سے ملنے سے انکار کردیا۔ خود بادشاہ کا یہ حال ہوا کہ پردہ پوش ہو کر رہ گیا، درشن کے لیے جھروکے میں بیٹھنا ترک کردیا۔ خاص لوگوں کے سوا کسی سے نہ ملتا تھا۔

شکست کے اسی غم نے اسے بیمار ڈال دیا۔ کچھ حالات سنبھل جاتے لیکن بادشاہ کو راہ راست پر لانے والے الفاظ ہمیشہ کے لیے دم توڑ گئے۔ وزیراعظم سعد اللہ خاں انتقال کر گئے۔ رایاں رگھوناتھ راؤ کو وزارت عظمیٰ کا قلمدان سونپا گیا۔

رگھوناتھ بادشاہ کا تقرب حاصل نہ کرسکا۔ شہنشاہ شاہجہاں امور سلطنت کے کاموں سے دور ہوتا گیا۔

تخت طاؤس خالی پڑا تھا۔

ہر وقت کی خدمت گزار، شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا رہا سہا کاروبار سلطنت چلانے میں مشغول تھی اور حالات کے نشیب و فراز پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہی تھی جو شہزادے سے مستقل رابطے میں تھی۔

شاہجہانی مسجد کے قریب اپنی کٹیا میں سرمدؔ اپنی عریانی سے بے خبر ننگ دھڑنگ بیٹھے تھے۔ ان کے لیے بھی طرح طرح کی باتیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ کوئی انہیں ولی اللہ کہتا تھا، کوئی ان کی عریانیت پر انہیں لائق ملامت سمجھتا تھا۔ داراشکوہ کے منظور نظر تھے اس لیے کھل کر کوئی کچھ کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔

اس وقت بھی وہ عقیدت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے کہ داراشکوہ کا ہاتھی ادھر سے گزرا۔ گھاس پھوس کی بنی اس کٹیا کے قریب وہ ہاتھی سے اترا۔ ہاتھی سے اترتے ہی چوبداروں اور خاص برداروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اسے لے کر کٹیا میں داخل ہوئے۔ سرمد کی آنکھوں میں چمک سی آئی۔ انہوں نے ایک ہاتھ شہزادے کی طرف بڑھا دیا۔ شہزادے نے ان کا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور بوسہ دیا۔

''میرے لیے دعا فرمایئے۔''

''بادشاہ ہو کر فقیروں سے دعا کا طالب ہے۔''

سرمد کی زبان سے اس فقرے کا ادا ہونا تھا کہ ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ سرمد نے شہزادے کو بادشاہ کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ نکالا گیا کہ تاج شاہی اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔

جہاں آرا مسلسل شب بیداریوں کی تھکن سے چور طلائی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسے شدت سے داراشکوہ کا انتظار تھا جس کو اس نے بلا بھیجا تھا۔ پھر داراشکوہ کی آمد کا شور مچا۔

''داراشکوہ بابا!''

''جی۔''

''ظل سبحانی کی بیماری کا حال تم پر روشن ہے۔''

''خدا انہیں جلد صحت یاب کرے۔''

''امید کی تمام شمعیں ایک ایک کر کے بجھنے لگی ہیں۔ دکن یہاں سے دور سہی لیکن اسی دنیا میں ہے۔ اورنگ زیب کو آتے دیر نہیں لگے گی۔ ابھی تک ہم نے کاتبوں کے پروانوں کو ادھر جانے سے روکے رکھا ہے لیکن ظل سبحانی کی بیماری کا حال کبھی نہ کبھی وہاں پہنچے گا۔''

''آپ اورنگ زیب کا تذکرہ کیوں لے بیٹھیں؟'' دارا نے منہ بگاڑ کر کہا۔

''اگر کسی سے خطرہ ہوسکتا ہے تو وہ اورنگ زیب ہے۔ اسی لیے ہم تمہیں آج پھر یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تاج پہنو اور تخت طاؤس پر قدم رکھ دو۔''

''ظل سبحانی کی زندگی میں؟''

''وہ بیمار ہیں۔''

''صحت یاب ہوئے تو جانتی ہو ہمیں کس عتاب شاہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیا ظل سبحانی یہ نہیں سوچیں گے کہ ہم نے ان کی علالت سے فائدہ اٹھا کر تاج چھین لیا۔''

''اس کی ضمانت ہم لیتے ہیں۔ اگر ظل سبحانی صحت یاب ہوگئے تو تمہاری اس جسارت کو وقت کا تقاضا کہہ کر تمہارے لیے معافی نامہ تحریر کرالیں گے۔ ظل سبحانی نے آج تک ہماری کوئی بات نہیں ٹالی۔ تم اس وقت تلوار پر گرفت مضبوط کرو اور سلطنت کو پارہ پارہ ہونے سے بچالو۔''

''میں خود میں ہمت نہیں پاتا۔''

''تم ولی عہد ہو۔''

''ظل سبحانی زندہ ہیں۔''

''ان کے مرتے ہی اقتدار کی جس رسا کشی کا آغاز ہوگا اسے نکیل ڈالنا تمہارے بس میں نہیں رہے گا۔ انتظامات ابھی سے سنبھالو۔''

''میرے بھائی؟''

''سب سے زیادہ خطرہ اورنگ زیب سے ہے۔ اس کے پاس آزمودہ کار لشکر اور بھاری توپ خانہ ہے۔ تم شاہی فرمان کے ذریعے وہ لشکر واپس بلاسکتے ہو۔ تاج پہن لوگے تو امرا ابھی تمہارے ہی گن گائیں گے۔ ورنہ اورنگ زیب انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے گا۔ راجپوت اور ہندو پہلے ہی سے تمہارے ساتھ ہیں۔''

کچھ دیر سکوت رہا پھر دارا چلنے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جہاں آرا بھی اٹھ گئی۔ دارا کورنش کے لیے جھکا اور پھر سیدھا ہو کر باہر نکل گیا۔ ہلکے ریشمی پردوں کو جنبش ہوئی۔ ہلکی سی روشنی ہوئی پھر نیم تاریکی۔

داراشکوہ کو اپنے محل کی طرف جاتے ہوئے اتنی جلدی کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت ہورہی تھی۔

محل میں داخل ہوتے ہی اس نے امرائے خاص کو طلب کرلیا۔

وہ دیوان خانہ حکومت پہنچا تو امیر الامرا نواب خلیل اللہ خاں، خان کلاں معظم خاں، مہاراجا مرزا جے سنگھ وغیرہ پہلے سے تشریف فرما تھے۔ خواجہ سرا دست بستہ کھڑے تھے۔ ایک خواجہ سرا نے تخت کے پہلو میں چاندی کی چوکی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر قرآن پاک رکھا دوسرے نے گنگا جل کی سنہری چھاگل۔

داراشکوہ تخت پر بیٹھ گیا۔ جنبش ابرو نے حکم دیا تو خواجہ سرا باہر نکل گئے۔

ان کے نکلتے ہی داراشکوہ امراسے مخاطب ہوا۔

''جہاں پناہ کی علالت خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس خبر سے رعایا کو بے خبر رکھا جائے لیکن یہ خبر ایسی نہیں کہ زیادہ دن چھپی رہے۔ اس خبر کی اشاعت کے بعد نہ جانے کیسے کیسے فتنے سر اٹھائیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سدباب پہلے ہی کرلیا جائے۔

آپ لوگوں سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ ظل سبحانی نے ہم کو ولی عہد مقرر کیا ہے۔ دوسرے بھائیوں پر فضیلت عطا کی ہے، اس لیے یہ ہمارا فرض ہے کہ جب تک ظل سبحانی کو صحت عطا نہیں ہوتی ہم امور جہانبانی کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب خدا شہنشاہ کو صحت عطا کرے گا اور وہ تخت طاؤس پر قدم رکھنے کی طاقت پائیں گے ہم ان کی امانت ان کے قدموں میں رکھ دیں گے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اورنگ زیب دکن کی فتوحات پر متعین ہے۔ بڑے بڑے سردار اس کے ہمراہ ہیں۔ اگر ظل سبحانی کی علالت کی خبر سن کر اس نے دارالخلافہ کی طرف حرکت کی تو بڑی تباہی ہوگی۔ ہمیں اس کی طرف سے بڑی فکر ہے۔ آپ لوگوں کی رفاقت اپنی جگہ لیکن تخت و تاج کے لیے لڑائیوں کی تاریخ مجھے بے قرار رکھتی ہے۔''

اسی وقت مہاراجا مرزا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

''ماتا کی سوگند۔ آپ کو وچن دیتا ہوں کہ اگر اورنگ زیب نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو اپنی آل اولاد نچھاور کردوں گا۔''

خان کلاں بھی کیوں پیچھے رہتا۔ اس نے بھی قول دیا۔

''خدا کی قسم! میں آپ پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا۔''

''آپ لوگوں کی وفاداری پر مجھے کامل یقین ہے۔ اب معاملہ رہ جاتا ہے وزیراعظم رگھوناتھ کا۔''

''صاحب عالم، آپ اس کے بارے میں کیا گمان رکھتے ہیں؟''

''بدگمانی ہم نے سیکھی نہیں۔''

''اس کا دل آپ کے ساتھ ہے لیکن تلوار اورنگ زیب کے ساتھ۔''

''ہمیں یقین ہے وہ ہمارا کہا نہیں ٹالے گا۔''

''آپ اسے کیا حکم دینے والے ہیں؟''

''اورنگ زیب کے ساتھ جتنے بڑے بڑے سردار راجا بکرماجیت، منعم خاں، رانا درگا سنگھ وغیرہ ہیں ان سب کو شاہی فرمان بھیجا جائے کہ وہ اپنے لشکروں کے ساتھ دارالحکومت میں حاضر ہوں۔''

''امیر علی عادل کی سرکوبی؟''

''وہ مکمل ہوچکی۔''

''اورنگ زیب کا ردعمل کیا ہوگا؟''

''ہم اس فرمان میں آنے والوں کے لیے مناصب و ترقی کی شقیں بھی بڑھا دیں گے۔''

''یہ کام وزیراعظم سے نہ لیا جائے تو بہتر ہے۔''

''پھر کون سا طریقہ ہے جو روا رکھا جائے؟''

''ابھی ظل سبحانی بقید حیات ہیں۔''

''اللہ انہیں سلامت رکھے۔''

''یہ فرمان ان کی طرف سے ہونا چاہیے۔''

''وہ ایسا فرمان لکھ دیں گے؟''

''آپ نے ظل سبحانی کے طرز کتابت میں ملکہ بہم پہنچایا ہے۔ خط سے خط ملا دیتے ہیں۔ آپ ہی فرمان لکھیں گے آپ ہی دستخط کریں گے۔''

''اس کے باوجود کوئی جائے اور وزیراعظم کو بلا کر لے آئے۔''

چنداں دیر نہیں گزری تھی کہ رگھوناتھ وزیراعظم دردولت پر حاضر ہوگیا۔

چوبدار نے آواز لگائی۔

''رائے رایاں رگھوناتھ رائے دردولت پر حاضر ہیں۔''

''باریاب ہوں۔''

اجازت ملتے ہی رگھوناتھ اندر داخل ہوا۔ حاضرین پر نظر ڈالی۔ کورنش کے بعد حکم ملا تو تخت کے سامنے دونوں گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گیا۔

''تم سوچتے ہوگے ہم نے تمہیں ناوقت کیوں طلب کیا۔''

''آپ مالک ہیں جس وقت چاہیں طلب کرسکتے ہیں۔''

''صرف مالک نہیں۔ جب تک شہنشاہ ہند ظل سبحانی کو صحت نصیب نہیں ہوجاتی ہم شہنشاہ ہیں۔''

''بجا ارشاد فرمایا۔'' رگھوناتھ نے کہا اور ادھر ادھر بیٹھے امرا کو دیکھا۔

اس کے بعد داراشکوہ نے تقریباً وہی باتیں اس سے کیں جو کچھ دیر پہلے اپنے امرا سے کرچکا تھا اور اس سے رائے طلب کی۔

''امور سلطنت چلانے اور قائم رکھنے کے لیے ہمارا

یہ قدم درست ہے یا نہیں؟''

''اس کا انحصار تو آپ کی نیت پر ہے۔ آپ تخت پر قابض ہو رہے ہیں یا یہ مدت عارضی ہے؟''

''آپ عنقریب دیکھیں گے کہ ظل سبحانی غسل صحت فرمائیں گے۔ جشن مہتاب برپا ہوگا تو وہ ہمیں اس جسارت پر معاف کریں گے۔''

''یہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال ظل سبحانی کا ردعمل کیا ہوگا۔''

''یہ سوچنا آپ کا کام نہیں۔''

''مجھ سے پوچھا گیا تو میں کیا عرض کروں گا؟''

''آپ فی الحال ان سے ملاقات نہیں کرسکتے۔ صرف ان احکام پر عمل کریں گے جو ہمارے دربار سے جاری ہوں گے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''شہر پناہ کے دروازوں پر پہرا سخت کردیا جائے۔ کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اورنگ زیب کے وکیل نواب عیسیٰ بیگ پر نظر رکھی جائے۔ اس کی طرف سے کوئی کاتب باہر نہ جائے۔''

داراشکوہ جان بوجھ کر اورنگ زیب کا ذکر درمیان میں نہیں لایا تھا۔

⊕⊕⊕

اس رات نے صبح کا منہ دیکھا تو جامع مسجد کی دیواروں پر عجیب و غریب پوسٹر لگے نظر آئے۔ عبارت ایسی تھی کہ جو ادھر سے گزرتا تھا پڑھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔

ان پرچوں پر جلی حروف میں یہ عبارت درج تھی۔

''ظل الٰہی کا چراغ حیات جھلملا رہا ہے مگر سانس کے ڈور ٹوٹی نہیں ہے۔ اس نازک موقع پر داراشکوہ جو نہ نماز کا ہے نہ روزے کا، جس نے تصوف کے کوئی اور ہی معنی نکالے ہیں۔ جس کا ہندوؤں سے ربط ضبط مثالی ہے، تخت طاؤس پر اپنے ناپاک قدم رکھنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ یہ شخص پربھو کے نام کی انگوٹھی پہنتا ہے۔ یوگیوں اور سنتھوں کا مداح ہے۔ ہندوستان کے مفتیان کبار کا فتویٰ ہے کہ ایسے شخص کے خلاف تلوار اٹھانا جہاد ہے۔

شیروں کی طرح اٹھو اور کفر کے اس چراغ کو بجھا دو۔''

ایک خواجہ سرا اس طرف سے گزرا۔ وہ بھی پڑھنے کھڑا ہوگیا اور سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ گیا۔ اس نے لوگوں کی نظریں بچا کر ایک پوسٹر دیوار سے نوچ لیا۔

واپس ہوا تو راستے بھر اسی کے متعلق باتیں سنتا چلا گیا۔

خواجہ سرا نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی پرچہ جہاں آرا کے سامنے رکھ دیا۔

''اسے پڑھ کر جہاں آرا کا بھی وہی حال ہوا جو خواجہ سرا کا ہوچکا تھا۔ سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور فوراً دارا کو طلب کیا۔

دارا جیسا بیٹھا تھا اسی طرح اٹھ کر چلا آیا۔ چہرے سے پریشانی اور شب بیداری عیاں تھیں۔ جہاں آرا نے وہ پرچہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

داراشکوہ نے اس پرچے کو نظر بھر کے دیکھا تک نہیں۔

''اچھا تو یہ آپ کے پاس بھی پہنچ گیا۔''

''یہ پرچہ تو شاہ جہاں آباد سے اکبر آباد تک پہنچ گیا ہوگا۔''

''کوتوال شہر نے میرے پاس بھی بھیجا تھا اور میرے احکام مانگے تھے۔''

''آپ نے کیا احکامات دیے؟''

''آپ سے مشورہ کرلینا ضروری تھا۔''

''آپ نے ہمارے مشورے کی قدر ہی کہاں کی ورنہ یہ وقت نہ آتا۔ تخت پر بیٹھنے سے روکنا آسان ہے لیکن تخت گھسیٹنا مشکل تھا۔ کاش! آپ اس سے پہلے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیتے۔''

''تو کیا اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا؟''

''کیوں نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ ہماری بصیرت کی قدر فرمائیں۔''

''آپ فرمائیں۔''

''آج جمعۃ المبارک ہے۔ غسل کریں۔ خلعت فاخرہ زیب تن فرمائیں۔ ظل سبحانی کی سواری خاص پر سوار ہوکر جامع مسجد جائیں۔ رعایا کو خطاب فرمائیں جس میں ظل سبحانی کی صحت کی دعا بار بار کی جائے۔''

دارا نے عمل کیا۔

پہلی بار وہ اس غسل خانے میں داخل ہوا جسے صرف شہنشاہ استعمال کرتا تھا۔ مرصع نہر پانی سے لبریز ہوگئی۔ فوارے اچھلنے لگے۔ غسل سے فراغت کے بعد وہ باہر آیا۔ غلام نے جامے کے تکمے لگائے۔

اب حالت یہ تھی کہ بازوؤں پر وہ جوشن آراستہ تھے جن پر ''برہما'' کے الفاظ کندہ تھے۔ کمر میں بندھے پٹکے میں شیو کی مورتی تھی۔

جہاں آرا نے یہ سج دھج دیکھی تو آنکھیں ماتھے پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

آ گئیں۔

"وقت کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم آج اپنے لباس سے یہ ہندو نشانیاں ہٹا دو۔"

"کیوں، آج کوئی اور دن ہے یا دارا شکوہ بدل گیا ہے؟"

"اعتراض کرنے والوں کو موقع ملے گا۔"

"میں اپنے اصول نہیں بدل سکتا۔ دنیا کو مجھے اسی حال میں قبول کرنا ہوگا۔" اس نے کہا اور باہر نکل آیا۔ گرز بردار سونے چاندی کے گرز لیے اس کی پشت پر تھے "فلک سیر" نامی گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ شہزادے نے رکاب میں پاؤں دھرا۔ جہاں آرا محل کی بالکنی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

شہر میں صبح ہی سے غل پڑ گیا تھا کہ دارا شکوہ جمعہ کی نماز ادا کرنے جامع مسجد آئے گا۔ اس کثرت سے مخلوق جمع ہوئی کہ مسجد بھر گئی۔

مسجد کی دیواروں پر اس کے خلاف پوسٹر اب بھی لگے ہوئے تھے۔

مسجد کے قریب پہنچتے ہی کئی سو مسلح راجپوت سواروں نے اس کی حفاظت کی۔ مغل محافظ اسے بحفاظت منبر تک لے گئے۔ قاضی القضاۃ نے اعلان کیا۔

"ولی عہد سلطنت، بلند اقبال، غریب پرور، سلطان دارا شکوہ اپنی رعایا کو شرف کلام عطا فرمائیں گے۔"

دارا شکوہ منبر پر آیا۔

لوگوں نے اس کے لباس کی طرف دیکھا جس پر ٹنکے ہوئے ہیروں پر شیو کی تصویر اور پربھو کے الفاظ کندہ تھے۔ مسجد اور ایسا لباس! سوچ سب رہے تھے بولنے کی ہمت کسی کو نہیں تھی۔ دارا شکوہ نے اپنی صفائی پیش کرنی شروع کی۔ زیادہ زور اس بات پر تھا کہ وہ ظاہری عبادات سے زیادہ عبادت کے اس پہلو کا قائل ہے جس کا تعلق لوگوں کی مدد اور انصاف سے ہے۔ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ ایک ایسے ملک پر حکومت کر رہا ہے جہاں ہندو مسلمان دونوں رہتے ہیں۔ اسے دونوں کی دلجوئی کا خیال ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے اور انصاف ہے۔

"اگر اس پر بھی تم سازشیوں کے آلۂ کار بنے رہے تو پھر میری تلوار فیصلہ کرے گی۔"

آخر میں اس نے شہنشاہ کی صحت یابی کے لیے دعا کرائی۔

"خدا شہنشاہ کو صحت عطا فرمائے تاکہ میں ان کی امانت ان کے سپرد کرنے کا اہل بنوں اور ان لوگوں کی باتیں غلط ثابت ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ میں نے تخت پر قبضہ کرلیا ہے۔ میں ولی عہد ہوں اور سلطنت کو اپنا حق سمجھتا ہوں۔"

نماز ختم ہونے کے بعد وہ مسجد سے باہر نکلا تو افواہوں کا بازار بھی اپنے ساتھ لایا۔ باورچیوں کی دکانوں پر، قلفیاں بیچنے والوں کے ٹھیلوں پر، بھنگ اور افیون بیچنے والوں کے اڈوں پر ہر جگہ دارا کی تقریر پر تبصرے ہو رہے تھے۔

"میاں دیکھ لینا۔ کچھ دن جاتے ہیں گائے کاٹنے پر بھی پابندی لگ جائے گی۔"

"کس مائی کے لعل میں ہمت ہے جو گوشت پر پابندی لگائے۔"

"دارا سنگھاسن پر بیٹھا تو کون قسم اٹھائے گا کہ وہ گوشت کھائے گا۔"

"دلی ابھی بہت دور ہے۔ ظل سبحانی مر نہیں گئے ہیں۔"

"مارتے کیا دیر لگتی ہے۔ دارا شکوہ بابا کی نیت اچھی نہیں لگتی۔"

"وہ تو صحت یابی کی دعائیں کرا رہے تھے۔"

"اور کیا کریں گے۔ دکھاوا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"سنا ہے حکیم راحت جو شہنشاہ کے معالج ہیں نظر بند کردیے گئے ہیں تاکہ شہنشاہ کی بگڑتی ہوئی حالت کو چھپایا جائے۔"

"کیا خبر مر بھی گئے ہوں۔ چھپایا جا رہا ہو۔"

"اگر یہ خبریں دکن پہنچیں تو اورنگ زیب یقیناً چڑھ دوڑے گا۔"

"سنا ہے اورنگ زیب کے وکیل نواب عیسیٰ بیگ بھی نظر بند کردیے گئے ہیں۔"

"اگر یہ خبر صحیح ہے تو بھائی اللہ سے دعا کرو۔ بھائی کی بھائی گردن کاٹے گا۔"

⊖⊖⊖

دارا شکوہ دولت خانے میں اکیلا بیٹھا آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کر رہا تھا کہ ایک غلام خاص اس کی تنہائی میں مخل ہوا۔

"حکیم احسن اذن باریابی کے منتظر ہیں۔"

"حکیم احسن! یا اللہ خیر، انہیں فوراً بھیجو۔"

حکیم صاحب کشمیری قالینوں پر چلتے ہوئے آئے اور کورنش بجالانے کے لیے رکوع کی حالت میں چلے گئے۔

"یہ وقت کورنش بجالانے کا نہیں۔ اس وقت تو یہ فرمایئے کہ ظل سبحانی......"

"مبارک ہو۔ ظل سبحانی نے کئی روز بعد آنکھیں کھولیں اور تبسم فرمایا۔"

یہ خوش خبری سننے کے باوجود دارا اداس ہوگیا۔ اس

کے چہرے پر پھیلی ہوئی پژمردگی صاف پڑھی جاتی تھی۔

"اس وقت ہمیں ان کے پاس ہونا چاہیے تھا لیکن ہمارا تو مجرا ہی موقوف ہے۔ دیکھیے بادشاہ بیگم (جہاں آرا) کی کوششوں سے ہمیں معافی ملتی ہے یا نہیں۔"

"رنج نہ فرمایئے شہزادہ معظم! ظل سبحانی کا دل آپ کی طرف سے نتھرے ہوئے پانی کی طرح صاف ہے۔ آنکھ کھولتے ہی انہوں نے آپ کے بارے میں استفسار کیا اور باریابی کے لیے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

یہ اتنی بڑی خوش خبری تھی کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ شہزادہ ہے۔ آداب شاہی کے خلاف تھا لیکن تقریباً دوڑتا ہوا دولت خانۂ خاص میں داخل ہوگیا۔ خواجہ سراؤں کے سلاموں سے بے نیاز کمرائے خاص تک پہنچ گیا۔ ظل سبحانی تکیے سے پشت لگائے بیٹھے تھے۔ دو کنیزیں دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ دارا شکوہ نے سر جھکا دیا۔ بادشاہ کا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر لرزنے لگا۔

"داروغہ سے کہو آج رات چراغاں کیا جائے۔"

شہزادے نے حکم دیا اور باپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"تخت طاؤس آپ کے انتظار میں ہے۔"

"اس قدر عجلت کیا ہے۔ کام تو تم چلا ہی رہے ہو۔"

"مخلوق خدا کے درمیان طرح طرح کی باتیں سر اٹھا رہی ہیں۔"

"ہمیں جہاں آرا سب کچھ بتا چکی ہے۔"

دارا وہاں سے رخصت ہوا تو یوں چل رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔

چاندنی خانے کا کارخانہ حرکت میں آیا اور رات نے دن کا لباس پہن لیا۔ جگہ جگہ روشنیوں کے جھاڑ اور فانوس فروزاں ہوگئے، کنیزیں اور رقاصائیں حاضر دربار ہوئیں تو ستاروں کے پھول زمین پر بکھر گئے۔

روشنی کا یہ بازار ابھی پوری طرح رنگ پر نہیں آیا تھا کہ ایک خواجہ سرا اس بھیڑ سے نکلا اور دارا کے سامنے آگیا۔ دارا نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ خواجہ سرا نے جلدی جلدی کورنش کی رسم ادا کی اور شہزادے کے بالکل نزدیک آکر کچھ کہا۔ شور مسرت میں کوئی نہیں سن سکا کہ اس نے کیا کہا۔ حاضرین کو تعجب تو اس وقت ہوا جب خواجہ سرا کے ہٹتے ہی شہزادہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ رقاصاؤں کے قدم کچھ دیر کے لیے تھمے اور پھر گردش میں آگئے۔

اس کے اٹھتے ہی گرز بردار اور شمشیر زن بھی حرکت میں آئے اور اسے لے کر دیوان خاص کی طرف چلے جہاں

احسان کا بدلہ

ایک نوجوان نے کسی مشکل وقت میں ایک بوڑھے کی مدد کی تھی۔ گردش زمانہ سے یہ نوجوان کسی سنگین جرم میں گرفتار ہوگیا اور اسے قتل کی سزا دی گئی۔ سپاہی اس کو لے کر مقتل کی طرف روانہ ہوئے تو تماشا دیکھنے کے لیے سارا شہر امڈ پڑا۔ ان میں وہ بوڑھا بھی تھا۔ اپنے محسن نوجوان کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل زخمی ہوگیا اور وہ زور زور سے دہائی دینے لگا کہ اے لوگو! ہمارا نیک دل بادشاہ فوت ہوگیا، افسوس صد افسوس کہ آج دنیا تاریک ہوگئی۔ سپاہی اور دوسرے لوگ یہ بری خبر سن کر غمزدہ اور پریشان ہوگئے اور اس نوجوان کو وہیں چھوڑ کر شاہی محل کی طرف بھاگے۔ بوڑھے نے فوراً اس کی زنجیریں کھول کر اسے بھگا دیا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔

سپاہی محل میں پہنچے تو بادشاہ کو زندہ وسلامت موجود پایا۔ کھسیانے ہوکر واپس آئے تو نوجوان کی جگہ بوڑھے کو وہاں پایا۔ سپاہی اسے گرفتار کرکے بادشاہ کے سامنے لے گئے اور سارا قصہ بیان کیا۔

بادشاہ نے غضب ناک ہوکر پوچھا کہ اے بڈھے تو نے میرے مرنے کی خبر کیوں اڑائی، آخر میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟ بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "جہاں پناہ! میرے جھوٹ بولنے سے آپ پر کوئی آنچ نہیں آئی لیکن میرے محسن نوجوان کی جان بچ گئی۔ فلاں وقت اس نے میری دستگیری کی تھی، آج اس کو مصیبت میں گرفتار دیکھا تو انسانیت اور جوانمردی کا تقاضا یہی تھا کہ میں اس کی مدد کروں۔ اسی لیے میں نے یہ حیلہ اختیار کیا۔"

بادشاہ یہ قصہ سن کر ایسا خوش ہوا کہ نہ صرف بوڑھے کو انعام واکرام دے کر رہا کردیا بلکہ اس نوجوان کی معافی کا حکم بھی صادر کردیا۔ نوجوان قید سے نکل کر اِدھر اُدھر جان چھپاتا پھرتا تھا کسی نے اس کو معافی کی خوشخبری سنائی اور پوچھا کہ تیری جان کیسے بچ گئی۔ اس نے جواب دیا کہ ایک حقیر رقم میرے کام آگئی جو میں نے اس سائل کو ضرورت کے وقت دی تھی۔ بعض اوقات ایک جو سخت مصیبت کو ٹال دیتا ہے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ معمولی لاٹھی نے عوج کو مار ڈالا۔ آخر محمد مصطفیٰ ﷺ کی سچی حدیث بھی تو ہے کہ عطا اور بھلائی بلا کو رفع کرنے والی ہے۔

نصیحت: سخاوت اور بھلائی مشکلات کا بہترین حل ہیں۔ اخلاق عبادت کی کمی کو پورا کرسکتے ہیں لیکن اخلاق کی کمی عبادت پورا نہیں کرسکتی۔

اقتباس "صوفی برکت علی" سے اقتباس

مرسلہ: یاسر علی راجپوت، نواں لاہور تحصیل گوجرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا سنہری تخت رکھا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی شہزادے کے قدم بوجھل ہوگئے۔ وہ سنہرے تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی خدام کے ہجوم نے تخت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

گرز برداروں کی دہری قطار وزیراعظم کو لیے دیوان خاص میں داخل ہوئی اور اسے چھوڑ کر واپس پلٹ گئی۔ وزیراعظم نے کورنش ادا کی اور شہزادے کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے تخلیے کا حکم دیا۔

تخلیہ ہوتے ہی دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

وزیراعظم کے نکلتے ہی شہزادہ تخت سے اترا اور محل میں جاری نہر کے کنارے چلتا ہوا دولت خانۂ خاص پہنچ گیا۔ ابھی شاہجہاں جشن چراغاں میں شریک ہونے کے لیے سوار نہیں ہوا تھا۔ جہاں آرا لباس فاخرہ زیب تن کیے تیار تھیں کہ شہزادے کی آمد کا سن کر یہی سمجھیں کہ انہیں دیر ہوگئی ہے۔ شہزادہ خود لینے آیا ہے۔ موسیقی کا شور مدھم ضرور ہوگیا تھا لیکن تھا ضرور۔ شہزادے نے جہاں آرا کو ساتھ لیا اور محل کے ایسے گوشے میں چلا گیا جہاں وہ سرگوشی میں بات کر سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابھی کوئی ان الفاظ کو سنے جو اس کی زبان سے ادا ہونے والے تھے۔ اس نے جھجکتے ہوئے تکلیف دہ الفاظ بہن کے کانوں تک پہنچا دیے۔ جو کچھ اس نے کہا اسے سن کر جہاں آرا دم بخود رہ گئیں۔

”تم نے اچھی طرح تحقیق کرلی ہے؟“

”میں نے تو تحقیق نہیں کی لیکن خبر پہنچانے والا خود وزیراعظم ہے۔“

”کیا وہ مغلیہ سلطنت کی دیواروں میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے؟“

”پہلے مجھے بھی یہ شک گزرا تھا لیکن اس کے پاس جو شخص خبر لایا ہے اس کی وفاداری پر شک نہیں کیا جا سکتا۔“

”وزیراعظم کو یہ خبر کس نے پہنچائی ہے؟“

”حشمت بیگ ہزار سواروں کے ساتھ دارالخلافہ پہنچا ہے۔“

”وہ اس خبر کو براہ راست ظل سبحانی تک بھی پہنچا سکتا تھا۔“

”وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ خبر علیل بادشاہ تک پہنچائی جا سکتی ہے یا نہیں۔“

”اس نے عقل مندی سے کام لیا۔ اب تمہیں بھی چاہیے کہ اس خبر کو بادشاہ سے چھپاؤ۔“

”اتنی بڑی خبر بادشاہ سے چھپانا دانش مندی نہیں۔“

”وہ یہ صدمہ برداشت کرلیں گے؟“

”وہ اپنے سینے میں شہنشاہ کا دل رکھتے ہیں۔“

”دارا، وہ ایک باپ بھی تو ہیں۔“

”انہیں اپنی شفقت کو دفن کرنا ہوگا۔ بنگالہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اگر اس کا تدارک نہیں کیا گیا تو یہ آگ تاریخ کو مسخ کردے گی۔ آنے والا مورخ شہنشاہ شاہجہاں کو نہ جانے کس نام سے یاد کرے۔“

دونوں نے طے کیا کہ بادشاہ کی علالت کے باوجود یہ خبر ان تک پہنچائی جائے اور ان کے مشورے سے اس کا کوئی تدارک کیا جائے۔

شہزادہ جب اس کمرے میں پہنچا جہاں شاہجہاں صاحب فراش تھا تو بادشاہ کی حالت دیکھ کر اس کے ارادے میں تغیر آنے لگا۔ باپ تک یہ خبر پہنچائی جائے یا نہیں۔

شاہجہاں دو تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر اضمحلال کے آثار صاف نظر آرہے تھے مرض چلا گیا تھا مرض کے آثار ابھی باقی تھے۔

ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر شاہجہاں کے چہرے پر تبسم ابھرا۔

”دارا شکوہ بابا، تم تو ہماری صحت یابی پر جشن مسرت منا رہے ہو۔ تمہیں تو اس وقت وہاں ہونا چاہیے تھا۔“

”میں آپ کی خیریت دریافت کرنے آگیا۔“

”ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ بس ذرا کمزوری ہے۔ بادشاہ بیگم کے ساتھ ہم کچھ دیر کے لیے جشن میں ضرور آئیں گے۔“

”میں تو یہ بتانے حاضر ہوا تھا کہ قلعہ چنار کے قلعہ دار کا بیٹا ہزار سواروں کے ساتھ یہاں پہنچا ہے اور ایک بری خبر لایا ہے۔“

”تم ہماری بیماری کا خیال مت کرو۔ تفصیل بیان کرو۔“

”کس منہ سے کہوں کہ شجاع نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ ایک بھاری لشکر لے کر بہار پہنچ گیا۔ بہار و بنگال سے لے کر دارالخلافہ تک جتنے فتنہ پرداز تھے سب اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔“

یہ تفصیل سنتے ہی شہنشاہ کی بیماری گویا رخصت ہوگئی۔ پشت پر لگے دونوں تکیوں کو پس پشت کیا اور تن کر بیٹھ گیا۔ اس کی آواز میں وہی پہلے جیسا جلال تھا۔

”آج سے کوئی اسے شجاع نہ کہے نہ شہزادے کے لقب سے یاد کرے۔ وہ ایک باغی ہے اور باغیوں کے خلاف شاہی فوجیں حرکت میں آتی ہیں۔ صبح کی پہلی توپ چلتے ہی ہم دربار منعقد کریں گے۔“

دارا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شہنشاہ نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

⊕⊕⊕

رات بھر جشن مسرت برپا رہا تھا۔ ہر شخص کسل مندی (تھکن) میں تھا۔ توپ داغی جاتی اور کوئی نہ اٹھتا لیکن حکم شاہی تھا۔ گرز بردار، چیلے، خدام، خواجہ سرا، خاص بردار، منصب دار سب اپنی اپنی جگہ استادہ ہوگئے۔

شہنشاہ نے ہفتوں بعد لباس فاخرہ پہنا، جواہرات زیب تن فرمائے اور تخت طاؤس پر مسند آرا ہوا۔ رات بھر صلاح مشورے ہوتے رہے تھے۔ کسے باریاب ہونا ہے یہ بھی طے ہو چکا تھا۔ دارا شکوہ باریاب ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شہزادہ سلیمان شکوہ حاضر ہوا۔

شاہجہاں کی آواز گونجی۔ ”ہم نے ایک باغی کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس کی کمان تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ راجا جے سنگھ اور دلیر خاں تمہاری معاونت کریں گے۔ خبردار! یہ خیال مت کرنا کہ تمہارے مقابلے پر ہمارا بیٹا شجاع ہے۔ وہ اب شہزادہ نہیں رہا۔ سلطنت کا باغی ہے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تمہیں اس بدبخت کو زندہ یا مردہ ہمارے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ جوانی کے جوش میں تیز رفتاری سے مت چلنا بلکہ راجا جے سنگھ وغیرہ کے مشورے پر عمل کرنا۔“

”ظل سبحانی! آپ کا ایک ایک لفظ میں نے اپنے دل کی کتاب پر درج کرلیا ہے۔ انشاءاللہ عمل کروں گا۔“

راجا جے سنگھ مجرے کو حاضر ہوا تو شہنشاہ نے اس کے سامنے بھی یہی باتیں کیں۔

”راجا جے سنگھ۔“

”جی عالم پناہ۔“

”تم ہماری جوانی کے گواہ ہو۔ تم گواہی دے سکتے ہو کہ ہم نے کبھی دشمن کی تعداد کی پروا نہیں کی، سنا ہے ہمارے باغی نے پچاس ہزار کا لشکر جمع کرلیا ہے لیکن یاد رکھو مابدولت کے لشکر کی آمد کا سنتے ہی پچاس ہزار کا لشکر اس طرح نابود ہو جائے گا جس طرح آندھی خس و خاشاک کو اڑا دیتی ہے۔ میں تمہیں سلیمان شکوہ، سالار لشکر کا اتالیق مقرر کرتا ہوں۔“

راجا جے سنگھ نے گھٹنوں تک سر جھکا کر حکم کی تعمیل کا عہد کیا۔

شہنشاہ کی نظریں ان سب کی طرف سے ہٹ کر محل کی منقش چھت کی طرف اٹھ گئیں۔

”یا اللہ! جس طرح دارا مجھے عزیز ہے اسی طرح اس کا بیٹا سلیمان شکوہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اس کی حفاظت فرمانا اور اسے مظفر و منصور مجھے واپس کر دینا۔“

دربار برخاست ہوا۔ شہنشاہ خلوت گاہ میں چلا گیا۔ حکم ہوا کہ کوئی اس کی تنہائی میں دخیل نہ ہو۔

⊕⊕⊕

لشکر کے روانہ ہوتے ہی دارا شکوہ نے اورنگ زیب عالمگیر کے وکیل کی جائداد ضبط کرلی اور اسے کڑے پہرے میں نظر بند کر دیا۔ یہ انتظام پہلے ہی کرلیا گیا تھا کہ یہاں کی کوئی خبر دکن تک نہ پہنچنے پائے۔ دارا کو شک تھا کہ اورنگ زیب شجاع سے ضرور مل جائے گا بلکہ مراد بخش بھی جو بہادر ہے مگر اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا، اورنگ زیب کی باتوں میں آجائے گا۔ اگر تینوں طاقتیں باہم مل جائیں تو مقابلہ مشکل ہو جائے گا۔

SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہنشاہ تقریباً گوشہ نشین ہو چکا تھا۔ تنہائی میں بیٹھ کر فتح یاب فوجوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کسی سے نہیں مل رہا تھا لیکن دارا شکوہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ دارا شکوہ کو کام بھی ایسا آن پڑا تھا کہ بادشاہ سے ملنا ضروری تھا۔

وہ بادشاہ کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا اور دکن سے فوجوں کو واپس بلانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

''ظلِ سبحانی، وہ وقت دور نہیں جب طاقت کے نشے میں سرشار اورنگ زیب بھی شجاع کے ساتھ مل جائے گا۔''

''اورنگ زیب سے ہمیں یہ امید نہیں۔ ضروری نہیں کہ جو نادانی بدبخت شجاع کر چکا ہے اورنگ زیب بھی کرے اور پھر شجاع کے عبرت ناک انجام کے بعد تو اس سے قطعی یہ امید نہیں کی جا سکتی۔''

''دکن سے ایسی خبریں آ رہی ہیں کہ ورغلانے والے اورنگ زیب کو ورغلا رہے ہیں۔ یہ خبریں بھی پہنچ رہی ہیں کہ اورنگ زیب اور مراد بخش کے درمیان خط کتابت ہو رہی ہے۔''

''ان خبروں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر ایسا کوئی وقت آیا تو مابدولت خود اورنگ زیب کو سمجھانے جائیں گے۔ وہ ہماری بات نہیں ٹالے گا۔''

''بھاری توپ خانے اور دلیر امرا کی موجودگی اسے من مانی پر مجبور کرے گی۔''

''تمہاری رائے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''اورنگ زیب کے ہمراہ جو بڑے بڑے امرا بیجاپور کی تسخیر پر مامور ہیں انہیں واپس بلا لیا جائے۔''

''یہ فیصلہ درست نہیں ہوگا۔ اورنگ زیب نے نہایت جانفشانی سے قلعہ بیدر، صوبہ احمد آباد اور قلعہ کلیانی کو فتح کیا ہے اور اب عرصہ دراز سے بیجاپور کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ امرا کو واپس بلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ بیجاپور سے ہاتھ اٹھا لیا جائے۔''

''اورنگ زیب ایک نادانی کر چکا ہے۔ خبریں پہنچ رہی ہیں کہ وہ عادل شاہ سے صلح کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مقصد یہی ہے کہ بیجاپور کی مہم ختم کرنے کے بعد وہ ان فوجوں کو دارالخلافہ کی طرف بڑھائے۔''

بادشاہ یہ سب باتیں سن کر چپ رہا۔ دارا شکوہ نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

احمد آباد سے یہ وحشت ناک خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں شہزادہ مراد نے سکہ اور خطبہ اپنے نام کر لیا ہے۔ گویا بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔ خواجہ شہباز کو فوج اور قلعہ شکنی کا سامان دے کر بندرگاہ سورت کے قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا ہے۔

دارا شکوہ ایک مرتبہ پھر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے خطرات سے آگاہ کیا۔ اس مرتبہ وہ بادشاہ کو اپنے دام میں لانے میں کامیاب ہو گیا۔

فرمان جاری ہوا۔ دکن تک پہنچتے کیا دیر لگتی۔ قریب تھا کہ اورنگ زیب فتح یاب ہوتا، فرمان شاہی نے جلوہ افروزی کی۔ ان تمام افسروں کو جو عالمگیر کی فوج میں شامل تھے شاہجہاں کا حکم پہنچا کہ فوراً عالمگیر کا ساتھ چھوڑ کر دربار میں چلے آئیں۔

یہ افسران پہلے ہی طویل محاصرے سے تنگ آ چکے تھے۔ اس فرمان کو بہانہ بنا کر عالمگیر کی فوج سے نکل آئے۔ اورنگ زیب مجبور ہو گیا اور والی بیجاپور سے ایک کروڑ روپیہ نذرانہ پر صلح کر لی۔ اس طرح یہ مہم ناتمام رہ گئی۔ عالمگیر بیجاپور سے روانہ ہو کر برہان پور آ گیا۔

دارا شکوہ نے مہاراجا جسونت سنگھ والی جودھپور کو فوج اور توپ خانہ دے کر گجرات کی طرف روانہ کر دیا کہ اگر اورنگ زیب اپنی جگہ سے حرکت کرے تو اس سے معرکہ آرا ہو۔

اورنگ زیب نے اب کوئی اور صورت نہ دیکھ کر اپنے بھائی مراد کو خط لکھا اور اس کے اعلان بادشاہت پر اسے مبارک باد دی۔

''مجھے اس دنیائے غدار کے معاملات سے کوئی دلچسپی و وابستگی نہیں۔ میرے پیش نظر تو صرف بیت اللہ کا طواف ہے۔ اس ''برادر بے شکوہ'' کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے ردعمل میں دوسرے بھائی جو کچھ سوچ رہے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل حق بجانب ہے اور بجا ہے۔ مجھے بھی اپنا شریک کار اور مددگار سمجھا جائے مگر چونکہ والد بزرگوار ابھی بہ قید حیات ہیں اس لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں بھائی والد محترم کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کر لیں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے اس بے دین کی خیرہ سرائی کا تدارک کریں جو بادۂ غرور اور نخوت و خود آرائی میں مست ہو رہا ہے۔ اگر قسمت یاوری کرے تو حضرت ولی نعمت (شاہجہاں) کا دیدار کر لیں اور فتنہ و فساد کا قلع قمع کر کے اس بھائی (مراد) کے قصور کی معافی طلب کر لیں جو حالت اضطرار میں سرزد ہو گیا ہے، (یعنی بادشاہت کا اعلان) سلطنت کا نظم و نسق درست کرنے اور مخالفین کو کیفر کردار پر پہنچانے کے بعد میں حضور والا سے کعبۃ اللہ کی اجازت حاصل کر لوں گا لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ اس جائز ارادے میں تاخیر نہ ہو اور تم ایک منظم و آراستہ فوج لے کر جسونت سنگھ کی تادیب کے لیے کوچ کر دو اور بس سمجھ لو کہ ہم بھی دریائے نربدا کے اس کنارے پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے ساتھ جو لاؤ لشکر اور توپ خانہ ہے اسے تم اپنی فتح یابی کا وسیلہ سمجھو۔''

⊜⊜⊜

سلیمان شکوہ کی کمانداری میں راجا جے سنگھ ہراول کے طور پر جب بنارس کے قریب پہنچا تو محمد شجاع بھی مقابلے پر تیار ہو گیا۔ دریا میں جتنی کشتیاں تھیں اس نے ان سب کو قبضے میں لے لیا اور پھر آگے بڑھ کر راجا کی فوج سے ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر چھاؤنی ڈال دی۔ دوسرے دن راجا نے حملے کا اعلان کیے بغیر صبح ہونے سے پہلے ہی کوچ کر دیا۔ سورج نے ابھی قد نہیں نکالا تھا کہ شجاع کی فوج پر حملہ ہو گیا۔ شجاع ابھی رات کے خمار سے بیدار نہیں ہوا تھا کہ سارا معاملہ ہی درہم برہم ہو گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ لڑائی کے ارمان بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ شجاع اپنی عورتوں اور خاص ہمراہیوں کو لے کر گھاٹ پر پہنچا اور کشتی میں سوار ہو کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ ایسا بھاگا کہ بنگال ہی جا کر دم لیا۔

اس کا خزانہ اور توپ خانہ راجا کے قبضے میں آ گیا جسے اس نے اکبر آباد روانہ کر دیا۔

⊜⊜⊜

گرمی کی شدت ایسی تھی کہ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے کی مثال صادق آ رہی تھی۔ جوتوں میں پاؤں جل رہے تھے۔ زمین تانبا بنی ہوئی تھی۔ بیمار بادشاہ کے لیے یہ موسم از حد خطرناک ہو سکتا تھا۔ اطبائے شاہی نے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا۔ بادشاہ نے شاہجہاں آباد (دہلی) جانے کا قصد کیا۔ تجویز ہوئی کہ نجومیوں سے روانگی کی مبارک ساعت لی جائے۔

مبارک ساعت کا تعین ہوتے ہی شاہجہاں نے پائے سفر اٹھایا۔ بادشاہ بیگم جہاں آرا ہر وقت کی خدمت گزار ساتھ تھی۔ دور تک دارا شکوہ اور شہزادیوں کے خاصان بارگاہ کی سواریوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جمنا کے کنارے کنارے اونٹوں اور خچروں کی لمبی قطاریں تھیں۔ دس ہزار آزمودہ کار محافظوں کی کشتیوں اور ڈونگیوں کا ذخیرہ

تھا جو سکندرہ کی حدود تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک شہر تھا جو دوسرے شہر منتقل ہو رہا تھا۔

⊜⊜⊜

بیجاپور سے محاصرہ اٹھانے کے بعد اورنگ زیب برہان پور چلا گیا تھا۔ جب شہزادہ مراد سے خط کتابت ہو چکی تو اس نے برہان پور سے نکل کر مراد سے ملاقات کی ٹھانی۔ طے ہو چکا تھا کہ ''نربدا'' کے کنارے ملاقات ہو گی۔

روانگی سے قبل اس نے برہان پور کے مشہور بزرگ شیخ برہان سے ملنے اور دعا لینے کی خواہش کی۔ خدام نے خانقاہ کا رخ کیا لیکن ناکام لوٹے۔ شیخ کی درگاہ سے اجازت کے پھول نہ مل سکے۔ اورنگ زیب کی طبیعت میں ضد بہت تھی۔ اس نے ٹھان لی کہ ملاقات کیے بغیر برہان پور سے قدم باہر نہیں نکالے گا۔ اس کے دیوان مرشد قلی خاں نے بہت اصرار کیا کہ شیخ سے ملاقات میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔

''ایسا نہ ہو کہ آپ بروقت منزل پر نہ پہنچ سکیں اور جسونت سنگھ مراد سے ٹکرا جائے۔''

بات دور اندیشی پر مبنی تھی لیکن اورنگ زیب بضد تھا کہ شیخ برہان کی اجازت کے بغیر برہان پور سے باہر قدم نہیں نکالے گا۔

اس کی ضد کو سامنے رکھتے ہوئے مرشد قلی خاں نے شیخ تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں تلاش کرنی شروع کر دیں اور بالآخر وہ شیخ کے ایک مقرب شیخ نظام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان بزرگ نے شیخ سے اجازت حاصل کر لی۔ شیخ نے شرط رکھی کہ وہ کسی جلوس کے بغیر تنہا ملاقات کے لیے آئے گا۔ اورنگ زیب نے یہ شرط مان لی اور ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

عام آدمی کی طرح تنہا ملاقات کے لیے گیا۔ صرف شیخ نظام ساتھ تھے۔

شیخ برہان نے ایک نظر اورنگ زیب پر ڈالی اور پھر بڑی دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ آنکھیں کھولیں تو یہ کلام زبان مبارک پر جاری تھا۔

''تم بادشاہ ہو۔ تمہارے لیے ہم فقیروں کی دعا و فاتحہ سے کیا ملے گا۔ ہاں تم عدل و انصاف اور رعیت پروری کے قصد سے دعا مانگو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھالیں گے۔''

اس کے علاوہ کوئی بات نہ ہوئی۔

دعا اور فاتحہ کے بعد شیخ نے نصیحت کے طور پر چند کلمے کہے اور تبرک وغیرہ دے کر رخصت کیا۔

شیخ نظام نے اپنے مرشد کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی بادشاہ کو سلطنت کا مژدہ دیا۔

شیخ برہان کی پیش گوئی برابر سفر میں تھی۔ اسی روز یہ نیک شگون ہوا کہ اورنگ زیب کا وکیل عیسیٰ بیگ جسے داراشکوہ نے قید کر دیا تھا۔ شاہجہاں نے اسے رہا کر کے رخصت کر دیا اور وہ یلغار کرتا ہوا اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

اس کے ذریعے مہاراجا جسونت سنگھ اور قاسم خاں کے اجین پہنچنے کی مفصل رپورٹ ملی۔ ان دونوں کو داراشکوہ نے روانہ کیا تھا۔

داراشکوہ نے اورنگ زیب کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ اورنگ زیب نے برہان پور میں مزید ایک ماہ قیام کر کے ضروری تیاریاں کیں اور پھر دارالخلافے کے ارادے سے کوچ کر دیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ باپ بیٹوں کے درمیان کیا معاملات طے پانے والے ہیں۔ اورنگ زیب کی سواری منزل بہ منزل گزرتی جا رہی تھی۔ آخر کار اس نے نربدا عبور کر لیا۔ شہزادہ مراد بھی اورنگ زیب کا خط ملنے کے بعد احمد آباد سے کوچ کر چکا تھا۔

دونوں کی ملاقات ''دیبال پور'' کے مقام پر ہوئی۔

دونوں نے دیکھا کہ گھاٹوں اور خشکی کی گزرگاہوں پر ایسی سخت ناکا بندی ہے کہ ہوا بھی چاہتی تو نظروں میں آئے بغیر نہیں گزر سکتی تھی۔ یہ شیخ برہان کی دعا تھی یا کیا تھا کہ مہاراجا جسونت سنگھ کو اس وقت اطلاع ملی جب اورنگ زیب اجین کے قریب پہنچ گیا۔

داراشکوہ کے جو آدمی قلعہ رہار اور اس کے نواح میں تھے دونوں بھائیوں کے لشکر کو بڑھتا ہوا دیکھ کر وہاں سے فرار ہو گئے اور جسونت سنگھ سے جا کر مل گئے۔ شاید انہی لوگوں کی زبانی مہاراجا کو اورنگ زیب کے لشکر کی آمد کی خبر ملی۔

جسونت سنگھ اور قاسم خاں بھی مقابلے کے لیے نکلے اور ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گئے۔

اورنگ زیب کے ساتھ ''کب'' نامی برہمن بھی تھا جو ہندی کا مشہور شاعر اور نہایت چرب زبان تھا۔ اورنگ زیب نے اسے یہ پیغام دے کر مہاراجا کے پاس بھیجا۔

''ہم صرف حضرت ولی نعمت کی عیادت اور قدم بوسی کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ مخالفت اور لڑائی کا کوئی ارادہ نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ تم بھی ہمارے ہم رکاب خدمت والا میں چلے چلو یا پھر راستہ چھوڑ کر اپنے وطن چلے جاؤ اور بندگان خدا کی خوں ریزی کا باعث نہ بنو۔''

جسونت سنگھ نے مصالحت کے اس پیغام کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور پیغام بھیج دیا کہ مجھے جو حکم دیا گیا ہے اس کی تکمیل ضرور کروں گا۔ مجھے آپ کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا گیا ہے لہٰذا میں راستہ روکوں گا۔

اب اورنگ زیب کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ اپنے لیے راستہ بنائے۔ اورنگ زیب نے اپنی فوج کو آراستہ کیا۔ توپ خانے کا مناسب انتظام کرنے اور کوہ پیکر ہاتھیوں کو آراستہ کر لینے کے بعد شہزادہ محمد سلطان کو ہراول کا کمان دار مقرر کیا۔ مراد نے اپنی فوج اور اپنے سرداروں کے ساتھ میمنہ کو سنبھال لیا۔ دوسری طرف مہاراجا جسونت نے بھی اپنے لشکر کی صف آرائی کر لی تھی۔ خود مہاراجا نے چند ہزار راجپوتوں کے ساتھ قلب لشکر میں جگہ لی۔

دونوں لشکر مستانہ وار ایک دوسرے کے مقابلے پر بڑھے۔ آتش باری کے ساتھ ہی معرکۂ قتال گرم ہو گیا اور لمحہ بہ لمحہ جنگ کی آگ تیز ہوتی گئی۔

دونوں گروہ ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں سرگرداں تھے۔ اورنگ زیب اس صورت حال کا بہ غور مشاہدہ کر رہا تھا۔ جب معاملہ بہت نازک ہو چلا تو اس نے اپنے ہاتھی کو آگے بڑھایا۔ دوسری طرف سے مراد میمنہ کی طرف سے آگے بڑھا۔ فوج کے حوصلے بڑھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ بدل گیا۔ کئی بہادر راجپوت سردار قتل ہو گئے۔ مہاراجا جسونت سنگھ ایسا خوف زدہ ہوا کہ اپنی راجپوتی شان کو بھی خیرباد کہہ بیٹھا۔ اپنے ہمراہیوں کے طعنوں کی پروا کیے بغیر میدان جنگ سے بھاگ نکلا اور اپنے وطن کی راہ لی۔ اس کے بھاگتے ہی سب کے قدم اکھڑ

گئے۔ داراشکوہ کی فوج منتشر ہو گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔

شہنشاہ کا بجرہ جمنا کے دھارے پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ دارا اس سے کچھ فاصلے پر تھا کہ ایک مغل پانی کا سینہ چیرتا ہوا دارا کے بجرے کے قریب آ گیا۔ دارا کے حکم پر پانی میں ڈونگی ڈالی گئی اور اسے دارا کے سامنے پیش کر دیا گیا، اوپر آ کر اس نے جو کچھ کہا اسے سن کر دارا کے ہوش اڑ گئے۔

''دھرمت کے میدان میں اورنگ زیب اور مراد نے شاہی لشکر کو شکست فاش دی۔ مہاراجا اپنے راج کی طرف نکل گیا۔''

دارا پہلے ہی شہنشاہ کو اکبر آباد سے لے جانے پر تیار نہیں تھا اور اب تو یہ وحشت ناک خبر آ گئی تھی۔ اورنگ زیب اور مراد کی فوجیں کسی بھی وقت اس کے سر پر آ سکتی تھیں۔ دارا نے ایک اور حکم جاری کیا۔ اس کی کشتی کو شہنشاہ کے بجرے کے قریب پہنچا دیا گیا۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ نقیبوں نے شہنشاہ کی واپسی کا اعلان کر دیا۔ میلوں تک پھیلا ہوا لشکر واپس ہونے لگا۔ چڑھا ہوا دریا اترنے لگا اور اترا بھی ایسے جیسے بارش کی آمد کا سن کر لوگ اپنا سامان ہٹاتے ہیں۔ اعداز خاں کو حکم ہوا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر اکبر آباد پہنچے اور توپ خانہ عالم پناہی نکال کر باہر ڈال دے۔ دارا ابھی پہنچا نہیں تھا کہ بھاری توپیں دھول پور کی جانب حرکت کرنے لگیں۔

اکبر آباد پہنچتے ہی دارا اضطراب کے عالم میں جلدی جلدی لڑائی کی تیاریاں کرنے لگا۔

شاہجہاں صاحب فراش تھا لیکن سن رہا تھا کہ بھاری توپیں دھول پور کی جانب حرکت کر چکی ہیں۔ سیکری کی محفوظ فوجیں طلب ہو چکی ہیں۔ اسلحہ خانوں کی کوٹھریاں خالی پڑی ہیں۔ اسے اپنی جوانی یاد آئی جب وہ شہزادہ خرم تھا اور نور جہاں کی سازشوں سے ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بڑے کروفر سے اٹھا تھا لیکن جہانگیری دہشت کے سامنے سر جھکا دینا پڑا تھا لیکن یہ اس وقت ہوا تھا جب ورود جہانگیر کا غلغلہ میدان جنگ میں بلند ہوا تھا۔ اسے بھی اس لڑائی میں داراشکوہ کے ساتھ ہونا چاہیے ورنہ دونوں بھائیوں کے درمیان مخالفت کا زور اور بڑھے گا، حکم ہوا کہ پیش خانہ شاہی کو شہر سے باہر لگایا جائے۔ یا بدولت اس جنگ میں بہ نفس نفیس شریک ہوں گے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔

تخت طاؤس کی سیڑھیوں کے نزدیک ہوادار لگا دیا گیا۔ شہنشاہ نے جلوس کیا اور اسے نزہت باغ پہنچا دیا گیا۔

منافع

اسکاٹ لینڈ کے ایک سرمایہ دار کو کاروبار کے سلسلے میں فوری طور پر باہر جانے کی ضرورت پیش آئی۔ وقت اتنا کم تھا کہ ہوائی جہاز چارٹر کیے بغیر وہاں پہنچنا مشکل تھا۔ ہوائی کمپنی نے بتایا کہ چار سو ڈالرز میں ایک ایسے جہاز کا انتظام کیا جا سکتا ہے جس میں دو مسافر جا سکیں گے۔

مجبوراً اس نے جہاز چارٹر کیا اور پوری قیمت وصول کرنے کے لیے دوسرے مسافر کے طور پر اپنی بیوی کو بھی بٹھا لیا۔

راستے میں پائلٹ نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو پہلے کبھی اتنے چھوٹے سے جہاز میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے؟''

اسکاٹ نے کہا۔ ''نہیں۔'' پھر کچھ دیر کے بعد پوچھا۔ ''ایک معمولی سے سفر کے لیے تم لوگ اتنی قیمت طلب کرتے ہو۔ میرے خیال میں شاید ہی کبھی کوئی مسافر تمہارا جہاز چارٹر کرنے کی جرأت کرتا ہوگا۔''

پائلٹ جانتا تھا کہ اسکاٹ پیدائشی کنجوس ہوتے ہیں۔ اس نے اسکاٹ کی دلی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے ایک چھوٹی سی شرط لگانا چاہتا ہوں۔ اگر پورے سفر میں آپ کا منہ بند رہا تو میں کرائے کا ایک ایک سینٹ واپس کر دوں گا۔ لیکن اگر آپ کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو آپ کو دوگنا کرایہ دینا ہوگا۔''

بیوی کے مسلسل احتجاج کے باوجود اسکاٹ اس شرط پر راضی ہو گیا۔ پائلٹ نے شرط جیتنے کے لیے نتوں جیسے سارے کرتب آزمائے کبھی جہاز کو ترچھا کیا۔ کبھی بالکل الٹ دیا۔ کبھی بلندی سے ایک دم نیچے لے آیا، کبھی قلابازیاں کھلائیں اور کبھی یہ ظاہر کیا جیسے جہاز کا انجن خراب ہو گیا ہے مگر اسکاٹ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

بالآخر منزل مقصود پر پہنچ کر پائلٹ نے چار سو ڈالرز نکال کر اسکاٹ کے حوالے کیے اور مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ میرے خوف ناک کرتبوں کے سامنے اپنا منہ بند کیے رہیں گے۔ آپ نے بلاشبہ عظیم ترین کارنامہ انجام دیا ہے۔''

''تمہارے کرتبوں کے سامنے منہ بند رکھنا آسان نہیں تھا۔'' اسکاٹ نے خندہ پیشانی سے تسلیم کیا۔ ''خصوصاً اس وقت جب میری بیوی کئی ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے گری۔''

قلمی تعاون: ذیشان فیروز، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

داراشکوہ، دیوان کل رستم خاں اور میر بخشی آداب بجالانے کے لیے حاضر ہوئے۔ شہنشاہ نے پہلو کے تکیوں پر کہنیاں جمائیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اگر مابدولت میدان جنگ میں نزول اجلال کریں گے تو نامراد باغی آدھی لڑائی تو اسی وقت ہار جائیں گے۔ اگر وہ پھر بھی بضد ہوئے تو ہم انہیں سمجھائیں گے۔ ہم اس بڑھاپے میں بھائیوں کو بھائیوں کے ہاتھوں لڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اگر کچھ غلط فہمیاں ہوگئی ہیں تو ان کا ازالہ بھی ہوسکتا ہے۔"

داراشکوہ پاس ادب کے باوجود خاموش نہ رہ سکا۔

"اگر اس طویل سفر کی بدولت مزاج مبارک اور ناساز ہوگیا تو دنیا کہے گی کہ بزدل دارا کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اکیلا میدان جنگ کا رخ کرتا۔ بیمار باپ کو اذیت دی۔

ظل الٰہی کی دارالخلافت سے جنبش اورنگ زیب کے حق میں ہوگی۔

یہ مہم اکیلے مجھ پر چھوڑ دیجیے اگر میں کامیاب ہوا تو حضور کی برکت سے ہوگا اور شکست ہوئی تو میرے نام لکھی جائے گی۔

اگر آج میں اورنگ زیب کی سرزنش نہ کرسکا تو عمر بھر اس کی سازشوں کا شکار ہونا پڑے گا۔"

"کیا تم اتنا انتظار بھی نہیں کرسکتے کہ تمہارا بیٹا سلیمان شکوہ فتح کے شادیانے بجاتا ہوا تم سے آملے۔"

"آپ کے بیٹے کے پاس اتنا وقت نہیں۔ اورنگ زیب طاقت کے نشے میں چور بڑھتا چلا آرہا ہے۔ آپ کی خدمت میں گزارش ہے کہ آپ قلعہ معلیٰ میں جلوس فرمارہیں اور غلام کو رخصت کریں۔"

شہنشاہ مجبور ہوگیا اور داراشکوہ کو جنگ کی اجازت دے دی۔

جمنا کے کنارے داراشکوہ کا مرمریں محل کھڑا تھا۔ محل کے باہر سنتھوں اور سادھوؤں کی بھیڑ جمع تھی۔ اندر کنیزیں داراشکوہ کو بکتر اور خود پہنا چکی تھیں۔ پھر صدقات سے بھرے ہوئے سونے چاندی کے خوان سروں پر دھرے ہوئے خواجہ سراؤں کے پرے ایک دروازے سے آتے، داراشکوہ ان خوانوں پر اپنا ہاتھ پھیرتا اور خواجہ سرا دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتے۔ جہاں آرا نے بھائی کے بازو پر امام ضامن باندھا۔

برآمد ہوتے ہی آچاریہ نے ڈنڈوت کے بعد اپنے ہاتھ سے ماتھے پر تلک لگایا۔ ایک سنتھ آگے بڑھا اور بائیں بازو پر مالا باندھ دی۔

دارا نے نقرئی سیڑھی پر قدم رکھا اور ہاتھی پر سوار ہوگیا۔ نقارے پر چوٹ پڑتے ہی ہاتھی نے قدم بڑھائے اور قلعہ معلیٰ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ یہاں دارا کو شہنشاہ کی خدمت میں پہنچ کر سلام عرض کرنا تھا۔

شہنشاہ شاہجہاں تخت طاؤس پر جلوہ فرما تھا۔ شمشیر زن، حاجب، چیلے، خواجہ سرا، منصب دار اور راجگان اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے تھے۔ عاجزی اور خاموشی کھڑی پہرا دے رہی تھی۔

دارا اپنے خدم و حشم کے ساتھ نمودار ہوا۔ کورنش بجاتا ہوا تخت کے قریب آیا۔ شہنشاہ نے اس کی نذر قبول کی۔

"غلام کو اجازت مرحمت فرمائیں کہ ساعت رخصت قریب ہے۔"

شہنشاہ نے اجازت دینے کے لیے لب کھولے لیکن الفاظ ادا نہ ہوئے۔ ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ دارا کو کسی معرکہ آرائی کے لیے بھیج رہے ہوں لیکن آج نہ جانے کیوں ان کا دل کہہ رہا تھا کہ دارا کو نہ بھیجیں۔ اس کی جگہ کوئی اور چلا جائے۔ یہ سوچ کر تو دل بھر آیا کہ معرکے میں دو بھائی مقابل ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ آنکھوں سے موتی چلتے۔ وہ ہمت کرکے اٹھے اور تخت طاؤس کی سیڑھیاں اترنے لگے۔ سیڑھیاں اترتے وقت یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ اب اس تخت پر کبھی بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ کچھ پڑھ کر دارا کے سینے پر دم کیا۔ پھر خود آگے بڑھے اور دارا کو گلے سے لگالیا۔ سب نے دیکھا تھا کہ بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"جان پدر جاؤ، ہمیں امید نہیں تھی کہ آل تیمور پر یہ دن بھی آئے گا۔ جب کوئی جنگ پر جاتا ہے تو ہم اسے کچھ نصیحتیں کرتے ہیں لیکن تمہیں کوئی نصیحت نہیں کریں گے کیونکہ یہ جنگ نہیں ہماری قسمت کا لکھا ہے۔ اورنگ زیب سے کہنا جنگ سے باز آجائے۔ ہماری قسمت کے ماتھے سے سیاہی پونچھ ڈالے۔"

دارا نے جواب میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔ رخصت کے سات سلام کیے۔ دیوان عام کی سیڑھیوں پر کھڑے رتھ کی طرف بڑھ گیا۔ اس رتھ پر بیٹھ کر اسے دکن کی طرف نکلنا تھا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہجہاں نے راجا جسونت سنگھ کی ہزیمت سے پہلے ہی جبکہ دکن اور احمد آباد کی فوجیں باہم نہیں ملی تھیں، باغی بیٹوں کے پاس جانے کا ارادہ کرلیا تھا

اور اس بارے میں خان جہاں سے مشورہ کرتا رہا تھا۔ خان جہاں اورنگ زیب کا ماموں تھا اور اس کے ساتھ بڑا اخلوص رکھتا تھا اور اس کے شاندار مستقبل کا خواہاں تھا۔ اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ بادشاہ جائے اور عالمگیر کو منا کرلے آئے۔ جب راجا کو ہزیمت اٹھانی پڑی تو بادشاہ پر خان جہاں کی طرف داری کا بھید کھل گیا اور وہ بہت غضبناک ہوا چنانچہ اپنے عصا سے اس نے خان جہاں کے سینے کو ٹھوکا دیا اور اسے دو تین دن تک سلام اور مجرا سے روک دیا۔ پھر اس پر مہربانی فرمائی اور اس جھگڑے میں دخل انداز ہونے کے سلسلے میں اس سے مشورہ کرتا رہا۔ اس نے ہر بار وہی پہلا مشورہ دیا۔ آخرکار پیش خانہ شاہی کے باہر نصب ہوجانے کے باوجود شاہجہاں کا ارادہ پورا نہ ہوسکا۔

⊜⊜⊜

داراشکوہ راہ سفر کو قطع کرتا ہوا دھول پور کی منزل پر پڑاؤ ڈالے تھکن اتار رہا تھا کہ جاسوسوں نے آکر خبر دی۔

"اورنگ زیب دریائے چنبل کے نزدیک آگیا ہے۔"

داراشکوہ کا ارادہ تھا کہ وہ یہاں ٹھہر کر سلیمان شکوہ کا انتظار کرے گا جو شجاع کی جنگ سے فارغ ہوکر واپس آرہا تھا۔

وہ بہت تیزی سے چلا تھا لیکن گھاٹ کا راستہ بند کرنے سے پہلے ہی مخالف فوجیں دریا عبور کرکے مقابلے پر آگئی تھیں۔ دارا کو ناچار فوجوں کی ترتیب میں مشغول ہونا پڑا۔

دارا کا خیمہ آراستہ ہوچکا تھا۔ سفید چاندنی پر زرد مخملیں قالین بچھے تھے۔ سنتھ، سادھو، فلسفی، شاعر اسے گھیرے بیٹھے تھے۔ جھاڑ اور کنول روشنی بکھیر رہے تھے کہ اچانک اسے سلیمان شکوہ یاد آگیا۔

"سلیمان کا کچھ پتا چلا؟"

"صاحب عالم! آپ افسردہ نہ ہوں۔ شہزادہ حضور بس تشریف لاتے ہی ہوں گے۔"

"کیا جنگ کے وقت بجنے والا نقارہ ہمیں فرصت دے گا۔"

"ہمیں پہل کرنے کی ضرورت کیا ہے۔"

"کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں ہم اطمینان سے سلیمان شکوہ کا انتظار کرسکیں۔"

کارروان آگے چل دیا۔

چالیس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک گاؤں سے گزر ہوا۔ کسی کو اس گاؤں کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ ہمدم خاں خواجہ سرا باریاب ہوا۔ کورنش بجالانے کے لیے گھٹنوں تک جھک گیا۔

"میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ چنبل کے گھنے جنگلات اور دلدلی زمین سے گزرنے کے بعد جو مقام آتا ہے اسے سموگڑھ کہتے ہیں۔ ہم نے جنگلات بھی پار کرلیے، دلدلی زمین سے بھی گزر آئے۔ یہ یقیناً سموگڑھ ہے۔ یہ علاقہ گویا چنبل اور اکبرآباد کے درمیان کا مقام ہے۔"

اس اطلاع کے بعد مقربین بارگاہ طلب ہوئے۔

"چنبل ہماری تلواروں کی زد میں ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی باغیوں کی فوج غالب آئی اور اکبرآباد کی طرف بڑھی تو "سموگڑھ" میں ہمیں موجود ہونا چاہیے۔"

تاریخ نے اس گمنام مقام کو اپنے صفحات پر درج کرلیا۔

چنبل کے کنارے پر اورنگ زیب کا سراپردۂ خاص کھڑا تھا۔ اورنگ زیب سر سے پاؤں تک فولاد میں ڈوبا تخت پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے پاؤں پا انداز پر تھے۔ اس کے مخصوص سپاہی اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ مشورہ یہ ہو رہا تھا کہ کون سا ایسا راستہ اختیار کیا جائے کہ داراشکوہ سے سامنا بھی نہ ہو اور دارالخلافے تک پہنچا بھی جاسکے۔ خان خاناں نجابت خاں کچھ کہنے کے لیے بہت دیر سے بے تاب تھا لیکن گفتگو کے دوران کوئی ایسا وقفہ نہیں آرہا تھا جس کا وہ فائدہ اٹھاتا، بالآخر اسے موقع مل گیا۔

"عالی جاہ کا اقبال بلند ہو۔ اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟"

"اجازت ہے۔"

"ایک مقامی زمیندار میری قید میں ہے۔ وہ اس شرط پر رہائی کا طلب گار ہے کہ وہ ہمیں گنجان جنگل سے گزار کر ایسے راستے پر ڈال دے گا جو ہمیں اکبرآباد تک پہنچادے گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کیونکہ عام لوگ اس راستے سے واقف نہیں۔ بس ایک مشکل ہے یہ علاقہ دلدل کا ہے۔"

"مشکلوں سے تو خیر ہم لڑلیں گے اس سے یہ پوچھو فاصلہ کتنا ہے۔"

"میں پوچھ چکا ہوں فاصلہ زیادہ نہیں صرف چالیس میل دور ہے۔ دلدل کا علاقہ بہت کم ہے۔"

"اگر اس نے راستے میں ہمیں بھٹکا دیا؟"

"وہ ہمارے ساتھ ہوگا عالی جاہ۔"

"اگر اس نے مرنے کی ٹھان لی تو اپنے ساتھ ہمیں بھی کسی دلدل میں اتار دے گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"حضور دانا ہیں۔ کوئی حل فرمائیں۔"
"اس کے کسی بیٹے یا قریبی عزیز کو بھی اپنے ساتھ رکھو۔"
"جو حکم۔"
نجابت خان نے آدمی بھیج کر زمیندار کے دو بیٹوں کو اپنے پاس بلوالیا۔ رات نے اپنے پاؤں جمانے شروع کردیے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کسی کو مشعل جلانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ایک مشعل جلائی گئی جس کی روشنی میں اورنگ زیب برآمد ہوا۔
تیس ہزار کا لشکر کوتل گھوڑوں، اونٹوں اور خزانے کی سانڈنیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ اورنگ زیب کے ساتھ نہ چھتر تھا نہ علم۔ عام سپاہیوں کی طرح گھوڑے پر سوار چلا جارہا تھا۔ بارہ گھنٹے تک مسلسل چلنے کے بعد دلدل کا علاقہ شروع ہوچکا تھا۔ زمین نرم ہوگئی۔ گھوڑوں کے سم دھنسنے لگے۔ خدا خدا کر کے یہ راستہ بھی کٹا۔ دارا کی طرح اورنگ زیب کے سامنے بھی یہی سوال تھا کہ یہ کون سا مقام ہے۔
جواب آیا "سموگڑھ"
اتفاق دیکھیے کہ دونوں فوجیں اتفاق سے آمنے سامنے آگئیں۔ وہ جاسوس جو لشکر سے بہت آگے آگے چل رہے تھے خبر لائے کہ دارا شکوہ کا لشکر کچھ فاصلے پر پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔ دارا شکوہ تک بھی یہ خبر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ مخالف فوجیں مقابلے پر آگئی ہیں۔
دارا شکوہ توپ خانہ کی تیاری، مست جنگی ہاتھیوں کی ترتیب اور فوج کی صف بندی میں مشغول ہوگیا۔
اورنگ زیب ایک گولے کی مار تک کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا تھا۔
دوسرا دن طلوع ہوا تو اورنگ زیب نے اپنی صف آرائی کی۔ صف شکن خاں کو حکم ہوا کہ توپ خانہ آگے بڑھائے۔ کوہ پیکر ہاتھیوں کو غرق آہن کر کے توپ خانے کے پیچھے متعین کیا۔ ہراول پر شہزادہ محمد سلطان کو رکھا۔ شہزادہ محمد اعظم کو میمنہ پر مقرر کیا۔
میسرہ پر مراد کی فوج تھی۔
لڑائی کا آغاز دونوں طرف کے توپ خانوں سے ہوا۔ گولے سروں سے گزر رہے تھے۔ آتش بان آگ برسا رہے تھے۔
اس کے باوجود بھی جنگجو آگے بڑھے تو تیر برسنے لگے نیزے چمکنے لگے۔
ایک موقع وہ آیا جب بادشاہی فوج کا ہراول سپہر شکوہ کی کمان میں آگے بڑھا اور صفوں کو چیرتا ہوا شہزادہ محمد سلطان کے قریب تک جا پہنچا۔ جنگ کا نقشہ پلٹنے ہی والا تھا کہ ایک گولہ رستم خاں فیروز جنگ کے ہاتھی سے آگے چلنے والے ہاتھی پر آکر لگا۔ ہاتھی سیاہ ڈھیر میں تبدیل ہوگیا۔ رستم خاں بوکھلا گیا اور ہراول سے مقابلہ ترک کر کے میمنہ کی طرف نکل گیا۔
دارا شکوہ کو سپہر شکوہ کی شکست کی خبر ملی تو وہ قلب کی فوج کو لے کر آگے بڑھا۔ ایسی شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ اورنگ زیب کے توپ خانے کے مقابل آگیا اور گولہ باری سے بچنے کے لیے مراد کی فوج پر حملہ آور ہوگیا۔ دونوں فوجیں دست بدست لڑنے لگیں۔ مراد کی فوج میں افراتفری تھی لیکن مراد کی بہادری ضرب المثل تھی۔ وہ ہاتھی کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر لڑ رہا تھا کہ ہاتھی جنگ سے منہ پھیر کر فرار نہ ہوسکے۔
دارا شکوہ کے بڑے بڑے سردار قتل ہوچکے تھے لیکن وہ سراسیمہ نہیں تھا۔ پھر اچانک یہ ہوا کہ اس کے ہاتھی کی عماری پر ایک آتش بان آکر لگا اور وہ گھبرا کر ہاتھی سے نیچے اتر گیا۔ بس اس کا اترنا ہی غضب ہوگیا۔ وہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوچکا تھا لیکن جب فوج نے اس کے ہاتھی کی عماری کو خالی دیکھا تو سب کا جی چھوٹ گیا اور سب فرار کی سوچنے لگے۔ اسی وقت ایک گولہ اڑتا ہوا آیا جس کی ضرب سے ایک مصاحب کا سیدھا ہاتھ صاف اڑ گیا اور اس نے اسی وقت جان دے دی۔ دارا شکوہ کے ہوا خواہ جو ادھر ادھر لگے ہوئے تھے بھاگنے لگے۔ ان کے دیکھا دیکھی باقی فوج بھی منتشر ہونے لگی۔
"کہاں ہیں رستم خاں فیروز جنگ، مہاراجا رام سنگھ راٹھور، مہراؤ چھتر سال۔ ان سب کو حکم پہنچاؤ کہ بھاگتی ہوئی فوج کو بھاگنے سے روکیں۔"
"اب ان میں سے کون ہے جو باقی ہے۔ سب کے سب آپ پر نچھاور ہوگئے۔"
یہ سنتے ہی دارا پر کچھ دیر کے لیے غشی طاری ہوگئی۔ پھر سنبھلا اور چاہتا تھا کہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر دشمن کے توپ خانے پر ٹوٹ پڑے کہ بچے کھچے مصاحبوں نے روکا۔
"حضور کیوں دشمن کے گولوں کو عزت بخشتے ہیں۔ سلطان سلیمان شکوہ دارالخلافت پہنچنے ہی والا ہے آپ وہاں پہنچیں گے تو ایسے ایسے کتنے لشکر چشم زدن میں تیار ہوسکتے ہیں۔"
دارا نے بھی سلطنت کے مقابلے میں جان کی حفاظت کو ضروری جانا۔ وہ گنتی کے چند ساتھیوں کے ساتھ اکبر آباد

کی طرف مڑ گیا۔
دارا نے صرف شکست کا ذائقہ ہی نہیں چکھا بلکہ خود اعتمادی بھی گنوادی۔
وہ اکبر آباد پہنچا تو شام ہوچکی تھی مگر اس کے کاررواں میں کوئی مشعل روشن نہیں تھی۔ اسے کہتے ہیں یہ بختی، قلعہ معلی میں شاہجہاں تھا جبکہ اس کا مرمریں محل بے زبان تھا۔ اس سے کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ وہ قلعہ معلی کی طرف جانے کے بجائے اپنے محل کی طرف چلا گیا۔ شرمندگی نے اسے باپ کے پاؤں چھونے نہیں دیے۔ شاہجہاں کی طرف سے پیغام آرہے تھے کہ ازسرنو تیاریوں کے لیے مشورہ کرنے چلے آؤ مگر وہ عذر بہانے کر کے ٹالتا رہا۔

❁❁❁

اورنگ زیب کروڑوں کا ساز و سامان لوٹ کر اپنے امرائے نامدار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کوچ کرتا ہوا اکبر آباد کی طرف چلا لیکن اکبر آباد میں داخل نہیں ہوا بلکہ شہر سے باہر باغ عماد الدولہ میں خیمہ زن ہوگیا۔
یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ دارا شکوہ اور سپہر شکوہ اشرفیوں سے لدے ہوئے خچروں اور روپوں سے لدے ہوئے اونٹوں اور جواہرات کے صندوقوں کے ساتھ شاہجہاں آباد کی طرف کوچ کر گیا۔
اورنگ زیب چاہتا تو دارا شکوہ کے تعاقب کے لیے آدمی دوڑا سکتا تھا لیکن اسے کوئی جلدی نہیں تھی، اس نے تو یہ کیا کہ قلعہ معلی کا محاصرہ کرلیا۔ اکبری مسجد کی فصیلوں پر توپیں چڑھادیں اور جمنا پر پہرے بٹھادیے۔ غالباً اسے یہ شبہ تھا کہ شاہجہاں بھی دارا کی محبت میں شاہجہاں آباد کوچ کر جائے گا۔
شاہجہاں سموگڑھ کی شکست سے پہلے ہی دل شکستہ تھا۔ اس محاصرے کے بعد بالکل ہی بے حواس ہوگیا۔
اورنگ زیب کے دل میں اب بھی تھا کہ وہ باپ کے دل میں جگہ بنالے۔ یہ محاصرہ تو صرف اس لیے تھا کہ سازشوں کا دروازہ بند کردیا جائے۔ کوئی باہر سے اندر نہ جاسکے۔ یہ رعایت اب تک تھی کہ قلعے سے باہر آنے والوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔
اورنگ زیب نے غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے شاہجہاں کی خدمت میں تفصیلی خط لکھا۔
"عرصے سے تشویش ناک خبریں آرہی تھیں۔ میں نے عقیدت و ارادت کے جذبے سے حضور والا کی خدمت میں آنا چاہا مگر مہاراجا نے راستہ روکنے کی کوشش کی۔ ناچار اس کی گوشمالی کر کے آگے بڑھا تو دارا شکوہ ایک بڑی جماعت لے کر سد راہ ہوا۔ اس سے بڑی شدید لڑائی لڑنی پڑی۔ اس نے مجھے قتل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی لیکن بالآخر ہزیمت اٹھا کر فرار ہوا۔ میں مدافعت پر مجبور تھا۔ تاج و تخت پر قبضہ کرنا میرا مقصود نہ تھا۔ میں اب بھی گزشتہ خطاؤں پر معافی مانگنے کو تیار ہوں، اگر حضور باریابی کی اجازت مرحمت فرمائیں۔"
اس خط کے موصول ہوتے ہی پدرانہ شفقت نے جوش مارا۔ اسے اورنگ زیب کا بچپن یاد آیا۔ وہ بچپن میں بھی ضدی تو تھا لیکن گستاخ نہیں تھا۔ چاہے دل سے نہ مانتا ہو لیکن جو کہا جاتا تھا اسے مان لیتا تھا۔ پھر اسے اپنی چہیتی بیوی ممتاز محل یاد آئی۔ وہ کہہ رہی تھی میرے اورنگ زیب کے حق میں آپ یہ کیا کررہے ہیں۔ خود قلعہ معلی میں ہیں اور میرا بچہ ایک باغ میں پڑا ہوا ہے۔ اسے بلا کیوں نہیں لیتے۔ وہ سدا کا ضدی ہے۔ اگر بگڑ گیا تو بھائیوں بھائیوں میں بڑا خون خرابا ہوگا۔ اسے بلا کر سمجھاؤ۔ وہ مان جائے گا۔
شہنشاہ اپنے خیالوں سے لوٹا تو لاتعداد قیمتی موتی مسند پر بکھیر چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھے اور جہاں آرا کو طلب کیا۔
"بادشاہ بیگم، تم دیکھ رہی ہو ہم کیسے بدنصیب بادشاہ ہیں۔ ہم زندہ ہیں اور بیٹے سمجھ رہے ہیں ہماری آنکھیں بند ہوچکیں۔ جو سیلاب ہماری طرف بڑھ رہا ہے اگر اسے ابھی نہ روکا گیا تو سب کچھ بہالے جائے گا۔ اورنگ زیب کی طرف سے خط ملا ہے وہ اپنی خطاؤں پر شرمندہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم اس کے پاس جاؤ اور ہماری طرف سے اسے دلاسا دو۔ اسے راضی کرو کہ وہ ہم سے ملاقات کرے۔ ہوسکتا ہے اس ملاقات کے بعد ہم دارا شکوہ کی طرف سے اس کا دل صاف کردیں اور ہاں اس کی خدمت میں تحائف بھی لیتی جانا۔ ہم چاہتے ہیں اسے "عالمگیر" نامی تلوار بھیجیں۔ تیموری خاندان میں اس سے اچھی تلوار دیکھی نہیں گئی۔"
"آپ کو یقین ہے کہ دارا کی نفرت اورنگ زیب کے دل سے نکل جائے گی؟"
"تم اسے یہاں لے تو آؤ۔ پھر ہم اسے خود سمجھالیں گے یا کم از کم یہ تو معلوم ہوجائے گا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔"
"آپ کی ہر خواہش ہر حکم ہمارے لیے ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم ضرور جائیں گے ظل سبحانی۔"
جہاں آرا شہنشاہ کی سفارت کے فرائض انجام دینے کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں آرا کی سواری اس شان سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

باہر آئی کہ ایک ہزار خواجہ سرا آراستہ گھوڑوں پر سوار اس کے ساتھ تھے، عصابردار سڑک سے راہ گیروں کو ہٹانے کے لیے آگے آگے تھے۔ محاصرہ کیے ہوئے لشکر نے کوئی مزاحمت نہ کی اور سواری آگے بڑھتی گئی۔

اورنگ زیب کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ بہن اس سے ملاقات کے لیے آرہی ہے، مصاحبین کو لے کر پیشوائی کے لیے آگے بڑھا۔ بہن کا ایسا احترام کہ سواری پر نگاہ پڑتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا۔ اسے تخت پر بٹھایا اور خود دوزانو فرش پر بیٹھا۔ ساتھ آئی کنیزوں نے تحائف کی کشتیاں سامنے رکھ دیں۔ جہاں آرا نے ''عالمگیر تلوار'' اٹھا کر اورنگ زیب کے ہاتھ میں دی۔

''ظلِ سبحانی نے یہ خاص طور پر آپ کے لیے بھیجی ہے، اسے قبول کیجیے۔''

اورنگ زیب نے ہاتھ میں تلوار تھامی، بوسہ دیا۔ کمر سے اپنی تلوار کھول ڈالی اور عالم گیر نامی تلوار باندھ لی (شاید اس دن کے بعد ہی اس کا لقب ''عالمگیر'' قرار پایا)

جب وہ شہنشاہ کی جانب سے بھیجے گئے تحائف قبول کر چکا تو جہاں آرا نے وہ تحائف پیش کیے جو وہ اپنی طرف سے لائی تھی۔

اس کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔ وہ اسے نشیب و فراز سمجھاتی رہی اور بالآخر اس نے اورنگ زیب سے وعدہ لے لیا کہ وہ ظلِ سبحانی کے حضور پیش ہوگا اور گفتگو کے ذریعے اپنے معاملات کو سلجھائے گا۔

اورنگ زیب نے نہایت تسلی آمیز جواب دیا۔

''ظلِ سبحانی سے فرما دیجیے گا کہ اورنگ زیب آج شام ہی کو قدم بوسی کے لیے حاضر ہوگا۔''

جہاں آرا رخصت ہوگئی اور اورنگ زیب باپ کے حضور پیش ہونے کے لیے خیالات جمع کرنے لگا۔

ظہر کی نماز کے بعد اورنگ زیب سوار ہوا۔ پچیس ہزار فوج اس کے جلو میں چل رہی تھی۔ اس کا جلوس اکبری مسجد کے سامنے تک پہنچ گیا تھا کہ اس کے سامنے ایک خط پیش کیا گیا جو بہ ظاہر شاہجہاں کی طرف سے لکھا گیا تھا اور دارا کے نام تھا۔ اس خط میں اسے نئی فوج آراستہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ نوید سنائی گئی تھی کہ جب اورنگ زیب اس سے ملنے قلعہ معلیٰ آئے گا اس کی بوٹیاں اڑا دی جائیں گی۔

یہ خط دارا کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی پکڑا گیا تھا۔

اورنگ زیب کو اس خط کی صداقت پر شبہ تھا لیکن حالات بتا رہے تھے کہ یہ خط شاہجہاں نے ہی لکھا ہوگا یا اس سے لکھوایا گیا ہوگا۔ یہ الگ بات کہ دارا کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔

جہاں آرا بیگم جو شاہجہاں کی دنیا میں سب سے بڑھ کر عزیز تھی، دارا شکوہ کی نہایت طرف دار تھی۔ وہ شاہجہاں سے جو چاہے لکھوا سکتی تھی۔

اس کے باوجود وہ جانا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ جہاں آرا بیگم کسی وقت بادشاہ سے جدا نہیں ہوتی اور اس کے مزاج پر اس قدر حاوی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے وہی ہوتا ہے اور یہ پیغام اس کا ایک چکمہ ہے اور اس نے تاتاری عورتوں میں سے جو محل سرا میں چوکی پہرے کے کام پر متعین ہیں کچھ قوی ہیکل اور مضبوط اور مسلح عورتیں اس قصد سے لگا رکھی ہیں کہ جب وہ قلعے میں داخل ہو تو فوراً اس پر آن پڑیں۔

اسے یہ بھی یقین ہوگیا کہ شاہجہاں اب بھی دارا شکوہ کے خواب دیکھ رہا ہے اور اس لیے کہ جہاں آرا دارا شکوہ کی طرف دار ہے۔ تلوار سے کام نہیں چلا تو اب سازشوں پر اتر آئی ہے۔

اورنگ زیب قلعہ معلیٰ میں داخل نہ ہوا۔ راستے سے پلٹا اور دارا شکوہ کے محل میں اتر گیا۔ شہزادہ محمد سلطان کو حکم ہوا کہ شہر کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لے تاکہ شہر والے لشکریوں اور شہر کے اوباشوں کی دست برد سے محفوظ رہیں۔ قلعہ معلیٰ کا محاصرہ نہایت سخت کر دیا گیا۔ اب کسی کو اندر سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی نہ کوئی باہر سے اندر جا سکتا تھا۔

اس دوران باپ بیٹوں میں تلخ و تند مراسلت بھی ہوتی رہی۔

دارا شکوہ بھاگم بھاگ شاہجہاں آباد کے قریب پہنچا تھا کہ وحشت ناک خبریں اس کے گوش گزار ہوئیں۔ اسے معلوم ہوا کہ اورنگ زیب نے اکبر آباد کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ ظلِ سبحانی تقریباً نظر بند ہو کر رہ گئے ہیں، معاملات حکومت اب ان کے ہاتھ میں نہیں رہے اور اب اورنگ زیب اس کے تعاقب میں روانہ ہونے والا ہے۔ عالمگیر کی فوج کے تعاقب اور شہر میں محصور ہو جانے کے اندیشے سے وہ شہر کے اندر نہیں گیا بلکہ باہر ہی پڑاؤ ڈال لیا اور بادشاہی سرکار اور امرا کے گھروں سے جو مال و اسباب ملا سب قبضے میں کر لیا۔ اب اسے سلیمان شکوہ کا انتظار تھا۔ پڑاؤ ڈالے بیٹھا رہا کہ بیٹے کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرے۔

سلیمان شکوہ نے شجاع کو شکست دے دی تھی لیکن پھر ایسا پانسا پلٹا کہ اورنگ زیب کے خوف سے اسے اکبر آباد یا شاہجہاں پور آنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے ساتھی اسے چھوڑ

گئے اور وہ خود سری نگر کے ایک زمیندار کی پناہ میں قیدیوں کی طرح رہنے پر مجبور ہوگیا۔

دارا کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے جگر کا ٹکڑا کس حال میں ہے۔ زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ زیادہ انتظار کرتا تو بھائی کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہونے کا ڈر تھا۔ اس نے کوچ کا فیصلہ کر لیا۔ زندگی رہی تو فتح کے بہت سے مواقع آئیں گے۔ اس نے ایک تازہ لشکر دس ہزار سواروں پر مشتمل تیار کیا اور پنجاب کی طرف روانہ ہوگیا۔

پرندہ پھر اڑ گیا۔ اورنگ زیب صرف اتنا کر سکا کہ تعاقب کرنے والوں کو شاہجہاں آباد کی طرف دوڑائے اور یہ انتظام کر دے کہ دارا شاہجہاں آباد میں داخل نہ ہو سکے۔ دارا کو اتنی عقل تو تھی۔ وہ شاہجہاں آباد میں کیوں داخل ہوتا۔ لاہور کی طرف اڑ گیا۔

دارا کا لاہور کی طرف چلے جانا یہ ثابت کر رہا تھا کہ وہ شہنشاہ سے خط کتابت کرتا رہے گا اور کسی وقت خطرے کا باعث بنے گا۔

اس نے شہنشاہ پر اور زیادہ سختیاں بڑھا دیں۔ قلعے کا پانی بند کر دیا کہ شہنشاہ عاجز ہو کر قلعہ اس کے حوالے کر دے۔ شاہی خزانہ اسی قلعے میں تھا اور دارا کو یہ موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جائے۔ اتفاق یہ بھی ہوا کہ شاہجہاں کا ایک اور خط پکڑا گیا جو اس نے کابل کے صوبے دار مہابت خاں کے نام لکھا تھا۔ اس سے استدعا کی تھی کہ وہ اسے (شاہجہاں) اورنگ زیب اور مراد کے پنجے سے چھڑائے۔ اس نے لکھا تھا۔

''مہابت خاں جیسا بہادر جس کی ہیبت سے زمانہ لرزاں ہے شاہجہاں کی طرح گوشہ نشیں بیٹھا رہے تو ہزار تعجب ہے۔ مناسب یہ ہے کہ وہ بہادر آراستہ لشکر لے کر عزیمت کرے اور جلوہ ریز لاہور پہنچ کر دارا شکوہ بابا کی مدد و رفاقت کرے اور ان دونوں نابرخورداروں کو جزائے اعمال پر پہنچانے کی سعی کرے اور صاحب قران ثانی قیدی (شاہجہاں) کو اس قید سے چھٹکارا دلائے۔''

اسی خط میں یہ بھی لکھا گیا تھا۔ ''میں نے فرزند ارجمند کو بھی لکھ دیا ہے کہ وہ خود کو تمہارے سپرد کر دے اور اس سپہ سالار کی اطاعت ہی میں اپنی فلاح و بہبود اور میری رہائی کو مضمر سمجھے۔''

ان سطروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاہجہاں اب بھی دارا شکوہ سے خط کتابت کے ذریعے تعلق رکھے ہوئے ہے۔

ان انکشافات کے بعد اب مزید کسی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے شہزادہ محمد سلطان کو حکم دیا کہ وہ قلعے میں داخل ہو جائے اور شہنشاہ کو معزول کر دے۔ شہزادہ محمد سلطان قلعے میں داخل ہوگیا۔ خزانوں اور کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔

بوڑھا بیمار قیدی ایک کمرے تک محدود ہوگیا جہاں بادشاہ بیگم اس کی چہیتی بیٹی بہ دستور خدمت کے لیے موجود تھی۔ وہ اسے سیاست کے نئے نئے راستے دکھاتی رہتی تھی۔ جو چاہتی تھی کراتی تھی لیکن اب خاموش تھی۔ اورنگ زیب نے اس کی ہر چال کو ناکام کر دیا تھا۔ اس کا چہیتا بھائی دارا لاہور میں بے یار و مددگار تھا۔

اورنگ زیب کو شاید اب تک یقین نہ ہو لیکن اب یقین ہونے لگا تھا کہ بادشاہ کی زندگی میں بھی وہ بادشاہ بن

ہماری سڑکیں

ہماری سڑکیں ایسی ہیں کہ ان پر تحریکیں ہی چل سکتی ہیں۔ اس کے باوجود ہر چوک میں سیاست اور ٹریفک پھنسی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں محتاط ڈرائیور اسے کہتے ہیں۔ جو اشارہ توڑنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھ لیتا ہے۔ موٹر سائیکل پر ڈبل سواری بٹھانے پر جب بھی پابندی لگتی ہے تو ویگنوں میں اتنا رش ہو جاتا ہے کہ سیٹ حاصل کرنے کے لیے آپ ویگن کے ڈرائیور بن جائیں۔ سڑکوں پر اتنا رش ہوتا ہے کہ نگراں وزیر نے کہا۔ نگراں وزیر بننے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ گاڑی پارک کرنے کے لیے جگہ نہیں ڈھونڈنی پڑتی۔ پارکنگ کی حد تک ہم جاپان بنتے جا رہے ہیں۔ ایک جاپانی صحافی لکھتا ہے۔ میری بیوی جب بھی کہیں پارکنگ کے لیے خالی جگہ دیکھتی ہے۔ کار خریدنے کے لیے ضد کرنے لگتی ہے۔ ہمارے خیال میں ان سب مسائل کا حل اس اسپینی کہاوت میں ہے کہ اگر بے عیب اور مستقل سواری چاہتے ہو۔ تو پیدل چلو......

ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب مزاح بخیر سے انتخاب

مراسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

WWW.PAKSOCIETY.COM

سکتا ہے۔ صرف دارا کا کانٹا درمیان سے نکالنا ہے۔

جب شہنشاہیت کی خوبو دماغ میں سمانے لگی تو دارا سے بھی زیادہ اسے مراد کی فکر ہوئی۔ ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے جبکہ مراد خود کو بادشاہ ہی تصور کر رہا تھا۔

مراد نہایت دلیر اور جانباز تھا لیکن اس کے ساتھ نہایت سادہ لوح تھا۔ بہت آسانی سے لوگوں کے دام میں آجاتا تھا۔ داراشکوہ پر جب اس کو فتح حاصل ہو چکی تو اس کو لوگوں کے بہکانے سے یہ خیال آیا کہ یہ معرکے میں نے سر کیے ہیں۔ میں ہی تنہا سلطنت کا حق دار ہوں۔ اس خیال سے اس نے عالمگیر سے علیحدگی اختیار کرلی اور عالمگیر کے بڑے بڑے امرا کو بھاری تنخواہوں اور انعاموں کی طمع دلا کر توڑنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ بیس ہزار فوج اس کی رکاب میں جمع ہوگئی۔

اس کے خیر خواہوں نے اسے اونچ نیچ سمجھائی۔

''اورنگ زیب نے فتح کے بعد سموگڑھ میں داراشکوہ کی بارگاہ آپ کو دینے کے بجائے خود استعمال کی۔ ظل سبحانی سے نامہ و پیام اپنی ذات تک محدود رکھا۔ قلعہ معلیٰ اپنے بیٹے کے اختیار میں دیا۔ بادشاہ بیگم اس سے ملنے آئیں تو آپ سے نہیں ملنے دیا گیا۔ داراشکوہ کا محل اپنے استعمال میں رکھا۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ خود کو شہنشاہیت کا حق دار سمجھتا ہے۔ آپ کو اس سے الگ نہ ہونا چاہیے۔''

ان میں سے کوئی بات بھی اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔ وہ خود کو بادشاہ سمجھ کر بادشاہت میں مگن رہا۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب نے اسے پیغام بھیجا کہ اس کے ساتھ دعوت میں شریک ہو۔

وہ جانے کو تیار تھا۔ کوئی اسے روک نہیں سکتا تھا لیکن خیر خواہوں نے یہ مشورہ ضرور دیا کہ اگر جانا ہی ہے تو لشکر کے ساتھ جائے اور اندیشوں کا اظہار بھی کیا لیکن اس نے برہمی کا اظہار کیا۔

''ایسے بے ہودہ کلمات کے کہنے اور سننے سے باہمی محبت اور عہد و قرار میں فرق پڑ جاتا ہے۔''

چند جاں نثاروں کے ساتھ دعوت میں شریک ہونے چلا گیا۔

وہ بے فکر ہو کر دعوت میں شریک ہوا۔ دعوت کے بعد آرام کرنے کے لیے لیٹا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ بدقسمتی کو یہی وقت درکار تھا۔ پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔ آنکھ کھلی تو بے بسی کے سوا کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔

چار ہاتھیوں پر پردہ دار ہودج بندھوائے اور ہر ہاتھی کے ساتھ فوج کا ایک ایک دستہ دو دو نامی سرداروں کے ساتھ مقرر کر کے ان کو چار مختلف سمتوں پر بھیجنے کی شہرت دے دی۔ جس ہاتھی پر مراد سوار تھا اسے گوالیار پہنچا دیا گیا۔

چار ہاتھیوں کا انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ مغل سرداروں اور مراد کے دوسرے ہواخواہوں کی توجہ بٹ جائے اور وہ اس خاص ہاتھی کو تلاش نہ کر سکیں جس پر مراد سوار ہو۔

گرفتاری کے بعد مراد بخش کا تمام خزانہ اور ساز و سامان ضبط کر لیا گیا۔

داراشکوہ نے لاہور پہنچنے کے بعد فوج جمع کرنے اور وہاں کے باشندوں کی دلجوئی کرنے میں دن بسر کیے۔ زمینداروں اور فوج داروں سے عہد و پیمان کیے۔ شاہجہاں کی طرف سے خطوط آتے رہتے تھے جو اس کی تسلی کا باعث بن رہے تھے اس نے بنگال میں شجاع کے پاس بھی ایک خط روانہ کیا اور اس عہد کے ساتھ اتحاد کی دعوت دی کہ اورنگ زیب پر فتح پانے کے بعد ملک کو باہم تقسیم کرلیں گے۔

وہ اس عہد نامے کے جھانسے میں آگیا اور داراشکوہ کی مدد پر جانے کا فیصلہ کر لیا اور چند ہی دن بعد جہانگیر سے ایک باقاعدہ فوج اور بڑا توپ خانہ لے کر نکلا۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد داراشکوہ نے لاہور میں تخت نشینی کا جلوس منعقد کرنے اور سکہ و خطبہ جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن خود اعتمادی رخصت ہو چکی تھی۔ عالمگیری افواج کی پیش قدمی اور دبدبے کی وجہ سے یہ تقریب ملتوی کر دی۔

بڑے بڑے زمینداروں اور فوج داروں نے جب اس کا خوف دیکھا اور نئے بادشاہ کے بڑھتے ہوئے اقبال کو دیکھا تو وہ بھی اس سے کترانے لگے۔ جتنا لشکر جمع کیا تھا وہ بھی منتشر ہو گیا۔ کابل سے مہابت خاں بھی اس کی مدد کو نہ آیا۔

دارا کے جی میں سمائی بلکہ زمینداروں کی طرف سے جان کو خطرہ لاحق ہوا تو وہ تین چار ہزار سواروں اور مختصر سے توپ خانے کے ساتھ ٹھٹھہ اور ملتان کے راستے سے فرار ہو گیا۔

یہ خطرہ موجود تھا کہ اگر اورنگ زیب آگیا تو وہ اس کا پیچھا ضرور کرے گا۔ اس کا انتظام بھی ضروری تھا، بادشاہی فوج کے راستے میں جو گھاٹ پڑتا تھا اس پر اس

نے داؤد خاں کو مقرر کر دیا کہ چند دن تک بادشاہی فوج کو روکے رکھے بعد میں کشتیوں کو جلا کر اور غرق کر کے اس کے پاس آجائے۔

''بدنصیب ہوں۔ کہاں جاتا ہوں تمہیں معلوم ہو ہی جائے گا۔''

بدنصیبی قدم سے قدم ملا کر ساتھ چل رہی تھی۔

اورنگ زیب بہ نفس نفیس دارا کے تعاقب میں تھا۔ دریائے ستلج کو عبور کیا۔ معلوم ہوا داراشکوہ ملتان کی طرف عازم سفر ہوا ہے۔

داراشکوہ نے ملتان پہنچنے کے بعد زیادہ توقف نہیں کیا اور بھکر کی طرف چلا گیا۔

اورنگ زیب ملتان سے قریب چھاؤنی ڈالے بیٹھا تھا کہ پرچہ نویسوں نے اطلاع دی کہ شجاع پچیس ہزار سوار اور ایک بڑا توپ خانہ لے کر مقابلے پر نکل آیا ہے۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ سے پہلے شجاع کی سرکوبی ضروری سمجھی۔ داراشکوہ کا تعاقب چھوڑ کر دارالخلافہ کی طرف واپسی کا حکم دے دیا۔ شاہی سواری پہلے لاہور گئی اور پھر لاہور سے روانہ ہو کر شاہجہاں آباد میں داخل ہوئی۔

واضح ہو کہ اس نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان ایک سال پہلے ہی کر دیا تھا۔

اورنگ زیب کچھ دنوں کے لیے داراشکوہ کو بھول کر شجاع کی طرف متوجہ رہا۔ چوہے بلی کا کھیل جاری رہا۔ شجاع بار بار مقابلے پر آتا رہا اور شکست کھا کر فرار ہوتا رہا۔ بالآخر ''کھجوہ'' کے مقام پر ایک لڑائی لڑ کر اورنگ زیب نے شہزادہ شجاع کو آسام میں گم نام موت مر جانے پر مجبور کر دیا۔

داراشکوہ میں اب اتنا دم خم نہیں رہا تھا کہ شجاع کی مدد کو پہنچتا اور متحد ہو کر اورنگ زیب کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا۔ لاہور سے فرار ہو کر وہ ''بھکر'' پہنچ گیا تھا لیکن لشکر بہت کم رہ گیا تھا۔ جو رہ گیا تھا اس میں سے بھی بھکر پہنچ کر بہت سے رفیق ساتھ چھوڑ گئے۔ ناچار اس نے اپنے محل کی عورتوں کو کچھ خزانہ طلائی اور بھاری ساز و سامان کے ساتھ بھکر کے قلعے میں چھوڑا۔ کچھ لوگ ان کی حفاظت کے لیے چھوڑے اور خود عام شاہراہ سے ہٹ کر گھنے جنگلوں میں داخل ہو گیا کہ کسی نہ کسی طرف نکل ہی جائے گا۔

مختصر سا لشکر ساتھ تھا اور کڑے کوسوں کا سفر۔

بادشاہی فوج مسلسل تعاقب میں تھی۔ اس کے لیے دوبھر تھا کسی جگہ رک کر سانس لیتا۔ اس کے ساتھی مسلسل کم ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ بھوک سے مر گئے، کچھ ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ٹھٹھہ کے کنارے پہنچا اور پلٹ کر دیکھا تو صرف ہزار سوار رہ گئے تھے۔ بادشاہی لشکر شیخ میر کی قیادت میں برابر تعاقب کر رہا تھا لیکن حال اس کا بھی خراب تھا۔ پانی کی کمی اور راستے کی صعوبتوں نے اس کے بھی بہت سے آدمی ضائع کر دیے تھے۔ اس نے گھبرا کر اورنگ زیب کو پروانہ بھیجا۔

''میں اندھیری رات میں جگنو کی روشنی کی طرح ہوں۔ ایسی معمولی روشنی میں کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ یہ تو معلوم ہے کہ داراشکوہ میرے آگے کہیں چل رہا ہے لیکن کہاں؟ میں اپنے بہت سے آدمی گنوا کر بھی ٹٹول ٹٹول کر چل رہا ہوں۔ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہاں ٹھوکر لگ جائے۔''

اورنگ زیب کو جب یہ دردناک پروانہ ملا تو اس نے شیخ میر کو واپس بلا لیا۔

تعاقب بہ ظاہر ختم ہو گیا لیکن تقدیر کی گردش ختم نہیں ہوئی تھی۔ داراشکوہ ایسے پرندے کی طرح تھا جس کے پر بھیگ گئے ہوں اور وہ دھوپ کی تلاش میں ہو۔ بھاگم بھاگ سیوستان کی سرحد پر پہنچنے کے بعد اس نے احمد آباد کا رخ کیا۔

اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بادشاہی فوج اب اس کے تعاقب میں نہیں ہے لہٰذا ''کچھ'' پہنچ کر اس نے قیام کر لیا اور لشکر جمع کرنے لگا۔ ''کچھ'' کا زمیندار نقد و جواہرات پا کر اس کا مطیع ہو گیا۔ دارا نے اس کی لڑکی اپنے بیٹے سپہر شکوہ سے منسوب کر دی۔

زمیندار اس کی خاطر مدارات میں مشغول رہا اور جب دارا نے جانا چاہا زمیندار نے سواریوں کا بندوبست کر دیا اور اپنی سرحد سے گزار کر اسے احمد آباد کے لیے رخصت کیا۔

داراشکوہ احمد آباد کی دھوپ میں ہاتھ تاپنے اس لیے جانا چاہتا تھا کہ وہاں کے صوبہ دار شاہ نواز خاں سے اس کی

''آپ کی بیٹی بڑی بداخلاق ہے جناب!''
''اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہو؟ آخر کیا بات ہے؟''
''میں جب بھی یہاں آتا ہوں، وہ مجھے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرانے لگتی ہے!''
''یہ تو تہذیب اور سلیقے کی بات ہے کیونکہ اس کے بجائے اگر کوئی دوسری لڑکی تمہیں دیکھے گی تو یقیناً کھلکھلا کر ہنس پڑے گی!''

WWW.PAKSOCIETY.COM

رشتہ داری تھی۔ ہمدردی تو وہ عالمگیر کا تھا لیکن دارا کو یقین تھا کہ وہ بھائیوں کے جھگڑے میں نہیں پڑے گا اور اس کے استقبال کے لیے باہر نکلے گا۔

داراشکوہ کی آمد کا سن کر وہ قلعے سے باہر نکلا اور دارا کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور یہ وعدہ بھی کرلیا کہ وہ اسے ضروری سامان فراہم کرے گا۔

احمد آباد میں مراد کے دس لاکھ روپے اور طلائی سامان تھا۔ اس نے یہ سب داراشکوہ کی نذر کردیا۔ مراد دراصل شاہ نواز خاں کا داماد تھا جسے عالمگیر نے قید کردیا تھا (بعد میں مروادیا) اس لیے شاہ نواز خاں دارا کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اگر داراشکوہ برسر اقتدار آگیا تو مراد کی رہائی ممکن ہوسکے گی۔

داراشکوہ نے بندرگاہ سورت، کھنبایت، بھروچ اور دوسرے سیر حاصل پرگنوں پر اپنے آدمیوں کو مقرر کردیا۔ بیس ہزار سوار بھی فراہم کرلیے۔ بیجاپور اور حیدرآباد کے حکام کے نام بھی اس نے نقد اور فوج بطور کمک بھجوانے کے لیے خطوط لکھے۔

وہ یہ سب تیاریاں کر ہی رہا تھا کہ اسے بادشاہی فوج سے راجا جسونت کے فرار ہونے کی اطلاع ملی۔ یہ جسونت وہی تھا جسے اس نے بھی عالمگیر کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔

وہ ابھی اس خبر کی تصدیق کر ہی رہا تھا کہ راجا جسونت کا خط آگیا۔ خبر کی تصدیق ہوگئی۔ راجا نے لکھا تھا کہ اگر داراشکوہ جودھپور آجائے تو اجمیر دور نہیں۔ دونوں کی فوجیں مل کر اجمیر پہنچیں گی۔

داراشکوہ دکن جانے کا ارادہ کررہا تھا لیکن جسونت سنگھ کا خط آنے کے بعد اس نے راجا کے پاس جانے کا ارادہ کرلیا۔ احمد آباد میں تقریباً ڈیڑھ ماہ گزارنے کے بعد وہ ایک آراستہ فوج اور ایک بڑا توپ خانہ لے کر احمد آباد سے نکلا۔

ہر منزل پر اسے راجا جسونت کے خطوط ملتے جاتے تھے۔

بدقسمتی نے دارا کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ عالمگیر کو اطلاع مل گئی کہ داراشکوہ نے راجا جسونت سے ساز باز کرلی ہے۔ یہ اتحاد کسی طرح بھی بادشاہی فوج کے لیے مناسب نہیں تھا۔

اجمیر کا صوبہ دار تربیت خاں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اورنگ زیب تخت طلائی پر براجمان تھا اور صوبہ دار کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ محمد امین خاں اور دوسرے حکام سلطنت بھی صف بہ صف بیٹھے تھے کہ اورنگ زیب کی آواز گونجی۔

”راجا جسونت سنگھ کی گوشمالی ضروری ہوگئی ہے۔ محمد امین خاں ہم تمہیں مقرر کرتے ہیں کہ لشکر لے کر جاؤ اور جسونت سنگھ کو ہمارے دربار میں پیش کرو۔“

”ہرچند کہ آپ کی رائے سے اختلاف بہ منزلہ کفر ہے لیکن اگر جان کی امان پاؤں اور آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں کچھ عرض کروں۔“

”اجازت ہے۔“

”یہ وقت جنگ کا نہیں مصلحت سے کام لینے کا ہے۔ داراشکوہ جودھپور کے لیے روانہ ہوچکا ہے۔ جب تک ہماری فوجیں پہنچیں گی داراشکوہ پہنچ چکا ہوگا۔ ہمارا مقابلہ دونوں دشمنوں سے ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ راجا جسونت سنگھ کے مناصب و اعزاز میں اضافہ کرکے اپنا طرف دار بنالیا جائے۔ اس نے دارا کا ساتھ نہیں دیا تو دارا مایوس و نامراد کسی طرف کو نکل جائے گا یا اگر مقابلے پر آیا بھی تو اکیلا ہوگا۔ حضور کی بہادر افواج اسے کچل دیں گی۔“

”یہ تجویز بھی بری نہیں لیکن اگر اس نے ہماری پیشکش ٹھکرادی تو مابدولت کی سبکی ہوگی۔“

”وہ اس لائق نہیں کہ آپ اسے براہ راست مخاطب کریں۔ اس کام کے لیے راجا جے سنگھ کو مقرر کیجیے۔ جودھپور اس کے تعلقے سے قریب ہے۔ وہ ضامن بن کر راجا کو رام کرلے گا۔ دونوں راجپوت ہیں۔ ایک کا کہا دوسرا نہیں ٹالے گا۔ جب یہ کام ہوجائے تو اپنی فوجیں بھی روانہ کردیجیے گا۔ زیادہ امید یہ ہے کہ دارا اجمیر کی طرف جائے گا۔ وہاں ہم کھلے میدان میں اسے گھیر لیں گے۔“

تیز رفتار قاصد راجا جے سنگھ کے پاس پہنچا۔

راجا جسونت سنگھ جودھپور سے ایک آراستہ فوج لے کر بیس کوس پر داراشکوہ کے استقبال اور رفاقت کی نیت سے نکل آیا تھا کہ راجا جے سنگھ نے اس سے رابطہ کیا اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ جسونت سنگھ نے ارادہ بدل دیا اور اپنے مقام پر واپس چلا گیا۔

جب اس کی واپسی کی خبر دارا کو ملی تو بہت پریشان ہوا۔ وہ راستے میں تھا۔ واپس جانے کا یارا نہیں تھا۔ راستے ہی میں ٹھہر گیا۔ اس کے لشکر کے ساتھ دے چند نام کا بھی ایک آدمی تھا جو راجا سے ربط ضبط رکھتا تھا۔ داراشکوہ نے اسے ایلچی بنا کر راجا کے پاس بھیجا۔

”راجا سے کہنا راجپوت تو اپنے وچن کے لیے جان

دے دیتے ہیں۔ تمہیں ایسی کیا مجبوری آگئی کہ اپنے قول سے پھر گئے۔ کیا تمہیں اکبر آباد کا وہ زمانہ یاد نہیں جب میں فقیروں کو بادشاہ بنایا کرتا تھا۔ میری فیاضی کو بھول گئے۔ میں اب بھی وہی داراشکوہ ہوں۔ وقت ملا تو تمہیں جواہرات میں تول دوں گا۔ ہر خوف کو بالائے طاق رکھ کر میرے پاس چلے آؤ۔“

دے چند یہ پیغام لے کر راجا کے پاس چلا گیا۔ اپنی جانب سے بہت کچھ کہا۔ جسونت سنگھ نے راجا جے سنگھ سے ہونے والی مراسلت کو راز میں رکھا۔ صاف انکار بھی نہیں کیا لیکن ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

”میں اپنے قول پر قائم ہوں لیکن اس وقت میرا آنا خلاف مصلحت ہے۔ آپ فی الحال اجمیر جا کر ٹھہر جائیں اور دوسرے راجپوتوں کو پیغام بھیج کر اپنے پاس بلالیں۔ جب دو تین سربرآوردہ راجپوت آپ کے پاس جمع ہوجائیں گے تو میں خود آپ کے پاس آجاؤں گا۔“

دارا نے اس نصیحت پر اس طرح عمل کیا جیسے جسونت سنگھ واقعی اس کا ہمدرد ہے۔ وہ اجمیر چلا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی دے چند کو ایک مرتبہ پھر راجا کے پاس بھیجا اور بڑے سبز باغ دکھائے مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دے چند ناکام واپس آگیا۔ اس نے واپس آکر صاف کہہ دیا کہ اب جسونت سنگھ سے امید رکھنا فضول ہے۔ وہ اپنے قول سے پھر چکا ہے۔

اس دوران یہ خبریں بھی مشہور ہونے لگیں کہ اورنگ زیب کی جانب سے راجا کے نام معافی کا فرمان جاری ہوا ہے۔ اس خبر کے بعد اس کی سمجھ میں آجانا چاہیے تھا کہ راجا ٹال مٹول سے کیوں کام لیتا رہا ہے لیکن ڈوبنے والا تنکے کا سہارا لیتا ہے اس نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ جسونت سنگھ کو اپنی راہ پر لے آئے۔ اس نے اپنے لڑکے سپہر شکوہ کو جسونت سنگھ کے پاس بھیجا۔

سپہر شکوہ کی خوشامد بھی کام نہیں آئی۔ جسونت سنگھ کو آنا تھا نہ آیا بلکہ اس مرتبہ تو اس نے صاف منع کردیا۔ ضد یہی تھی کہ داراشکوہ اجمیر چلا جائے۔

ابھی داراشکوہ جسونت سنگھ کے انکار کے صدمے سے بری بھی نہیں ہوا تھا کہ اورنگ زیب کے قریب پہنچ جانے کی خبر ملی۔

اورنگ زیب کی فوجیں دھول اڑاتی فتح کے نعرے بلند کرتی چلی آرہی تھیں۔ دارا کھلے میدان میں پڑا ہوا تھا۔ اس کھلے میدان میں لڑنا اس کے لیے مفید نہیں تھا۔ اس نے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
اپریل 2013ء کے شمارے کی رنگا رنگ جھلک

سرورق کی کہانیاں
واپسی کا سفر ہر شخص کی قسمت میں نہیں ہوتا مگر بعض لوگوں کے لیے واپسی میں ہی زندگی مضمر ہوتی ہے سہانے سپنوں اور خوابوں کا سفر...... احمد اقبال کے تیکھے انداز بیان میں
جرم...... دوستی اور فریب کی گہرائیوں سے شناسائی کا سفر، سرورق کا دوسرا رنگ
اولین صفحات ● سچ اور جھوٹ کے مابین بہت فرق ہوتا ہے مگر المیہ ہے کہ بعض سچ وقت گزرنے کے بعد جھوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ کاشف زبیر کے قلم سے زندگی کی تلخ حقیقتیں
گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ
للکار ● محبت کی جلتی بجھتی شمعیں اور انتقام کے بھڑکتے شعلے طاہر جاوید مغل کی سنسنی خیز تحریر
مغرب کے نرالے انداز
مغربی دنیا کی تہذیب اور معاشرے کی عکاس جرم اور محبت کی پُر درد، ناقابل فراموش کہانیاں
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اجمیر کے نواحی کوہستان میں مورچے باندھ کر محصور ہو جانے کا ارادہ کرلیا۔
اس سے پہلے کہ کھلے میدان کی زمین رنگین ہوتی اس نے کوچ کیا اور درے میں داخل ہوگیا۔ جگہ جگہ پتھر اور گارے کی دیواریں کھڑی کرتا گیا۔ دیواروں پر توپیں نصب کرائیں اور مورچوں پر بندوقچیوں کو متعین کر دیا۔ خود کو قلب میں رکھا اور آگے سپہر شکوہ کو آتش بازی کے ہتھیار اور مشہور توپوں کے ساتھ رکھا۔
اورنگ زیب یلغار کرتا ہوا دارا شکوہ کے مورچوں سے آدھے میل کے فاصلے پر آکر رک گیا۔ اس کے امیروں نے بھی مورچے بنالیے۔ دارا شکوہ کو فائدہ یہ تھا کہ وہ بلندی پر تھا۔ اس کی طرف سے جو گولہ آتا تھا وہ کارگر ہوتا تھا۔ چار راتیں اسی طرح گزر گئیں اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اورنگ زیب نے اپنے پیادوں کو جو ''پہاڑی'' کے نام سے مشہور تھا روانہ کیا۔ دارا شکوہ کو ادھر سے حملے کا خطرہ تھا اس لیے اس طرف اس نے کافی توپیں لگا رکھی تھیں جو مسلسل باڑھ پر باڑھ چلاتی جا رہی تھیں۔ شاہ کے پیادے بھاری نقصان اٹھانے کے باوجود برابر آگے بڑھتے رہے۔ لاشیں گرتی رہیں اور وہ بڑھتے رہے۔ بالآخر پہاڑی پر پہنچ گئے۔
دارا شکوہ ایک پہاڑی پر کھڑا جنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے اپنی فوج کو بہت غیرت دلائی لیکن پہاڑی پر شاہی جھنڈا لہراتے ہی اس کی فوج نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ دارا کو اپنی شکست کا یقین ہوگیا۔ رات کے اندھیرے نے اسے پناہ دی اور وہ وہاں سے فرار ہوگیا۔ سپہر شکوہ اور حرم کی عورتوں کے سوا کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ تھوڑے سے جواہرات اور اشرفیاں اس کے ساتھ تھیں اور وہ احمد آباد کی طرف جا رہا تھا۔
اس کی فوج کی اس وقت عجیب حالت تھی۔ کچھ زخمی تھے کچھ ایسی حالت میں بھاگے کہ اپنی عورتوں تک کو ساتھ نہ لے جاسکے۔ کوہستان میں حیران و سرگرداں نکل گئے۔
اورنگ زیب کو جب دارا کی شکست اور فرار کا علم ہوا تو سجدہ شکر بجالایا اور اجمیر جا کر خواجہ غریب نواز کے مزار پر حاضری دی۔ یہیں اس نے راجا جے سنگھ اور بہادر خاں کو زادِ راہ کے لیے رقم عنایت کی اور دونوں کو حکم ہوا کہ وہ دارا شکوہ کا تعاقب کریں۔
بداقبالی ساتھ لگی ہوئی تھی۔ دارا شکوہ حیران پریشان احمد آباد کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑے سے لوگ ساتھ تھے۔ ابھی بہ مشکل چار پانچ کوس کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ساتھ کے لوگوں کے دلوں میں بے ایمانی آگئی۔ ہاتھیوں پر سے قیمتی مال اسباب اتار کر اونٹوں اور خچروں پر لاد دیا۔ عورتوں کے زیور بھی اتار لیے۔ آپس میں دست و گریباں ہوگئے، جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے کر فرار ہوگیا۔ کوئی اونٹ کی نکیل پکڑ کر لے گیا تو کوئی خچر کو ہانکتا ہوا نکل گیا۔ جو خواجہ سرا ساتھ تھے ان لٹیروں کو روک نہ سکے۔
بدقسمت دارا شکوہ لٹا لٹایا بے سروسامان احمد آباد کے نواح میں پہنچا۔ اس سے پہلے اس کی شکست کی خبر پہنچ چکی تھی۔ یہ بھی خبریں گرم تھیں کہ دارا کے تعاقب میں شاہی فوجیں روانہ ہو چکی ہیں۔ خالی ہڈی کو کتا بھی نہیں چچوڑتا۔ نہ لشکر ساتھ تھا نہ مال و اسباب کون اس کے استقبال کو نکلتا۔ شہر کے دروازے پر پہنچا تو اورنگ زیب کے نام کے نقارے بج رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تصویر حسرت و یاس بنا فصیلوں کو تکتا رہا۔ ایک جھرجھری سی لی اور گردن کو جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ دو کوس چل کر ''پرگنہ کری'' میں چلا گیا۔ یہاں ایک مشہور راہزن کانجی کولی نامی تھا۔ اتنا طاقتور تھا کہ اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ وقت ایسا تھا کہ کوئی اس کی مدد کو نہ آتا تھا۔ اس نے اس راہزن کو بتایا کہ وہ کون ہے اور مدد کی درخواست کی۔
''مہاراج، میں یہ تو نہیں کرسکتا کہ تمہارے لیے اورنگ زیب سے ٹکرلوں۔ ہاں اتنا ہے کہ جب تک آپ میرے پاس ہیں کوئی آپ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ سرکاری فوجیں بھی آجائیں تو تمہیں تلاش نہیں کرسکتیں۔ میرے پاس چھپنے کی بہت سی جگہیں ہیں۔''
''میں اقتدار میں آگیا تو تمہیں مالا مال کردوں گا۔''
''میں راہزن ہوں راجا مہاراجا نہیں جو لالچ میں آکر کوئی کام کرتے ہیں۔ میں تو جنگل میں رہتا ہوں۔ میرے ساتھ جنگل میں رہیے۔ جب اقتدار مل جائے تو اپنے گھر سدھاریے۔''
''بس کچھ دن مجھے اپنے پاس رکھ لو۔ جب خطرہ ٹل جائے گا تو میں کسی طرف نکل جاؤں گا۔''
کانجی کولی اس کا رفیق بن گیا۔ اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دارا اس دوران سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ کس طرف جانا ہے۔ اسے علاقہ ''کچھ'' کا زمیندار یاد آیا۔ جب وہ بھکر سے احمد آباد آیا تھا اس زمیندار نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی تھی اور بطور پیشکش آئندہ کی توقعات پر اپنی لڑکی کو بھی سپہر شکوہ سے نامزد کر دیا تھا۔ دارا نے کانجی سے کہا وہ اسے علاقہ کچھ تک پہنچا دے۔ کانجی نے

ہامی بھرلی۔ اپنے گروہ کو ساتھ لیا اور اسے ''کچھ'' کی سرحد پر پہنچا دیا۔ خود واپس آگیا۔
دارا اس زعم میں تھا کہ زمیندار اس کا نام سنتے ہی دوڑا چلا آئے گا اور پہلے کی طرح آؤ بھگت کرے گا۔ اس نے اپنے ایک ملازم کو زمیندار کے پاس بھیجا۔ زمیندار نے صاف آنکھیں پھیر لیں۔ ملنا تو بڑی بات پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ دارا کے ملازم سے صاف کہہ دیا کہ وہ دارا سے کبھی ملا ہی نہیں اور نہ کبھی اسے مہمان ٹھہرایا تھا۔ انسانیت کے ناتے مدد کرسکتا تھا لیکن وہ اورنگ زیب کے فراری کی مدد کرکے اورنگ زیب سے دشمنی مول نہیں لے سکتا۔
دارا شکوہ کو اس جواب کی توقع نہیں تھی لیکن ملازم کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ دو تین دن تک زمیندار کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا آخر مایوس ہو کر ''بھکر'' کی طرف روانہ ہوگیا۔
جب وہ سندھ کی حدود میں داخل ہوا تو فیروز میواتی جو اب تک اس کا ساتھ دیتا رہا تھا، صحراؤں کی خاک چھانتا رہا تھا، اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ یہ صدمہ دارا کے لیے کم نہ تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ ''جاد پان'' کی ولایت میں داخل ہوگیا۔ ابھی کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ جنگلی قبائل نے اس کا راستہ روک لیا اور اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ ان قبائل کے لیے اکیلا دارا شکوہ کافی تھا۔ اس کے ساتھ خواجہ سرا بھی تھے۔ شہزادہ ان قبائل سے لڑتا بھڑتا مکشیوں کی ولایت میں پہنچ گیا۔ مکشیوں کے سردار مرزا مکشی نے اس کا استقبال کیا اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔
''شہزادۂ عالم، آپ مجھ پر بھاری نہیں ہیں لیکن آپ کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ شاہی فوجیں برابر آپ کا پیچھا کرتی رہیں گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ایران چلے جائیں۔ وہاں اپنی طاقت جمع کریں اور ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ شہنشاہ ہمایوں کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ میں خود رہنمائی کے لیے بدرقہ کے طور پر آپ کے ساتھ رہوں گا۔'' شہزادے نے اس وقت رضامندی کا اظہار کر دیا۔ سردار مرزا نے اسے قندھار تک پہنچا دیا۔
شہزادہ ابھی تک کھوئے ہوئے تخت و تاج کو واپس لینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دانش مند ہونے کے باوجود جلد بازی سے کام لیا۔ ایران جانے اور تیاری کے ساتھ واپس آنے کے مشورے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور ایران جانے کے بجائے داور یاد ہاتدر کے زمیندار ملک جیون کو یاد کیا۔ اسے وہ احسان یاد تھا جو اس نے کبھی ملک جیون پر کیا تھا۔ جیون وہ شخص تھا جو کسی سنگین جرم میں ماخوذ ہوا تھا اور شاہجہاں نے اسے ہاتھی کے پیروں کے نیچے ڈال دینے کا حکم صادر کیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں دارا شکوہ نے اس کی سفارش کی تھی اور اس کی جان بچ گئی تھی۔ جان کا بدلہ جان ہوتا ہے۔ اس وقت دارا شکوہ کی بھی جان کا مسئلہ تھا۔ دارا نے قاصد بھیج کر اپنی آمد کی اطلاع بھیجی۔ ملک جیون نے ایسی بہادری کا مظاہرہ کیا کہ شہزادے کی پذیرائی کے لیے اپنی گڑھی سے پاپیادہ چل کر آیا۔ گھر لے جاکر ٹھہرایا اور دن رات خدمت گزاری میں لگ گیا۔
دارا شکوہ کی بیوی نادرہ بیگم جو سلیمان شکوہ کی ماں تھی اور دارا کے ساتھ صحرا صحرا بھٹکتے بھٹکتے تھک چکی تھی۔ ایک طرف بیٹے کی جدائی کا صدمہ تھا جو اسے رلاتا رہتا تھا دوسری طرف عزیز شوہر کی پریشانیاں تھیں۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی شہزادی نے یہ دن کاہے کو دیکھے ہوں گے۔ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ ملک جیون کے پاس آکر اسے آرام ملا تھا لیکن شاید اب وہ کسی آرام کی متحمل نہیں رہ گئی تھی۔ داور آتے ہی بیمار پڑگئی اور دو چار دن ہی میں چٹ پٹ ہوگئی۔
اس رات کو دارا شکوہ گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ صبح وہ نہیں رہے گی۔ بڑے پیار سے پچھلے دنوں کے عیش و آرام کا تذکرہ کرتی رہی تھی اور اچھے مستقبل کے خواب دکھا رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ سلیمان شکوہ کا ذکر تک زبان پر نہیں لائی تھی جبکہ اٹھتے بیٹھتے سلیمان شکوہ کا نام اس کے ہونٹوں پر رہتا تھا۔ شاید وہ اب مایوس ہو چکی تھی۔ یہی مایوسی اس کی موت کا سبب بن گئی۔ اس نے سوچا ہوگا وہ کس کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندہ رہے۔ صبح ہوئی تو گھر میں ماتم نے سفید چاندنی بچھا دی۔ دارا شکوہ اب تک ٹوٹا تھا بیگم کی موت کا سن کر بکھر گیا۔ جتنے آنسو تھے سب بہا دیے پھر بھی چین نہ آیا تو سات خواجہ سراؤں کو طلب کیا۔

''دیکھو، یہ میری وہ امانت ہے جس کی میں حفاظت نہ کر سکا۔ اب تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اس امانت کو لاہور لے کر جاؤ اور حضرت شیخ میر کے مقبرے میں دفن کرو۔ کبھی لوٹ کر آنا ہوا تو ہم فاتحہ کے لیے لاہور ضرور جائیں گے۔''

جنازہ روانہ ہوا۔ دارا کو محسوس ہوا اب ہندوستان میں اس کے لیے کچھ نہیں رہ گیا۔ خشک آنکھوں سے اس نے ملک جیون کی طرف دیکھا۔

''ملک جیون! یہاں سے ایران کتنی دور ہے؟''

''صاحب عالم! یہ جو پہاڑ نظر آ رہے ہیں بس یہیں سے ایران شروع ہو جاتا ہے۔''

''کیا تم ہماری رہبری کے لیے ساتھ چلو گے؟''

''جیون تو آپ کا غلام ہے دنیا کے آخری کونے تک ساتھ چلے گا۔''

''سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہم نادرہ بیگم کے ساتھ نہ جا سکے تو تم ہمارے ساتھ کیا چلو گے۔''

''وقت آیا تو آپ خود دیکھ لیں گے۔''

''وقت کا کیا ہے۔ کل ہم ایران کے لیے عازم سفر ہوں گے۔''

''جیون آپ کے ساتھ ہوگا اور اس کے مسلح سوار بھی۔''

داور کی زمین پر صبح کا سورج طلوع ہوا تو دارا نے رکاب میں پاؤں دھرا۔ سپہر شکوہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔

ملک جیون نے اسے ایران تک پہنچانے کی ہامی بھر لی تھی لیکن دل ہی دل میں اسے گرفتار کر لینے کی فکر میں تھا۔ اورنگ زیب کو خوش کرنے اور مناصب کی ترقی کے لالچ میں وہ ان احسانات کو بھول گیا جو دارا شکوہ نے اس پر کیے تھے۔ اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے مسلح آدمیوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک گروہ سپہر شکوہ کو اپنے حصار میں لے کر چلنے لگا اور اتنی سست روی سے چلا کہ وہ دارا شکوہ سے دور ہو جائے۔ دوسرا گروہ دارا شکوہ کے ساتھ ساتھ تھا۔

ملک جیون دارا کے ہمراہ اسے باتوں میں لگائے چل رہا تھا۔ ملک جیون نے اچانک گھوڑا پھیرا اور دارا سے الگ ہو گیا۔ دارا اس کی اس حرکت پر چونکا ضرور تھا لیکن شک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ تعجب تو اسے اس وقت ہوا جب اس کے ساتھ چلنے والے مسلح افراد نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دارا شکوہ نے گھبرا کر اپنی تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ ایک فولادی ہاتھ نے اس کی کلائی تھام لی۔ دوسرے ہاتھ نے کمر سے اس کی تلوار نکال لی۔ اب وہ غیر مسلح تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا کہ شاید فرار کی کوئی راہ نکل آئے۔ دیکھا تو کچھ فاصلے پر ملک جیون کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''مجھے ملک جیون کے پاس لے کر چلو۔'' اس نے مسلح افراد سے کہا۔

''اسی کے پاس تو چلنا ہے۔ چلیے۔''

دارا نے گھوڑا پھیرنا چاہا۔ بدمعاشوں میں سے ایک نے اسے ٹوکا۔

''ملک جیون کے پاس گھوڑے پر بیٹھ کر جانا گستاخی ہے۔ نیچے تشریف لے آئیے۔''

''وہ ہماری رعایا ہے۔''

''کبھی تھا۔'' ایک ساتھ کئی قہقہے بلند ہوئے اور دارا کو گھوڑے سے اترنا پڑا۔ تلواروں کے جلوس میں اسے ملک جیون کے پاس پہنچا دیا گیا۔

''جیون! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔''

''یہی کہ آپ گرفتار ہو چکے ہیں۔ سپہر شکوہ کچھ دیر میں آتا ہی ہوگا۔''

''یہ مت بھولو کہ شاہجہاں بادشاہ ابھی زندہ ہیں اور سپہر ان کا پوتا ہے۔''

''وہ زندہ ہیں لیکن مردہ بدست زندہ ہیں۔ حکم تو عالمگیر کا چلتا ہے۔''

''سپہر اورنگ زیب کا بھتیجا بھی تو ہے۔''

''یوں تو آپ بھی بھائی ہیں۔ مراد بھی بھائی ہے جو قید میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔''

''یہ ہماری آپس کی لڑائی ہے۔ ہمیں لڑنے دو۔''

''یہ بات اورنگ زیب سے کہنا جو آپ کے سامنے ہمیں انعام و اکرام سے نوازے گا۔''

''اگر تمہیں انعام چاہیے تو صبر کرو۔ ہمارا وقت آنے دو۔ ہم تمہیں اتنا نوازیں گے کہ تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔''

''صبر کا یارا کسے ہے۔ انعام تو ہمیں ابھی چاہیے۔''

ملک جیون نے کہا اور اپنے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

''صاحب عالم جتنے زیورات پہنے ہوئے ہیں سب اتار لو۔''

یہ سننا تھا کہ تیموری لہو نے جوش مارا۔ کمر میں ایک چھوٹی تلوار بندھی ہوئی تھی اسے نکالا۔ چاہتا تھا کہ اپنے پیٹ میں اتار لے لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں ہی رک گیا۔ فولادی پنجوں نے اسے مرنے نہیں دیا۔

''اوہو۔ غیرت ابھی زندہ ہے۔ صاحب عالم کو رسیوں میں جکڑ لو۔''

''جیون، کیا تجھے یاد نہیں کہ میں نے تجھ پر احسان کیا تھا۔ تیری جان بچائی تھی۔''

''مجھے سب یاد ہے۔ میں بھی کوشش کروں گا کہ آپ کو مرنے نہ دوں۔''

دارا شکوہ ابھی کچھ اور کہنے والا تھا کہ گرفتار کرنے والے سپہر شکوہ کو بھی لے آئے۔ اس کی حالت دارا سے بھی بری تھی۔ اسے گھوڑے کی پیٹھ سے باندھ دیا گیا تھا۔

دارا کی مجبور آنکھوں کے سامنے اس کا بچا کھچا سامان لوٹا جا رہا تھا۔ نادرہ بیگم کے انتقال کے بعد دوسرا موقع تھا جب سپہر شکوہ کی حالت دیکھ کر دارا کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔

دونوں باپ بیٹے کو رسیوں اور زنجیروں سے جکڑ کر انہیں پہلے سے طے شدہ مقام پر قید کر دیا گیا۔

راجا جے سنگھ اور بہادر خاں دارا کے تعاقب میں اجمیر سے چلے تھے اور اب سندھ کی سرزمین میں داخل ہو چکے تھے۔ دارا اس طرح غائب ہوا تھا کہ سراغ تو کیا ملتا سراغ دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ دونوں اپنے لشکر لیے مارے مارے پھر رہے تھے۔ سندھ میں آ کر انہیں صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ شہزادہ ایران کی سرحد کے قریب دیکھا گیا ہے۔ ایران یا قندھار پہنچنے کے بعد اسے گرفتار کرنا مشکل تھا۔ دونوں نے مشورہ کیا کہ اب دارا کی تلاش فضول ہے۔ واپس چلا جائے۔ ممکن تھا کہ عقاب اپنے شکار کو چھوڑ کر اڑ جاتا کہ ملک جیون کا قاصد آن پہنچا۔ ایران گویا ہندوستان میں سمٹ آیا۔ دونوں عقاب اڑے اور ملک جیون کے پاس پہنچ گئے۔

دارا کے جسم پر پسینے میں تربتر سوتی کپڑے تھے جو میلے ہو چکے تھے۔ سر پر عمامہ تھا لیکن اس میں سرپیچ تھا نہ جیغہ نہ کلغی۔ دیکھنے میں شہزادہ کم کسان زیادہ لگتا تھا۔ خط کئی دن سے نہیں بنا تھا۔ ڈاڑھی کے بال منتشر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ سپہر شکوہ کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ رنگ ہلدی سے زیادہ زرد ہو رہا تھا۔

راجا جے سنگھ پر نظر پڑتے ہی دارا کی آنکھیں سرخ ہو گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے ندامت سے گردن جھک گئی۔ کل تک جو کورنش کے لیے اس کے آگے جھک جاتا تھا آج اسے گرفتار کرنے آیا تھا۔

شتر سوار تیار کھڑا تھا۔ بہادر خاں نے اورنگ زیب کے نام لکھا گیا خط اس کے حوالے کیا۔ اس خط میں دارا کی گرفتاری کی اطلاع دی گئی تھی۔

شتر سوار شاہجہاں آباد کی طرف دوڑ گیا۔

شاہجہاں آباد میں اورنگ زیب عالمگیر کا جشن جلوس منعقد ہو رہا تھا۔ اس جشن کی خصوصیت یہ تھی کہ اکبر آباد سے تخت طاؤس منگوا لیا گیا تھا۔ تخت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے اشرفیوں کا پہاڑ ضرورت مندوں میں لٹا دیا گیا۔ حاضرین نے عمر درازی کی دعائیں کیں۔ نذریں وصول کی جا رہی تھیں کہ ملک جیون کے پاس سے آنے والے شتر سوار نے شاہجہاں آباد میں قدم رکھا۔

میر عدل بادشاہ کے بالکل نزدیک پہنچے۔

''راجا جے سنگھ اور بہادر خاں کوکلتاش کا رقعہ پہنچا ہے۔ داور کے زمیندار ملک جیون کی کوششوں سے باغی شہزادے کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔''

اورنگ زیب نے سپاٹ چہرے سے میر عدل کی طرف دیکھا۔ اتنی بڑی خبر سن کر بھی اس کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ دراصل وہ ابھی اس خبر کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔

میر عدل کو ابرو کے اشارے سے دور ہونے کو کہا اور نذریں وصول کرنے میں مشغول ہو گیا۔

تین گھڑی بعد اورنگ زیب تخت طاؤس سے غروب ہوا اور دیوان خاص میں طلوع ہوا۔ یہاں اس کے محرمان خاص جمع تھے۔ ان پر اس راز کو ظاہر کرنے میں اس نے کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

''آپ لوگ اپنی اپنی رائے سے آگاہ کریں کہ اس بدبخت (دارا) کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔''

جب کئی لوگ اپنی اپنی رائے سے آگاہ کر چکے تو عالمگیر نے اپنے مقرب خاص دانش مند خاں سے پوچھا۔ یہ امیر ذہانت میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔ اپنی اسی صفت کی بدولت شاہجہانی سرکار سے اسے دانش مند خاں کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اورنگ زیب کو بہت پسند کرتا تھا اور دارا کے خلاف تھا۔ اس مخالفت کے باوجود اس نے نہایت صائب رائے کا اظہار کیا۔

''سلطنت پر آپ کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے۔ کسی دشمن کو سر اٹھانے کی جرأت نہیں۔ باغی شہزادہ اب بہت ٹھوکریں کھا چکا۔ اس کے دماغ سے شاہی کا خناس نکل گیا ہوگا۔ اس لیے اب اسے قتل کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میری رائے میں اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔ قضا

WWW.PAKSOCIETY.COM

خود اسے تلاش کرلے گی۔"
اورنگ زیب نے یہ جواب سن تو لیا لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دانش مند خاں سے متفق نہیں۔ خوشامدی امرا نے اس کے چہرے کو پڑھ لیا۔ ایک امیر نے اسے خوش کرنے کے لیے رائے دی۔

"حضور، میری رائے میں شہزادے کو زندہ رکھنا خلافِ مصلحت ہے۔ اس ملک میں جب بھی کوئی فتنہ سر اٹھائے گا فتنہ ساز شہزادے کو سپر بنائیں گے۔ جب تک وہ زندہ رہے گا اس کے طرفدار چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

ایک دوسرے امیر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اس بندۂ ناچیز کی رائے بھی یہی ہے۔ فتنہ کچلنے سے بہتر ہے فتنہ پیدا ہی نہ ہونے دیا جائے۔" اورنگ زیب نے دربار برخواست کیا۔

نقیبوں نے اس کی آمد کا شور مچایا اور وہ حرم سرا میں داخل ہوا۔ بیگمات شاہی مبارک باد کے لیے حاضر ہوئیں۔ اورنگ زیب نے یہاں بھی اپنا سوال دراز کیا۔

"باغی شہزادے کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"

"اسے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ اس کی زندگی سازشیوں کو آپ کے خلاف جال بننے کا موقع دے گی۔ سازشیں تلواروں کو زنگ آلود کردیتی ہیں۔"

اس مشورے نے اورنگ زیب کو مطمئن کردیا۔ اب تک اکثریت کی رائے یہی تھی کہ دارا کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ ان مشوروں کی ضرورت بھی اسے اس لیے پیش آئی تھی کہ معاملہ بھائی کا تھا اور وہ اپنے اس فعل کے لیے جواز ....تلاش کررہا تھا۔

اورنگ زیب نے ملک جیون کے پاس خلعت، فرمان اور ہزاری دوسو سوار کے منصب کا پروانہ روانہ کیا اور بہادر خاں کو حکم دیا کہ وہ قیدی کو شاہجہاں آباد پہنچانے کا بندوبست کرے۔

ملک جیون نے دارا کی رسوائی کا پوری طرح بندوبست کیا تھا۔ اس کی شان اور مرتبے کا مطلق خیال نہ رکھا۔ ایک میلی کچیلی ہتھنی بٹھادی گئی جس پر کھجور کی چھال کے گدے رکھے تھے۔ سب سے پہلے دارا کو سوار کرایا گیا۔ اس کے آگے سپہر شکوہ کو بٹھایا گیا اور پیچھے ایک سپاہی ننگی تلوار لے کر بیٹھ گیا۔ بہادر خاں اور راجا جے چند اپنے سجے سجائے ہاتھیوں پر روانہ ہوئے۔

داراشکوہ اپنی حالت زار پر افسردہ ضرور تھا لیکن اسے اب بھی امید تھی کہ یہ تکلیف عارضی ہے۔ عالمگیر اس کا بھائی ہے۔ دیکھتے ہی لہو جوش مارے گا۔ قید میں بھی رکھے گا تو آرام و آسائش کو پاس سے ہٹنے نہیں دے گا۔

حلیہ پہلے ہی خراب تھا شاہجہاں آباد پہنچتے پہنچتے چہرے کا رنگ سیاہ ہوگیا۔ کوئی دیکھتا تو پہچاننا مشکل ہوتا کہ یہی داراشکوہ ہے۔

حکم شاہی ہوا کہ باپ بیٹے دونوں کو اسی طرح ہاتھی کی عماری میں بٹھائے ہوئے لاہوری دروازے سے دارالخلافہ دہلی میں داخل کریں اور چاندنی چوک، بازار سعد اللہ خاں اور قلعہ ارک کے نیچے سے گزارتے ہوئے لوگوں میں ان کی تشہیر کریں۔ پھر پرانی دلی سے خضر آباد میں لے جاکر خواص پورہ کی عمارت میں مقید کردیں۔

یہ بدقسمت جلوس سڑکوں پر سے گزرا تو سڑکیں اور چھتیں انسانوں سے بھر گئیں۔ ہر شخص اسے دیکھتا تھا اور ان غداروں پر لعنت بھیجتا تھا جن کی غداری سے وہ گرفتار ہوا تھا۔

ملک جیون کا نام ہر زبان پر تھا۔

جب اس طرح اسے گھمایا گیا تو آخری امید بھی ختم ہوگئی۔ یہ امید تھی کہ اورنگ زیب ماں جایا ہے۔ مارے گا بھی تو چھاؤں میں ڈالے گا لیکن اس تشہیر نے اسے یقین دلادیا کہ انجام اچھا نہیں۔

"بیٹا سپہر!"

"جی بابا۔"

"ہم تمہارے گناہ گار ہیں۔ کاش ہم تمہیں اپنے ہاتھوں مار ڈالتے۔ اس رسوائی سے یہ صدمہ کم ہوتا کہ ہم نے اپنا بیٹا کھودیا۔ آخر سلیمان کی گمشدگی کا صدمہ بھی ہم جھیل ہی رہے ہیں۔"

"بابا جانی، مجھ سے بھی آپ کا دکھ دیکھا نہیں جاتا لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔"

داراشکوہ شاہجہاں آباد کی صرف زمین دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک آنکھیں نہیں اٹھائی تھیں کہ آسمان نظر آتا۔ عوام کی طرف سے ہونے والی آہ وزاری کی آوازیں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر اپنے گریبان پر ہاتھ ڈالا کہ مالا مروارید اتار کر عوام کی طرف اچھال دے لیکن وہاں تھا کیا بوسیدہ کرتے کی دھجیاں ہاتھ میں آگئیں۔

"بھائی کیا ہماری سواری لال قلعہ سے گزر رہی ہے؟"

"ہاں۔"

"کچھ دیر کو یہاں ٹھہر جاؤ، میں جی بھر کے لال قلعہ دیکھ لوں۔"

پیچھے بیٹھے ہوئے سپاہی نے اسے ڈپٹ دیا۔ "قیدی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی فرمائش پوری نہیں کی جاسکتی۔"

دارا نے پہلی مرتبہ آنکھیں اٹھائیں۔ اس کے سامنے سے لال قلعہ گزر رہا تھا یا وہ قلعے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

حکم کے مطابق دارا کو خواص پورہ کے محل میں لے جایا گیا۔ پھاٹکوں، برجوں اور فصیلوں پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دارا کے پہنچنے کے بعد معتبر امیروں کی رکاب میں پہرا کھڑا کردیا گیا۔

ملک جیون کو "بخت یار خاں" کا خطاب ملا تھا۔ اس کی وصولی کے لیے وہ دوسرے دن دہلی میں داخل ہوا۔ لوگ ایک دن پہلے داراشکوہ کی تذلیل دیکھ چکے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ ملک جیون کی غداری نے دارا کو اس حال تک پہنچایا ہے۔ وہ غدار اب اس شان سے دہلی میں داخل ہورہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی غضب کی چنگاریوں نے شعلوں کی صورت اختیار کرلی۔ لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے اور بلند آوازوں سے ملک جیون کی طرف گالیاں اچھالنے لگے اور پھر سنگ باری شروع کردی۔ ملک جیون کے کئی ساتھی زخمی اور ہلاک ہوگئے۔ اس کے ساتھیوں نے اسے بڑی مشکل سے بچایا اور غضب ناک مجمع سے نجات دلا کر بادشاہ کے حضور بھیج دیا۔

کوتوال شہر گھوڑے پر سوار سپاہیوں کے ساتھ پہنچا تو سارا شہر فساد کا منظر پیش کررہا تھا۔ نجاست کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جو کوٹھوں پر چڑھی عورتوں نے ملک جیون اور اس کے ساتھیوں پر پھینکی تھی۔ سپاہی ادھر ادھر پھیل گئے اور بلوائیوں کو قابو میں کیا۔ کئی لوگوں کو گرفتار کیا باقی گھروں میں چھپ گئے اور یوں یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔ اگر کوتوال بروقت نہ پہنچتا تو یہ فساد شہر کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل جاتا اور پھر اس پر قابو پانا مشکل ہوجاتا۔

"رعایا اب اتنی خودسر ہوگئی ہے کہ ہمارے مہمان سے بھی گستاخیاں کرتی ہے۔" اورنگ زیب نے تخت طاؤس پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"حضور یہ سب داراشکوہ کے حامیوں کی کارستانی ہے ورنہ عام لوگ تو اب بھی حضور کا دم بھرتے ہیں۔" نواب خلیل اللہ خاں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر کہا۔

"تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ عوام کا غصہ نہیں تھا بلکہ کسی سازش کا حصہ تھا۔"

"غلام کا یہی خیال ہے۔"

"کوتوال شہر کو حکم دیا جائے کہ وہ تفتیش کرے اور مجرم کو ہمارے حضور پیش کرے۔"

تصویرِ کائنات

دو عورتوں کو چھ ماہ سزا ہوئی۔ انہیں ایک ہی کوٹھڑی میں رکھا گیا وہ مسلسل چھ ماہ تک باتیں کرتی رہیں۔ جب جیل سے رہائی ہوئی اور باہر نکلیں تو ایک نے دوسری سے کہا۔ "آؤ بہن اس درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر باتیں کریں آج تو ہمیں بچھڑنا ہے۔"

☆☆☆

عورتوں میں بڑی خرابی یہ ہے کہ جب بھی مل کر بیٹھتی ہیں۔ تو ہر اس عورت کی برائی کرتی ہیں جو وہاں موجود نہ ہوں۔ اس برعکس مردوں میں بڑی خوبی یہ ہے کہ جب بھی مل کر بیٹھیں تو ہر اس عورت کی تعریف کرتے ہیں جو ان کی بیوی نہ ہو۔

☆☆☆

میاں بیوی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ "میں جاکر دیکھتا ہوں، خاوند باہر کی طرف لپکا اور دروازے کے اندر سے پوچھا......کون......؟"

دروازے کے دوسری طرف سے آواز آئی۔

"عزرائیل"

خاوند الٹے قدموں سے واپس آگیا۔

"بیگم وہ تمہیں بلارہے ہیں۔"

☆☆☆

بیوی شوہر سے۔ "دوپہر کو فون پر آپ نے ملازمہ سے نجانے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ کام چھوڑ کر ہی چلی گئی۔"

شوہر۔ "ارے باپ رے باپ میں تو سمجھا تھا کہ ٹیلی فون پر تم ہو۔"

بابر عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں

دوسرے دن کوتوال نے اس فساد کے سرغنوں کا پتا چلایا تو معلوم ہوا کہ اس سارے ہنگامے کا بانی ہیبت خاں احدی تھا۔

ہیبت خاں پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ کوتوال نے اس خطرے میں ہاتھ ڈالنے سے بہتر یہ سمجھا کہ بادشاہ کا فرمان حاصل کرلیا جائے۔

اس نے اپنی تفتیش کا لب لباب میر عدل تک پہنچا دیا۔ میر عدل نے بادشاہ کے گوش گزار کیا۔

"اگر غداروں کو بروقت سزا نہیں دی گئی تو حضور کی سلطنت میں ایسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔"

عالمگیر کا زبانی فرمان جاری ہوا۔ "ہیبت خاں کو ایسی سزا دی جائے کہ نہ صرف عوام کو عبرت ہو بلکہ دوسرے غداروں پر مابدولت کی ہیبت طاری ہوجائے اور پھر کسی کو جرأت نہ ہو۔"

اب یہ معلوم نہیں کہ سزا کی نوعیت نواب خلیل اللہ خاں کی تجویز کردہ تھی یا کوتوال شہر نے اپنی سفا کی کا مظاہرہ کیا۔

ہیبت خاں کو گرفتار کیا گیا اور اسی روز اسے ایک میدان میں لے جایا گیا جہاں ایک گڑھا پہلے سے کھود دیا گیا تھا۔

عوام میں شور تھا کہ ہیبت خاں کو پھانسی دی جائے گی یا اس کا سر قلم کیا جائے گا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ محض کوڑے برسائے جائیں۔ من چلے نوجوان اس منظر کو دیکھنے کے لیے اس میدان کا رخ کرنے لگے۔ اس مجمع کو قابو کرنے کے لیے کوتوال شہر اور لاتعداد سپاہی پہلے سے موجود تھے۔ اس مجمع کو روکنا مقصود نہیں تھا بلکہ پولیس کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ کوئی ہنگامہ برپا نہ ہو۔

"یہاں کوئی پھانسی گھاٹ تو نظر آ نہیں رہا ہے۔ پھانسی کہاں دی جائے گی۔" کسی آدمی نے برابر کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے جلاد کی تلوار ہیبت خاں کا فیصلہ کرے۔"

"ہاں بھائی بادشاہوں کے پاس بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔"

کہنے والا خاموش ہوگیا۔ مجمع خاموش کھڑا تھا۔ کبھی کبھی کوئی سرگوشی اس خاموشی میں ارتعاش پیدا کرتی تھی اور پھر سناٹا ہوجاتا تھا۔

میدان میں کچھ سپاہی وحشی شکاری کتوں کو لے کر داخل ہوئے تو سب کی آنکھیں اس طرف اٹھ گئیں۔

"یہ کتے کیوں لائے گئے ہیں؟"

"مجمع بے قابو ہوا تو ان کتوں سے کام لیا جائے گا۔"

"اس کام کے لیے سپاہی کیا کم تھے۔ یہ تو کتوں سے بھی زیادہ کتے ہیں۔" کسی نے کہا اور کئی قہقہے بلند ہوگئے لیکن یہ قہقہے اچانک دب بھی گئے۔

ایک چھکڑا میدان میں داخل ہوا جس میں ہیبت خاں بیٹھا تھا۔ گھڑسوار دستے نے اس چھکڑے کو گھیرا ہوا تھا۔

لوگ دور سے دیکھ نہیں سکتے تھے کہ چھکڑے میں کون ہے لیکن جب ہیبت خاں کو اتارا گیا تو لوگوں نے اسے پہچانا اور مکھیوں کی بھن بھناہٹ کی طرح چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی طرف سے ہیبت خاں کے حق میں نعرے بھی بلند ہوئے لیکن سپاہی فوراً اس طرف پہنچے اور خاموشی ہوگئی۔

ہیبت خاں کو اس گڑھے کے قریب لایا گیا جو میدان کے بیچ میں کھودا گیا تھا۔ لوگوں نے پہلی مرتبہ اس گڑھے پر توجہ دی۔

"یہ گڑھا کیوں کھودا گیا ہے۔"

"ہوسکتا ہے ہیبت خاں کو زندہ دفن کیا جارہا ہو۔"

"خدا کی پناہ! کیا اورنگ زیب اتنا ظالم بھی ہوسکتا ہے۔"

"یہ تو حدود شرعی سے بھی تجاوز ہے۔ کسی زندہ انسان کو دفن کرنا کہاں کا انصاف ہے۔"

یہ باتیں درمیان ہی میں رہ گئیں۔ ہیبت خاں کو کئی گرانڈیل حبشیوں نے پکڑا اور گڑھے میں اس طرح اتارا کہ وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔

"یہ کس طرح دفن کیا جارہا ہے۔"

"دیکھتے جاؤ۔"

اس گڑھے میں مٹی ڈالی جانے لگی تو لوگوں کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کے سائے نظر آنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

مٹی بھری جاچکی تھی۔ ہیبت خاں آدھا زمین میں دفن کیا جاچکا تھا۔ اب لوگ بھی سمجھ چکے تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور شاید ہیبت خاں بھی سمجھ گیا تھا۔ وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

کوتوال نے اشارہ کیا اور کتوں کے گلے ان کے پٹوں سے آزاد کردیے گئے۔ انہوں نے بھونکتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور ہیبت خاں کو بھنبھوڑنے لگے۔

یہ ایسا دردناک منظر تھا کہ بہت سے لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ بہت سے لوگ واپس شہر کی طرف بھاگے۔ کچھ نے ہیبت خاں کو بچانے کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ سپاہی حرکت میں آئے اور ان پر کوڑے اور

لاٹھیاں برسائی جانے لگیں۔

کتے اپنا کام کرتے رہے۔ سپاہیوں نے مجمع پر گھوڑے دوڑادیے۔ دیکھتے دیکھتے میدان خالی ہوگیا۔

اس رات دہلی کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلا۔ اس لیے نہیں کہ انہیں ہیبت خاں سے دلی عقیدت تھی بلکہ اس لیے کہ اس سفاکی کا مظاہرہ انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

ہیبت خاں کے واقعے کے بعد ضروری ہوگیا تھا کہ دارا شکوہ کو قتل کردیا جائے ورنہ ایسے واقعات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہیں گے۔ وہ جب تک ہے اس کے طرفداروں کو آس بندھی رہے گی۔ اورنگ زیب کے دربار میں ایسے لوگ موجود تھے جو اورنگ زیب کو دارا کے خلاف بھڑکاتے رہے تھے اور اس کے قتل پر آمادہ کرتے رہے تھے۔ اس میں کچھ شک بھی نہیں کہ دارا جب تک زندہ رہتا سازشیں برپا رہتیں اور ملک کو امن و امان نصیب نہ ہوتا۔ اس لیے عالمگیر کو وہی کرنا پڑا جو اس کے باپ شاہجہاں سے اس کو ترکے میں ملا تھا۔ شاہجہاں نے اپنے بھائیوں داور بخش و شہریار اور حقیقی بھتیجوں کو قتل کرادیا تھا۔ عالمگیر کو بھی اسی قسم کی بھینٹ چڑھانے کا حق تھا۔

تیموری خاندان بلکہ تمام ایشیائی سلطنتوں میں مدعیان سلطنت قید اور نظر بند ہوکر بھی سلطنت کے منصوبوں سے دست بردار نہیں ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ان کے طرفداروں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ یہ گروہ اس وقت تک نچلا نہیں بیٹھتا تھا جب تک نخل آرزو کے تمام رگ و ریشے کٹ نہ جائیں۔

عالمگیر دیکھ چکا تھا کہ دارا شکوہ جب قیدی کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا تھا تو آہوں اور سسکیوں سے بازار گونج رہے تھے (کچھ دارا کے مخالفوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہوگا) اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ہیبت خاں نے فساد برپا کرنے کی کوشش کی لہٰذا مصاحبوں کی یہ رائے اس کے دل میں اتر گئی کہ دارا شکوہ کو قتل کرادیا جائے۔

اس قتل کو اس نے مذہب کا لباس پہنایا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے (دارا شکوہ) حد شرع سے تجاوز کرکے تصوف کو بدنام کیا تھا اور الحاد و کفر کا مرتکب بنا تھا۔

علما سے فتویٰ لے لیا گیا۔

بہادر خاں نے پیش خانہ لگادیا۔ ہزار ہا سوار لشکر گاہ سے نکل کر محل کی طرف حرکت کرنے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے محل کی دیواریں چھپ گئیں فوجی نظر آنے لگے۔ چار چنڈول آکر رکے۔ ان میں کون بیٹھا تھا کون اترا کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی یہی سمجھا کہ شاید دارا شکوہ کو گوالیار لے جایا جارہا ہے اس کے لیے سواریاں آئی ہیں۔

چنڈول سے اترنے والے جب اندر پہنچے تو محل کی دیواروں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ان کے کپڑے سیاہ تھے۔ سروں پر اسی رنگ کی پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان پگڑیوں کے شملوں سے انہوں نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے۔ صرف آنکھیں تھیں جو انگارہ سی چمک رہی تھیں۔

اس کمرے میں ذرا دور ایک چٹائی پر دارا بیٹھا تھا۔ وہی دارا جو نہایت شان و شوکت کا شہزادہ تھا۔ جب اس کی سواری شہر کے بازاروں سے گزرتی تھی تو وہ روپے برساتا ہوا گزرتا تھا۔ شہنشاہ ہند شاہجہاں کا چہیتا تھا لیکن یہ کیا کہ شاہجہاں ابھی زندہ تھا اور دارا کا یہ حال کہ چٹائی پر فقیروں سے بدتر بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو سے لگا ایک لڑکا تھا۔ یہی سپہر شکوہ تھا، شاہجہاں کا پوتا۔

دارا اس لڑکے کے پاس سے ہٹ کر اس میلے سے تکیے پر سر رکھنا چاہتا تھا جو اس کے قریب ہی دھرا تھا کہ کسی کے چلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ شاید دل میں کبھی کا اندیشہ تھا جواب ظاہر ہورہا تھا۔

"چھپ جا سپہر شکوہ کہیں چھپ جا۔ وہ آگئے ہیں۔"

"چھپنے کی کوئی جگہ نہیں بابا۔ اماں کی آغوش تھی وہ بھی نہیں رہی۔"

"مجھے معلوم ہے آنے والے تجھے زندہ رکھیں گے مجھے ماردیں گے۔"

"اس سے پہلے میں انہیں ختم کردوں گا۔" اس نے قریب رکھی پیش قبض اٹھالی جو کسی طرح اس کے ساتھ چلی آئی تھی (چھوٹی تلوار کو پیش قبض کہا جاتا تھا)

برآمدے سے کسی کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔ آواز سے ظاہر ہورہا تھا کہ ان کی تعداد ایک سے زیادہ ہے۔

"خبردار! کوئی نادانی مت کرنا۔ آنے والے سے مجھے بات کرنے دینا۔ ہوسکتا ہے آنے والے پروانۂ رہائی لائے ہوں۔" دارا نے کہا اور سپہر شکوہ کے ہاتھ سے پیش قبض لی اور تکیے کے نیچے رکھ دی۔

آنے والے اچانک سامنے آگئے۔ یہ تعداد میں چھ تھے۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو۔ تم نے مجرموں کی طرح چہرے کیوں چھپائے ہوئے ہیں۔"

"بادشاہ کا حکم ہے......"

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہنے والے نے اتنا ہی کہا تھا کہ دارا نے آواز پہچان لی۔ ”سیف خاں چہرہ کھول دو۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“

سیف خاں نے پگڑی کا شملہ چہرے سے ہٹا دیا۔

”قسم بہ خدا! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی تم میرے سامنے اس حال میں آؤ گے۔“

”میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے کہ اپنوں سے بھی غداری کی جا سکتی ہے۔“

”میں نے اپنے باپ سے وفاداری کی۔“

”میں بھی اپنے بادشاہ سے وفاداری کر رہا ہوں۔“

”میں نے اپنے باپ کی وفاداری میں تلوار اٹھائی تھی بے بس نہتے قیدیوں پر ظلم نہیں کیا تھا۔“

”میں بھی کوئی ظلم نہیں کر رہا ہوں۔ علما نے آپ کے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے۔“

”وہ بھی تمہاری طرح نمک حرام ہوں گے۔“

”اگر یہ طعنہ ہے تو میں تمہارے ہاتھ میں بھی تلوار دیتا ہوں۔“

”میں تمہارا احسان لینا نہیں چاہوں گا۔“ دارا نے کہا اور تکیے کے نیچے رکھی ہوئی پیش قبض نکال لی اور تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہی نادانی وہ کر رہا تھا جس کے لیے سپہر شکوہ کو منع کر چکا تھا۔

پیشہ ور قاتلوں کے سامنے چھوٹی سی پیش قبض کیا کرتی۔ ایک دو ہاتھ ہی چلائے تھے کہ سب نے مل کر اسے گھیر لیا۔ پیش قبض اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ ایک نقاب پوش سپہر شکوہ کی طرف بڑھا۔ دارا ایک مرتبہ پھر طیش میں آ گیا۔

”خبردار! شہزادے کو ہاتھ مت لگانا۔“

”اسے ہم تم سے دور لے جا رہے ہیں تاکہ جو کچھ اب ہونے والا ہے اسے یہ نہ دیکھ سکے۔“

”خدا کے لیے اسے کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ میرے خاندان میں اب یہی ایک لڑکا رہ گیا ہے۔“

دارا چیختا رہا اور وہ نقاب پوش سپہر شکوہ کو لے کر چلا گیا۔ باہر چنڈول کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پر اسے سوار کر دیا گیا لیکن چاروں ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ تھا۔

سپہر شکوہ کو گوالیار لے جایا جا رہا تھا۔ قلعہ گوالیار میں اسے قید ہونا تھا۔

داراشکوہ نے لاتوں اور گھونسوں سے مقابلہ کرنا چاہا لیکن اسے زمین پر گرا دیا گیا اور نذر بیگ نامی ایک غلام نے جو عالمگیر سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ وہ داراشکوہ کا سر کاٹ کر اس کے قدموں میں لے آئے گا، دارا کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔

منصوبے کے تحت محل کے باہر ہاتھی تیار کھڑا تھا۔ اس کی لاش کو ہاتھی کی عماری پر رکھا گیا اور تشہیر کے لیے اس ہاتھی کو چوک اور بازاروں سے گزارا گیا۔

شہر کا گشت کرانے کے بعد اس کے دھڑ کو لاہوری دروازے پر لٹکا دیا گیا اور چاندنی چوک کے چوراہے پر سر آویزاں کر دیا۔

اس کی لاش تین دن تک لٹکی رہی۔ شہریوں کا یہ حال تھا کہ چند لوگوں کے سوا کوئی اس عبرت ناک منظر کو دیکھنے نہیں آیا۔ یہ اورنگ زیب کے عمل کے خلاف ایک خاموش مظاہرہ تھا۔

تین دن بعد اس کے دھڑ اور سر کو اتارا گیا اور مقبرۂ ہمایوں میں لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

⊖⊖⊖

دارا کے لیے اس مقبرے سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی جہاں وہ مسلسل اپنی غلطی کا اعتراف کرتا رہا ہوگا اس غلطی کا جو ہمایوں سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر فرار ہوا تھا تو اس نے ایران جا کر دم لیا تھا۔ وہاں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اطمینان سے بیٹھ کر لشکر جمع کیا اور فاتح بن کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ دارا لاہور، ملتان، احمد آباد، گجرات اور سندھ میں گردش کرتا رہا۔ تعاقب میں فوجیں تھیں۔ وہ فرصت ملی ہی نہیں کہ لشکر جمع کرتا۔ اورنگ زیب کی حکمرانی تھی۔ لوگ اس کے خوف سے دارا کے قریب آتے ہوئے ڈرتے تھے یا عین موقع پر اس کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے جیسا کہ راجا جسونت سنگھ نے اس کے ساتھ کیا۔ کرائے کے سپاہی تو اس طرف جاتے ہیں جہاں معاوضہ زیادہ ملے۔

کاش! داراشکوہ ایران چلا گیا ہوتا۔

ماخذات

مغلیہ دور حکومت، خافی خاں۔ اورنگ زیب عالمگیر، شبلی نعمانی/اوم پرکاش۔
تاریخ شاہجہاں، ڈاکٹر بنارسی پرشاد

برائے کاروبار

کاشف زبیر

رزقِ حلال عین عبادت ہے مگر... صرف باضمیر لوگوں کے لیے... کاروباری لوگ اس لذت سے محروم ہوتے ہیں۔ انہیں تو صرف موسم کے اعتبار سے خود کو بدلنا آتا ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ قدرت کبھی کبھی ان کی زندگی میں ایسا بدلاؤ لے آتی ہے جس کا گمان تک نہیں ہوتا۔ انہوں نے بھی نہ سوچا تھا کہ ایک ذراسی بھول انہیں یوں دربدر کر دے گی۔

زندگی کو کھیل تماشا سمجھنے والوں کا

انوکھا روپ

لاس اینجلس گوسپ کے دفتر میں گہما گہمی تھی، کیونکہ شمارہ جانے کی آخری تاریخ تھی۔ سارہ جیکسن دفتر میں داخل ہوئی تو فریڈ نے اسے دیکھ کر سیٹی بجائی۔ سارہ نے برا سا منہ بنایا۔ ”تم اپنی چھچھوری حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔“

”اگر تم ایسے لباس میں دفتر آؤ گی تو میں سیٹی ضرور بجاؤں گا۔“ فریڈ نے اس کے منی اسکرٹ اور چھوٹی سی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”مجبوری تھی، کل رات میں سلیبرٹیز کے ایک خفیہ کلب کی پارٹی میں شریک ہوئی تھی۔“

فریڈ چونک گیا۔ ”کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

سارہ مسکرائی۔ ”جب میری اسٹوری شائع ہوگی تو پتا چل جائے گا۔“

فریڈ تقریباً ستائیس برس کا، چہرے سے شوخ اور تیز نظر آنے والا نوجوان تھا، وہ بھی سارہ کی طرح رپورٹر تھا۔ سارہ متوسط قامت اور جسامت کی چوبیس سالہ خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی اور وہ اسی کا فائدہ اٹھاتی تھی۔ وہ رات گئے تک پارٹی میں رہی تھی اسی وجہ سے اسے صرف چند گھنٹے سونے کا موقع ملا تھا۔ ابھی وہ اپنی ڈیسک پر بیٹھی بھی نہیں تھی کہ بین نے اپنے کمرے سے جھانکا۔ ”سارہ ذرا ادھر آنا۔“

سارہ کا موڈ آف ہوگیا، اسے معلوم تھا کہ اب کوئی نہ کوئی کام اس کے سر تھوپ دیا جائے گا۔ بین رسالے کا ایڈیٹر اور سارہ کا باس تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں جانے لگی تو فریڈ نے پیچھے سے پھر سیٹی بجائی۔ بین اپنے مانیٹر پر جھکا یوں دیکھ رہا تھا جیسے مانیٹر سے کسی چیز کو کھینچ کر باہر نکال لے گا۔ سارہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”یس باس؟“

”یہ دیکھو۔“ بین نے ایک تصویر اس کے سامنے ڈال دی۔

سارہ نے تصویر اٹھائی اور دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ یہ جنگل اور پہاڑوں کے پس منظر میں ایک اسنومین یا بگ فٹ کی تصویر تھی۔ وہ ایک درخت کے سائے میں کھڑا ہوا تھا لیکن بالکل واضح تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”اسنومین۔“ بین نے ذرا جوش سے کہا۔

”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے، میرا مطلب ہے تمہارے ساتھ یہ واہیات مذاق کس نے کیا ہے؟“

”یہ مذاق نہیں ہے۔ یہ اصلی ہے۔“

”بین، میں تمہیں ایسی دس ہزار تصاویر نیٹ پر دکھا سکتی ہوں جو بالکل اصلی لگتی ہیں لیکن وہ سب جعلسازی سے بنائی ہوئی ہیں۔“

”یہ اصلی ہے کیونکہ ہمارے ایک نامہ نگار نے خود کھینچی ہے اور اب تک اس تصویر کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم ہے۔“

”نامہ نگار بھی جعلسازی کرسکتا ہے۔“

”ڈیئر... ڈیئر تم زیادہ ہی مشکوک ہو رہی ہو۔ میں نے جیف کو تصویر دکھائی ہے۔“ بین نے رسالے کے آئی ٹی کے ماہر کے بارے میں بتایا۔ ”اس کا کہنا ہے تصویر اصلی ہے اور اس میں کوئی جعلسازی نہیں ہے۔“

سارہ نے گہری سانس لی۔ ”اوکے، یہ تصویر اصلی ہے پھر...؟“

”تم اور فریڈ جا کر اس اسنومین کو تلاش کرو۔“

یہ سن کر سارہ اچھل پڑی۔ ”کیا...... ہم تلاش کریں اور اس خطرناک درندے کو... ہرگز نہیں۔“

”اس میں خطرہ نہیں ہے اور پھر تمہارے ساتھ فریڈ بھی ہوگا۔ تمہیں معلوم نہیں ہے، وہ ماہر نشانے باز ہے اور یہاں آنے سے پہلے اس نے امریکی میرین کی ٹریننگ لی تھی مگر اپنی طبیعت کی وجہ سے اسے کمیشن نہیں ملا۔“

سارہ کے لیے یہ انکشاف تھا۔ ”ٹھیک ہے وہ ماہر نشانچی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اسنومین کا شکار کرسکتا ہے۔“

”نہ نہ... شکار نہیں کرنا ہے اسے تلاش کرنا ہے اور اس کی موجودگی کا ثبوت حاصل کرنا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے وہ ثبوت حاصل کرنے کے لیے ہمیں قریب آنے دے گا اور جب ہم اس کے قریب پہنچ جائیں گے تو وہ ہمیں واپس جانے دے گا۔“

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ بین جھنجلا گیا۔ ”اطلاعات کے مطابق بہت سارے دوسرے لوگوں نے بھی اس اسنومین کو دیکھا ہے لیکن اس نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ کئی ٹی وی چینل بھی اپنی ٹیمیں بھیج رہے ہیں۔“

”ٹی وی والے تو ہر چیز کے لیے دوڑ پڑتے ہیں کیونکہ انہیں چوبیس گھنٹے اسکرین پر کچھ نہ کچھ دکھانا ہوتا ہے لیکن تمہارے رسالے کے کل دو سو بیس صفحے ہیں ان کے لیے ہر خبر پر دوڑنا لازمی نہیں ہے۔“

”ہالی ووڈ ٹریش والے بھی اپنے رپورٹر بھیج رہے ہیں۔“ بین نے اصل بات اگل دی۔ ہالی ووڈ ٹریش، لاس اینجلس گوسپ کا حریف رسالہ تھا۔ بین اس معاملے میں شدید جذباتی تھا۔ بہ قول فریڈ کے اگر بین کو معلوم ہو جائے کہ ہالی ووڈ ٹریش والے جہنم جانے کا سوچ رہے ہیں تو بین ان سے پہلے جہنم جانے کے لیے بے چین ہو جائے گا۔ سارہ نے انکار کر دیا۔

”میں نہیں جا رہی کیونکہ میں خفیہ کلب والی اسٹوری نمٹا رہی ہوں۔“

”تم اس پر بھی کام جاری رکھنا اور یہ کام بھی کرلو اس سے تمہیں ڈبل بونس مل جائے گا۔“ بین نے اسے لالچ دیا۔ اس بات نے سارہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا کیونکہ وہ اپنی کار بدلنے کا سوچ رہی تھی، اس کی موجودہ کار بہت گڑبڑ کرنے لگی تھی۔ اس نے سوچا اور سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے لیکن بونس کم سے کم دو ہزار ڈالرز ہو، اس سے کم ہوا تو میری طرف سے معذرت ہے۔“

بین کے چہرے پر شکن آئی لیکن پھر وہ مسکرانے لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مان گیا۔ سارہ باہر آئی اور فریڈ کے سیٹی بجانے سے پہلے اسے خوشخبری سنا دی تھی مگر خلاف توقع وہ بچ بچ خوش ہوگیا۔ ”تمہارے ساتھ میں جہنم میں جانے کو بھی تیار ہوں۔“

”وہاں تم خود جانا۔“

☆☆☆

سارہ نقشے میں دیکھ رہی تھی، اس نے روانہ ہونے سے پہلے اس علاقے کے بارے میں ایک چھوٹی سی گائڈ بک لے لی تھی جس میں تہ کیا ہوا بہت تفصیلی نقشہ بھی تھا۔ اس نے کہا۔ ”سیرا نیواڈا کا علاقہ ایک طویل پہاڑی سلسلہ ہے اور اس میں امریکا کی چند بلند ترین چوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں تین چوٹیاں ایسی ہیں جن کی بلندی چار ہزار میٹرز سے زیادہ ہے۔“

”ہمالیہ میں سو چوٹیاں ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک کی بلندی سات ہزار میٹرز ہے۔“ ڈرائیو کرتے فریڈ نے کہا۔

”میں سیرا نیواڈا کی بات کر رہی ہوں۔ یہ امریکا کے چند مقبول ترین گرمائی تفریحی مقامات میں شامل ہے اور ہر سال لاکھوں سیاح یہاں آتے ہیں۔“

”ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”ہمیں این نانٹنی فائیو سے ذرا دور واقع سیرا نیواڈا ریسورٹس تک جانا ہے، یہاں ہمیں رہائش کی سہولت مل جائے گی۔“

فریڈ نے نقشہ دیکھا اور تشویش سے بولا۔ ”یہ تو بہت بیہودہ سفر ہے، ہمیں لاس ویگاس کی طرف سے گھوم کر جانا پڑے گا۔“

”بالکل...... لیکن یہ اتنا طویل سفر بھی نہیں ہے۔“

”کن خیالوں میں ہو ہمیں ساڑھے چار سو میل کا سفر کرنا ہوگا۔ یعنی ہم رات تک ہی وہاں پہنچ سکیں گے۔“

وہ صبح سویرے لاس اینجلس سے روانہ ہوئے تھے۔ یہ آٹھ گھنٹے کا سفر تھا اور انہیں درمیان میں ایک ایک گھنٹے کے لیے رکنا بھی تھا تاکہ جیپ کے انجن کو ٹھنڈا ہونے کا موقع مل سکے۔ سارہ نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جگہ سطح سمندر سے دو ہزار میٹرز بلند تھی اس لیے وہاں اکتوبر کے وسط میں بھی خاصی سردی ہوتی اور اس سے اوپر تو شاید برف باری کا آغاز بھی ہو گیا ہوتا۔ نامہ نگار ریشمین اینڈی جسے ریش کہا جاتا تھا، اسے یہ اسنومین اکتوبر کی دو تاریخ کو دکھائی دیا تھا۔ سارہ نے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے یہ اصلی اسنومین ہوگا۔“

فریڈ نے شانے اچکائے۔ ”ہو بھی سکتا ہے ورنہ اس معاملے میں اب تک بس سننے میں آیا ہے یا اس کے پیروں کے نشانات ملے ہیں۔“

”فرض کرو ہمارا سامنا اس مخلوق سے ہوگیا تب ہم اپنے بچاؤ کے لیے کیا کریں گے؟“

”میں شاٹ گن لایا ہوں اس کی گولی ہاتھی کا بھیجا بھی اڑا سکتی ہے۔“ فریڈ نے کسی قدر فخر سے کہا۔ ”میں دو سو گز کی دوری سے کوکا کولا کی بوتل اڑا سکتا ہوں۔“

شام کے وقت وہ لاس ویگاس سے گزر کر بلندی کی طرف جانے لگے تب انہیں سردی کا سامنا کرنا پڑا۔ سارہ تیار ہو کر آئی تھی، اس نے اپنے سامان سے جیکٹ اور جینز کی پتلون نکال کر پہن لی۔ فریڈ نے اس پر سرد آہ بھری تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ مختصر لباس میں تھی۔ کچھ دیر بعد تاریکی چھا گئی لیکن جب وہ سیرا نیواڈا ریسورٹس پہنچے تو وہاں خاصی گہما گہمی تھی۔ مختلف ہوٹلوں کے سامنے کاریں کھڑی تھیں۔ بارز اور تفریح گاہوں میں ہونے والا شور باہر تک سنائی دے رہا تھا۔ یہ خاصا بڑا ریسورٹس تھا یہاں ایک درجن کے قریب ہوٹلز اور موٹلز، چار بارز اور ایک نائٹ کلب بھی تھا۔ موسم نہایت سرد تھا اور درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے پاس پہنچا ہوا تھا۔ فریڈ نے بھی گرم لباس پہنا اور سارہ سے کہا۔

”یہاں اس موسم میں بھی خاصا ہجوم ہے۔“

”اس موسم میں یہاں کوئی نہیں آتا لیکن میرا خیال ہے یہ اسنومین کا سن کر آنے والے لوگ ہیں۔“

وہاں درجنوں گاڑیاں کھڑی تھیں یعنی آنے والوں کی تعداد خاصی تھی۔ سارہ اور فریڈ ایک بار میں آئے۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور اس میں مرد اور عورتوں کی تعداد یکساں تھی۔ صرف ایک گھنٹے میں انہیں معلوم ہوگیا کہ ان میں سے بیشتر عام لوگ تھے جو اسنومین کی زیارت کے لیے اس موسم میں یہاں دوڑے آئے تھے۔ بار مین اور ویٹریس بہت خوش تھیں۔ خلاف توقع کمائی جو ہو رہی تھی۔ وہ یقیناً اسنومین کو دعائیں دے رہے ہوں گے۔ سارہ اور فریڈ ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ سارہ نے کہا۔ ”ریش سے رابطہ کرو، ہمیں اس کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔“

فریڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ ہماری مدد نہیں کرسکتا، وہ دمے کا مریض ہے اور یہ مرض اس بلندی پر سرما میں اس کے لیے اذیت ناک ہو جاتا ہے اس لیے وہ نیچے لاس ویگاس چلا گیا ہے۔ بہرحال میری اس سے بات ہوئی تھی اور اس نے مجھے گائڈ کیا ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔“

”کیا یہاں سے مدد نہیں مل سکتی؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مل تو سکتی ہے مگر اس طرح بلاوجہ کے لوگ پیچھے پڑ جائیں گے۔" فریڈ نے کہا۔ "ہمیں خاموشی سے کام کرنا ہے اور اسنومین تک رسائی حاصل کرنی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"بس تم دیکھتی رہنا، یہاں میری میرین کی تربیت کام آئے گی۔"

انہوں نے بار میں ہی کھانا کھایا۔ آف سیزن ہونے کے بعد یہاں سپلائی بند ہو جاتی تھی اس لیے ہر چیز مہنگی ملتی تھی۔ رات گزارنے کے لیے وہ اسنولائٹ موٹل میں آگئے۔ یہ درمیانے سائز کا صاف ستھرا اور خوب صورت موٹل تھا جہاں تمام سہولیات دستیاب تھیں۔ موٹل کے مالکان فیرن اور اس کا گھیم شیم شوہر کلائڈ تھے۔ دونوں میاں بیوی ہنس مکھ اور دوستانہ طبیعت رکھتے تھے۔ فیرن نے سارہ کو بتایا کہ ان کے پاس اب ایک سنگل روم اور ایک ڈبل بیڈ روم تھا۔ سنگل روم کا کرایہ تیس ڈالرز تھا اور ڈبل روم کا پچاس ڈالرز۔ فریڈ نے جلدی سے کہا۔ "ہمیں ڈبل بیڈ والا روم دیدو۔"

جب فیرن نے رجسٹر میں اندراج کر کے چابی فریڈ کی طرف بڑھائی تو سارہ نے کہا۔ "سنگل روم مجھے دیدو۔"

"ہم دونوں ایک ہی کمرے میں ٹھہر سکتے ہیں۔" فریڈ نے کہا۔

"سوری، مجھے اکیلے سونے کی عادت ہے۔" سارہ مسکرائی اور فیرن نے سنگل روم اسے دیدیا۔

"اس کرائے میں ناشتا شامل ہے۔ اگر تم چاہو تو کل شام چار بجے تک یہاں رک سکتے ہو اس کے بعد اگلے دن کا کرایہ چارج ہوگا۔"

وہ جیپ سے اپنا سامان نکال کر کمروں میں لے آئے۔ فریڈ کا موڈ خراب تھا لیکن سارہ جانتی تھی کل تک وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کمرے بہترین اور تمام سہولتوں سے آراستہ تھے۔ گرمائش کا انتظام بھی اچھا تھا۔ سارہ رات سکون سے سوئی۔ صبح وہ موٹل کے ڈائننگ روم میں ناشتا کر رہے تھے تو فریڈ اپنے کھلنڈرے موڈ میں آگیا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی باتوں سے ایسا لگا کہ سب ہی اسنومین کو دیکھنے آئے تھے۔ ایک چوہے جیسی شکل والا شخص کہہ رہا تھا۔ "یہ سب فراڈ ہے، میں اسے ثابت کردوں گا۔"

"یہ فراڈ نہیں ہے۔" ایک صحت مند لڑکی نے کہا۔ "مجھے یقین ہے اسنومین ہوتا ہے۔"

"وہ خاصا خوفناک ہوتا ہے۔" کلائڈ نے اسے ڈرایا۔ "بہتر ہوگا کہ وہ نظر بھی آجائے تو اس سے دور ہی رہا جائے۔"

"میں بس اس کی ایک تصویر لوں گی۔" صحت مند لڑکی نے کہا۔

"لیکن میں صرف تصویر نہیں لوں گا۔" چوہے نما شخص مسکرایا۔

اسی دوران میں مقامی شیرف وہاں آگیا شاید اسے یہاں ہونے والی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تھی۔ اس نے اعلانیہ انداز میں کہا۔ "اس موسم میں پہاڑوں کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے اس لیے ہر فرد اپنی ذمے داری پر جائے گا، کسی اکیلی لڑکی یا خاتون اور اٹھارہ سال سے کم عمر فرد کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"یہ پابندی کیوں؟... یہ کس قانون کے تحت ہے؟... ہم ضرور جائیں گے۔" مختلف احتجاجی آوازوں نے کہا۔

"مجھے اختیار ہے کہ میں لوگوں کے تحفظ کے لیے پابندی لگا سکتا ہوں، اگر کسی کو اعتراض ہے تو عدالت جا سکتا ہے لیکن پہاڑوں پر نہیں جا سکتا۔"

سارہ نے دیکھا وہاں آنے والوں میں نصف لڑکیاں، خواتین یا اٹھارہ سال سے کم عمر افراد تھے اور اب یہ اس طرف نہیں جا سکتے تھے۔ صحت مند لڑکی جو کچھ دیر پہلے چوہے نما شخص سے اختلاف کر رہی تھی۔ اب وہ اس سے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی تھی یقیناً وہ اس سے ساتھ لے جانے کو کہہ رہی تھی کیونکہ وہ اکیلی تھی اور شیرف کی لگائی گئی پابندی کی زد میں آتی تھی۔ سارہ اور فریڈ ناشتا کر کے باہر آئے، فریڈ کچھ چیزیں لینے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ سارہ نے دیکھا کہ لوگ نکل رہے تھے ان میں سے کچھ گاڑیوں میں تھے اور کچھ پیدل ہی جا رہے تھے۔ صحت مند لڑکی اب چوہے نما شخص کے ساتھ تھی وہ اس کی ٹو سیٹر جیپ میں سوار تھی۔ کلائڈ بھی کہیں جا رہا تھا کیونکہ وہ اپنی گاڑی کا بونٹ کھولے کھڑا تھا پھر اس نے بونٹ بند کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر میں فریڈ بھی شانے پر بڑا سا بیگ ٹانگے ہوئے آیا۔ اس نے سارہ سے کہا۔ "اپنے گرم کپڑے اور اضافی سوٹ ساتھ لے لو۔"

وہ چونکی۔ "کیوں؟"

"ہم رات پہاڑوں میں رکیں گے۔" اس نے کہا تو سارہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ جب وہ واپس آئی تو موٹل تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ پہاڑوں کی طرف جانے والے عجلت میں روانہ ہوئے تھے کیونکہ شیرف جا چکا تھا اور لوگوں نے اس کی لگائی پابندی کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ پھر ان سب کو شام سے پہلے واپس آنا تھا، رات کو سردی شدید ہو جاتی اور کھلی فضا میں رہنا بہت مشکل تھا۔ جیپ میں بیٹھ کر فریڈ نے نقشے کا معائنہ کیا اور ایک جگہ انگلی رکھی۔ "ہمیں یہاں جانا ہے۔"

"اسکل ماؤنٹین۔" سارہ نے کہا۔

"ہاں، یہ یہاں سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور اس کی بلندی ڈھائی ہزار میٹرز سے زیادہ ہے۔ شاید یہاں برف پڑی ہو۔ ریش نے اسنومین یہیں دیکھا تھا۔"

"یہاں تک کوئی سڑک نہیں جاتی ہے۔" سارہ نے نقشہ دیکھا۔ "آخری پانچ میل ہمیں کچے راستوں پر سفر کرنا ہوگا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے میری پرنسز ہمیں کسی پہاڑ کی چوٹی پر بھی لے جا سکتی ہے۔" اس نے جیپ کے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارا۔ موسم اچھا تھا اور نکھری ہوئی دھوپ تھی۔ وہ روانہ ہوئے۔ ان کے سامان میں ٹن بند اور دوسری محفوظ رہ جانے والی خوراک تھی اس لیے انہیں کھانے کی پروا نہیں تھی جبکہ دوسرے لوگ لنچ پیک لے کر روانہ ہوئے تھے۔

"مجھے چوہے نما آدمی کے تیور خطرناک لگ رہے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ اسنومین کو شکار کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"ممکن ہے، ویسے اس کے پاس کوئی ہتھیار تو نظر نہیں آیا۔"

"تم نے غور نہیں کیا اس کے پاس شکاری جیپ ہے جو انہی علاقوں میں سفر کے لیے کارآمد ہے۔ اس کے پاس اسلحے کی موجودگی عین ممکن ہے۔"

"اس کی وجہ سے ہمیں مشکل نہ ہو۔"

"ہمارا مقصد اسنومین تک پہنچنا ہے ممکن ہے یہ اس معاملے میں ہماری مدد کر سکے۔"

راستے میں پیدل چلنے والوں کا خاصا ہجوم تھا۔ فریڈ نے کہا۔ "ان میں سے شاید ہی کوئی اسکل ماؤنٹین تک پہنچ سکے کیونکہ راستہ بہت دشوار ہے اور یہ تھک جائیں گے۔"

"تم پہلے یہاں آچکے ہو؟"

"ہاں، بہت پہلے...... جب میں سولہ سال کا تھا۔"

ٹین نے فریڈ کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ اسکل ماؤنٹین کے دامن میں تھے۔ یہ کوئی چوٹی نہیں تھی بلکہ تہ در تہ پہاڑوں پر پھیلا ہوا علاقہ تھا۔ انہوں نے ایک جگہ جیپ روکی تو سارہ نے اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو چوہے نما شخص کی جیپ..."

"ظاہر ہے اسے یہیں آنا تھا۔"

وہاں کچھ گاڑیاں اور بھی تھیں۔ فریڈ نے دور ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو، دریا کے عین اوپر ہے ہمیں وہاں جانا ہے۔"

یہاں سردی زیادہ تھی، انہوں نے جیپ سے اپنا سامان نکالا اور اوپر کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہاں ڈھلان زیادہ تھی مگر سہارے کے لیے جگہ جگہ بلند قامت درخت بھی تھے۔ فریڈ نے ایک جی پی ایس لیا ہوا تھا اور اس کی مدد سے کسی خاص لوکیشن کی طرف جا رہا تھا۔ وہ دوپہر تک اس مقام تک پہنچے تھے اور فریڈ نے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ "ریش نے اسنومین اس کے نیچے دیکھا تھا۔"

سارہ درخت کی طرف آئی اس نے نیچے زمین کا معائنہ کیا تو وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔ فریڈ نے عقب سے کہا۔ "بیکار ہے، یہاں ہر ہفتے بارش ہوتی ہے اس لیے کسی قسم کا نشان باقی نہیں رہا ہوگا۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ دوسرے کئی لوگوں نے بھی اسنومین کو دیکھا ہے؟"

"ممکن ہے لیکن حتمی ثبوت صرف ریش نے حاصل کیا ہے۔"

"آج کے دور میں تصویر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"تم نے درست کہا، ہم اسی لیے تو یہاں ہیں۔" فریڈ نے پشت پر بندھا ہوا بیگ اتارا اور دور ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے ہمیں وہاں پہنچ کر کیمپ کرنا ہوگا۔"

پہاڑی برف سے سفید ہو رہی تھی اور وہاں بلندی بھی تھی اسی لحاظ سے موسم بھی سرد ہوتا۔ "کیا یہ مناسب ہے؟"

"بالکل اسنومین کے بلندیوں پر پائے جانے کا امکان ہوتا ہے نیچے تو وہ کسی عارضی ضرورت کی وجہ سے آتا ہوگا۔ دوسرے جس بلندی پر ہم ہیں یہاں عام افراد موجود ہوں گے، ان کی موجودگی میں کام مشکل ہوگا، اس لیے ہمیں ان سے دور جانا ہوگا۔"

انہوں نے اسی جگہ لنچ کیا اور پھر اوپر کی طرف روانہ ہوگئے۔ شام چار بجے وہ اس پہاڑی تک پہنچ گئے تھے، یہاں چاروں طرف برف تھی کیونکہ یہاں بلندی دو ہزار آٹھ سو پچاس میٹرز تھی۔ یہ نو ہزار تین سو فٹ سے زیادہ کی بلندی تھی اور یہاں جون جولائی میں بھی موسم سرد رہتا تھا۔ اس وقت تو قیامت کی سردی تھی۔ انہوں نے درختوں کے درمیان ایک جگہ کیمپ لگایا۔ فریڈ نے دو چھوٹے سائز کے خیمے نکالے اور انہیں نصب کرنے لگا۔ جیسے جیسے سورج غروب ہو رہا تھا سردی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سارہ نے

ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں آگ جلانی پڑے گی۔“

”ہرگز نہیں، آگ دور سے دکھائی دے گی اور اسنو مین نے دیکھ لیا تو وہ بھاگ جائے گا۔“

”ممکن ہے وہ آگ دیکھ کر انکوائری کے لیے یہاں آجائے اور ہمارا مقصد پورا ہو جائے۔“

فریڈ سوچ میں پڑ گیا۔ ”تجویز اچھی ہے لیکن ہم آگ کہیں اور جلائیں گے۔“

”رات میں سردی سے انتقال ہو جائے گا۔“ سارہ نے جل کر کہا۔

”نہیں ہوگا، ابھی ہم اپنے خیموں میں گھس جائیں گے یہ اندر سے بہت گرم ہوتے ہیں۔ سردی کا پتا بھی نہیں چلے گا۔“

فریڈ بیگ سے آلات نکالنے لگا۔ اس میں رات کو دیکھنے والی دوربین، ایک انفراریڈ ڈی ٹیکٹر تھا۔ جو ایک کلومیٹر کی دوری تک کسی بھی حرارت دینے والے جسم کی نشان دہی کر سکتا تھا۔ ایک گھپ اندھیرے میں تصویر اتارنے والا کیمرا تھا۔ جیسے ہی سورج غروب ہوا اور مکمل تاریکی چھائی فریڈ نے پہلے انفراریڈ آلے کی مدد سے پہاڑی اور اس کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہاں کئی حرارت خارج کرنے والے اجسام تھے لیکن یہ سب چھوٹے موٹے جانوروں کے تھے۔ فریڈ نے کہا۔ ”جسم جتنا بڑا ہوگا اسکرین پر اتنا ہی بڑا دھبا آئے گا۔“

تجربے کے طور پر فریڈ نے آلہ اسے تھمایا اور خود سو گز دور چلا گیا۔ سارہ نے اس کی ہدایت کے مطابق اس کا عکس محفوظ کر لیا تھا۔ واپس آ کر فریڈ نے آلہ لیا۔ ”دیکھو انسان کا دھبا اتنا بڑا ہوگا یعنی اسنو مین کا دھبا اس سے بڑا ہوگا۔“

انہوں نے چھوٹا سا برنر جلا کر اپنے لیے کھانا گرم کیا اور پھر کافی تیار کی۔ سردی شدید ہو گئی تھی اس لیے کافی کے فوراً بعد وہ اپنے خیموں میں گھس گئے۔ فریڈ نے آلہ ساتھ ہی رکھا تھا، اس نے سارہ سے کہا۔ ”اگر رات میں کوئی آواز آئے یا کوئی خیمے میں گھسنے کی کوشش کرے تو تم بلا تکلف چیخ مارنا۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ بولی۔ ”میرا خاموشی سے اسنو مین کے ہاتھ لگنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

مگر اس رات کچھ نہیں ہوا تھا۔ صبح فریڈ نے خیمہ ہلایا تو سارہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ پھر فریڈ کی آواز سن کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ کپڑے اور جوتے پہن کر باہر آئی۔ رات کسی وقت ہلکی سی برف باری ہوئی تھی اور سفوف جیسی برف چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ کیونکہ دن کا وقت تھا اس لیے فریڈ نے الاؤ جلا لیا تھا اور سارہ اس کے پاس آ کر آگ تاپنے لگی۔ اس نے کہا۔ ”یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا؟“

”اتنی آسانی سے ہوگا بھی نہیں... ابھی ہمارے پاس ایک ہفتہ ہے۔“

”ایک ہفتہ۔“ سارہ کی جان نکل گئی۔ ”ہمیں یہاں ایک ہفتہ رکنا پڑے گا؟“

”ہاں، ہم اتنے ہی دن کے لیے آئے ہیں۔“

ناشتا کر کے انہوں نے سامان پیک کیا اور بیگ ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپا دیے۔ وہ دائیں طرف پھیلے ہوئے جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ فریڈ کی گردن میں دوربین جھول رہی تھی جس سے وہ وقفے وقفے سے آس پاس کے علاقوں کا جائزہ لے رہا تھا جنگل ابھی برف سے پاک تھا۔ جنگل کے پاس اونچی چٹانیں تھیں اور ان سے ایک آبشار نیچے گر رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے اس میں پانی کم تھا۔ فریڈ دوربین لگا کر چٹانوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ چونکا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اسنو مین...“

سارہ لپک کر اس کے پاس آئی۔ ”کہاں ہے مجھے بھی دکھاؤ۔“

فریڈ نے اسے دوربین دی۔ ”وہ دیکھو... وہ مینار جیسی نوک والی چٹان کے دائیں طرف...“

سارہ کا جسم سنسنا اٹھا تھا پہلے اس نے ایک سرخی مائل جسم کی جھلک دیکھی پھر اس نے دوربین فوکس کی تو اسے اسنو مین واضح نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک پتھر کے ساتھ موجود تھا۔ وہ بہت جسیم تھا۔ سارہ کا اندازہ تھا کہ اس کا قد کم سے کم سات فٹ تھا۔ بڑا سا سر جس کے نقوش انسانوں جیسے تھے لیکن رخساروں سے لے کر جسم کے ہر حصے پر سرخی مائل سیاہ گھنے بال تھے۔ وہ اس سردی میں بھی آرام سے بیٹھا تھا۔ سارہ ابھی دیکھ رہی تھی کہ اچانک فائر کی آواز آئی اور اسنو مین پتھر کے پیچھے گرنے کے انداز میں غائب ہو گیا۔ ”میرے خدا۔“ سارہ چلائی۔ ”کسی نے اسے شوٹ کر دیا ہے۔“

فریڈ نے جھپٹ کر دوربین اس سے لی۔ ”ہاں وہ غائب ہے۔“

وہ تیزی سے چٹانوں کی طرف جانے لگے۔ مگر ابھی کچھ دور تھے کہ ایک طویل چیخ سنائی دی۔ سارہ نے ایک لمحے کو دیکھا، کوئی اوپر چٹانوں سے گر رہا تھا۔ اس کی چیخ ختم ہوئی تو کسی عورت کی چیخ سنائی دی جو مسلسل جاری تھی۔ فریڈ چونکا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”کوئی اوپر چٹانوں سے نیچے گرا ہے۔“

”اسنو مین؟“

”نہیں آدمی ہے، میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔“

وہ چٹانوں کے دامن میں پہنچے تو اوپر سے گرنے والا چوہے نما شخص ثابت ہوا اور ظاہر ہے وہ مر چکا تھا۔ اس پر رونے والی وہی صحت مند لڑکی تھی۔ فریڈ نے جھک کر چوہے نما آدمی کی نبض چیک کی لیکن وہ مر چکا تھا۔ اتنی بلندی سے گرنے کے بعد اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سارہ بھی آبدیدہ ہو گئی تھی، اس نے صحت مند لڑکی کو لاش کے پاس سے ہٹایا تو وہ اس کے شانے سے منہ لگا کر رونے لگی۔ فریڈ اوپر دیکھ رہا تھا۔ چوہے نما آدمی نے شکاری جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کی جیکٹ میں شاٹ گن کے بلٹ رکھنے والے مخصوص خانے بنے ہوئے تھے۔ لیکن اس کی گن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لڑکی کا نام جولیا تھا اور کچھ دیر بعد اس کی حالت اس قابل ہو گئی کہ وہ فریڈ کے سوالوں کے جواب دے سکے، اس نے اٹک اٹک کر بتایا۔

چوہے نما آدمی فرینک تھا وہ اسنو مین کا شکار کرنے آیا تھا۔ جولیا نے اس کی مخالفت کی تھی لیکن الٹا فرینک نے اسے اپنا ہمنوا بنا لیا اور وہ اس کے ساتھ یہاں تک چلی آئی۔ وہ رات کو ان ہی پہاڑوں میں رہے تھے اور صبح فرینک اور وہ اسنو مین کی تلاش میں نکلے تھے۔ فرینک نے دوربین سے چٹانوں کے اوپر اسنو مین کو دیکھ لیا تھا اور وہ جولیا کو نیچے چھوڑ کر خود اس کا شکار کرنے اوپر روانہ ہوا تھا۔ وہ چٹانوں پر چڑھنے کا ماہر تھا اس لیے اسے اوپر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پھر جولیا نے ایک فائر کی آواز سنی، وہ اوپر دیکھ رہی تھی کہ اس نے اسنو مین کی جھلک دیکھی اور اس کے فوراً بعد فرینک اوپر سے نیچے آ گرا تھا۔ فریڈ نے فرینک کی لاش کا معائنہ کیا۔ اس کا چہرہ اور ہاتھ صاف ستھرے تھے اسی طرح لباس سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ کسی درندے نے اس پر حملہ کیا ہے ورنہ کوئی نہ کوئی نشان تو ہوتا۔ لگ رہا تھا کہ اسنو مین نے اسے اٹھا کر نیچے پھینک دیا تھا۔ اچانک فریڈ کو احساس ہوا کہ وہ بھی خطرے میں ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنی شاٹ گن شانے سے اتاری اور چاروں طرف دیکھا۔ اس دوران میں سارہ اپنے موبائل پر سگنل دیکھ رہی تھی مگر اس سمیت کسی کے موبائل پر سگنل نہیں تھے۔

”ہمیں نیچے جانا ہوگا۔“ فریڈ نے کہا۔

”فرینک......؟“ جولیا نے سسکی لی۔

”مجبوری ہے۔“ فریڈ نے کہا اور فرینک کی لاش جھاڑیوں سے ڈھانپ دی۔ ”امید ہے چند گھنٹے میں پولیس یہاں آجائے گی اور اس دوران میں لاش محفوظ رہے گی۔“

وہ روانہ ہوئے۔ سارہ ہر تھوڑی دیر بعد سگنل دیکھ رہی تھی لیکن سگنل انہیں اس جگہ ملے جہاں فریڈ نے اپنی جیپ کھڑی کی تھی۔ انہوں نے نائن ون ون کال کر کے واقعے کی اطلاع دی اور دو گھنٹے بعد پولیس اور طبی عملہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ راستے کی دشواری کی وجہ سے ہیلی کاپٹر استعمال کیا گیا اور دوپہر تک لاش اٹھا لی گئی تھی۔ فریڈ، سارہ اور جولیا واپس ریسورٹس آگئے تھے کیونکہ پولیس نے فی الحال وہاں موجود ہر شخص کو نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ یہ سنتے ہی ریسورٹس میں سنسنی پھیل گئی تھی کہ اسنو مین نے فرینک کو مار دیا تھا۔ لوگوں نے فوراً رخت سفر باندھنا شروع کیا اور شام تک مشکل سے ایک درجن افراد رہ گئے تھے۔ اسنو لائٹ موٹل میں اب صرف وہی تین افراد مقیم تھے۔ فیرن اور کلائڈ دکھی لگ رہے تھے۔ فرینک کے لیے نہیں بلکہ اپنے بزنس کے لیے جو اچانک ہی ٹھپ ہو گیا تھا۔ چند گھنٹے میں ان کا موٹل خالی ہو گیا تھا۔

شیرف ان کا بیان لینے وہیں آیا تھا۔ سارہ، فریڈ اور جولیا نے بیان دیا۔ جب وہ اسے اسنو مین کے بارے میں بتا رہے تھے تو وہ کسی قدر استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ سارہ کو غصہ آگیا۔ ”لگ رہا ہے تمہیں ہماری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے؟“

”مس سارہ، اس علاقے میں رہنے والوں نے کبھی اسنو مین نہیں دیکھا اور تم باہر سے آنے والوں نے نہ صرف اسنو مین دیکھ لیا بلکہ ایک قتل بھی اس کے سر تھوپ دیا۔“

”قتل تو ہوا ہے؟“

شیرف نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فرینک پارسن اوپر سے گرنے سے مرا ہے، یہ چٹانیں بہت خطرناک ہیں۔“

”میں نے خود اسنو مین کی جھلک دیکھی تھی۔“

”میں نے اور فریڈ نے اسے واضح دیکھا تھا۔“ سارہ بولی۔

”یا تو تمہیں دھوکا ہوا ہے یا کوئی تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔“ شیرف نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں اس اسٹوری کو اپنی رپورٹ کا حصہ نہیں بنا سکتا۔“

”مرضی تمہاری۔“ سارہ نے شانے اچکائے۔ ”ہم نے اپنا بیان دیدیا ہے۔“

شیرف نے خبردار کیا۔ ”تم لوگ اس واقعے کے بارے میں کوئی رپورٹنگ نہیں کرو گے اور نہ ہی میڈیا یا پریس...“

”شیرف اس کی پابندی تو امریکا کا صدر بھی نہیں لگا سکتا۔“ فریڈ نے اعتراض کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وہ نہیں لگا سکتا لیکن میں لگا سکتا ہوں۔" شیرف غرّایا۔ "دوسری صورت میں تم سب کو پولیس کی تحویل میں اس کاؤنٹی کی حد سے باہر چھوڑا جائے گا۔"

"اوکے!" فریڈ نے جلدی سے کہا۔ "فی الحال ہم کوئی رپورٹنگ نہیں کریں گے۔"

شیرف کے جانے کے بعد سارہ نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔ "تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"ان چٹانوں کی طرف جانے کا جہاں اسنومین دیکھا تھا۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" سارہ نے انکار کر دیا۔ وہ موٹل کے ڈائننگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گزشتہ روز یہاں جتنی رونق تھی، اس وقت یہ اتنا ہی خالی لگ رہا تھا۔ جولیا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ آرام کرنے چلی گئی تھی۔ کلائڈ اپنی گاڑی کے ساتھ مصروف تھا۔ سارہ نے کھڑکی کے شیشے کے پار اسے دیکھا وہ چلتے ہوئے ہلکا سا لنگڑا رہا تھا۔ فیرن وہاں موجود تھی، وہ ان کی طرف آئی تو سارہ نے پوچھا۔ "کلائڈ کے پاؤں میں تکلیف ہے؟"

فیرن نے باہر دیکھا اور بولی۔ "نہیں اسے عرق النسا کی شکایت ہے سردیوں میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ کیا تم لوگ بھی جانے کا سوچ رہے ہو؟"

"ابھی نہیں، ہم سے کم کل تک رکیں گے۔" فریڈ نے جلدی سے کہا۔ اس نے سارہ کو اشارہ بھی کیا تھا کہ وہ جو بات کر رہے تھے اس بارے میں کچھ نہ بولے۔ فیرن نے چاروں طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"کل تک یہاں کتنی رونق تھی۔"

"یہ تو بونس تھا جو تم لوگوں کو آف سیزن مل گیا۔" سارہ نے کہا۔ "ورنہ میرے خیال میں اس موسم میں یہاں کوئی نہیں آتا ہوگا؟"

فیرن نے سر ہلایا۔ "سیزن اپریل سے ستمبر تک کا ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد یہاں بہت سردی ہو جاتی ہے، پانچ مہینے تو برف ہوتی ہے۔"

"اس دوران میں تم لوگ کیا کرتے ہو؟"

"موٹل کے بیشتر کمرے بند کر دیتے ہیں اور زیادہ تر اپنے گھر میں رہتے ہیں بھی کبھی کھانے کے کچھ آرڈر مل جاتے ہیں۔ یا شراب لینے آتے ہیں۔"

"تم لوگ بیچتے ہو؟"

"ہاں، یہ سردیوں کا بزنس ہے اس سے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ کلائڈ ہر ہفتے لاس ویگاس جا کر تازہ سپلائی لے آتا ہے۔"

"کل بھی کلائڈ سامان لینے گیا تھا؟"

"آں... ہاں۔" فیرن نے کہا۔ "تم لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"رات کا کھانا سات بجے چاہیے۔ اس وقت تک کے لیے کوئی ڈرنک لے آؤ۔" فریڈ نے کہا اور فیرن کے جانے کے بعد آہستہ سے بولا۔ "کل کا پروگرام کسی کے سامنے ڈسکس نہیں کرنا ہے۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ میں نہیں جاؤں گی۔"

"تب تمہیں جیپ کے ساتھ رکنا ہوگا۔ تمہیں جیپ میں چھوڑ کر میں اوپر جاؤں گا۔"

"میں یہاں رہ جاتی ہوں۔"

"نہیں، اس صورت میں مجھے غائب پا کر یہ جان جائیں گے کہ میں کہاں گیا ہوں اور ممکن ہے پولیس کو اطلاع کر دیں۔ ہمیں ساتھ نکلنا ہوگا ویسے تم جیپ میں آرام کرنا۔"

بادل ناخواستہ سارہ نے سر ہلایا۔ "کب نکلنا ہے؟"

"صبح سویرے۔"

رات کا کھانا کھا کر وہ سونے کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کیونکہ سارے ہی کمرے خالی تھے اس لیے فریڈ نے بھی ایک سنگل روم لے لیا۔ وہ صبح چھ بجے اٹھ گئے تھے۔ فیرن نے ان کے لیے ناشتا بنایا۔ کلائڈ روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ سامان لینے لاس ویگاس جا رہا تھا کیونکہ پیش گوئی تھی کہ دو دن بعد برف باری ہو گئی اور یہ سلسلہ چار سے پانچ دن جاری رہے گا۔ اس لیے وہ ابھی سے سامان لینے جا رہا تھا۔

"ہم بھی جا رہے ہیں۔" فریڈ نے فیرن کو آگاہ کیا۔

"جولیا بھی جا رہی ہے؟" فیرن نے افسردگی سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے آج ہی موٹل کا بیشتر حصہ بند کرنا ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں، ابھی یہاں ایک حادثہ ہو گیا ہے لیکن اگلے سال سیزن کے آغاز میں پہلے سے زیادہ سیاح آئیں گے۔" سارہ نے اسے تسلی دی۔ "خاص طور سے جب اسنومین کے بارے میں ہماری رپورٹ چھپے گی۔ ہمارا رسالہ لاس اینجلس گوسپ ایک ملین کی تعداد میں چھپتا ہے اور ان میں سے کم سے کم ایک لاکھ افراد ضرور اسنومین دیکھنا چاہیں گے۔"

"آج کل کاروباری حالات خراب ہیں، کساد بازاری نے سب سے زیادہ سیاحت کو متاثر کیا ہے، لوگوں کے پاس رقم ہی نہیں ہے کہ وہ گھومنے کے لیے گھر سے نکلیں۔ یہ سیزن بھی بس ایسے ہی گیا ہے۔"

ناشتا کر کے انہوں نے اپنا سامان جیپ میں رکھا۔ تمام

اوائیگی وہ پہلے ہی کر چکے تھے اس لیے فیرن کو بائے کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہائی وے پر پہنچ کر فریڈ نے لاس ویگاس کی طرف جانے کے لیے جیپ کا رخ مخالف سمت میں موڑ دیا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟" سارہ نے پوچھا۔

"ذرا آگے ایک راستہ ہے جو اسکل ماؤنٹین کی طرف جاتا ہے اگرچہ یہ طویل ہے لیکن اُمید ہے اس پر پولیس سے مڈبھیڑ نہیں ہوگی۔"

راستہ کچا اور دشوار تھا شاید اسے مجبوری میں ہی استعمال کیا جاتا ہوگا۔ اس طرف زمین بہت ناہموار اور پہاڑ ناقابل عبور قسم کے تھے۔ جی پی ایس کے مطابق وہ اسکل ماؤنٹین سے کوئی چار میل کی دوری پر تھے جب راستہ مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ جیپ اب آگے نہیں جا سکتی تھی اس لیے انہیں پیدل ہی سفر کرنا تھا۔ فریڈ جیپ سے اترنے لگا، اس نے اپنی شاٹ گن بھی نکال لی تھی۔ سارہ نے کہا۔ "ایک منٹ...... رائفل تم ساتھ لے جا رہے ہو اور اسنومین یہاں آگیا تو میں کیا کروں گی؟"

"اسنومین یہاں کیوں آنے لگا؟"

"یہ اس کا علاقہ ہے وہ یہاں بھی آسکتا ہے۔"

"رائفل لے جانا ضروری ہے۔"

"میں اس طرح نہیں رہ سکتی۔" سارہ بھی نیچے اتر آئی۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔"

فریڈ خوش ہو گیا۔ "یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ ایک سے بھلے دو ہوتے ہیں۔"

انہوں نے تمام ضروری سامان لیا اور روانہ ہو گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے جیپ ایک جگہ چھپا دی تھی اور جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں جمع کر کے اس پر ڈال دی تھیں تاکہ وہ دور سے نظر نہ آئے۔ سارہ نے کہا۔ "اگر شیرف کو ہماری بات کا یقین آگیا ہو تو اس وقت اس کے آدمیوں کی چٹانوں پر موجودگی ممکن ہے۔"

"ہو سکتا ہے، ہم دیکھ بھال کر جائیں گے۔" فریڈ نے کہا۔ "مجھے یقین ہے اسنومین کا ٹھکانا ان چٹانوں میں کہیں ہے اور اسے فرینک کی مداخلت اور پھر فائر نے مشتعل کیا ہوگا تبھی اس نے فرینک کو نیچے پھینکا۔"

"اگر اس نے تمہیں رائفل سمیت دیکھ کر شکاری سمجھا اور تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا تو میں کیا کروں گی۔"

"تم جولیا کی طرح میری لاش پر رونا دھونا کرنا۔" فریڈ نے بھنا کر کہا۔ "اب چپ کر کے سفر کرو ایسا نہ ہو اسنومین ہماری آوازیں سن لے۔"

یہ راستہ نہایت دشوار تھا بعض جگہوں پر تو انہیں اوپر چڑھنے کے لیے ہاتھوں کا سہارا بھی لینا پڑتا تھا۔ سارہ دل ہی دل میں فریڈ کو کوس رہی تھی جو اسنومین کی خاطر اتنا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اسنومین خود ایک بہت بڑا خطرہ تھا اور ان کے سامنے ایک مسلح آدمی کو مار چکا تھا۔ بے شک فرینک کی موت اوپر سے گرنے کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن اسے پھینکا تو اسنومین نے ہی تھا۔ ایک گھنٹے میں وہ مشکل سے دو میل کا فاصلہ طے کر سکے تھے لیکن اس طرف سے جانے کا انہیں یہ فائدہ ہوا تھا کہ وہ اب براہ راست چٹانوں کے اوپری حصے کی طرف جا رہے تھے دوسری صورت میں انہیں اوپر چڑھنے کے لیے باقاعدہ کوہ پیمائی کرنا پڑتی اور ان دونوں میں سے کوئی اس فن کا ماہر نہیں تھا۔ موسم اس روز بھی صاف تھا۔ تیز دھوپ میں سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چٹانوں کے پاس آئے تو درخت کم ہو گئے تھے۔ یہاں جھاڑیاں زیادہ تھیں۔ ایک جگہ رک کر فریڈ نے دوربین سے آس پاس کا علاقہ اچھی طرح کھنگالا۔ "یہاں کم سے کم کوئی پولیس والا نہیں ہے۔"

"اور اسنومین...؟"

"اسی کی تلاش میں تو ہم یہاں آئے ہیں۔" فریڈ نے دوربین گلے میں ڈال کر اپنی شاٹ گن چیک کی۔ اس میں ایک وقت میں سات کارتوس آتے تھے اور یہ سب بہت مہلک کارتوس تھے۔ "آؤ، آگے چلیں۔"

"پہلے کھانا کھا لیں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

اس مشکل سفر نے ان کا ناشتا ہضم کر دیا تھا۔ فریڈ نے اتفاق کیا اور انہوں نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں نکال کر پیٹ بھرا۔ سارہ نے تھرماس میں کافی لے لی تھی۔ کافی پی کر وہ آگے جانے کے لیے تیار ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد وہ ان چٹانوں کے اوپری حصے کے پاس تھے۔ یہ چٹانیں دونوں طرف سے آس پاس کی زمین سے بلند تھیں اور ان کا اوپری حصہ نصف مربع کلومیٹر پر محیط تھا۔ آبشار ایک ندی تھی جو یہاں سے نیچے جا رہی تھی۔ فریڈ کئی بار رک کر دوربین سے آس پاس کا معائنہ کر چکا تھا۔ اس نے سارہ سے کہا۔ "اسنومین وہاں دیکھا تھا۔ ہم بھی وہیں کہیں ٹھکانا بناتے ہیں اور چھپ کر اسنومین کا انتظار کرتے ہیں۔"

"اسنو وہ درندہ ہے۔" سارہ نے کہا۔ "جانوروں کی سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ ہماری بو پالے۔"

"اگر وہ ہماری بو محسوس کرے گا تو لازمی اس وقت وہ پاس ہوگا، اس لیے ہم بھی اسے دیکھ سکتے ہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وہ بے خبری میں آگیا تو......؟"

"تم فکر مت کرو، میں ایسا بندوبست کروں گا کہ وہ ہماری بے خبری میں نہیں آسکتا۔"

کچھ دیر میں فریڈ نے ایک جگہ تلاش کر لی تھی۔ یہ ایک چٹان میں ذرا بلندی پر چھوٹا سا غار تھا جس کے آگے جھاڑی اگی تھی اور اس کا دہانہ مشکل سے نظر آتا تھا۔ غار اندر سے صاف ستھرا تھا لیکن سارہ ڈری ہوئی تھی۔ "کہیں یہ استومین کا غار نہ ہو۔"

"وہ اس غار میں آسکتا ہے؟" فریڈ نے سادگی سے پوچھا کیونکہ غار کل سات فٹ لمبا، چھ فٹ اونچا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ استومین جیسی دیو قامت مخلوق اس میں کہاں آسکتی تھی۔ سارہ جھینپ گئی۔ فریڈ نے تین عدد وائرلیس کیمرے چٹان کے آس پاس لگائے۔ یہ مووی ایک چھوٹے سے کمپیوٹر پر بھیجتے تھے۔ انہوں نے غار میں سامان سیٹ کیا۔ تین بجے دھوپ ہلکی ہونے لگی تھی۔ فریڈ کیمروں کا رزلٹ چیک کر رہا تھا۔ یہ خاصے بڑے علاقے کو کور کر رہے تھے۔ سارہ نے پوچھا۔

"ابھی تو دن کی روشنی ہے رات کے وقت یہ کیمرے بیکار ہو جائیں گے۔"

"نہیں، یہ نائٹ موڈ پر بھی کام کرتے ہیں اور اس وقت یہ زیادہ کارآمد ہو جائیں گے۔"

شام ہوتے ہی سردی میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی گرم جیکٹیں نکال کر پہن لی تھیں۔ آگ جلانا یہاں بھی ممکن نہیں تھا ورنہ اس کا انعکاس ضرور باہر دیکھا جا سکتا تھا۔ فریڈ نے اس سے کہا۔ "ہمیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا اور باری باری جاگ کر کیمروں پر نظر رکھنا ہوگی۔"

انہوں نے سات بجے رات کا کھانا کھا لیا تھا۔ کیمرے اب نائٹ موڈ پر کام کر رہے تھے۔ پہلی باری سارہ کی تھی، اسے رات بارہ بجے تک جاگ کر کیمروں پر نظر رکھنا تھی۔ اس کے بعد فریڈ کی باری آتی اور وہ صبح تک جاگتا۔ سارہ تھکی ہوئی تھی لیکن اسے جاگنا ہی تھا۔ فریڈ اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس کر سو گیا تھا۔ سارہ ہلکا کمبل اوڑھے اور اپنے بیگ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی وہ اونگھنے لگتی تھی لیکن فوراً ہوشیار ہو جاتی۔ دس بجے نیند شدت اختیار کر گئی تھی اس لیے اس نے تھرماس میں بچی کھچی کافی گرم کر کے پی، اس کی تلخی نے نیند کو کچھ دیر کے لیے پسپا کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ نہ جانے کیسے سو گئی۔ اچانک کسی نے اسے ہلایا اور پھر ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ وہ ہڑبڑائی لیکن فریڈ کو دیکھ کر پرسکون ہو گئی۔ فریڈ نے آہستہ سے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور پھر اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کیمرا نمبر تین تھا جو سب سے بلندی پر لگا تھا اور یہ دکھا رہا تھا کہ چٹانوں میں ایک سرخ بڑا سا دھبا حرکت کر رہا تھا۔

"استومین۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"میرا خیال ہے۔" فریڈ بولا۔ "ہمیں تیار ہو جانا چاہیے۔"

"کس لیے؟"

"اس کے شکار کے لیے۔" فریڈ نے شاٹ گن اٹھا کر شانے پر لادی اور اس کے کارتوس کا پاؤچ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

سارہ حیران ہوئی پھر اس نے کہا۔ "ہم اس کا شکار کرنے نہیں آئے ہیں۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو، کیا ہم اس کی زیارت کرنے آئے ہیں؟ اسے دنیا کے سامنے لانے کا واحد طریقہ یہی ہے۔"

سارہ مخالفت کرتی رہ گئی مگر فریڈ باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ سارہ اکیلے نہیں رہنا چاہتی تھی اس لیے وہ بھی باہر آگئی۔ فریڈ نے نائٹ ویژن عینک لگا لی تھی اور اب اسے اندھیرے میں بھی صاف نظر آرہا تھا لیکن سارہ کچھ دیکھنے سے قاصر تھی۔ فریڈ نے چٹانوں اور جھاڑیوں کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ وہاں گیا ہے۔"

"خدا کے لیے۔" سارہ پریشان ہو کر بولی۔ "تم بھول رہے ہو اس نے مسلح ہونے کے باوجود فرینک کو کسی کھلونے کی طرح نیچے اچھال دیا تھا۔"

"فرینک سے کوئی غلطی ہوئی ہو گی اور پھر وہ عام آدمی تھا میں عام آدمی نہیں ہوں، تم فکر مت کرو۔"

"میرا خیال ہے وہ بھی اسی غلط فہمی میں مارا گیا تھا۔" سارہ نے جل کر کہا۔

"اب خاموش رہنا، ہمیں بالکل خاموشی سے اس کا پیچھا کرنا ہے میں اس کا ٹھکانا دیکھنا چاہ رہا تھا۔"

سارہ کو نظر نہیں آرہا تھا اس لیے وہ فریڈ کے بالکل پیچھے تھی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چل رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے قدم قدم پر ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ اچانک اس کا پاؤں ایک گڑھے میں گیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ فریڈ نے مڑ کر غصے سے سرگوشی کی۔ "کیا مسئلہ ہے، تم خاموش نہیں رہ سکتیں، اس سے تو بہتر تم جیپ میں رہ جاتیں۔"

"میں تو یہاں آکر پچھتا رہی ہوں۔" وہ جل کر بولی۔ "میرا پاؤں مڑ گیا ہے اور شاید موچ آگئی ہے، مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"تب تم یہیں رکو کیونکہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔"

"پلیز مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔" سارہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا لیکن فریڈ اس سے پہلے ہی آگے بڑھ چکا تھا۔ سارہ ایک چٹان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سردی شدید تھی لیکن وہ سردی سے زیادہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ فریڈ لمحوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں تھا۔ سارہ نے گھڑی دیکھی، رات کے دو بج رہے تھے۔ فریڈ کو گئے ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا لیکن ابھی تک اس کی واپسی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ سارہ آواز دیتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ کہیں اس کے بجائے استومین سن کر نہ آجائے۔ سردی سے اس کا برا حال تھا لیکن آرام کرنے سے پاؤں کی تکلیف کم ہو گئی تھی اس لیے اس نے واپس غار میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک پاؤں سے لنگڑاتے ہوئے چل رہی تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے آس پاس کوئی ہے، اسے کسی کے بھاری انداز میں سانس لینے کی آواز آئی تھی۔ وہ سہم کر رک گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ کہیں فریڈ نہ ہو، اس نے آہستہ سے کہا۔ "فریڈ یہ تم ہو؟"

جواب میں ایک بھاری غراہٹ سنائی دی اور ایک بالوں بھرا ہاتھ آکر اس کے منہ پر جم گیا۔ سارہ کی چیخ گھٹ کر رہ گئی اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ آخری احساس بس یہ تھا کہ بالوں بھرے ہاتھ اسے اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ ایک غار میں فرش پر پڑی تھی۔ وہاں بدبو تھی اور ہوا میں گھٹن تھی لیکن سردی زیادہ نہیں تھی۔ اسے ہوش آیا تو وہ کچھ دیر لیٹی رہی۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ نیم تاریکی میں اسے غار میں اور کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ استومین کہیں گیا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا، غار میں جانوروں کی ہڈیاں بکھری تھیں اور یہ بدبو ان کی تھی۔ سارہ کے جسم میں تھرتھری سی آگئی۔ استومین اسے اٹھا لایا تھا اور نہ جانے اب اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ یہ بات تو لازمی تھی کہ وہ اس کے عورت ہونے کا قطعی لحاظ نہیں کرتا اور عین ممکن تھا وہ اسے بھی ڈنر یا لنچ میں کھانے کے لیے لایا ہو۔ وہ فریڈ کو کوسنے لگی پھر اسے بین کا خیال آیا، وہ اسے بھی کوسنے لگی کہ اس پر یہ آفت ان دونوں ہی کی وجہ سے آئی تھی۔

ابھی وہ باہر نکلنے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ غار کے دہانے کی طرف سے ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ وہ پھرتی سے جہاں لیٹی ہوئی تھی وہیں جا کر لیٹ گئی۔ چند لمحے بعد بھاری بھرکم استومین اندر آیا۔ اس نے کچھ اٹھا رکھا تھا، وہ اس نے سارہ کے قریب زمین پر پھینکا تو وہ لرز گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا ہرن تھا جسے استومین شکار کر کے لایا تھا۔ سارہ اپنے بدن کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس وقت وہ فریڈ اور بین کو برا بھلا کہنا بھی بھول گئی تھی۔ اسے اپنی عافیت شدید خطرے میں لگ رہی تھی لیکن استومین اس کے قریب نہیں آیا بلکہ وہ ایک نزدیک پتھر پر ٹک کر غرانے کے انداز میں ہانپنے لگا تھا۔ سارہ نے اب تک آنکھیں سختی سے بند کی ہوئی تھیں لیکن جب وہ اس کے نزدیک نہیں آیا تو اس نے ہمت کر کے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اسے اپنے سامنے ایک بھاری بھرکم بالوں بھرا وجود نظر آیا۔ نیم تاریکی کی وجہ سے وہ بہت نمایاں نہیں تھا لیکن جتنا بھی دکھائی دے رہا تھا وہ سارہ کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ جسامت میں عام انسان سے خاصا بڑا تھا اور ظاہر ہے اسی لحاظ سے طاقتور بھی تھا۔ اس کے بڑے سے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی انگاروں کی طرح دہکتی سرخ آنکھیں تھیں جن سے درندگی جھلک رہی تھی۔ ایک بار اس نے سارہ کی طرف دیکھا تو اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسے لگا کہ ابھی وہ اٹھ کر اس کی طرف آئے گا لیکن خیریت رہی کہ اس نے سارہ کی طرف رخ نہیں کیا۔ اس کے بجائے کچھ دیر بعد اس نے ہرن اٹھایا اور غار کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا اور پھر وہاں سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے وہ ہرن کو کچا ہی چبا رہا ہو۔ خوف اور سنسنی کے احساس نے سارہ کو پھر بے ہوش کر دیا تھا۔

دوسری بار اس کی آنکھ کھلی تو وہ غار میں اکیلی تھی اور استومین غائب تھا۔ بہت دیر وہ ایسے ہی پڑی رہی پھر اس نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں اور مزید ہمت کر کے اٹھ بیٹھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے غار کے اندرونی گوشے کی طرف دیکھا کہ کہیں استومین وہاں نہ ہو لیکن وہ وہاں نہیں تھا، وہ کہیں گیا ہوا تھا۔ سارہ کو خیال آیا کہ اسے یہ سنہری موقع ملا ہے اور شاید دوبارہ نہ ملے۔ وہ اٹھی اور دبے قدموں غار کے دہانے تک آئی۔ دہانہ آڑا ترچھا تھا اس لیے باہر کی روشنی اندر تک نہیں آرہی تھی۔ مگر باہر آتے ہی اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ استومین غار کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور شاید کچھ کھا رہا تھا۔ سارہ رک گئی۔ اچانک استومین نے سر اٹھا کر جیسے ہوا میں کچھ سونگھا۔ شاید اسے سارہ کی بو آئی تھی۔ وہ دبے قدموں پیچھے ہٹی۔ اس نے غار کا معائنہ کیا۔ وہاں کوئی ہتھیار نہیں تھا اس لیے اس نے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہڈی اٹھالی۔ یہ شاید کسی بڑے ہرن کی ران کی ہڈی تھی اور ہتھیار کے طور پر استعمال کی جاسکتی تھی۔ سارہ واپس اپنی جگہ آکر لیٹ گئی۔ خطرہ تھا کہ شاید اسنومین اندر آئے گا اور اسے چھیڑنے کی کوشش کرے گا۔ مگر وہ اندر نہیں آیا۔ پیٹ پوجا اس کے لیے زیادہ اہم تھی۔

سارہ کے پاس اس کا چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرا تھا اس نے اسے سائلنس پر کیا اور پہلے غار کی کئی زاویوں سے تصاویر لیں پھر دبے قدموں باہر آئی اور پشت سے اسنومین کی کئی تصاویر لیں۔ اسے معلوم تھا ایک بار وہ یہاں سے نکل گئی تو یہ تصاویر دھوم مچادیں گی۔ تصویریں لے کر وہ واپس آئی۔ اس نے اسنومین کی کھائی ہوئی ہڈیوں اور گوشت کے بچے کھچے ریشوں کی تصاویر بھی لی تھیں، پھر اسے خیال آیا۔ اس نے اپنی بھی تصویریں لیں اور پھر دہانے پر جاکر کچھ تصویریں اس طرح لیں کہ اس کے پس منظر میں اسنومین بھی نظر آرہا تھا۔ اب اس کے پاس اسنومین کی موجودگی کا پکا ثبوت آگیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد سارہ نے دوبارہ جاکر دیکھا تو وہ وہیں براجمان تھا۔ سارہ کو غصہ آنے لگا کہ یہ کہیں دفع کیوں نہیں ہوتا، اسی جگہ کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ پھر اسے فریڈ کا خیال آیا کہ وہ اسنومین کا پیچھا کررہا تھا کہ اس کا شکار کرسکے لیکن سنومین الٹا اسے اٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے آیا تھا تو فریڈ کا کیا ہوا تھا۔ کیا اسنومین نے اسے بھی فرینک کی طرح ماردیا تھا؟ یہ خیال آتے ہی سارہ کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اگر فریڈ مارا گیا تھا تو وہ کلی طور پر اسنومین کے رحم و کرم پر تھی۔ سارہ نے ہڈی دیکھی اور اسے اسنومین کے خلاف بیکار سمجھ کر پھینک دیا۔ پھر اس نے ایک بڑا پتھر تلاش کیا اور دوبارہ غار کے دہانے کی طرف آئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آزاد ہونے کی ایک کوشش ضرور کرے گی چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ وہ دبے قدموں باہر آئی اور اس نے دوسری طرف منہ کیے بیٹھے اسنومین کے سر پر پتھر پوری قوت سے مارا۔ اس کے منہ سے ایک عجیب غراتی آواز نکلی اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔

سارہ نے پتھر پھینکا اور پوری قوت سے بھاگی۔ صبح کے بارہ بج رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے وہ بار بار مڑ کر دیکھ رہی تھی کہ کہیں اسنومین اس کے تعاقب میں تو نہیں آرہا ہے۔ مگر اسے اسنومین نظر نہیں آیا تھا، وہ دوڑتی ہوئی ان چٹانوں تک آئی جہاں انہوں نے اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ اسے اُمید تھی وہاں اس کا سامان ہوگا۔ اس میں اس کا موبائل تھا اور وہ پولیس سے رابطہ کرسکتی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے غار میں داخل ہوئی تھی کہ کسی نے اسے جکڑ لیا۔ سارہ نے خوفزدہ انداز میں چیخ ماری۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ روشنی سے اندر تاریکی میں آئی تھی اس لیے اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اسے فریڈ کی آواز آئی۔ ”آرام سے... آرام سے ڈیئر... یہ میں ہوں۔“

”تم۔“ سارہ نے الگ ہوکر اچانک اسے ایک زوردار تھپڑ مارا۔ ”تم گدھے اسنومین کا شکار کرنے گئے تھے اور وہ تمہیں دھوکا دے کر مجھے اٹھالے گیا۔“

”وہ میں واقعی دھوکا کھا گیا تھا۔“ فریڈ نے خفت سے کہا۔ ”واپسی پر میں نے تمہیں غائب پایا تو آس پاس تلاش کرتا رہا پھر مجھے خیال آیا...“

”کہ میں واپس چلی گئی ہوں۔“ سارہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”یہ سوچ کر تم سکون سے بیٹھ گئے۔ حالانکہ میں اتنے مشکل راستے پر اور اکیلی کسی صورت نہیں جاسکتی۔ میں واپس جاتے ہی تم پر اور بین دونوں پر لعنت بھیج کر جاؤں گی۔“

”کہاں جاؤ گی؟“

”ہالی وڈ ٹریش والوں کے پاس۔“ وہ بولی۔ ”میرے پاس اسٹوری ہے، میں نے نہ صرف اسنومین کے ٹھکانے اور اس کی تصویریں لی ہیں بلکہ میں زبردست جدوجہد کے بعد اسے بے ہوش کرکے وہاں سے نکلی ہوں۔ تم سمجھ رہے ہونا...... اتنی زبردست اسٹوری کے ہوتے ہوئے ہالی وڈ ٹریش والے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔“

فریڈ چونک گیا۔ ”تم نے اسنومین کا ٹھکانا دیکھا ہے۔“

”ہاں، وہ یہاں سے کچھ دور ہے اور وہ شاید اب تک بے ہوش پڑا ہوگا۔ میں نے اس کے سر پر بہت بڑا پتھر مارا تھا۔“ سارہ کے لہجے میں فخر آگیا۔

”سنو، کیا تم مجھے وہاں تک لے جاسکتی ہو۔“ فریڈ نے لجاجت سے کہا۔ ”کل رات تو وہ مجھے دھوکا دے گیا۔“

”نہیں بابا، میری ہمت نہیں ہے کہ دوبارہ اس طرف جاؤں۔ میرا ارادہ فوری یہاں سے روانہ ہوجانے کا ہے۔“

”تم اکیلے کیسے جاسکتی ہو؟“

”اکیلے کیوں... تم بھی چلو گے۔“ سارہ نے کہا۔

”میں یہاں اسنومین کی تلاش میں آیا ہوں یہ کام کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

”تم پاگل ہورہے ہو۔ کل رات تمہاری قسمت اچھی تھی جو تم بچ گئے اور میں بھی بچ گئی کیونکہ اسنومین ایک ہرن شکار کرکے لایا تھا اور اسے کھا رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ مجھے کھا جاتا۔

”اسنومین آدم خور نہیں ہے ورنہ لوگ غائب ہونا شروع ہوجاتے۔“

”گوشت خور تو ہے اور آدمی بھی گوشت کا بنا ہوتا ہے۔ اس لیے میں اس طرف نہیں جاؤں گی۔“

”تب مجھے اکیلے جانا پڑے گا اور اس کے ٹھکانے کی تلاش میں بھٹکنا بھی پڑے گا یعنی دیر لگے گی۔ وہ ہمارا ٹھکانا دیکھ چکا ہے اور مجھے شبہ ہے کل رات اس نے جان بوجھ کر باہر نکالا تھا تاکہ تمہیں اٹھا کر لے جاسکے۔ وہ اس ٹھکانے سے واقف ہے ایسا نہ ہو کہ ادھر میں جاؤں اور ادھر وہ دوبارہ آجائے۔“

”نہیں۔“ سارہ کانپ اٹھی تھی۔

”اس لیے میرے ساتھ چلو، رات کی بات اور تھی۔ میرے پاس شاٹ گن ہے میں اپنا اور تمہارا تحفظ کرسکتا ہوں۔“

سارہ کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اسنومین کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوئے۔ سارہ کا پاؤں ٹھیک ہوگیا تھا چوٹ خاص نہیں تھی لیکن رات کو زیادہ محسوس ہورہی تھی اس نے روانہ ہوتے ہوئے مٹر کا ایک ٹن اور ایک انرجی ڈرنک لے لی تھی وہ اسی سے ناشتا کررہی تھی۔ بھوک پیاس کا خیال بھی نہیں تھا مگر توانائی تو بحال رکھنا تھی جبکہ انہیں ابھی ایک طویل اور مشکل سفر بھی درپیش تھا۔ سارہ ایک جگہ کچھ کنفیوز ہوئی تھی کیونکہ وہ اسنومین کے ٹھکانے سے منہ اٹھا کر بھاگی تھی اور اس نے راستے کا زیادہ خیال نہیں کیا تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ لیکن جلد ہی اس نے درست راستہ تلاش کرلیا۔ فریڈ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے اس سے ایسی ہی توقع ہو۔ سارہ کو غصہ آرہا تھا مگر اس نے ظاہر نہیں کیا۔ کچھ دیر میں وہ اسنومین کے ٹھکانے کے پاس جانکلے۔

”وہ جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا غار دیکھ رہے ہو وہی سنومین کا ٹھکانا ہے۔“

”تم نے کہا تھا کہ تم نے اسے غار سے باہر بے ہوش کیا تھا تو اسے یہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”ہاں، میں نے اسے وہ چھوٹا پتھر ہے اس کے پاس بے ہوش کیا تھا لیکن شاید وہ ہوش میں آگیا ہوگا اور اس وقت غار میں ہوگا۔“

یہ سنتے ہی فریڈ نے یوں شاٹ گن تان لی جیسے اسنومین کے سامنے آتے ہی اس پر گولی چلادے گا۔ سارہ اس سے اس حد تک متفق ہوگئی تھی کہ اس جیسے درندے کو فوراً گولی ماردینی چاہیے۔ وہ اسے کتنی آسانی سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے فرار کا موقع مل گیا ورنہ نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ وہ فریڈ کے پیچھے تھی۔ لیکن غار کے پاس آکر اس نے اندر جانے سے انکار کردیا۔ ”میں اندر نہیں جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے تب تم یہیں رکو، میں دیکھتا ہوں۔“ فریڈ نے کہا اور دبے قدموں غار میں داخل ہوگیا۔ سارہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ ابھی اندر سے سنومین کی دہاڑ اور فریڈ کی شاٹ گن کی آواز آئے، اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر شاٹ گن کی آواز نہ آئی یا شاٹ گن کے بعد بھی اسنومین کی دہاڑ سنائی دی تو وہ یہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہوجائے گی اور اس بار اکیلے ہی نیچے جیپ کی طرف روانہ ہوجائے گی۔ مگر خاصی دیر گزر گئی اور اندر سے نہ تو اسنومین کی آواز آئی اور نہ ہی شاٹ گن چلنے کی آواز آئی۔ اس کا دل لرزنے لگا۔ کہیں اسنومین نے خاموشی سے تو فریڈ کو نہیں دبوچ لیا تھا؟ وہ آہستہ سے غار کے پاس گئی اور فریڈ کو آواز دی۔

”تم ٹھیک ہونا؟“

اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ مزید آگے آئی، اب وہ بالکل غار کے دہانے پر تھی۔ اس میں اندر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ پھر فریڈ کو پکارنے جارہی تھی کہ اچانک کوئی اندر سے نمودار ہوا۔ سارہ کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔

”ایزی... ایزی... یہ میں ہوں۔“ وہ فریڈ تھا۔

”بدتمیز آدمی، تم نے میرا دم نکال دیا۔“

”اندر کوئی نہیں ہے، غار خالی ہے۔“ فریڈ نے کہا۔ ”شاید سنومین یہاں سے جاچکا ہے۔“

”وہ جا نہیں چکا ہے بلکہ ہماری تلاش میں ہوگا۔“ سارہ نے فکرمندی سے کہا۔

یہ بات فریڈ کے دل کو بھی لگی تھی۔ ”تب ہم کیا کریں؟“

”یہاں سے بھاگ چلیں، سنا ہے درندہ زخمی ہوکر اور زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے۔“

فریڈ تذبذب میں تھا وہ بین کی ہدایت کے مطابق یہاں اسنومین کی موجودگی کا کوئی پکا ثبوت لینے آیا تھا اور اس کی لاش ہی سب سے بڑا ثبوت ہوسکتی تھی۔ ویسے تو زندہ اسنومین زیادہ کارآمد ہوتا لیکن اسے زندہ کون پکڑتا۔ اس لیے فریڈ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اسے شوٹ کردے گا اور پھر اس کی لاش لے جائے گا۔ سارہ نے اہم ترین سوال کیا۔ ”فرض کرو تم اسے مار بھی دیتے تو اس کی لاش کیسے لے جاتے۔ میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے وہ کم سے کم چھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سات سو پونڈ وزنی درندہ ہے۔"

یہ فریڈ نے سوچا ہی نہیں تھا اتنے وزنی جسم کو لے جانے کے لیے اسے کم سے کم چھ افراد کی ضرورت پڑتی۔ پھر اس نے شانے اچکائے۔ "خیر کوئی بات نہیں اس کا جسم یہیں چھوڑ کر ہم اس کا سر تو لے جا سکتے ہیں۔"

"کاٹ کر۔" سارہ نے سہم کر کہا۔

"ظاہر ہے۔" فریڈ نے کہا اور واپس غار کی طرف بڑھا اس بار سارہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ یہ جان کر کہ اسنومین کہیں باہر ہے اب وہ باہر رکنے کو تیار نہیں تھی۔ فریڈ نے بھی اس کی طرح غار کی تصاویر لیں۔ سارہ نے بدبو سے بچنے کے لیے منہ پر رومال رکھ لیا تھا۔

تصویریں لے کر وہ باہر آئے۔ سارہ نے کہا۔ "پلیز اب واپس چلو اس سے پہلے کہ اسنومین دوبارہ واپس آجائے۔"

فریڈ شاید تیار نہیں تھا لیکن جب وہ واپس اپنے غار کے پاس پہنچے تو وہاں پولیس موجود تھی اور شیرف ان میں خود شامل تھا۔ اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم اسنومین کو دیکھنے آئے تھے اور ہم نے اس کا ٹھکانا تلاش کر لیا ہے۔" سارہ نے کہا۔

شیرف نے ان کے ساتھ جا کر اسنومین کا ٹھکانا دیکھا مگر اس نے ہڈیوں اور گوشت کے سڑتے ریشوں کی وجہ سے اسے اسنومین کا ٹھکانا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ سارہ کو غصہ آیا اور وہ اسے اسنومین کی لی ہوئی تصویروں کے بارے میں بتانے جا رہی تھی کہ اسے عقل آگئی۔ "شیرف کیا تم پوری ذمے داری سے اسنومین کی موجودگی سے انکار کر رہے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور میں تم دونوں کو اپنی ذمے داری پر اس کاؤنٹی سے باہر بھی چھوڑ کر آؤں گا۔"

"ہمارا سامان اور گاڑی۔" فریڈ نے احتجاج کیا۔

"تم میرے آدمیوں کے ساتھ جاؤ وہ بھی پہنچ جائے گا لیکن اب تم دونوں پولیس کی تحویل میں رہو گے۔"

سارہ خوش تھی، اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا اور اب وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اس نے شیرف سے کہا۔ "کیا فرینک کی موت کی وجہ سامنے آگئی ہے؟"

"بالکل...... وہ حادثاتی طور پر ان چٹانوں سے گرا تھا۔"

"جولیا نے اسنومین کی جھلک دیکھی تھی۔"

"اسے وہم ہوا تھا۔" شیرف نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "اس نے جانے سے پہلے اپنے تحریری بیان میں اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔"

فریڈ اور اسے پولیس اہلکاروں کی تحویل میں وہاں سے روانہ کر دیا گیا، اس کے لیے مروجہ راستہ اختیار کیا گیا۔ ان کی گاڑی بھی پولیس والے پہنچاتے اور ان کا سامان بھی انہیں اس وقت ملتا جب انہیں کاؤنٹی کی سرحد پر چھوڑ دیا جاتا۔ فریڈ تلملا رہا تھا اور راستے بھر دبی زبان میں شیرف اور اس کے محکمے کو گالیاں دیتا رہا اور جب کوئی پولیس والا اسے گھورتا تو وہ دانت نکال دیتا۔ کئی گھنٹے بعد وہ دن ڈھلے پر ایک بار پھر کلائڈ اور فیرن کے موٹل میں تھے۔ فیرن انہیں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ "تم لوگ پھر آگئے؟"

"آئے نہیں لائے گئے ہیں۔" ڈپٹی شیرف نے اسے آگاہ کیا۔ "یہ اسنومین کے چکر میں ممنوعہ علاقے میں گئے تھے اور رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔"

"ہم کوئی جرم نہیں کر رہے تھے جو رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔"

اس دوران میں کلائڈ بھی وہاں آگیا تھا۔ اس نے سر پر بڑا سا اونی ٹوپا پہنا ہوا تھا۔ وہ ان سے باتیں کرنے لگا اور فیرن ان کے لیے کھانا بنانے لگی کیونکہ اس کا بھوک سے برا حال تھا۔ انہیں وہاں چھوڑ کر پولیس والے چلے گئے تھے لیکن انہوں نے فریڈ اور سارہ کا سامان اپنے قبضے میں رکھا تھا۔ سارہ کو موقع ملا تو اس نے دبی زبان میں فیرن اور کلائڈ کو اپنا کارنامہ سنایا۔ وہ دونوں سن کر خوش ہو گئے کہ سارہ کے پاس اسنومین کی تصاویر ہیں اور وہ اس کی قید سے آزاد ہوئی تھی۔ فیرن نے جوش سے کہا۔ "واؤ... یہ تو شاندار اسٹوری ہو گی۔"

"پھر تصویروں کی وجہ سے اس میں چار چاند لگ جائیں گے۔" کلائڈ نے اس کی تائید کی۔ وہ کرید کرید کر پوچھ رہے تھے کہ اس کے ساتھ کیا گزری۔ سارہ ان کے جوش و خروش کی وجہ سمجھ رہی تھی۔ جب سارہ کی اسٹوری شائع ہوتی اور لوگوں کو اسنومین کے بارے میں پتا چلتا تو اگلے سیزن میں یہاں سیاحوں کی ریل پیل ہو جاتی۔ ظاہر ہے ان کے وارے نیارے ہو جاتے۔ گفتگو کے دوران کلائڈ کا ہاتھ بار بار اپنے سر کی طرف جا رہا تھا اور ایک بار تو اس نے ٹوپی اتار دی تھی لیکن فیرن کے گھورنے پر دوبارہ پہن لی تھی مگر سارہ نے وہ چیز دیکھ لی تھی جسے فیرن اور کلائڈ چھپانا چاہ رہے تھے۔ کھانے کے بعد فریڈ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا واش روم سے آتا ہوں۔"

اس کے جاتے ہی سارہ نے کہا۔ "تو یہ تم دونوں کا چلایا ہوا چکر ہے۔"

"کیا مطلب؟" فیرن انجان بنی۔

"کلائڈ کے سر پر ٹوپی کے نیچے ایک زخم ہے اور یہ زخم اس پتھر سے آیا جو میں نے اسنومین کے سر پر مارا تھا۔"

"لگتا ہے تم بے پے بغیر بہک رہی ہو۔" فیرن نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا لیکن اس کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"میرا خیال ہے گزشتہ سیزن میں تم لوگوں کا کام اچھا نہیں تھا اس لیے تم نے سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ ترکیب سوچی۔" سارہ نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔ "اسنومین کلائڈ بنا اور اپنی لحیم شحیم جسامت کی وجہ سے اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا باقی کسر اسنومین کی کھال نے پوری کر دی۔ ویسے مجھے پاس سے دیکھنے کے باوجود ذرا شک نہیں ہوا کہ اسنومین نقلی ہے۔ تمہاری اداکاری لاجواب تھی۔"

"دیکھو تم کسی غلط فہمی..." کلائڈ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہنا چاہا کہ سارہ نے ہاتھ اٹھایا۔

"یہ بات ابھی مجھ تک محدود ہے ورنہ میں فریڈ کے سامنے بات کرتی۔ اس میں میرا مفاد بھی ہے۔ میں تم لوگوں کا راز فاش نہیں کروں گی۔"

اس بار فیرن نے ہتھیار ڈال دیے۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو پچھلا سیزن بہت خوفناک گزرا۔ یقین کرو ہم نے سامان کی ادائیگی اور ملازموں کی تنخواہیں بھی بڑی مشکل سے ادا کیں۔ گزشتہ سالوں میں جو کمایا تھا وہ اس سال ٹھکانے لگ گیا۔ تب میرے ذہن میں یہ خیال آیا۔"

"اس کا مطلب ہے تم ذہین عورت ہو۔" سارہ نے پُرتحسین لہجے میں کہا۔ "ورنہ یہ تجویز کلائڈ کے ذہن میں آتی۔"

"یہ تو مان ہی نہیں رہا تھا، بڑی مشکل سے میں نے اسے راضی کیا۔ اسنومین کی کھال بھی میں نے خود ہی سی۔ کسی اور سے یہ کام کرواتے تو راز فاش ہونے کا خطرہ تھا۔ میں بتا نہیں سکتی یہ کام کتنا مشکل تھا، پورا ایک مہینا لگا تھا کھال تیار کرنے میں۔ کلائڈ کا قد چھ فٹ چھ انچ ہے، اسے سات فٹ تک پہنچانے کے لیے پیروں میں موٹا سول رکھنا پڑا اور کھوپڑی کا اوپری حصہ بھی اونچا کر کے بنانا پڑا۔"

"تم نے یہ کام بھی لاجواب کیا۔" سارہ نے تسلیم کیا۔ "اب میں اپنی رپورٹ اسی لحاظ سے بناؤں گی کہ اسنومین وجود رکھتا ہے، مجھے یقین ہے لوگ اس پر یقین کریں گے اور بہت سے احمق یہاں کا رخ کریں گے۔"

"ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے۔" فیرن نے کہا۔

"لیکن کچھ سوالات ہیں، اول یہ کہ تم نے مجھے کیوں اٹھایا؟"

"ہمیں معلوم ہے تم رپورٹر ہو کلائڈ تمہیں اپنا ٹھکانا دکھانا چاہ رہا تھا تاکہ تم تصویریں لے لو اور پھر وہاں سے فرار ہو جاؤ۔"

"میرا خیال تھا کہ تم میرے سر پر ہڈی مارو گی لیکن تم نے چار کلوگرام کا پتھر دے مارا۔" کلائڈ نے سر سہلایا۔ "میں سچ مچ کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"تم نے دیکھ لیا تھا کہ ہم کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

"ہاں، میرے پاس بھی نائٹ ویژن ہے۔ میں وہاں سے اپنا سامان نکالنے گیا تھا۔ فرینک کی موت کے بعد ہم نے یہ ڈراما ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"کیسا سامان۔"

"میں اسنومین بن کر ایک دو دن وہاں رہتا اور جنگل میں گھومتا تھا۔ ظاہر ہے مجھے کھانے پینے کا سامان چاہیے تھا۔ غار کے لیے میں نے جنگل سے ہڈیاں تلاش کیں اور گوشت کے ریشے وہاں پھینکے تاکہ غار اسنومین کی رہائش گاہ نظر آئے۔"

"وہ بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے تک مجھے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ اسنومین اصلی نہیں ہے۔"

"تمہیں کیسے شک ہوا؟"

"تمہارے سر کی پٹی سے اور پھر مجھے یاد آیا کہ جب فرینک کو حادثہ پیش آیا تھا اس روز بھی تم صبح سویرے چلے گئے تھے اور شام کو واپسی پر تم لنگڑا رہے تھے۔"

کلائڈ نے سر ہلایا۔ "اس کی چلائی گولی میری ران کو چھوتی گزر گئی تھی، معمولی سا زخم تھا۔"

"پھر تم نے فرینک کے ساتھ کیا، کیا؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" کلائڈ نے جلدی سے کہا۔ "یقین کرو میں نے اسے ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ بس اچانک سامنے آ کر ڈرایا تو وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور وہ نیچے گر کر مر گیا۔"

"وہ اپنی شکاری ذہنیت کا شکار ہوا۔ وہ اسنومین شکار کرنے آیا تھا۔" سارہ نے کہا اور فریڈ کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ ایک گھنٹے بعد شیرف کے آدمی فریڈ کی جیپ لے آئے تھے۔ اس میں ان کا سامان رکھ کر پولیس اپنی تحویل میں انہیں کاؤنٹی کی آخری حد تک چھوڑنے گئی تھی۔ جانے سے پہلے سارہ نے شیرف سے کہا۔

"ہم اگلے سیزن میں دوبارہ آئیں گے کیونکہ اگلے سیزن میں اسنومین کو دیکھنے بے شمار لوگ یہاں آئیں گے۔"

"اسنومین۔" شیرف نے منہ بنایا۔ "اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔"

سارہ نے قہقہہ لگایا۔ "تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

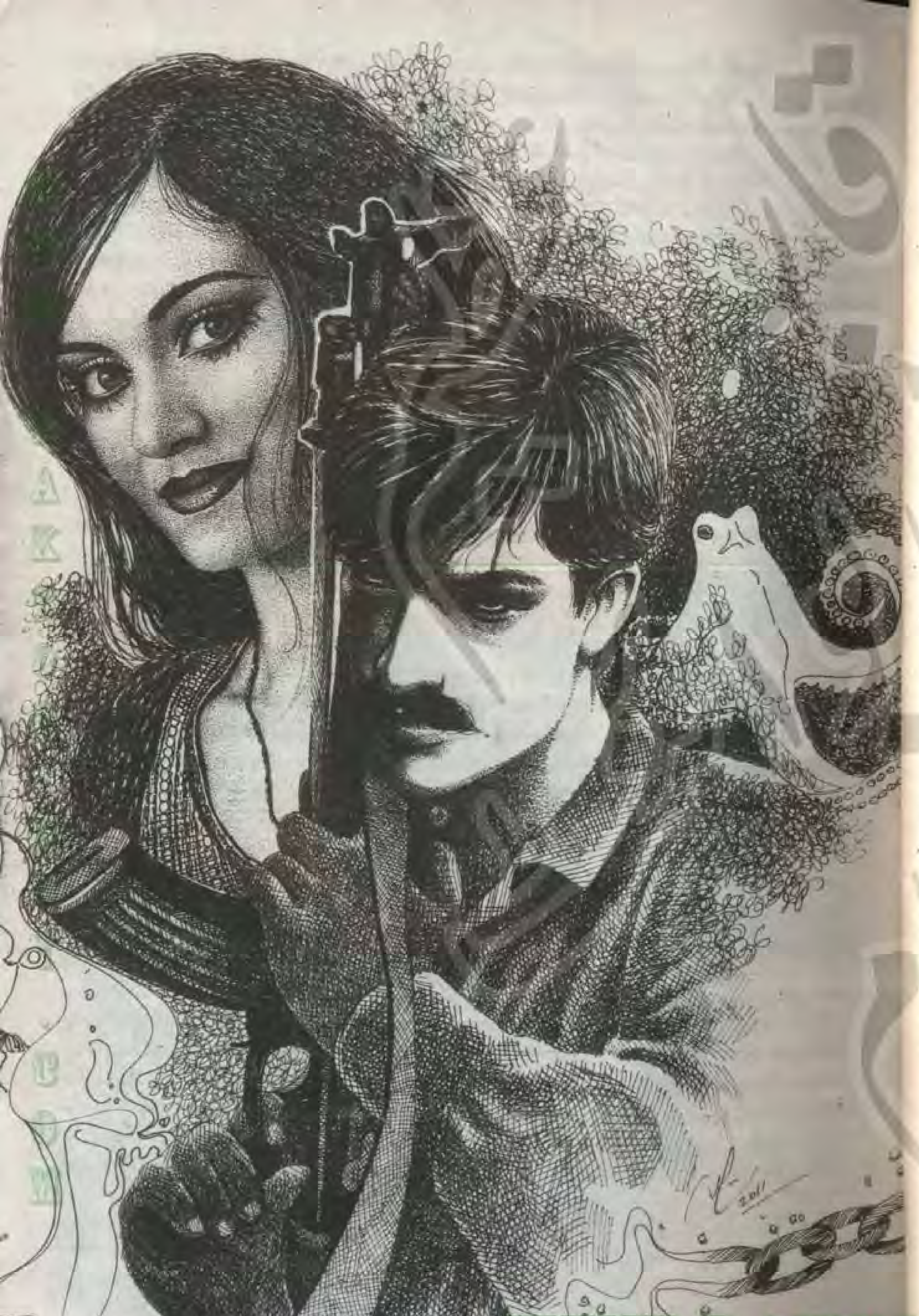

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

قسط 22

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیرالعقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی مگر اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیموں ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ مستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرغنہ اور انڈرورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈرورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغاخانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کرلیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہوجاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرالیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہوجاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرالیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہوجاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پاکر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کرلیتا ہے۔ اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغاخانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ مگلا بوکی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کرلی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور اورنگ زیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کرلیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگ زیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگ زیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے۔ لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرادیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دیں۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈرورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی

اورنگ زیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگ زیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگ زیب معذرت کر کے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کو آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواستگار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگ زیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہوسکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کرلیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحین کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک تعویز دیا جبکہ میڈم روبی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ بعض معاملات میں سراج بھی لاعلم تھا، ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ اس کا ذہن مختلف الجھنوں کا شکار تھا۔ شیخ حامد کے گرد گھیرا تنگ ہوگیا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہوگیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب وشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہوگئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہوگیا۔ حملہ کرانے والے کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیرِ سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہوجاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں۔ میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہوگئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد تھا لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بدستور ایک معمابنی ہوئی تھی۔ سب اس کی موت پر مطمئن تھے جبکہ اورنگ زیب اپنے موقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کرلیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج و اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور آکٹوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ پھنکوا دیا جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے غنڈوں نے تباہ کر دیا۔ وشنو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگ زیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے نگینے نے اس کی رہنمائی اور حفاظت کی اور پرتاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زندہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوگئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر نقب لگائی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اچانک لیاقت حسین کی نظر ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کے نگینے پر پڑی جو سرخ ہو رہا تھا، دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھ آہستہ سے کھسکا کر سراج کا دیا ہوا پستول تکیے کے نیچے سے نکال لیا۔ لیٹے ہی لیٹے اس نے پوزیشن بدل کر گولی داغ دی، دروازے کے ساتھ کھڑا ہوا سایہ ڈکراتا ہوا دروازے کو تھامے تھامے نیچے جھول گیا، اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے دوسروں کو بھی محتاط کر دیا ہوگا۔ لیاقت حسین نے یہ سوچ کر اٹھنے میں دیر نہیں کی، وہ پستول پر اپنی گرفت مضبوط کیے دروازے تک پہنچ گیا۔ اسی لمحے کسی نے باہر سے سرسراتی آواز میں کہا۔

"لیاقت حسین...... باہر نکلنے کی حماقت نہ کرنا ورنہ آج ہم تمہیں بھی بھون کر رکھ دیں گے۔ یہ بھی سوچ لو کہ تمہاری گھر والی ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کا کیا انجام ہوگا؟"

"تم...... تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" لیاقت حسین نے دبنگ آواز میں سوال کیا پھر بڑی پھرتی سے فرش پر لیٹ کر تیزی سے دروازے کی سمت کرالنگ کرنے لگا۔

"فرحین خطرے میں ہے۔" یہ سوچ کر ہی اس کے وجود میں چنگاریاں چھٹنے لگی تھیں لیکن وہ محتاط رہ کر قدم اٹھانے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔

"تم فوری طور پر اپنی گھر والی کو لے کر پندرہ روز کے لیے گاؤں چلے جاؤ۔" تحکمانہ لہجے میں جواب ملا۔

"اس کے بعد چاہو تو واپس آجانا۔"

"اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو......؟" لیاقت حسین نے دروازے کے قریب پہنچ کر پوزیشن سنبھالی۔

"تو تمہاری بیوی کی شرمناک تصویریں سینما کے پوسٹر کی طرح شہر کی گلی کوچوں میں نظر آئیں گی۔"

اس جملے نے جیسے لیاقت حسین کے اندر ٹھہرے بارود کو آگ لگا دی۔ اس نے تڑپ کر اپنے آدھے جسم کو دروازے کے باہر نکالا اس کے ساتھ ہی اس کے پستول سے خارج ہونے والی گولی اس سائے کو زمین پر ڈھیر کر گئی جو فرحین کے سلسلے میں شرطیں منوا رہا تھا۔ لیاقت حسین کی شعلہ بار نظریں اپنے آفس کی طرف اٹھیں۔ اسی لمحے تین آدمی فرحین کو سامنے کیے ہوئے باہر نکلے۔

"اب کوئی دوسری گولی نہ چلانا لیاقت حسین ورنہ ہم تمہاری بیوی کے چیتھڑے اڑا دیں گے۔" سامنے آنے والوں میں سے ایک نے للکار کر کہا۔

"تو میری فکر مت کر لیاقت۔" فرحین نے بے جگری سے کہا۔ "اپنی غیرت ان کتوں کے ہاتھ فروخت نہ کرنا۔"

نیم تاریکی کے باوجود لیاقت حسین کی نظروں نے فرحین کو بغیر اوڑھنی کے تین مردوں کے شکنجوں میں پھڑپھڑاتے دیکھا تو دیوانہ ہو گیا۔ ساری احتیاط کے تقاضوں کو فراموش کر کے اس نے ایک اور گولی داغ دی۔ اس کا نشانہ پکا تھا، فرحین کے سیدھے ہاتھ والا مرد بغیر آواز نکالے اوندھے منہ سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔ باقی دونوں نے فرحین کو گھسیٹ کر اس کی آڑ لے لی۔ اب وہ آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"ہم نے اپنے خاموش پستول تمہاری بیوی کی گردن پر جما رکھے ہیں۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ "دروازے پر اپنی گاڑی پر بیٹھنے کے بعد ہم اسے چھوڑ دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔"

"نہیں لیاقت حسین......" فرحین نے پھر نتائج کی پروا کیے بغیر چلا کر کہا۔ "ان دو غلے کتوں کی گندی زبان پر بھروسا نہ کرنا...... تو وار کر...... میں بھی کام آ گئی تو پروا نہیں۔"

لیاقت حسین کے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ پوزیشن اب ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی خطرہ مول لیتا۔ دونوں افراد نے پوری طرح فرحین کی آڑ لے رکھی تھی۔ وہ فرحین کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے پھاٹک کی سمت بڑھ رہے تھے جب فرحین نے اچانک تڑپ کر خود کو چھڑانے کی خاطر زور لگایا۔ اس کا آدھا جسم نیچے کی طرف جھکا تو لیاقت حسین نے ایک گولی اور چلا دی، اس بار بھی اسے مایوسی نہیں ہوئی، دو میں سے ایک اور کراہتا ہوا نیچے گرا۔ اب صرف ایک رہ گیا تھا جس نے فرحین کو پوری طرح دبوچ لیا تھا۔

"گولی چلا لیاقت......" فرحین نے احتجاج کیا......

"یہ خنزیر اگر اٹھا لے گیا مجھے تو ہم دونوں کی غیرت کو داغ لگ جائے گا...... سن رہا ہے...... میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"فکر مت کر لیاقت کی زندگی...... تجھے کوئی کہیں نہیں لے جا سکتا۔" لیاقت حسین نے تیزی سے جگہ بدلتے ہوئے جملہ ادا کیا۔ سرسراتی ہوئی دو گولیاں اس کے قریب ہی فرش سے ٹکرا کر نکل گئیں۔

"لیاقت......" فرحین ہذیانی انداز میں چیخی۔ "وہ جاننا چاہتی تھی کہ دشمن کی چلائی ہوئی گولیوں کا انجام کیا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے باقاعدہ خود کو چھڑانے کی خاطر زور آزمائی بھی شروع کر دی۔

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی دہکتی ہوئی نظریں کسی موقع کی تلاش میں تھیں۔ وہ طے کر چکا تھا کہ اپنی عزت اور غیرت کو کسی بھی قیمت پر دشمن کے ساتھ نہیں جانے دے گا۔"

"لیاقت...... جواب دے۔" فرحین پر دیوانگی طاری ہونے لگی۔

اسی لمحے باہر سے کسی گاڑی کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری، ایک لمحے بعد ہی ایک وین پھاٹک کے سامنے آ کر رکی کسی نے چلا کر کہا تھا۔

"خطرہ ہے...... نکل چلو۔"

آخری شخص کے لیے بھی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ اپنے باقی ساتھیوں کا انجام دیکھ کر پاگل ہو رہا تھا، گاڑی سے خطرے کا سن کر اور دیوانہ ہو گیا۔ فرحین کو وہ گھسیٹتا ہوا پھاٹک تک لے گیا پھر لیاقت حسین کی توجہ ایک پل کو فرحین کی طرف ہو گئی جو چیختے چیختے یکلخت کراہتی ہوئی زمین پر گری تھی۔ اسی لمحے آخری شخص لپک کر پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ گاڑی کی آواز بھی تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔

لیاقت حسین دیوانوں کی طرح اٹھ کر فرحین کی طرف بھاگا جو فرش پر اوندھی پڑی تھی، وہ پاگلوں کی طرح اسے ٹٹولنے لگا اس کے جسم پر خون یا زخم کا کوئی نشان نہیں تھا، سانس بھی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ پھر اس نے فرحین کے سر پر ہاتھ پھیرا تو دانت پیس کر رہ گیا۔ مجرم جاتے جاتے پستول کی بٹ اس کے سر پر مار کر نکل گیا تھا۔

وہ فرحین کو گود میں اٹھا کر اس کے گالوں اور پیشانی کو بار بار چومتا اپنے کمرے تک آیا۔ فرحین کو بستر پر لٹا کر اس

نے سب سے پہلے اپنا موبائل آن کر کے سراج کو اطلاع دی۔ سیٹھ عثمان کو بھی پوری سچویشن سے آگاہ کر دیا۔ پھر یکلخت اسے...... چوکیدار کا خیال آیا تو الٹے قدموں دوبارہ باہر آ گیا۔ ایک سوال بھی اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔

"کیا رائفل چلنے کی آواز نے بھی آس پاس کے بنگلوں کے چوکیداروں کو نہیں چونکایا......؟"

چوکیدار کے قریب پہنچ کر اس کو اپنے سوال کا جواب بھی مل گیا۔ اس کی رائفل سے کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ پیشانی پر داغی گئی کسی پستول کی گولی نے اسے پل بھر میں موت کی نیند سلا دیا تھا۔ آنے والوں میں سے کسی ایک شخص نے اسے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر قابو کرنے کی کوشش کی ہوگی، وہ غریب فرض کی ادائیگی کی خاطر زندگی کی پروا کیے بغیر اس سے الجھ گیا ہوگا، پھر اسی کشمکش کے دوران وہ خود اپنے پستول سے نکلی ہوئی گولی کا شکار ہو گیا۔ بعد میں پیچھے آنے والوں نے چوکیدار کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ اپنے آدمی کی لاش گھسیٹ کر انہوں نے اسے ایک طرف ڈال دیا پھر اسے واپس لے جانا ان کے مقدر میں نہیں تھا۔

لیاقت حسین نے ہاتھ اٹھا کر اس جاں نثار کے لیے مغفرت کی دعا کی پھر قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں آ گیا جہاں فرحین بدستور بے ہوشی سے دوچار تھی۔

اورنگ زیب اس وقت رات کے کھانے سے فارغ ہوا تھا جب اسے پینتھر کی کال موصول ہوئی۔ روشن اسکرین پر اس کے نمبر دیکھ کر اورنگ زیب کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔ پینتھر کی کال اب اکثر آنے لگی تھی۔

"میری ایک بات غور سے سنو وکی۔" اس نے قدرے کھردرے لہجے میں پینتھر کو اصلی نام سے مخاطب کیا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ بلاضرورت مجھے......"

"اس وقت بھی میں نے ایک خاص وجہ سے فون کیا ہے جناب۔" پینتھر نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس وقت ہنی مون بیوٹی پارلر کے کیفے کے سامنے بیٹھا زبردستی کافی حلق میں انڈیل رہا ہوں۔"

"ون منٹ۔" اورنگ زیب کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "مجھ سے گفتگو کرتے وقت تم بازاری زبان بولنے سے پرہیز کیا کرو۔"

"سوری سر......" پینتھر نے فوراً ہی تلافی کر لی۔

"اس وقت تم اس بدنام پارلر کے قریب کیا کر رہے ہو؟" اورنگ زیب کا لہجہ بدستور خشک تھا۔

"میں نے آپ سے جونی اور شیلا ورما کے......"

"وقت مت برباد کرو۔" اورنگ زیب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں اس قسم کے گندے معاملات میں کبھی نہیں الجھا۔ تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا۔"

"جونی نے دو روز پہلے مس ڈکسن سے ملاقات بھی کی تھی۔" پینتھر نے پھر ایک نئی اطلاع دی۔

"اس ملاقات میں تمہیں کہیں غیر قانونی بات نظر آئی؟"

"شیلا ورما کیا خدمت انجام دے رہی ہے اس کا علم بھی ہوگا آپ کو......؟"

"فضول باتوں سے آئندہ پرہیز ہی کرنا۔" اورنگ زیب نے جھنجلا کر کہا۔ "پولیس کے دانش مند افسران ہمیشہ جوئے کے اڈوں اور عصمت فروشی کا کاروبار کرنے والوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ ان جگہوں سے بھتہ وصول کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔"

"میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں سر......"

"کہو......"

"لڑکیاں کہاں پہنچائی جاتی ہیں یہ بات شاید جونی کے علاوہ خود شیلا ورما کو بھی نہیں معلوم۔" پینتھر نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

"پھر...... تم اتنی گہرائی میں جانے کی حماقت کیوں کر رہے ہو؟"

"سر...... آپ نے بھی سکندر علی شاہ کا نام ضرور سنا ہوگا؟"

"یہ نام درمیان میں کہاں سے آ گیا؟" اورنگ زیب چونکا۔

"مجھے شبہ ہے کہ اس کے ڈانڈے بھی شیلا ورما سے ملتے ہیں۔" پینتھر نے بات جاری رکھی۔ "اس کی دوسری بیوی بناؤ سنگار کرانے کی خاطر اکثر شیلا ورما کے پارلر پر ہی آتی ہے۔"

اس بار اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ شیلا ورما اور سکندر علی شاہ کی دوسری بیوی کے حوالے کے بعد وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"سر......" پینتھر نے اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ وہ بھی شیلا ورما کے لڑکیوں والے کاروبار میں برابر کی حصہ دار ہے۔"

"اس شبہے کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟" اورنگ زیب نے پہلی بار سنجیدگی سے پوچھا۔

"میری معلومات کے مطابق اس کا تعلق بھی کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑے خاندان سے نہیں تھا، خوب صورتی اور رنگ روپ کی وجہ سے پتھر سے نگینہ بن گئی۔ جھونپڑی سے نکل کر محل تک پہنچ گئی۔''

''نگینہ شاید سکندر علی شاہ کی دوسری بیوی کا نام ہے؟''

''جی ہاں سر...... اس کا اصلی نام جمیلہ تھا، باپ کسی سرکاری دفتر میں معمولی کلرکی کرتا تھا۔'' پینتھر نے اپنی معلومات کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔ ''قسمت اچھی تھی جو کسی ذریعے سے سکندر علی شاہ تک پہنچ گئی۔ کچھ دنوں داشتہ رہی پھر بیوی بننے کے ساتھ ساتھ نگینہ بھی بن گئی۔ ایک دو بار میں نے اسے جونی کے اس عارضی کمرے میں بھی جاتے دیکھا ہے جہاں وہ دن بھر رہتا ہے ورنہ...... اس کی اکثر راتیں شیلا ورما کی خواب گاہ میں ہی بسر ہوتی ہیں۔''

''تم...... اس گندے معاملات میں کیوں الجھے ہوئے ہو......؟'' اورنگ زیب نے دوبارہ الجھ کر سوال کیا۔

''اس کاکروچ کی کھوج میں ہوں سر...... جو صرف گندی نالیوں ہی میں سکون کی سانس لیتا ہے۔'' اس بار پینتھر نے معنی خیز انداز میں کاکروچ کی وضاحت کی تو اورنگ زیب چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

''میں تمہاری بات کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔ جو قدم اٹھانا محتاط رہ کر اٹھانا، ورنہ کسی بڑے خطرے سے بھی دوچار ہو سکتے ہو۔''

''اسی سلسلے میں ایک درخواست کرنا چاہتا تھا۔''

''وہ کیا......؟''

''آپ اپنے کسی خاص بھروسے کے آدمی کو نگینہ کی نگرانی پر لگا دیں۔ جونی اور شیلا ورما کو میں سنبھال لوں گا۔''

پینتھر سے بات ختم کرنے کے بعد بھی خاصی دیر تک وہ کاکروچ کے حوالے سے آکٹوپس کے بارے میں غور کرتا رہا پھر بستر پر لیٹتے لیٹتے اسے سراج کی کال ملی تو اس نے بڑی تیزی سے لباس تبدیل کیا اور سیٹھ عثمان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان فرحین کو لے کر اسپتال روانہ ہو چکے تھے۔ لیاقت حسین کو قانونی تقاضوں کی خانہ پری کی خاطر بنگلے پر ہی رکنا پڑا۔ علاقے کی پولیس کے آنے کے دس منٹ بعد اورنگ زیب اور سراج بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔

بنگلے کے چوکیدار کے علاوہ پانچ لاشوں کا جائے وقوعہ سے ملنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لیاقت حسین ایک طرف خاموش کھڑا ان لاشوں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں صرف فرحین کا خیال نشتر بن کر چبھ رہا تھا۔ سراج اس کے قریب آیا تو وہ پھٹ پڑا، ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

''صاحب...... ان کتے کے پلوں نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی...... مجھے افسوس ہے کہ ایک حرام کا تخم بچ کر نکل گیا۔''

''فرحین زخمی تو نہیں ہوئی؟'' سراج نے اس کی دلجوئی کی۔

''وہ بے ہوش ہے صاحب۔ جو شخص میرے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا اسی نے بٹ مار کر فرحین کو بے ہوش کیا تھا ورنہ......''

''فکر مت کرو...... عثمان اور بھابی اس کے ساتھ گئے ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

دو گھنٹے کی ضروری کارروائی کے بعد لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ علاقے کا ایس ایچ او سراج کے قریب آ کر بولا۔ ''سر...... مجھے لیاقت حسین کا بیان بھی درکار ہے۔''

''کیری آن...... بٹ بی پولائٹ۔'' سراج نے اسے انگریزی میں سمجھایا۔

لیاقت حسین کی پیشانی پر شکنیں ابھرنے لگیں، اس کے اندر غیرت کا ایک طوفان پھر ٹھاٹیں مارنے لگا۔

''لیاقت حسین۔'' ایس ایچ او نے اسے براہ راست مخاطب کیا۔ ''تمہیں اس بات کا علم کس وقت ہوا کہ آنے والے تمہاری عورت کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے؟''

''میں سوتے سوتے جاگا تھا......'' لیاقت حسین نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ''اس وقت وہ بستر پر نہیں تھی باہر کا دروازہ بھی کھلا تھا جہاں ایک آدمی کھڑا تھا، میں اندھیرے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔''

''پھر......''

''پھر میں نے ایک سائیلنسر لگا پستول تکیے کے نیچے سے نکالا اور اسے اوپر روانہ کر دیا۔'' لیاقت حسین نے چیختے لہجے میں کہا پھر ایک ہی سانس میں تمام کہانی دُہراتا چلا گیا۔

''مجرم تمہاری عورت کو کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ انہیں تم سے کیا دشمنی تھی؟'' ایس ایچ او نے مزید وضاحت چاہی۔ ''کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔''

''وہ ولد الحرام زندہ ہوتے تو میں ان سے دریافت کرنے کے بعد ہی تمہارے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔'' لیاقت حسین نے حقارت سے جواب دیا۔ اس کے اندر سلگتی آگ پھر بھڑکنے لگی تھی۔ خون کی گردش تیز ہونے کے ساتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ اس کی آواز بھی تیز ہونے لگی۔
"کیا بات ہے؟" اورنگ زیب نے قریب آتے ہی سراج کی سمت دیکھا۔
"اٹ از آل رائٹ۔" سراج نے جواب دیا پھر وہ براہ راست لیاقت حسین سے مخاطب ہوا۔ "مجھے تمہارے جذبات کا خیال ہے لیاقت حسین لیکن کاغذات کی خانہ پری بھی ہماری ضرورت ہوتی ہے۔"
"فرحین صرف تمہاری نہیں، ہماری بھی عزت اور وقار کا مسئلہ بن گئی ہے۔" اورنگ زیب نے لیاقت حسین کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ لہجے میں کہا۔ "تم نے اب تک پولیس کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ بھی تمہیں یاد ہیں۔"
"مم...... میں کیا بتاؤں صاحب کہ آنے والے جنگلی کتے کون تھے...... کس کے اشارے پر بھونک رہے تھے؟" لیاقت حسین نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے غریب چوکیدار کو بھی نہیں بخشا صاحب...... اب اس کے گھر کا چولہا کون جلائے گا؟ وہ دو بچوں کا باپ تھا۔ میری ہی طرح شہر آکر اس نے بھی چار پیسے کمانے کی غلطی کی تھی۔ یہاں جو لوٹ مار ہوتی ہے اس کا سوال جواب ہم سے کیوں ہوتا ہے؟ زخم پر مرہم رکھنے کے بجائے اسے سوالوں کے نشتر لگا لگا کر اور گہرا کرنا...... یہ کون سا قانون ہے؟ کہاں کا انصاف ہے؟"
اورنگ زیب اسے سمجھانا چاہتا تھا جب لیاقت حسین کا موبائل گنگنانے لگا، اس نے جیب سے موبائل نکال کر آن کرلیا، دوسری طرف سے سیٹھ عثمان کی محبت بھری آواز ابھری۔
"ڈاکٹر پوری طرح مطمئن ہیں لیاقت حسین، ان کا کہنا ہے فرحین کو بیس پچیس منٹ بعد ہوش آجائے گا۔ تم فکر مت کرو، راحیلہ ہے اس کے پاس، میں تمہاری طرف واپس آرہا ہوں۔"
"فرحین کو گہرا زخم تو نہیں آیا......" لیاقت حسین نے جذباتی انداز میں دریافت کیا۔
"نہیں...... معمولی سی سوجن ہے، ایک دو روز میں وہ بھی جاتی رہے گی۔ سراج کہاں ہے؟"
جواب میں لیاقت حسین نے موبائل سراج کی طرف بڑھا دیا۔ اس دوران ایس ایچ او بھی اس کی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ لگا چکا تھا چنانچہ اس نے لیاقت حسین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں اب کچھ کچھ حالات کا اندازہ لگا چکا ہوں اس لیے آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ آپ کا بیان پھر کسی وقت......"
"نہیں......" اورنگ زیب نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ "آپ میری موجودگی میں باقی کاغذات بھی مکمل کرلیں۔"
اورنگ زیب کے درمیان میں آجانے کے بعد لیاقت حسین نے وہ تمام باتیں تفصیل سے بتادیں جو گزر چکی تھیں، بعد میں دستخط بھی کردیے۔ پولیس کے جانے کے بعد سراج نے فوری طور پر ذاتی اختیارات کا استعمال کیا، دونوں بنگلوں کی دیکھ بھال کے لیے اس نے سادہ لباس میں کچھ افراد کو وہاں طلب کرلیا۔ اسی دوران سیٹھ عثمان بھی آگئے۔ لیاقت حسین فرحین کے لیے پریشان تھا اس لیے وہ سب سے اجازت لے کر اسپتال روانہ ہوگیا۔

دوسری صبح سراج ایس پی اورنگ زیب کے آفس میں موجود تھا۔
"کیا رپورٹ ہے؟"
"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دوپہر تک مکمل ہوجائے گی۔" سراج نے اپنی گزشتہ رات کی مصروفیت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ "جو مارے گئے تھے ان میں سے تین پولیس کو مطلوب خطرناک مجرم تھے، باقی دو کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔"
"اوہ......" اورنگ زیب نے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے آنے سے پیشتر ابھی میں نے لیاقت حسین کو بھی موبائل پر کنٹیکٹ کیا تھا، فرحین کے ہوش میں آنے کے بعد اب وہ خاصا ریلیکس ہوگیا ہے۔ اس نے ایک نئی بات بتائی ہے۔ مجرم اس سے مطالبہ کررہے تھے کہ وہ کم از کم پندرہ روز کے لیے گاؤں چلا جائے۔"
"آئی۔سی" سراج چونکا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آکٹوپس بھی لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں سے خائف ہے۔"
"اس کا تجربہ ہم دونوں کو بھی ہوچکا ہے۔ کنول نے مرنے سے پیشتر جو بیان دیا وہ بھی آکٹوپس کے سلسلے میں میرے شبہے کی تصدیق کرچکا ہے لیکن......" اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "ایک سوال ابھی قابل حل ہے۔"
"وہ کیا......؟"
"حالات کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ وہ اسی شہر میں کہیں موجود ہے لیکن کہاں؟"

"ہمیں اس کے لیے بھی اپنے کھوجیوں سے کام لینا ہوگا۔"
کچھ دیر ان کے درمیان شیخ حامد کے بارے میں اہم مشورے ہوتے رہے پھر اورنگ زیب نے سرسری لہجے میں پوچھا۔
"شیلا ورما اور اس کے بیوٹی پارلر کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟"
"دونوں بدنام ہیں لیکن آپ کو اس وقت اس کا خیال کیسے آگیا؟"
"کل میرے کسی آدمی نے ایک نئی اطلاع دی ہے۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "سکندر علی شاہ کی دوسری بیوی نگینہ بھی شیلا ورما کے بیوٹی پارلر پر آتی جاتی ہے۔ جونی کے خاص کمرے میں بھی اس کا خاصا وقت گزرتا ہے۔"
"یہ اطلاع ہمارے لیے کارآمد ہوسکتی ہے۔" سراج نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "جونی اور نگینہ دونوں فٹ پاتھ سے اٹھ کر اب عیش و عشرت کی زندگی بسر کررہے ہیں۔"
"سکندر علی شاہ کے بارے میں میری معلومات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔" اورنگ زیب نے کہا۔ "وہ کس خانے میں فٹ ہوتا ہے؟"
"اس کا شمار...... عثمان اور رستم علی آغا خانی سے اونچی کیٹیگری میں کیا جاسکتا ہے۔" سراج نے مختصراً تفصیل بیان کی۔ "کچھ خاص حالات کی وجہ سے اب وہ صرف محدود سرکل میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اس کے اثر و رسوخ بھی بہت اونچے لیول تک ہیں۔"
"خاص حالات سے تمہاری کیا مراد ہے؟"
"میں ایک دو روز میں اس کی فائل نکلوا کر آپ کے حوالے کردوں گا جس میں کچھ اہم رپورٹیں بھی موجود ہیں۔"
"پلیز......" اورنگ زیب نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں اب ہمارے لیے ضروری ہے کہ شیلا ورما کے علاوہ جونی اور نگینہ کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھی جائے۔"
"ٹھیک ہے، میں ایک دو خاص آدمیوں کو اس کام پر لگا دیتا ہوں۔"
"جونی کے بارے میں کیا کہو گے؟"
"دھندا کرنے والا...... خسرہ......" سراج نے حقارت کا اظہار کیا۔ "اسی کو دریافت کرنے کے بعد شیلا ورما نے شوہر سے طلاق لے لی تھی۔"
"میرے مخبر کی اطلاع کے مطابق شیلا ورما کو خود بھی نہیں معلوم کہ اس کے پارلر سے سپلائی کی ہوئی لڑکیاں کہاں بھیجی جاتی ہیں...... یہ گندا کام بھی جونی انجام دیتا ہے......"
اورنگ زیب کچھ دیر خاموش رہا پھر معنی خیز انداز میں بولا۔
"موجودہ گفتگو کے بعد تم آکٹوپس کو کس خانے میں فٹ کرو گے؟"
"میں سمجھا نہیں......"
"خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کے سلسلے میں اس کی نیت بھی کبھی ٹھیک نہیں رہی۔"
"میں اس سے اتفاق نہیں کروں گا۔" سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "وہ جن حالات سے گزر چکا ہے اس کے بعد کم از کم ایسے تھرڈ ریٹ لوگوں سے دور ہی رہنے کو ترجیح دے گا۔"
اورنگ زیب کی نظریں سراج پر جمی رہیں پھر اس نے گفتگو کا رخ تبدیل کردیا۔
"افضل خان اور شبنم کی سیکیورٹی سے غافل نہ رہنا۔ وہ دونوں بھی ہمارے لیے اہم ہیں۔"
"میں نے پہلے ہی اس کا خیال رکھا ہے۔"
"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"
"اگر الماس کے کہنے پر عمل کروں تو مجھے یہاں سے اٹھ کر سیدھا آپ کی رہائش گاہ پر جانا ہوگا۔"
"کوئی خاص بات......؟" اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
"لیاقت حسین کے حادثے کی تفصیل سننے کے بعد اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ آپ کا سارا ضروری سامان آپ کو مطلع کیے بغیر سمیٹ کر گھر پہنچا دوں۔" سراج نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اس کا بھی یہی خیال ہے کہ لیاقت حسین کے بعد مجرم آپ کو بھی خدانخواستہ نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کریں گے۔"
"اس خطرے کا اظہار میں بھی کرچکا ہوں۔ اسی لیے میں نے تمہارے بنگلے کے اوپر کا اسٹور روم صاف کرایا ہے لیکن...... میں گھر سے سامان اٹھا کر کسی مجرم کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتا کہ اس سے خائف ہوں۔"
"پھر...... آپ کا کیا حکم ہے......" سراج نے معصومیت سے دریافت کیا تو اورنگ زیب کو ہنسی آگئی۔
"تم اپنے آفس جاؤ، میں رات کو الماس سے بات کرلوں گا۔"
"خدا کرے کہ اس کے سر میں آپ کی بات سما جائے۔" سراج نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ پھر مسکراتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا کمرے سے نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا جب اورنگ زیب نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

''آکٹوپس کی عالیشان کوٹھی کے بارے میں کورٹ نے کیا فیصلہ سنایا ہے؟''

''اسے بحق سرکار ضبط کرلیا گیا ہے، بیلف (Baliff) کی موجودگی میں ایک ہفتے بعد سرکاری آکشنر نیلام کرے گا۔''

''کیا تمہیں اس نیلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی......؟'' اورنگ زیب کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''میں سمجھا نہیں......''

''خطرناک جانور جو پناہ گاہ بناتے ہیں اس کے کئی چور راستے ہوتے ہیں جس کا علم اسی قبیلے کے دوسرے جانوروں کو بھی ہوسکتا ہے۔'' اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا اب بھی تم میرا مقصد نہیں سمجھے؟''

''رات بھر کا جاگا ہوا ہوں اس وقت میری عقل کام نہیں کررہی۔''

''پھر گھر جاکر آرام کرو لیکن میں ایک بے حد ضروری کام تمہیں سونپ رہا ہوں۔ اسے رازداری سے کرنا شرط ہے۔'' اورنگ زیب نے مدھم لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان لوگوں کی فہرست درکار ہوگی جو اخبارات میں اشتہار آنے کے بعد آکشنر کے پاس اپنا نام اور بڈ (Bid) جمع کرائیں گے۔''

''آئی۔سی۔'' سراج کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ ''اتنی اہم بات میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی۔''

''دماغ کا تعلق بھی نیند ہی سے ہوتا ہے۔'' اورنگ زیب نے بے تکلفی سے جواب دیا پھر اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

پرتاب بھوشن اپنی کٹیا میں پاؤں پسارے لیٹا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں اس وقت چھت پر جمی تھیں جبکہ سلونی نیم عریاں حالت میں بیٹھی اس کے پیروں کی چمپی کررہی تھی، اس کے ہاتھ بھی کئی بار جان بوجھ کر رپٹے تھے لیکن پرتاب کے سر پر جوں تک نہیں رینگی۔

''آج کس وچار میں گم ہو مہاراج......؟'' اس نے بڑی لگاوٹ سے پرتاب کو مخاطب کیا۔

''تجھے بتانے کی بات نہیں ہے......'' پرتاب بھوشن نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''میں کچھ دیر بعد آجاؤں؟'' سلونی نے اپنی موجودگی کا مقصد بیان کرنے کی خاطر بھرپور انگڑائی لی۔

''کیوں؟ پیر داتے ہوئے تیری جان نکل رہی ہے؟''

''نہیں......لیکن میں نے آج تک کبھی کسی کے پیر بھی نہیں دبائے۔'' سلونی کے اندر کی عورت جاگنے لگی۔ ''مندر کے ٹھکے ہوئے پجاری بھی میری سیوا کرنے کی راہ تکتے رہتے ہیں پر......تمہاری بات اور ہے۔''

''چل......دفع ہوجا......'' پرتاب نے اسے جھڑک دیا۔ ''میں بھی ایک لنگوٹی کو آٹھ دس بار استعمال کے بعد اتار پھینکتا ہوں۔ کنجری کہیں کی۔''

سلونی بل کھا کر اٹھی......کسی ناگن کی طرح پرتاب کو گھورتی لہراتی کٹیا کے باہر نکل گئی۔ پرتاب بھوشن کے دماغ میں پھر لیاقت حسین کا خیال کسی بگولے کے مانند چکرانے لگا......اس نے بھوانی کے لیے کئی بار لمبے لمبے جاپ کیے تھے۔ بھوانی نے خوش ہوکر اسے مدھو پجارن دان کردی تھی......وہ کھرا سونا تھی، ہر بار ایک نیا سواد دیتی تھی لیکن لیاقت حسین کو تباہ کرنے کے سلسلے میں وہ بھی پراسرار طور پر جل بھن کر راکھ ہوگئی تھی۔ کچھ دنوں پہلے لیاقت حسین کو ہتھیلی لگانے والی کسی شکتی نے اسے منڈل سے نکال کر بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔ بار بار کی شکست نے پرتاب بھوشن کے اندر سلگتی آگ کو اور بھڑکا دیا تھا۔ اس نے پھر بھوانی کو وچن دیا تھا کہ جب تک اس مسلے کو نشٹ نہیں کردے گا، آرام سے نہیں بیٹھے گا۔

خاصی دیر وہ اسی خیال سے الجھتا رہا پھر کٹیا سے نکل کر مندر کے بڑے پجاری مدن چند کی طرف چلا گیا۔

''آج ادھر کیسے آگئے مہاراج؟'' مدن چند کے خاص سیوک نے اسے دروازے پر روک کر پوچھا۔

''مدن ہے اندر......؟''

''ہاں مہاراج پرنتو......اس سمے......''

''جانتا ہوں۔'' پرتاب نے اس کے گالوں پر چپت مارتے ہوئے رازداری سے پوچھا۔ ''اس سمے بھی کسی سندری پجارن کی ہنڈیا بھون رہا ہوگا۔''

سیوک نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ پرتاب کو اس کا درمیان میں آنا اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ بڑے پجاریوں نے اسے خاصی ڈھیل دے رکھی ہے۔

''سلونی تو نہیں ہے......؟'' پرتاب بھوشن نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''وہ اب ہنڈیا نہیں رہی مہاراج۔'' سیوک نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ''آج کل تو اندر سبھا کی ایک اپسرا نے اپنا جادو جگا رکھا ہے، کسی کو پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے

دیتی۔ تھیا مرچ کی انو سار پورے مندر میں کولہے مٹکاتی پھرتی ہے، سب ہی دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔''

''پھر......'' پرتاپ نے سیوک کے قریب ہوکر رازداری سے پوچھا۔ ''مدن چند نے کون سا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے؟''

''آج پہلی بار کواڑ کو کنڈی لگی ہے مہاراج......اندر کیا ہورہا ہے یہ کسے معلوم۔'' سیوک نے چٹخارا لے کر کہا۔ ''باہر نکلے گی تو اندر کا بھید بھی کھل جائے گا۔''

''کتنی دیر سے اندر ہے؟''

''تمہارے آنے سے بیس منٹ پہلے ہی اندر گئی ہے۔'' سیوک نے کہا۔ ''بڑے پجاری جی اسے گیتا کا پاٹھ بھی پڑھاتے ہیں۔''

اسی لمحے دروازہ کھلا اور پرتاب بھوشن کی نظروں کے سامنے بھی ایک بجلی کوند گئی۔ سیوک نے جو کہا تھا وہ جھوٹ نہیں تھا، نئی کمسن پجارن کے انگ انگ سے مستی پھوٹتی تھی، اس نے ایک نظر پرتاب بھوشن پر بھی ڈالی پھر اس طرح کترا کر نکل گئی جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ پرتاب کے دل پر سانپ لوٹ کر رہ گیا۔

مدن چند نے ہمیشہ کی طرح پرتاپ کا سواگت اچھے ہی شبدوں سے کیا تھا۔ اسے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے بولا۔

''آج ادھر کا راستہ کیسے بھول گئے مہاراج؟''

''تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' پرتاب بھوشن نے بڑے پن سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ تم اس روگی کا کوئی علاج بتا سکو۔''

''کس روگی کی بات کررہے ہو......؟''

''وہی مسلا لیاقت حسین۔'' پرتاب نے کہا۔ ''ایک بار پھر وہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا پرنتو میں نے بھی کالی کی سوگند اٹھا رکھی ہے، یا تو اس پاپی کو نشٹ کروں گا یا پھر......''

''تم نے کہا تھا کہ کوئی شکتی ہے جو اس کی بھی سہائتا کر رہی ہے؟'' مدن چند نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''ہاں......ہے ایک سایہ جو ابھی تک میری پکڑ میں نہیں آسکا......وہی کئی بار میرا راستہ کھوٹا کرچکا ہے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے؟ تمہاری آگیا ہو تو میں بھی کچھ سوچ بچار کروں۔'' مدن چند نے سنجیدگی سے کہا۔ ''درگا کے لیے میں نے بھی کئی جاپ کیے ہیں، وہی میری سہائتا بھی کرتی ہے۔ اس کی شکتی بھی اپرم پار ہے۔''

''میں اسی کارن آیا تھا......تم بھی ایک بیٹھک لگا کر اسے کھوج لو ورنہ میں نے اسے قبر تک نہ چھوڑنے کی سوگند اٹھا رکھی ہے۔''

مدن چند نے اسی وقت اشنان کیا پھر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا، اس کے ہونٹ کسی منتر کا جاپ کرنے لگے، پرتاب نے نظریں گھما کر اس کے بستر کی طرف دیکھا تو دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ بستر پر اسے کوئی شکن نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے ایک نظر میں تاڑ لیا کہ نئی پجارن کے سلسلے میں ابھی تک شاید مدن چند کی دال بھی نہیں گلی تھی ورنہ چادر کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور آڑھا ترچھا نظر آتا۔ وہ نئی پجارن کو دانہ ڈالنے کے بارے میں سوچ بچار میں مصروف تھا جب مدن چند اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ اس کے چہرے پر بڑی گمبھیر سنجیدگی مسلط تھی۔

''کیا اشارہ دیا درگا دیوی نے؟'' پرتاب بھوشن نے پوچھا۔

''میرا کہا مانو تو تم اس مسلے کا پیچھا چھوڑ دو......یہ روگ ہمارے بس کا نہیں ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو مدن چند؟''

''درگا دیوی نے یہی اشارہ دیا ہے۔''

''پرنتو میں نے کالی دیوی کو وچن دے رکھا ہے اسے کیسے توڑ سکتا ہوں۔''

''یہ تم جانو لیکن......درگا دیوی بھی پاروتی دیوی ہی کا ایک روپ ہے۔''

''وہ......وہ شکتی کون ہے جو اس مسنڈے کی سہائتا کررہی ہے؟''

''میں بھی نہیں بتا سکتا مگر درگا کا کہا جھوٹ بھی نہیں ہوتا۔'' مدن چند دبی زبان میں بولا۔ ''مجھے کیول یہی اشارہ ملا ہے کہ تم اس شکتی کا کوئی توڑ نہیں کرسکو گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے مدھو کی طرح تم بھی کام آجاؤ۔''

جواب میں پرتاب بھوشن سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لمحہ بھر کچھ سوچتا رہا پھر اس طرح ہنسنے لگا جیسے مدن چند نے اس سے کوئی مذاق کیا ہو۔

''میں تم سے جھوٹ کیوں کہوں گا مہاراج۔'' مدن چند نے اپنایت کا اظہار کیا۔ ''جو نظر آیا وہ تمہارے بھلے کے لیے بتا دیا۔''

''میں جانتا تھا کہ یہ بکھیڑا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔'' پرتاب بھوشن نے سینہ تان کر گھمنڈ سے کہا۔ ''چھوڑو......میں خود ہی اس سے نمٹ لوں گا۔''

''جیسی تمہاری مرضی مہاراج۔''

''ایک بات اور پوچھوں؟'' اس بار پرتاب بھوشن

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے رازداری سے سوال کیا۔

”پوچھو مہاراج...... میں تم سے غلط نہیں کہوں گا......“

”یہ نئی گوریا (چڑیا) جو ابھی پھر پھراتی باہر گئی ہے تمہارے جال میں پھنسی یا ابھی دانہ چگ چگ کر لال جھنڈی دکھا رہی ہے؟“

”اس کو ایک نظر دیکھ کر بھی کی رال ٹپکتی ہے۔“ مدن چند نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”ابھی نئی نئی آئی ہے تو کچھ دنوں نخرے بھی اوش دکھائے گی۔“

”میرا بھی دھیان رکھنا گرو۔“ پرتاب بھوشن نے اٹھتے ہوئے مدن چند کے پٹھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”سلونی میں اب پہلا جیسا سوندھا پن بھی نہیں رہا......“

مدن چند نے مسکرا کر بات ٹال دی۔

☠☠☠

دو روز سے وشنو صرف ہوٹل کے کمرے ہی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ لوچن کو اس کی وجہ بھی معلوم تھی، اسی کی شکایت پر ملٹری کا ایک میجر آ کر اسے آخری وارننگ دے گیا تھا۔ لوچن انجان ہی بنا رہا۔

اس وقت بھی وشنو بالکونی میں کرسی ڈالے بیٹھا باہر کا نظارہ کر رہا تھا جب اس نے اچانک جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال کر آن کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بس ایک پل کو خوشی سے چونکا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے نظریں گھما کر لوچن کی طرف دیکھا جو بہ ظاہر اس وقت بھی صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا پھر بھی وشنو نے مدھم لہجے میں کہا۔

”میں پہلے بھی ایک بات بار بار دہرا چکا ہوں، باس سے براہ راست بات کیے بغیر تمہارے کہنے پر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔“

”کیا تم نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے؟“

”اوہ......“ وشنو مسکرایا۔ ”وہ خبر پولیس کی طرف سے بھی چھپوائی جا سکتی ہے۔“

”میری بات دھیان سے سنو۔“ اس کی بات کو نظرانداز کر کے کہا گیا۔ ”باس کا حکم ہے کہ تم فوری طور پر اس چینی سے دور ہو جاؤ۔“

”دو روز پہلے ملٹری کے ایک میجر نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔“ وشنو نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”جانتے ہو کیوں؟“

”ہاں...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم پچاس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگانے کے بعد کسی سرکس کے بازی گر کی طرح قلابازی کھا کر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہو......“

”میں پھر وہی مطالبہ دہراؤں گا......“ وشنو نے پھر بگ باس کے ساتھ بات کرنے کی شرط باندھی۔

”ایک منٹ انتظار کرو......“

وشنو نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی نظریں نیچے سڑک پر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جب وہ دوسری جانب سے باس کی مخصوص آواز سن کر خوشی سے اچھل پڑا۔

”میں...... میں وشنو بول رہا ہوں، آپ کا نمک حلال سیوک۔“

”ایک بات دھیان سے سن لو وشنو۔“ دوسری جانب سے کرخت لہجے میں کہا گیا۔ ”دوبارہ تم مجھ سے براہ راست بات کی ضد کبھی نہیں کرو گے۔“

”اب تمہاری آواز سن لی ہے تو تمہارے کتوں کی بات بھی برداشت کر لوں گا۔“ وشنو نے بازاری انداز میں اپنی تابعداری کا یقین دلاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا حکم ہے میرے لیے؟“

”ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ دو سادہ لباس والے تمہاری نگرانی پر مامور کر دیے گئے ہیں۔“ اس بار بھی بولنے والے کے لہجے کی ترشی برقرار رہی۔ ”انہیں کسی کے اشارے پر ہی یہ ڈیوٹی سونپی گئی ہے۔“

”جانتا ہوں۔“ وشنو نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں بھی اسے جان بوجھ کر ڈھیل دے رہا ہوں، چاہتا تو اسی کا روپ دھار کر نو دو گیارہ ہو چکا ہوتا۔ قد کے معمولی فرق کو کون دھیان سے دیکھتا ہے۔“

”ایک لمحے پہلے جو کہا گیا تھا اسی پر عمل کرو......“ تحکمانہ لہجے میں جواب دیا گیا۔ ”دوسرا حکم بعد میں دیا جائے گا۔“

”مجھے فوری طور پر کچھ رقم کی بھی......“

”چوبیس گھنٹے کے اندر وہ بھی مل جائے گی۔“ اس جملے کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

وشنو نے موبائل جیب میں رکھا...... بالکونی سے ریلنگ کے قریب کھڑے ہو کر نیچے کے حالات کا نہایت غور سے پہلی بار جائزہ لیا پھر ٹہلتے ہوئے انداز میں اندر آ کر لوچن کے قریب بیٹھ گیا۔ لوچن نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، اس وقت بھی وہ فری اسٹائل کشتی دیکھنے میں محو تھا۔

”اسی کمرے میں تمہارے ساتھ میں بھی رہتا ہوں۔“ وشنو نے اسے متوجہ کرنے کی خاطر کہا۔

”جانتا ہوں......“ لوچن نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

”یہ بھی ضرور جانتے ہو گے کہ دو روز پہلے فوجی مجھ سے ملاقات کرنے کیوں آئے تھے؟“

”تمہارا کوئی ذاتی معاملہ رہا ہوگا......“ لوچن کی نظریں بہ دستور ٹی وی اسکرین پر جمی رہیں۔

”آج کسی نے میرے شبہے کی تصدیق بھی کر دی ہے۔“ وشنو نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“

لوچن نے ٹی وی بند کر دیا۔ اس کے تیور بھی اچانک ہی تیکھے ہو گئے تھے۔ وشنو کو اس نے تیز نظروں سے گھورا۔

”کھل کر بات کرو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”وہ تمہارے اشارے پر کسی کے کہنے سے ہی آئے تھے۔“ وشنو بے پروائی سے مسکرایا۔ ”تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو تم نے کیا۔ ہمارے لیے وفاداری بھی شرط ہوتی ہے لیکن...... تم بھی جانتے ہو کہ میں کس کا آدمی ہوں، جیل میں ہماری پہلی ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی فرار ہوئے تھے۔“

”اب کیا بتانا چاہتے ہو......؟“ لوچن نے سوال کیا، اس کے تیور بھی تیکھے ہونے لگے تھے۔

”یہی کہ ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔“ وشنو نے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں زیادہ دنوں کی پابندی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”کیا باس سے تمہاری بات ہو گئی؟“ لوچن نے شانے اچکا کر سوال کیا۔

”ہاں......“ وشنو نے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی۔ ”اس کی طرف سے اب جو ہدایت ملی ہے اس پر بھی عمل کرنا میرے لیے ضروری ہے۔“

”یہ بھی تمہارا ذاتی معاملہ ہے...... میں تمہیں اس کے حکم پر چلنے سے روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

”کل صبح میں تمہیں اس ہوٹل میں نہیں ملوں گا...... اس وقت یہی بتانا چاہتا تھا۔“ وشنو کے لہجے میں ایک خاموش چیلنج بھی تھا جسے محسوس کر کے لوچن کی کھوپڑی بھی گرم ہو گئی۔

”چیلنج کر رہے ہو؟“ اس نے خطرناک نظروں سے وشنو کو گھورا۔

”نہیں...... ایک بنتی کرنا چاہوں گا۔“ وشنو نے کینچلی بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔ ”نہ میں اچھوت ہوں نہ دوسرے کو اچھوت سمجھتا ہوں۔ تمہارے ساتھ ایک برتن میں کھا بھی چکا ہوں اس لیے یہی چاہوں گا کہ ہم آئندہ جب بھی ملیں، جہاں بھی ملیں ایک دوسرے کے متر (دوست) بن کر ملیں، ایک دوسرے کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش نہ کریں۔“

”میں بھی دوستوں کا دوست ہوں وشنو مگر...... تم بھی جانتے ہو کہ ابھی میں جس کے لیے کام کر رہا ہوں وہاں پونے دو مہینے کا کنٹریکٹ اور رہ گیا ہے، ہماری تنظیم کی طرف سے پہلی شرط یہی ہوتی ہے کہ کسی بھی حکم کی خلاف ورزی نہ کی جائے اس لیے میں تم کو زبان نہیں دے سکتا۔“

”مجھے تمہارا جواب سن کر خوشی ہوئی۔“ وشنو مسکرانے لگا۔ ”ہونا بھی یہی چاہیے۔ منش جس ہانڈی کا کھائے اس میں چھید کبھی نہیں کر سکتا...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ایس پی اورنگ زیب نے بھی تمہیں دوست بنا لیا ہے۔“

”اس کے کچھ احسان تم پر بھی ہیں۔“ لوچن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”کیا تم ایس پی کے ساتھ نمک حرامی کا سوچ سکتے ہو؟“

”نہیں...... لیکن میں پولیس والوں کی دوستی پر وشواس نہیں رکھتا۔“ وشنو نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”اورنگ زیب بھلا آفیسر ہے، میں اس کے احسان کو بھی یاد رکھوں گا۔“

”یہاں سے تمہارا نکلنا آسان نہیں ہوگا۔“ لوچن نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ اب ملٹری کے خفیہ لوگ تمہاری طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے۔“ وشنو نے شانے اچکا کر بے پروائی سے کہا پھر اٹھ کر مسکراتا ہوا دوبارہ بالکونی میں آ گیا۔ اس کی نظریں اب سڑک سے بالکونی کی اونچائی کی پیمائش کر رہی تھیں۔

☠☠☠

اس وقت رات کے دس کا عمل تھا جب لیاقت حسین فرحین کے قریب بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا۔

”اوپر والے کی مہربانی ہے جو تمہاری جان بچ گئی ورنہ وہ اپنے پانچ آدمیوں کی موت کا بدلہ تم سے بھی لے سکتے تھے۔“

”تمہارے اوپر کوئی الزام تو نہیں آیا۔“ فرحین نے بڑی اپنائیت سے سوال کیا۔

”نہیں...... سب اوپر والے کا کرم ہے۔ سراج صاحب اور ایس پی صاحب کی موجودگی میں تھانے کا افسر بھی بھیگی بلی بن گیا تھا۔“

”ہم گھر کب چلیں گے؟“ فرحین نے پوچھا۔

”ابھی تمہیں ایک دن اور رہنا ہوگا۔ آج میں بھی عثمان صاحب کے ساتھ بڑے ڈاکٹر سے ملا تھا، وہ بھی کہہ رہا تھا کہ کل دوپہر کے بعد یہاں سے چھٹی مل جائے گی۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ایک بات پوچھوں لیاقت......؟" فرحین نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اگر مجھے کچھ ہوجاتا تو......؟"

"تو لیاقت بھی زندہ نہ رہتا......؟" لیاقت حسین نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر کہا پھر ان کے درمیان زیادہ بات نہیں ہوسکی۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے دونوں کو چونکا دیا تھا۔ لیاقت حسین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ آنے والا ایک میل نرس تھا۔

"مجھے مریضہ کو ایک ضروری انجکشن لگانا ہے۔"

لیاقت حسین نے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا لیکن فرحین نے منہ دوسری طرف کر کے لیاقت حسین سے کہا۔

"میں کسی مرد سے ٹیکا نہیں لگواؤں گی......تم کسی نرس کو بلالو۔"

"اس وقت تمہارے وارڈ کی نرس دوسرے کمروں کو اٹینڈ کر رہی ہے بی بی......" میل نرس نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "انجکشن لگانا ضروری ہے، بڑے ڈاکٹر نے خاص طور پر اس کی ہدایت کی ہے۔"

"نہیں......" فرحین نے پھر اصرار کیا۔ "میں کسی مرد سے ٹیکا نہیں لگواؤں گی۔"

"یہ انجکشن فوراً نہ لگا تو خراب بھی ہوسکتا ہے۔" میل نرس نے لیاقت حسین سے کہا۔

لیاقت حسین فرحین کو شہر کی نزاکتوں سے آگاہ کرنے کی خاطر اس کے قریب گیا۔ اسی وقت اس کی نگاہ ماں کی دی ہوئی انگوٹھی پر پڑی جس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

"خطرہ......" لیاقت حسین کا ذہن جاگنے لگا۔ ماں کی دی ہوئی اس انگوٹھی کے نگینے نے اسے اس وقت بھی آگاہ کیا تھا جب فرحین کو دشمنوں نے اپنا ہدف بنانے کی کوشش کی تھی، پانچ افراد بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے اور اب...... اب شاید پھر فرحین کی زندگی کسی خطرے سے دوچار تھی...... وہ خطرہ کیا ہوسکتا ہے......انجکشن......؟"

لیاقت حسین کے ذہن میں انجکشن کا خیال ابھرا تو وہ بھی سمجھ گیا کہ میل نرس بھی غالباً دشمنوں کے ہاتھ بک گیا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا پھر...... اس نے اپنا پستول نکال کر میل نرس پر تان لیا۔ قہر آلود لہجے میں بولا۔

"انجکشن کی ٹرے ایک طرف رکھ کر تم بھی ادھر کونے میں بیٹھ جاؤ۔"

میل نرس بوکھلا گیا۔ اس نے پہلے تعمیل کی پھر احتجاج کیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں جناب...... مجھے ابھی دوسرے مریضوں کو بھی اٹینڈ کرنا ہے۔"

"خاموشی سے بیٹھے رہو نہیں تو میں تمہیں گولی مارنے سے دریغ نہیں کروں گا۔" لیاقت حسین نے پوزیشن لینے کے بعد دروازہ بھی اندر سے بند کر دیا تو فرحین بھی چپ نہ رہ سکی۔

"یہ...... یہ تجھے کیا ہوگیا ہے لیاقت؟"

لیاقت حسین نے فرحین کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، الٹے ہاتھ سے موبائل نکال کر براہ راست اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ ہونے پر سنجیدگی سے بولا۔

"صاحب......آپ ادھر اسپتال آجاؤ۔ میں نے کسی کو پستول دکھا کر روک رکھا ہے، فرحین کی زندگی شاید پھر خطرے میں ہے۔"

"کون ہے وہ......؟" اورنگ زیب نے سوال کیا۔

"یہ بھی آپ آکر معلوم کرلینا۔" لیاقت حسین نے جواب دے کر رابطہ منقطع کیا پھر اس نے سیٹھ عثمان کو بھی وہی اطلاع کردی۔

میل نرس اس صورت حال سے بری طرح بوکھلا گیا تھا، اس کے چہرے پر خوف کے ساتھ اس خطرے کا احساس بھی منڈلا رہا تھا جس سے وہ خلاف توقع دوچار ہوگیا تھا۔

"آ......آپ کو...... کس بات کا شبہ ہے جناب؟"

میل نرس نے اس بار قدرے بدلے ہوئے تیور سے لیاقت حسین کو گھورا۔

"دونوں ہاتھ سامنے کیے، چپ بیٹھے رہو۔" لیاقت حسین نے بے حد سرد آواز میں کہا۔ "میں پانچ افراد کو پہلے بھی گولی مار چکا ہوں۔ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میل نرس کے چہرے پر موت کے سائے منڈلانے لگے، وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ خود کو بچانے کی خاطر کوئی قدم اٹھانے کا خطرہ مول لیتا۔ فرحین بھی بے چین نظر آرہی تھی۔ لیاقت حسین نے اس کی بھی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

بیس منٹ بعد کچھ قدموں کی آواز دروازے کے باہر آکر تھم گئی۔ کسی نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا تھا۔ "میں آگیا ہوں لیاقت حسین...... دروازہ کھولو۔"

لیاقت حسین نے میل نرس پر سے نظریں ہٹائے بغیر دروازہ کھول دیا، اس نے اورنگ زیب کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ عثمان صاحب کے علاوہ اسپتال کا بڑا ڈاکٹر بھی تھا جو پریشان نظر آرہا تھا۔ میل نرس کو دیکھ کر وہ بھی ایک لمحے کو چونکا لیکن اس کے بولنے سے پیشتر اورنگ زیب نے سچویشن دیکھ کر لیاقت حسین سے پوچھا۔

"تم نے اس میل نرس کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

"یہ...... یہ فرحین کو انجکشن دینے آیا تھا صاحب لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ کھرا آدمی نہیں ہے۔"

"کون ہو تم......؟" اورنگ زیب سے پہلے ڈاکٹر نے میل نرس کو مخاطب کیا پھر اس نے اورنگ زیب سے انگریزی میں کہا۔ "یہ میل نرس کے لباس میں ضرور ہے لیکن ہمارے اسٹاف کا آدمی نہیں ہے۔"

"صاحب......" لیاقت حسین جذباتی ہونے لگا۔ "آپ اس کا خیال رکھو۔ اب میں وہ انجکشن اسی کو لگاؤں گا جو یہ فرحین کو دینے آیا تھا، سارا بھید ابھی کھل جائے گا۔"

اورنگ زیب کے جواب دینے سے پہلے آئی جی بھی ایک پولیس انسپکٹر کے ساتھ اندر آگیا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" اس نے اورنگ زیب سے سوال کیا۔

"تم......تم سب مل کر بھی مجھے ہاتھ نہیں لگا سکو گے۔" میل نرس نے بڑی بے جگری سے کہا تو سب ہی چونک اٹھے، میل نرس نے بات جاری رکھی۔ "ہم پولیس تھانے کے چکر میں نہیں پڑا کرتے......"

"اسے گرفتار کرلو......" آئی جی نے ساتھ آنے والے انسپکٹر کو حکم دیا تو میل نرس سینہ تان کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے قریب آنے سے پیشتر میری ایک بات بھی سن لو۔ ہم جس کام کا بیڑہ اٹھاتے ہیں اسے ادھورا نہیں چھوڑتے۔"

"پریشان مت ہو۔" اورنگ زیب نے اس کے ارادے کو بھانپ کر نرمی سے کہا۔ "پولیس تمہارے ساتھ پورا انصاف کرے گی۔"

"نہیں ایس پی...... میں تمہارے قریب بھی نہیں آؤں گا۔" میل نرس سنجیدگی سے بولا۔ "ہم اپنا انصاف بھی خود کرتے ہیں۔ یہی سیدھا اور آسان راستہ ہمارے لیے سب سے بہتر ہوتا ہے۔"

آئی جی کے ساتھ آنے والے پولیس انسپکٹر نے اچانک میل نرس کی طرف چھلانگ لگا دی، اسے پلک جھپکتے میں دبوچ لیا۔ "اب کیا بکواس کرو گے؟" آئی جی نے غرا کر میل نرس سے سوال کیا۔

میل نرس بے بس ہونے کے باوجود جواب میں حقارت سے ہنسا پھر اس نے اپنے نقلی دانت کے اندر چھپا ہوا زہریلا کیپسول نکال کر چبالیا، دوسرے ہی لمحے وہ انسپکٹر کے شکنجے میں بے جان لاش بن کر جھول گیا۔

آئی جی کی نظریں اورنگ زیب کی جانب اٹھیں۔

"مجھے اسی بات کا خدشہ تھا سر...... اب ٹرے میں موجود انجکشن ہی ہمارے کسی کام آسکے گا۔"

پولیس کارروائی سے پیشتر ہی اورنگ زیب اور سیٹھ عثمان کے کہنے پر فرحین کو بھی دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ لیاقت حسین بدستور اپنی جگہ کھڑا مرنے والے میل نرس کو حقارت بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔

"یہ کون شخص ہے؟" آئی جی نے اورنگ زیب سے انگریزی میں لیاقت حسین کے بارے میں دریافت کیا۔

"یہ وہی شخص ہے جناب جس نے گزشتہ دنوں پانچ افراد کو گولی ماری تھی، ان میں تین پولیس کو مطلوب اشتہاری مجرم تھے۔" اورنگ زیب نے کہا۔ "مسٹر عثمان کا پارٹنر بھی ہے، وفاداری کے طور پر ان کی گاڑی کسی اور کو ڈرائیو نہیں کرنے دیتا۔"

"اوہ......آئی سی۔" آئی جی نے پھر تعجب سے کہا۔ "لیکن آج اس کو میل نرس پر کس طرح شبہ ہوا؟"

"کچھ غیبی قوتیں ہیں جو اس کی مدد کرتی ہیں۔ پولیس کو اس سے پیشتر بھی اس کا تجربہ کئی بار ہوچکا ہے۔" اورنگ زیب نے مختصر تفصیل بتادی۔

"گڈ......" آئی جی نے لیاقت حسین کو دلچسپ نظروں سے دیکھا پھر باقاعدہ اس سے ہاتھ ملا کر بولا۔ "مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"لیکن مجھے ایک غم ہے صاحب۔" لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کہا۔ "شاید ہم نے پولیس کو طلب کر کے اچھا نہیں کیا۔" اس کی نظریں مردہ میل نرس کی جانب گھوم گئیں۔ "جو انجکشن یہ مردود ہماری بیوی کو دینا چاہتا تھا وہ مجھے اسی کو زبردستی لگا دینا چاہیے تھا، یہ بھی معلوم ہوجاتا کہ انجکشن میں کون سا قاتل زہر بھرا تھا۔"

"نہیں لیاقت حسین!" اورنگ زیب نے اس سے دوستانہ انداز میں کہا۔ "جب ہم تمہارے ساتھ ہیں تو آئندہ بھی کبھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی غلطی نہ کرنا۔"

آئی جی کی موجودگی میں میل نرس کی لاش کو ضروری کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا، اصلی میل نرس بھی اسپتال کے میڈیکل ڈریسنگ روم سے بے ہوشی کی حالت میں مل گیا۔ بھرا ہوا انجکشن ایک پلاسٹک بیگ میں محفوظ کر کے اورنگ زیب نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

لیاقت حسین کے فرحین کے پاس جانے کے بعد آئی جی اورنگ زیب اور سیٹھ عثمان کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا جب اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے براہ راست آئی جی سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

درخواست کی۔

"سر...... اگر یہ واقعہ میڈیا تک پہنچ گیا تو اس اسپتال کی ساکھ پر اچھا اثر نہیں پڑے گا اس لیے میری درخواست ہے کہ اگر آپ......"

"ڈونٹ وری......" آئی جی نے مسکرا کر کہا پھر اورنگ زیب نے بھی ڈاکٹر کو تسلی دی تو اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

☆☆☆

بہت عرصے بعد یہ پہلا اتفاق تھا جب تھریسا ناشتے کی میز پر موجود نہیں تھی۔ اس کی جگہ گھر کی ملازمہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ میڈم نے ایک لمحے کو اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا پھر اسے یاد آگیا کہ گزشتہ رات تھریسا اس کے بیڈروم سے رات ایک بجے کے بعد ہی گئی تھی۔ ان کے درمیان شادی کا معاملہ زیر بحث رہا تھا، تھریسا کا خیال تھا کہ روبی کو شیخ حامد کے تصور کو بھی گولی مار کر اپنا گھر بسا لینا چاہیے جبکہ میڈم اسی بات پر بضد تھی کہ اسے شادی کی ضرورت کا خیال اپنے مظلوم شوہر کے مرنے کے بعد بھی ایک بار بھی نہیں آیا۔ وہ صرف اور صرف اپنے شوہر کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر لٹکتا دیکھنے کی خواہش مند تھی جس کے سبب اس نے ڈی آئی جی کے لیے ایک کنڈیشن رکھ دی تھی اور اب اس کو پورا ہوئے بغیر وہ کسی قیمت پر اپنے مرحوم شوہر کی روح کے سامنے شرمندہ ہونے کو تیار نہیں تھی۔

ناشتے کے دوران بھی میڈم روبی کے ذہن میں وہی قاتل موجود تھا جو اب کھل کر سامنے آگیا تھا، ایس پی اورنگ زیب نے جو کہا تھا اس کی تصدیق مرنے سے پیشتر کنول نے بھی کردی تھی۔ الماس کے ذریعے اسے فرحین کو اغوا کرنے والی واردات اور ان لاشوں کی تفصیل بھی معلوم ہو چکی تھی۔ ان تمام باتوں نے میڈم روبی کے وجود میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا کردی تھی۔ اس کے شوہر کا قاتل دوبارہ سامنے آکر کسی زہریلے کن کھجورے کی طرح بلبلاتے لگا تھا۔ وہ خود پردے کی آڑ میں تھا لیکن اس کے شکاری کتے پھر بے خوف دندناتے پھر رہے تھے۔ ایسی حالت میں وہ اپنی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ حسب معمول لاؤنج میں آگئی۔ اخبار اٹھا کر بیٹھی تھی کہ الماس کا فون آگیا جس نے اسے ایک نئی واردات کی اطلاع دی جو گزشتہ رات اسپتال میں ہوئی تھی۔ لیاقت حسین نے اگر بروقت میل نرس پر شبہ نہ کیا ہوتا تو فرحین کا مر جانا یقینی تھا، اصل قاتل اس بار بھی پردے کے پیچھے تھا، اس کے ایک اور وفادار کتے نے گرفتاری دینے کے بجائے اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا چراغ گل کرلیا تھا۔

الماس کا فون آجانے کے بعد میڈم روبی نے اخبار ایک طرف ڈال دیا، دوبارہ ملازمہ کو بلا کر تھریسا کو دیکھنے کو کہا۔ اس کے ذہن میں شیخ حامد کا منحوس تصور پھر کسی بھوت کے تصوراتی ہیولے کی طرح لہرانے لگا جس کے سلسلے میں خود میڈم کی ذاتی کوششیں بھی ابھی تک بارآور ثابت نہیں ہو سکی تھیں۔ اس نے منہ مانگے داموں کے عوض انڈرورلڈ سے تعلق رکھنے والے تین افراد کی خدمات حاصل کی تھیں، ان میں سے دو...... ڈوما اور ہاشم کام آچکے تھے، صرف لوچن باقی رہ گیا تھا۔

میڈم کا ذہن گزرے ہوئے واقعات میں الجھ رہا تھا جب ملازمہ نے قریب آکر تھریسا کے بارے میں ایک پریشان کن اطلاع دی۔ "وہ کمرے میں موجود نہیں ہیں میڈم...... میں نے کمرے کی حالت سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے لیکن میں نے ڈر کی وجہ سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"کیا بکواس کر رہی ہے۔" میڈم تلملاتی ہوئی اٹھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی تھریسا کے بیڈروم میں داخل ہوئی تو اسے بھی کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا۔

تھریسا اپنے بستر پر نہیں تھی۔ مسہری کی چادر ایک طرف فرش پر پڑی تھی، کچھ سامان بھی بے ترتیب نظر آرہا تھا، کمرے میں ایک عجیب سی مہک بھی بسی ہوئی تھی۔ میڈم کے کہنے پر باقی ممکنہ جگہوں پر بھی دیکھا گیا لیکن تھریسا کہیں نہیں ملی، میڈم نے بنگلے کے گارڈ کو طلب کیا۔ اس نے بھی کسی کے آنے جانے کا شبہ نہیں ظاہر کیا۔ بعد میں بنگلے کے عقب والے حصے میں ڈیوٹی دینے والا گارڈ ایک خالی سرونٹ کوارٹر سے بیہوشی کی حالت میں ملا تو میڈم روبی کے ذہن میں لو کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس نے سب کو زبان بند رکھنے کی تاکید کی پھر تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے بیڈروم میں آگئی۔

"تھریسا اغوا کرلی گئی ہے۔" یہ خیال اس کے وجود میں کسی بے چین پارے کے مانند گردش کر رہا تھا۔ یہ اغوا اس کے لیے بھی دشمن کی طرف سے ایک وارننگ تھی، تھریسا کے ذریعے اب شاید وہ اسے بھی بلیک میل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ تمام ممکنہ پہلوؤں پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتی رہی۔ پولیس کو فوری طور پر اطلاع دینے سے پیشتر وہ ذاتی طور پر اس اغوا کے پس منظر میں منڈلاتے خطروں اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

امکانات پر سنجیدگی سے سوچتی رہی۔ یہ خیال بھی اس کے لیے بڑا تلخ تھا کہ پولیس کی بالادستی کے باوجود ایک مجرم بڑے دھڑلے سے پے در پے واردات کرنے پر کمربستہ تھا لیکن ابھی تک قانون کے لمبے ہاتھ اس کی گرد کو بھی نہیں پاسکے تھے۔ ان وارداتوں کے پیچھے ایسا کوئی نشان بھی نہیں ملا جو قانون کے کام آتا۔ وہ ان ہی خیالات سے الجھ رہی تھی جب اس کے بیڈروم میں موجود مخصوص فون نمبروں پر کسی کی کال موصول ہوئی۔ میڈم نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ وہ نمبر زیادہ لوگوں کے علم میں نہیں تھا۔

''ہیلو......''

''ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ابھی تک پولیس کو درمیان میں لانے کی غلطی نہیں کی۔'' دوسری جانب سے بڑی ڈھٹائی سے کہا گیا۔

''کون بول رہے ہو......؟'' میڈم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اسے لمبے ہاتھوں کی ایک انگلی سمجھ لیں جس کو آپ کے مخصوص نمبر معلوم کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔''

''مقصد بیان کرو......؟''

''آپ کی لیڈی سیکریٹری ہمارے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔ آپ چاہیں تو اسے باعزت واپس بھی کیا جاسکتا ہے۔''

''کیا شرط ہے؟'' میڈم کی کشادہ پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔

''آپ آغا منظور...... یعنی ڈی آئی جی صاحب کے ساتھ شادی کرنے کا خیال ذہن سے کھرچ کر نکال دیں۔''

''یہ میرا قطعی ذاتی اور نجی معاملہ ہے۔''

''میں نے جس ہاتھ کی بات کی ہے وہ بھی آپ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتا ہے۔'' اس بار بھی کھردرے لہجے میں جواب ملا۔ ''جو پالتو کتے وقت کے ساتھ ساتھ وفاداریاں بھی تبدیل کردیں...... باس ان کو پسند نہیں کرتا۔''

''اگر میں تمہاری شرط ماننے سے انکار کردوں تو؟''

''پہلے نمبر پر آپ کی وفادار سیکریٹری کی عزت کی دھجیاں اڑائی جائیں گی۔ دوسرا نمبر ہمیں اس کے بعد ملے گا۔''

میڈم نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ دوسرے نمبر کا اشارہ اسی کی طرف تھا۔

''آپ نے کوئی جواب نہیں دیا میڈم۔'' مضحکہ اڑاتے والے لہجے میں کہا گیا۔ ''کیا ہمیں انتظار کرنا ہوگا؟''

''نہیں......'' میڈم نے اس بار فیصلہ کن جواب دیا۔ ''تم تھریسا کو باعزت واپس کردو لیکن اپنے خفیہ ہاتھ سے ایک بات اور کہہ دینا، دوبارہ وہ میرے کسی ذاتی معاملے میں الجھنے کی غلطی نہ کرے۔''

''ہم حکم کے غلام ہیں بی بی...... آپ نے جو کہا وہ بھی اوپر تک پہنچا دیں گے۔''

''میری سیکریٹری کی واپسی کب تک ہوگی......؟''

''آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ویسے ایک درخواست بھی ذاتی طور پر کررہا ہوں۔ پولیس کے کانوں تک یہ بات نہ پہنچے تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

میڈم نے جواب دینے کے بجائے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے کی شگفتگی آنے والی کال سے خاصی متاثر ہوئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے اپنی خواب گاہ تک ہی محدود رہی پھر دروازے پر ہونے والی دستک ہی نے اسے متوجہ کیا تھا۔ اس نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی تو کسی خیال سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے میں بھی عجلت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا، تھریسا اس کے سامنے موجود تھی۔

''آر یو سیف؟(Are you safe)'' میڈم نے تھریسا کو سامنے دیکھ کر بڑے جذباتی لہجے میں دریافت کیا۔

جواب میں تھریسا بے اختیار اس کے گلے لگ گئی پھر اس نے جو تفصیل بتائی وہ اس دعوے کے خلاف نہیں تھی جو میڈم روبی سے فون پر کیا گیا تھا۔

☠☠☠

سراج کمرے میں داخل ہوا تو اورنگ زیب نے سامنے رکھی فائل بند کردی۔

''کیا رپورٹ ہے؟'' اس نے سراج سے پوچھا۔

''انجکشن میں ایسا زہر پایا گیا ہے جو فرحین کو اگر لگ جاتا تو ایک گھنٹے کے بعد وہ غنودگی ہی کی کیفیت میں اوپر پہنچ جاتی۔'' سراج نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''فائنل رپورٹ دوپہر تک آجائے گی۔''

''پوسٹ مارٹم کے بارے میں کوئی پیش رفت ہوئی؟''

''میں نے اس سلسلے میں براہ راست سرجن سے بھی رابطہ قائم کیا تھا لیکن اس نے بھی وہی کھرا جواب دیا جو ڈاکٹر نے دیا تھا۔'' سراج نے جھلا کر کہا۔ ''اب ایسی رپورٹس سیل بند لفافے میں سرکاری طور پر متعلقہ آفیسر کو ملا کریں گی۔''

''قانون بھی یہی ہے...... بہرحال اس سلسلے میں ڈی آئی جی سے بات کروں گا۔''

''اب آپ میرے لیے فوری طور پر کچھ ریڈی میڈ ناشتا منگا دیں ورنہ میں بھی قانونی طور پر......''

سراج اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا، ڈیوٹی کانسٹیبل اندر

داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں دو توس، دو ابلے ہوئے انڈے اور کافی کا سامان موجود تھا، وہ ٹرے دوسری میز پر رکھ کر اورنگ زیب کے اشارے پر چلا گیا تو سراج نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا اب لیاقت حسین کی طرح آپ کے اندر بھی کوئی الہامی (القائی) کیفیت پیدا ہورہی ہے؟''

''ابھی الماس کا فون آیا تھا۔ اس نے تمہاری سفارش کی تھی۔ ورنہ میں آفس میں لنچ اور ڈنر کرنے کے بھی خلاف ہوں۔''

سراج جواب دینے کے بجائے ناشتے کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد سراج کے ایک سپاہی نے اندر آکر ایک سیل بند بڑا لفافہ اس کے سامنے رکھ دیا پھر باقاعدہ سیلیوٹ کر کے واپس چلا گیا۔

''یہ وہی سکندر علی شاہ کے اس کیس کی فائل ہے جس میں آپ کو کچھ چونکا دینے والی باتیں بھی ملیں گی۔''

''گڈ...... مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ کام پہلی فرصت میں کردیا۔''

''اس میں الماس کے بجائے آپ کی اس محبت کا اثر ہے جو آپ نے مجھے دی ہے۔''

''ون منٹ...... یہ آفس ہے مسٹر سراج۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آکٹوپس اب جس تیزی سے اپنے ہاتھ پاؤں استعمال کررہا ہے وہ ہمارے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔ کنول کی موت کے بعد تین دنوں کے اندر فرحین پر دوبارہ حملہ...... تم اسے کس نظر سے دیکھ رہے ہو؟''

''میں آپ کی بات سے صد فیصد متفق ہوں مگر اس کا سراغ ملنا بھی ضروری ہے۔''

''ہے ایک طریقہ......'' اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ کیا......؟''

''کسی جانور کو اس کی بنائی ہوئی پیچ در پیچ کھوہ یا بھٹ سے نکالنے کی خاطر اس کے دہانے پر آگ بھڑکانا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔''

''یہاں بات انسانوں کی ہورہی ہے جہاں کچھ قانونی پیچیدگیاں ہمارے آڑے آجاتی ہیں۔'' سراج نے کسمساتے ہوئے کہا۔ ''جس وقت وہ ہماری نظروں کے سامنے تھا ہم اس وقت بھی اسے شکنجوں میں جکڑ کر سب کھایا پیا اگلوا سکتے تھے لیکن تب بھی ڈی آئی جی اور مرکزی حکومت کے کچھ ایسے افسروں نے راستہ روک رکھا تھا جو آکٹوپس کے آٹھوں ہاتھ سے لمبی لمبی رقمیں سمیٹ رہے تھے۔''

''آئی ایگری ود یو......'' اورنگ زیب نے بدستور خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر...... کیا ضروری ہے کہ آگ بھڑکانے کی خاطر ہم پیٹرول اور ماچس ہی کا استعمال کریں۔ ویسے بھی اب ایٹمی دور ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سراج چونکا۔

''میں نے تم سے پچھلے دنوں بھی کہا تھا کہ تم صرف ایک ڈیوٹی مائنڈڈ پولیس آفیسر ہو......'' اورنگ زیب نے براہ راست سراج کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب بھی یہی کہوں گا۔''

سراج دوبارہ کرسی پر کسمسایا پھر وہ کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب اورنگ زیب کے اس موبائل نے وائبریٹ کیا جس میں ان رجسٹرڈ سم تھی۔ وہ اسے خاص خاص اور اہم آدمیوں کے لیے استعمال کرتا تھا...... فوری طور پر اس نے موبائل آن کرلیا۔ دوسری جانب سے ابھرنے والی مدھم آواز سن کر چونکا۔ ایک نظر سراج پر ڈالی پھر خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

''تم نے مناسب راستہ اختیار کیا ہے...... گھبراؤ نہیں...... ہاں میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں...... وہاٹ؟'' اورنگ زیب کی نگاہیں کوئی بات سن کر سلگنے لگیں۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا؟...... ٹھیک ہے...... میں خیال رکھوں گا...... وِش یو گڈ لک۔''

''کس کی کال تھی؟'' سراج نے اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر کہا۔ ''کوئی اہم خبر معلوم ہوتی ہے۔''

''تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔'' اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ''کنول اور فرحین کے بعد کل رات پھر آکٹوپس کے شکاری کتے ایک واردات کرگئے۔''

''وہ کیا......؟''

''سوری مائی ڈیئر۔'' اورنگ زیب نے بڑی اپنائیت سے معذرت کی۔ ''فی الحال میں اس سلسلے میں زبان نہیں کھول سکتا لیکن...... اب ہمارے لیے بھی خاموش تماشائی بنے رہنا ممکن نہیں ہے۔''

''میرے لیے کوئی خدمت......؟''

''تم نے شیلا ورما اور جونی کے پیچھے کس کو لگایا ہے؟''

''ہے میرے اعتماد کا ایک خاص آدمی...... اسے پہلے بھی آزما چکا ہوں۔''

''میری ذاتی رائے ہے کہ تم اس آدمی کی جگہ افضل خان کو یہ ذمے داری سونپ دو...... موجودہ حالات میں وہ ہمارے لیے زیادہ موثر ثابت ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسا میک اپ اختیار کرے جسے دیکھ کر شبنم

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی اس کی اصلیت نہ جان سکے۔"
"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔" سراج نے دبی زبان میں سوال کیا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آکٹوپس کے شکاری کتے افضل خان اور شبنم کی نقل وحرکت سے بے خبر ہوں گے۔"

"یو آر رائٹ۔" اورنگ زیب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا۔ "میں اپنے کسی آدمی کو اس کام پر لگا دیتا ہوں، شیلا ورما اور جونی کی روز وشب کی مصروفیت کا قریب سے جائزہ لینا ہمارے لیے اب اہم ہوگیا ہے۔"

"میں بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کروں گا۔ ویسے ایک بات میرے لیے ابھی تک معما بنی ہوئی ہے۔ جونی مس ڈکسن سے کس مقصد سے ملا تھا؟"

"اس میں معمے والی کیا بات ہے؟" اورنگ زیب نے کہا۔ "دوسروں کی طرح جونی نے بھی مس ڈکسن سے مل کر اپنے مستقبل کے بارے میں ہی جاننے کی کوشش کی ہوگی۔"

پھر...... آئی جی کا فون آنے کی وجہ سے سراج نے خاموشی اختیار کرلی۔

"انجکشن کی زبانی رپورٹ ڈی ایس پی سراج نے ذاتی تعلقات کی بنا پر معلوم کرلی تھی۔" اورنگ زیب نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آفیشل راستے سے موصول ہوگی...... سراج نے پولیس سرجن سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوئی...... وہ نیا آدمی ہے اس لیے فی الحال گھسے پٹے قانون پر چلنے کی کوشش کررہا ہے...... سوری سر، اگر اس نے مجھے بھی ٹالنے کی بات کی تو میں برداشت نہیں کرسکوں گا...... یہ زیادہ مناسب رہے گا...... جی نہیں، ابھی تک اس کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ اشتہاری مجرم نہیں تھا...... ڈونٹ وری سر، میں کسی کے دباؤ میں آنے والا آفیسر نہیں ہوں...... تھینک یو سر۔"

گفتگو ختم ہوئی تو سراج نے دریافت کیا۔ "کوئی نئی اطلاع؟"

"آئی جی کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے کچھ بااثر لوگ ہمارے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کریں۔"

"وہ ابھی نیا نیا آیا ہے...... اسے اس بات کا خیال کیوں آیا......؟"

"اس میں نئے پرانے کی بات نہیں ہے مائی ڈیئر...... ہر اہم کیس میں کوئی نہ کوئی اڑنگا کسی نہ کسی صورت میں ضرور لگتا ہے۔" اورنگ زیب نے جواب دینے کے ساتھ ہی سکندر علی شاہ کی فائل بھی کھول لی تو سراج نے کہا۔

"یہ فائل آپ کو خاصی دیر مصروف رکھے گی۔ اگر اجازت ہو تو اس دوران میں اپنے دفتر کی طرف بھی جھانک لوں۔"

"ٹھیک ہے......"

سراج اٹھنے لگا تو ان رجسٹرڈ موبائل نے پھر وائبریٹ کرنا شروع کیا، اورنگ زیب نے سراج کو اشارے سے بیٹھنے کو کہا پھر اس نے موبائل آن کرلیا۔ دوسری جانب سے لوچن کی آواز ابھری۔

"وہ دوغلا باسٹرڈ آپ کے ملٹری والوں کی نظروں میں بھی دھول جھونک کر چھومنتر ہوگیا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ اگر ملٹری والے اسے اپنی تحویل میں لے کر ڈرائنگ روم ٹریٹمنٹ کے درمیان اس کی ایک دو پسلی کھسکا دیتے تو وہ دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگانے کا رسک بھی نہ لیتا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"کل رات کی۔"

"اور تم اس کی اطلاع اب دے رہے ہو؟" اورنگ زیب نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے قدرے درشت انداز میں سوال کیا۔

"اس باسٹرڈ کی چوکیداری میں رات بھر جاگنے کے بعد لمبی تان کر سوگیا تھا۔" لوچن نے تفصیل بتائی۔ "اس کے چیلنج کی خاطر میں نے اس پر نظر رکھی تھی۔ وہ رات میں دوبار تھوڑے وقفے سے بالکونی میں گیا تھا۔ میں آنکھوں میں جھری لیے دیکھتا رہا، تیسری بار وہ رات کو تقریباً دو بجے پھر بالکونی میں گیا...... جب دیر تک واپس نہیں پلٹا تو میں نے اٹھ کر بالکونی میں جھانکا۔ وہ شاید نیچے چھلانگ مار کر تو دو گیارہ ہوچکا تھا...... نیچے دور دور تک سناٹا تھا، میرا خیال ہے کہ وہ کسی سواری کی راہ تک رہا تھا، اس کے آنے کے بعد ہی اس نے چھلانگ لگانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ میں نے فوری طور پر باہر نگرانی کرنے والے ایک سادہ لباس سولجر کو اطلاع دی۔ وہ بھی پورا کمرا کھنگالنے کے بعد بغلیں بجاتا چلا گیا۔ اس کے سوا وہ بھی کیا کرسکتا تھا۔"

اورنگ زیب نے جھلا کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کردیا۔ وشنو کے فرار ہونے کی خبر سن کر سراج بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اورنگ زیب اب خانہ پری کی خاطر کرنل احتشام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

☠☠☠

سفید رنگ کی اس وین پر ایک مقامی رفاحی ادارے کا نام درج تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جو شخص موجود تھا اس کی شرٹ پر بھی اسی ادارے کا مونوگرام تھا۔ پشت پر ایک جانب مریض کی لمبی نشست تھی۔ دوسری جانب کی پشت پر دو افراد تنگ سیاہ لباس میں ملبوس نظر آرہے تھے۔ ایک پستہ قد تھا جس کا جسم بے حد گٹھا ہوا تھا، دوسرا درمیانہ قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے، ان کے درمیان قدموں میں ایک چاکلیٹی رنگ کا اسکول بیگ تھا جس میں شانوں پر لٹکانے والی بیلٹ بھی موجود تھی۔ دونوں افراد اپنی اپنی جگہ کسی سوچ میں غرق تھے، ان کے طرز عمل سے بھی یہی لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے واقف ضرور ہیں لیکن زیادہ بے تکلف نہیں تھے۔

اس وقت رات کے پونے بارہ کا عمل تھا، ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے وین کے اوپر لگی سرخ گھومنے والی لائٹ بھی روشن نہیں تھی، مخصوص سائرن کی آواز والا سسٹم بھی آن نہیں کیا گیا تھا۔

"یہ پہلا اتفاق ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ کہیں جارہے ہیں۔" پستہ قد آدمی نے گفتگو کی ابتدا کی، اس کا لب ولہجہ غیر ملکیوں جیسا تھا۔ "ہمارا پروفیشن بھی ایک جیسا ہے لیکن ہمیں کسی مریض کا علاج کرنے کے معاملے میں بہت محتاط رہنا ہوگا...... ایک ضروری بات اور بتادوں...... میں اپنے کاموں میں غیر ضروری مداخلت بھی برداشت نہیں کرتا۔"

"جانتا ہوں۔" دوسرے نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے حالات کے پیش نظر اپنے اندر کچھ تبدیلیاں ضرور کرلی ہیں لیکن کوئی دائمی مریض کبھی مل جائے تو اس کے علاج سے غافل بھی نہیں رہتا...... البتہ جہاں مخصوص ہدایتیں بڑے ڈاکٹر کی طرف جاری کردی جائیں وہاں گھٹن کا احساس ضرور ہوتا ہے۔"

"اس معاملے میں مجھے بھی اپنا ہم خیال سمجھو لیکن کبھی کبھی مریض کے علاوہ دوسرے صحت مند لوگوں کا خیال رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔"

"میں نے اسی خیال کے پیش نظر ضروری سامان بیگ میں رکھ لیا ہے۔"

دوسرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وین کا سفر دس منٹ بعد ختم ہوگیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آنے والے نے درمیانی کھڑکی کھول کر کہا۔ "میں نے احتیاطاً وین کو بنگلوں کے عقبی حصے میں پارک کیا ہے۔"

"تم نے غلط کیا ہے۔" پستہ قد والے نے ناگواری سے کہا۔ "گاڑی گھما کر مطلوبہ بنگلے کے عقبی بنگلے کے آس پاس روک لو۔"

ڈرائیور نے جواب دینے کے بجائے درمیانہ قد والے کی جانب دیکھا تو اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی، وین دوبارہ حرکت میں آگئی۔ کچھ دیر بعد اسے وہیں روکا گیا جہاں کے لیے کہا گیا تھا۔

پستہ قد آدمی نے وین سے اترنے میں پہل کی پھر اس نے دوسرے سے کہا۔ "میں تمہیں اندر پہنچنے کے بعد موبائل پر کال کروں گا۔ اس کے بعد ہی تم اسی راستے سے اندر آنا جو ہم نے پہلے سے طے کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے......"

پستہ قد آدمی جو لوچن کے سوا کوئی اور نہیں تھا تیزی سے قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔

"باس......" اس کے جانے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آنے والے نے باہر آکر اندر بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کیا۔ "کیا اس وقت ہمیں اس سوا پانچ فٹے کی ہدایت پر عمل کرنا ہوگا؟"

"تمہارا اندازہ غلط ہے۔" باس کہے جانے والے نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "یہ جتنا اوپر نظر آتا ہے اتنا ہی زمین کے نیچے بھی ہے، ہم سے زیادہ دوراندیش اور تجربے کار بھی ہے۔"

سوال کرنے والا خاموش ہوگیا، درمیانہ قد والا جو جگا تھا، وہ بھی وین سے باہر آگیا، دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ خلاف معمول اس وقت جگا کی نظریں بھی کسی آدم خور چیتے کی طرح چمک رہی تھیں۔ اسے زیادہ دیر انتظار

بیوی نے شوہر سے کہا

"ہنی کے ابو! میں ذرا مسز معین کے پاس جارہی ہوں۔ آپ آدھے گھنٹے کے بعد ہنڈیا چولہے سے اتارلیں اور ایک گھنٹے بعد ہنی کو فیڈر تیار کرکے دے دیں۔ میں بس پانچ منٹ میں آئی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں کرنا پڑا۔ سات آٹھ منٹ بعد ہی اسے موبائل پر گرین سگنل کا اشارہ مل گیا۔

”تم یہیں ٹھہرو لیکن آنکھیں کھلی رکھنا...... حسب دستور اگر کوئی ایمرجنسی پیش آجائے تو تمہیں ذاتی فیصلے کا مکمل اختیار ہوگا، البتہ اس بات کا دھیان رکھنا کہ کوئی بندہ ضائع نہ ہونے پائے۔“

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر جگا بھی مطلوبہ بنگلے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ اس کو اس بات کا علم تھا کہ عدالت کے فیصلے کے بعد شیخ حامد کے بنگلے کو نیلام کی خاطر دے دیا گیا تھا۔ پولیس کے صرف دو سپاہی وہاں ڈیوٹی دیتے تھے۔ نیلام میں بھی اب چند دن باقی رہ گئے تھے۔

دن کی روشنی میں جگا نے لوچن کے ساتھ مطلوبہ کوٹھی کا چاروں طرف سے گھوم پھر کا جائزہ لے لیا تھا۔ چنانچہ گرین سگنل ملنے کے بعد وہ اسکول بیگ نما تھیلے کو شانوں سے لٹکا کر اسی سمت چل پڑا۔ اس کی نظریں اپنے اطراف کا جائزہ بھی لے رہی تھیں، مطلوبہ جگہ پہنچ کر وہ ایک لمحے کو رکا پھر وہ نہایت پھرتی سے آٹھ فٹ اونچی دیوار کو بڑی مہارت سے پھلانگ گیا۔ اگلے ایک منٹ بعد وہ اس عقبی دروازے کے قریب پہنچ گیا جہاں لوچن موجود تھا۔

جگا کے آجانے کے بعد لوچن نے اسکول بیگ اس سے لے لیا۔ اس کے بعد وہ دونوں کوٹھی کی نچلی منزل کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے، جگا کے وجود کے اندر اس وقت چنگاریاں پوری طرح سلگ رہی تھیں، شیخ حامد کے غنڈوں نے اس کے فرنیچر مارٹ کو جس طرح تباہ کیا تھا اس کا خیال اس کے ذہن میں طوفان کی طرح سر ابھار رہا تھا، اگر اورنگ زیب نے اسے خاموش رہنے کو نہ کہا ہوتا تو وہ اپنی مرضی سے بھی جوابی کارروائی کر گزرنے سے دریغ نہ کرتا۔

بیس منٹ تک ایک ایک کونے کھدروں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ لوچن اور جگا ان تمام مشکوک جگہوں پر ٹائم بم فٹ کرتے رہے جہاں کسی چور راستے کا احتمال کیا جاسکتا تھا۔ کچھ بم انہوں نے چھت سے بھی چپکا دیے۔ اس کام سے فارغ ہونے میں بھی دونوں نے غیر معمولی عجلت سے کام لیا تھا۔

لوچن اپنی کارکردگی کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا جب جگا نے اس کے قریب آکر پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے دوست؟ کیا ان بموں کے بلاسٹ ہوجانے کے بعد بھی یہ عمارت قابل استعمال ہوسکتی ہے؟“

”نہیں......“ لوچن نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں ادھورا کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”گڈ......“ جگا نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرے اختیار میں ہوتا اور قرب و جوار میں بسنے والے بے قصور لوگوں کا خیال نہ ہوتا تو میں اس منحوس کوٹھی کو جڑ بنیاد سے خاک میں ملا دیتا......“

”یہ جذباتی باتیں ہم وین میں بیٹھنے کے بعد بھی کرسکتے ہیں......“ لوچن نے دستی گھڑی کے ریڈیم ڈائل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کبھی کبھی اگر کوئی ڈیوائس پرفیکٹ طریقے پر کام نہ کرے تو جان جانے کا خطرہ بھی لاحق ہوجاتا ہے۔“

جگا نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ دونوں وقفے وقفے سے عمارت کے باہر آئے۔ اس وقت بھی دور دور تک کسی انسان کا سامنا نہیں ہوا۔ وین کے حرکت میں آنے کے بعد ہی جگا نے کسی خیال سے چونک کر لوچن سے پوچھا۔

”جو کوٹھی کے صدر دروازے پر پہرا دے رہے ہیں ان کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا؟“

”ایک بات پوچھوں۔“ لوچن نے جگا کے سوال کا جواب نفی میں دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بگ باسٹرڈ سے کیا پرخاش ہے؟“

”ہے ایک قرض جو آج چکتا ہوجائے گا۔“

”ہوسکتا ہے۔“ لوچن نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ”میں تمہیں ایک ذاتی تجربے کی بات بتا رہا ہوں۔ شیر زخمی ہونے کے بعد آدم خور بھی بن جاتا ہے...... بگ باسٹرڈ کی طرف سے کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا رہنا...... ایسی شکل میں جبکہ وہ قانون کی نظروں سے بھی چھپا ہوا ہے۔“

”اسی بات کا ملال ہے دوست......“ جگا نے زہرخند سے جواب دیا۔ ”اگر وہ سامنے ہوتا تو میں اسے للکار کر ہی مارتا...... مچان پر بیٹھ کر شکار کھیلنا میری فطرت کے بھی خلاف ہے۔“

”اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں تمہارے بارے میں۔“ اس بار لوچن نے بشاشت لہجے میں کہا۔ ”تم قابل اعتماد نہ ہوتے تو تمہارے آفس میں بیٹھ کر کوئی ضروری کام کبھی انجام نہ دیتا۔“

”تم......شاید وشنو کی بات کررہے ہو؟“

لوچن جگا کا جواب سن کر چونکا لیکن کوئی سوال نہ کرسکا...... پے درپے ہونے والے خوفناک دھماکوں کی آواز نے ان دونوں ہی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

دوسرا رخ

ثمر عباس

بعض اوقات آنکھیں حقیقت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی سوچ کے مطابق منظر ترتیب دے لیتی ہیں۔ اس کی نگاہوں نے بھی کمال کا دھوکا کھایا تھا لیکن... اس چہرے کی معصومیت اور مظلومیت نے دل میں یوں ڈیرا ڈالا کہ تصویر کا کوئی دوسرا رخ پھر نظر ہی نہیں آیا۔

ایک جابر عاشق کی محبت اور مجبور حسینہ کی وفاؤں کا قصہ

اس چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین سے اترنے والا وہ واحد مسافر تھا۔ اس نوجوان نے سبز رنگ کی فوجی وردی پہن رکھی تھی جس پر مختلف نوعیت کے تمغے اور اسٹارز سجے ہوئے تھے۔ وہ لمبے قد، نیلی آنکھوں اور دلکش خدوخال کا مالک تھا اور اسے دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ نرم دل انسان ہے اور کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایک سفید بالوں والے درمیانی عمر کے سیاہ فام قلی نے اس کا بیگ اٹھایا اور اس خدمت کے عوض جب نوجوان سپاہی نے اسے معاوضے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے طور پر ایک ڈالر دینا چاہا تو وہ قلی بولا۔ ”اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ تم میرے بیٹے کی طرح ہو جو کوریا کی جنگ میں مارا گیا۔“

نوجوان سپاہی کے چہرے پر دکھ کا تاثر نمایاں ہو گیا۔ یہ صرف ایک شخص کا المیہ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے والدین اپنے جوان بیٹوں سے بچھڑنے کا غم سینے میں لیے پھر رہے ہوں گے۔ ایسے ہی ایک خاندان کا دکھ بانٹنے وہ بھی یہاں آیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ بوڑھا قلی جا چکا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور اس نوجوان کو شام سے پہلے اپنے ٹھہرنے کے لیے کوئی ٹھکانا تلاش کرنا تھا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا ہی تھا کہ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر سے ایک عمر رسیدہ شخص باہر آیا اور اس نوجوان کے قریب آ کر بولا۔

”تمہیں شہر جانے کے لیے سواری چاہیے ہوگی؟“

”ہاں، مجھے کسی ایسے ہوٹل کی تلاش ہے جس کا کرایہ بہت زیادہ نہ ہو۔“

”یہاں ایسا ایک سرائے نما ہوٹل ہے۔ اس کا کرایہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“

نوجوان سپاہی نے اپنا بیگ اٹھایا اور اس شخص کے ساتھ چل دیا جس کی پرانے ماڈل کی شیورلیٹ پلیٹ فارم کے باہر ہی کھڑی تھی۔ نوجوان سپاہی نے اپنی زندگی میں اتنی پرانی گاڑی کبھی نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت اسے وہی غنیمت معلوم ہوئی۔ چند منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کار ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے رک گئی۔ اس ہوٹل کا کوئی نام نہیں تھا، البتہ لکڑی کا ایک بورڈ صدر دروازے پر ضرور آویزاں تھا جس پر سفید رنگ سے ہوٹل لکھا ہوا تھا۔ ڈیسک کلرک نے بڑی بے زاری سے اسے دیکھا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے سپاہی کی آمد ناگوار گزری ہے۔ وہ کچھ کہے بغیر اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے ایک تنگ راہداری سے گزرتا ہوا آخری کمرے پر رک گیا۔ شاید وہ کمرا کافی عرصے سے خالی تھا اس لیے صفائی کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔

وہاں صرف ایک سنگل بیڈ تھا جس پر نیلی دھاریوں والا میٹرس بچھا ہوا تھا۔ ڈیسک کلرک نے بتایا کہ چادر کے لیے اسے پچاس سینٹ اضافی ادا کرنا ہوں گے۔ اس کی بغل میں ایک بوسیدہ سا رجسٹر دبا ہوا تھا۔ سپاہی نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلایا اور کلرک نے رجسٹر کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ سپاہی نے خالی صفحے پر اپنا نام میکس کلے لکھا اور دستخط کرنے کے بعد کلرک کو ایک ڈالر تھما دیا۔

”کیا یہاں ایسا کوئی شخص ہے جو میری وردی پر استری کر سکے؟“

”صبح میں ایک عورت صفائی کے لیے آتی ہے۔ ممکن ہے وہ یہ کام بھی کر دے۔“

یہ کہہ کر کلرک چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی اس نے میکس کو دو چادریں فراہم کر دیں۔ کلے نے اپنا بیگ ایک کونے میں رکھا اور بستر کے کنارے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا پھر اس نے دائیں پیر کی تین انگلیوں پر ہلکی سی مالش کی۔ اس کی دو انگلیاں جنگ کی نذر ہو چکی تھیں۔ جب وہ اپنے عزیز ترین دوست کارپورل جوئے ملر کے ساتھ ایک بارودی سرنگ پر سے گزرا۔ خوش قسمتی سے وہ زیادہ آگے نہیں گیا تھا اس لیے دھماکے کے نتیجے میں اس کے دائیں پیر کی دو انگلیاں ہی ضائع ہوئیں جبکہ داہنی آنکھ کے نچلے حصے پر بھی گہرا زخم آیا لیکن آنکھ بچ گئی۔ جوئے ملر کی بائیں ٹانگ اور جسم کے دوسرے حصے بری طرح متاثر ہوئے۔ وہ جاں کنی کے عالم میں زمین پر تڑپ رہا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ”گلوریا، گلوریا۔“

تھوڑی دیر بعد جب کلے کے حواس بحال ہوئے تو وہ گرتا پڑتا جوئے تک پہنچا لیکن اس وقت تک وہ مر چکا تھا۔ اس کا ہیلمٹ دور جا گرا تھا اور اس کے پاس ہی کسی لڑکی کی تصویر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے جھپٹ کر وہ تصویر اٹھائی اور اپنی جیب میں رکھ لی۔ یہ اسی لڑکی کی تصویر تھی جس کا نام مرتے دم تک ملر کی زبان پر تھا پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوری طبی امداد کے لیے قریبی اسپتال لے جایا گیا اور جب وہ ہوش میں آیا تب بھی اس کے کانوں میں گلوریا گلوریا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

وہ گلوریا سے اچھی طرح واقف تھا۔ جوئے اکثر اس کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ خصوصاً گزشتہ ایک ماہ کے دوران تو ہر وقت اس کی زبان پر گلوریا کا ذکر ہی رہتا تھا۔ وہ اسی کے قصبے میں رہتی تھی اور جوئے اس سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ جوئے اور میکس دونوں ہی اپنی مدت پوری کر چکے تھے اور چند دنوں بعد انہیں وطن واپس آنا تھا۔ ان کی واپسی تو ضرور ہوئی لیکن اس طرح کے جوئے کی مسخ شدہ لاش تابوت میں بند تھی اور میکس کو ایک اسٹریچر کے ذریعے سان ڈیگو کے نیول اسپتال پہنچایا گیا۔

اسپتال میں قیام کے دوران میکس گزرے دنوں کی یادوں میں کھویا رہا۔ ایک ایک کر کے سارے مناظر اس کی نظروں کے سامنے گزرتے رہے۔ وہ منظر اس کے ذہن کے پردے پر ساکت ہو کر رہ گیا تھا جب اس نے جوئے کو موت کی وادی میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ ان دو سو تکلیف بھرے دنوں کو بھی کبھی نہیں بھلا سکتا تھا جب وہ چینی فوجوں کے خلاف دفاعی جنگ پر مجبور ہو گئے تھے اور اسے وہ منحوس دن بھی اچھی طرح یاد تھا جب جوئے کو گلوریا کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی منگنی کسی اور شخص سے ہو رہی ہے۔ جوئے اس خط کو پڑھ کر بہت رویا۔ میکس کو اس سے ہمدردی تھی لیکن وہ اسے تسلی دینے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو اس بے وفا عورت کو گولی سے اڑا دیتا۔

یہ خط ملنے کے صرف گیارہ دن بعد ہی جوئے اور میکس کے ساتھ یہ حادثہ پیش آ گیا۔ ان گیارہ دنوں میں اس نے جوئے کی دیوانگی کو بے حد قریب سے محسوس کیا۔ گلوریا کے خط نے اس کی دنیا ویران کر دی تھی۔ وہ ہر وقت اس کو یاد کر کے روتا رہتا اور جب نشے میں ہوتا تو انتقام لینے کی قسمیں کھاتا۔ گلوریا کا خط ملنے کے بعد اس نے بے تحاشا پینا شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مخالف فوج سے فائرنگ کے تبادلے کے دوران میکس اس پر خاص طور پر نظر رکھتا تھا۔ بعض اوقات جوئے مورچے سے نکل کر فائر کے سامنے آ جاتا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر گولی کا نشانہ بننا چاہتا ہے۔ اسے زندگی سے پیار نہیں رہا، وہ مرنا چاہتا ہے۔ گلوریا کی بے وفائی نے اس سے جینے کی امنگ چھین لی تھی۔ میکس کلے کے خیال میں گلوریا ہی اس کی موت کا سبب تھی۔ اگر وہ اپنے ہوش و حواس میں ہوتا تو کبھی بارودی سرنگ پر اس کا پیر نہ پڑتا۔

اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اس نے جوئے کے قصبے ریبلے کا رخ کیا جہاں گلوریا رہتی تھی۔ اس قصبے میں اس کی آمد بالکل غیر ارادی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں بیڈ کے کنارے بیٹھا وہ جوئے اور گلوریا کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا پھر اس نے اپنے والٹ سے گلوریا کی تصویر نکالی اور اس پر نظریں جما دیں۔ یہ وہی تصویر تھی جو اسے جوئے کے ہیلمٹ کے پاس سے ملی تھی۔ گلوریا کے لیے اس کے دل میں نفرت تھی۔ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ کب اور کہاں گلوریا کو مارے گا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ اسے یہ قرض بہرحال چکانا ہے۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ نہا دھو کر تیار ہوا اور اپنے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر کمرے سے باہر آ گیا۔ کاؤنٹر پر وہی رات والا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ کلے نے اس سے کہا۔ ”میرے کمرے کے دروازے میں تالا نہیں ہے۔“

کلرک نے بے زاری سے اس کی جانب دیکھا اور منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کسی کمرے کے دروازے پر تالا نہیں ہوتا۔“

”ایسی صورت میں کیا ضمانت ہے کہ میرا سامان محفوظ رہے گا؟“

”تمہیں اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہماری ذمے داری ہے۔“

”سب یہی کہتے ہیں۔ بعد میں کوئی نقصان ہو جائے تو ذمے داری قبول نہیں کرتے۔“

”فی الحال میرے پاس تمہیں مطمئن کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔“ کلرک رکھائی سے بولا۔ ”بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا سامان بالکل محفوظ رہے گا۔“

ہوٹل سے باہر آنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سڑک پر چل دیا۔ وہ کچھ دیر گھوم پھر کر قصبے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع سفید عمارت پر گئی جس پر ”شوگر ہل لائبریری“ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ عمارت تک پہنچنے کے لیے پہاڑی میں سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا لائبریری میں داخل ہو گیا۔ ایک دبلی پتلی لیکن خوش شکل عورت نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ کلے نے اپنا چشمہ اور ٹوپی اتارتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”صبح بخیر مادام! کیا تمہارے یہاں ہائی اسکول کا سالانہ ریکارڈ مل سکتا ہے؟“

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔“ وہ عورت مستعدی سے بولی۔ ”آؤ، میں دکھاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اسے ایک جانب لے گئی جہاں پر ریکارڈ رکھا ہوا تھا۔ اس نے کلے سے پوچھا۔ ”تمہیں کس سال کا ریکارڈ چاہیے؟“

”1950ء۔“ کلے نے مختصر سا جواب دیا۔

اس عورت نے چند ہی سیکنڈ میں مطلوبہ ریکارڈ اس کے حوالے کر دیا اور بولی۔ ”کیا تم نے بھی اس اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے؟“

”نہیں میڈم، میرا دوست یہاں پڑھا کرتا تھا۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے، جب فارغ ہو جاؤ تو اسے یہیں میز پر چھوڑ دینا۔“

اس نے مجلد ریکارڈ کے صفحے پلٹنا شروع کر دیے۔ جوئے ملر کی تصویریں جگہ جگہ موجود تھیں۔ فٹ بال گراؤنڈ، باسکٹ بال کورٹ، اسکول کے ڈرامے، سالانہ تقریب۔ ہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

تصویر میں وہ موجود تھا۔ اسی ریکارڈ میں گلوریا سوین کی تصویریں بھی نظر آئیں۔ جوئے کے ساتھ بھی اس کی کئی تصویریں تھیں۔ باسکٹ بال کھیلتے ہوئے، دوڑ کے مقابلوں میں حصہ لیتے ہوئے اور سالانہ تقریب میں انعام لیتے ہوئے۔ ان تصویروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی جوئے کی طرح اسکول کی نمایاں طالبہ تھی جو ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی۔

کلے ان تصویروں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے اندر سے بار بار ایک ہی آواز ابھر رہی تھی۔ ''گلوریا، تم نے جوئے کو وہ خط کیوں لکھا تھا؟''

اس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا اور لائبریرین کا شکریہ ادا کر کے باہر آگیا۔ اب اس کا رخ ٹاؤن اسکوائر کی جانب تھا۔ وہاں سب سے پہلے اس کی نظر اسٹرینڈ تھیٹر پر گئی جس کے بارے میں جوئے نے اسے بتایا تھا کہ وہ کئی بار گلوریا کے ساتھ وہاں فلم دیکھنے جاچکا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر اس ہفت روزہ اخبار کا دفتر تھا جس کا جوئے مستقل قاری تھا۔ اس نے یہ اخبار کوریا میں بھی منگوانے کا انتظام کررکھا تھا۔ جنگ کی وجہ سے باقاعدہ ترسیل ممکن نہیں تھی اس لیے بعض اوقات تین چار شمارے ایک ساتھ مل جاتے تھے۔ آگے چل کر اسے کپڑوں کی ایک بڑی دکان نظر آئی جہاں جدید ڈیزائن کے مردانہ لباس شوکیس میں سجے ہوئے تھے۔ اسے بھی اپنے لیے سویلین ڈریس کی ضرورت تھی کیونکہ آرمی سے ڈسچارج ہونے کے بعد وہ صرف ایک ماہ تک اپنی وردی پہن سکتا تھا۔

اسے چلتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی لیکن ابھی تک ڈاک خانہ نظر نہیں آیا تھا۔ اسے گمان گزرا کہ وہ کہیں غلط راستے پر تو نہیں آگیا ہے۔ بہتر ہے کسی سے پوچھ لیا جائے۔ اس کی نگاہ ایک ڈرگ اسٹور پر گئی۔ کاؤنٹر پر ایک چھوٹے قد کا ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ کلے نے اپنے لیے لائم جوس کا آرڈر دیا اور اس کی چسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ ڈاک خانہ کہاں ہے؟''

''اسی سڑک پر آگے جاؤ گے تو تمہیں ڈاک خانہ نظر آئے گا۔''

اس نے چھوٹے قد والے کا شکریہ ادا کیا اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔ ڈاک خانے سے ہی اسے جوئے کے گھر کا پتا مل سکتا تھا جو چکا سا اسٹریٹ پر واقع تھا۔ مکان نمبر 140 پر پہنچ کر اس نے اپنا چشمہ اتارا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نوجوان لڑکی کی آواز آئی۔ اس نے دروازہ کھولے بغیر ہی پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''کیا مسز ایلی نور طر یہیں رہتی ہیں؟'' میکس نے پوچھا۔

''تمہیں ان سے کیا کام ہے؟''

''میرا نام میکس کلے ہے اور میں جوئے کا دوست ہوں۔ میرے پاس اس کی کچھ تصویریں ہیں۔''

''ماما۔'' لڑکی زور سے چلائی۔

ایک عمر رسیدہ عورت ایپرن پہنے ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اس کی نگاہیں کلے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافے پر جم گئیں۔

''میں......'' کلے نے اپنا تعارف کروانا چاہا۔

''تم میکس ہونا...... میکس کلے؟''

کلے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ عورت باہر آئی اور میکس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی۔

''بیٹھو۔'' وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''جوئے ہر خط میں تمہارا ذکر کرتا تھا۔'' پھر وہ اپنی لڑکی سے مخاطب ہوئی۔ ''امبی! یہ میکس ہے، جوئے کا دوست۔''

''میں اس کی کچھ تصویریں لایا ہوں۔'' جوئے نے لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تصویریں ہم نے مختلف مواقع پر بنوائی تھیں۔''

جب مسز طر اور امبی کو معلوم ہوا کہ کلے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے تو وہ بہت ناراض ہوئیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ کلے فوراً اپنا سامان لے کر آئے اور جوئے کے کمرے میں قیام کرے جو اس کے جانے کے بعد خالی پڑا ہوا تھا۔ کلے کو اس تجویز سے اتفاق نہ تھا مگر ان دونوں نے اس کی ایک نہ سنی اور کلے کو ان کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اب وہ امبی کے ساتھ اس کی ڈاج کار میں ہوٹل جا رہا تھا۔

''ممانے یہ کار جوئے کے انشورنس سے ملنے والی رقم سے خریدی تھی۔ ڈرائیونگ لائسنس میرے پاس پہلے سے تھا۔''

کلے نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی اور بولا۔ ''اس بات کو کتنا عرصہ ہوگیا؟''

''اوہ، ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں۔ اب میں بیس کی ہوگئی ہوں۔''

''تم سترہ سال کی ہو۔'' کلے بولا۔ ''جوئے نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ کوئی بھی لڑکی اپنی عمر زیادہ نہیں بتا سکتی۔'' امبی نے دلفریب مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں میری بات کا یقین کرلینا چاہیے۔''

ایک اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے امبی نے بتایا۔ ''یہاں گلوریا سوین کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کے بارے میں بھی جانتے ہوگے؟''

''ہاں، تھوڑا بہت۔''

''وہ جوئے کی پکی گرل فرینڈ تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد جوئے اس سے شادی کرنے والا تھا۔''

''ہاں، اس نے مجھے بتایا تھا۔'' کلے گہری سانس لیتے ہوئے بولا اور سوچنے لگا۔ ''گویا یہ لوگ اس خط کے بارے میں نہیں جانتے جو گلوریا نے جوئے کو لکھا تھا۔ اچھا ہی ہے، اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں کو مجھ پر شک نہیں ہوگا۔''

ہوٹل پہنچنے پر امبی گاڑی میں ہی بیٹھی رہی جبکہ کلے اپنا سامان لینے چلا گیا۔ واپسی پر ہائی اسکول کے عقب میں واقع فٹ بال گراؤنڈ کے باہر کھڑے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امبی نے کہا۔ ''یہ کوچ نی ہے، تم اس سے ملنا پسند کروگے؟''

''ہاں، ہاں ضرور۔''

امبی نے فٹ بال گراؤنڈ کے کنارے گاڑی پارک کی اور ان دونوں کا تعارف کروایا پھر اس نے ایک قریبی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں کوکا کولا کی مشین لگی ہوئی ہے، میں ابھی آئی۔''

اس کے جانے کے بعد کوچ نے کہا۔ ''تم محاذ سے آرہے ہو؟''

کلے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس قصبے کے تو معلوم نہیں ہوتے، تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''میں شکاگو کا رہنے والا ہے لیکن یہاں میرا ایک دوست جوئے طر رہتا تھا۔ میں نے اس کا اسکول ریکارڈ دیکھا ہے وہ یقیناً تمہاری کسی ٹیم میں کھیلتا ہوگا۔''

''ہاں، وہ فٹ بال، باسکٹ بال اور سو میٹر کی دوڑ وغیرہ۔''

''کیا وہ اچھا ایتھلیٹ تھا؟''

کوچ کچھ لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''کہہ سکتے ہیں۔''

''لگتا ہے تم کچھ چھپا رہے ہو۔ کوئی ایسی بات جو کہنا نہیں چاہتے۔''

کوچ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے؟''

''میں اس کی ماں کو کچھ تصویریں دینے آیا تھا۔''

''بس تم اسی کام کے لیے یہاں آئے تھے۔ اس کے علاوہ تمہارا کوئی اور مقصد نہیں؟''

کلے نے معصومیت سے کندھے اچکائے اور بولا۔

ہنسی نہیں...... مسکراہٹ

☆ ایک شخص اپنے بے وقوف دوست کو اپنا کھیت دکھا رہا تھا۔

دوست نے پوچھا۔ ''یہ کس چیز کا کھیت ہے؟''

پہلا شخص بولا۔ ''یہ کپاس کا کھیت ہے جس سے کپڑا بنتے ہیں۔''

دوست خوش ہوا۔ پوچھا! اچھا یہ بتاؤ، اس میں شلوار کا پودا کون سا ہے۔''

☆......☆☆......☆

ایک امیر آدمی کی زندگی بچانے کے لیے خون کی ضرورت تھی ایک کنجوس آدمی نے اسے خون دیا تو امیر آدمی نے اسے ایک قیمتی گھڑی دی۔ دوسری بار پھر خون کی ضرورت پڑی تو کنجوس آدمی نے پھر خون دیا۔ اس مرتبہ امیر آدمی نے صرف ایک ٹافی دی۔ کنجوس نے جب شکوہ کیا تو امیر آدمی نے کہا۔ ''اب میرے اندر کنجوس آدمی کا خون دوڑ رہا ہے۔''

☆......☆☆......☆

ایک غائب دماغ پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر پہنچے۔ بہت دیر تک اس کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے، کھانے کا وقت ہوا تو کھانا بھی وہیں کھالیا۔ پھر شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ کئی گھنٹے بعد جب پروفیسر صاحب رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ ''گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟''

پروفیسر صاحب نے چونک کر جواب دیا۔ ''خوب یاد دلایا آپ نے، دراصل میں آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔''

☆......☆☆......☆

ایک صاحب حجام کی دکان پر گئے اور بیٹھتے ہی بولے۔ ''دونوں مختصر کرنا۔''

حجام نے حیرت سے بولا۔ ''کیا مطلب؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میرے بال اور تم اپنی باتیں۔''

مرسلہ: توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ظاہر ہے ورنہ میں یہاں کیوں آتا۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم سے یہ سب کیوں پوچھ رہا ہوں۔" کوچ چند قدم آگے بڑھا اور واپس پلٹتے ہوئے بولا۔ "دراصل یہاں کچھ لوگ اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے اور تم جانتے ہو کہ آدمی اپنے دوستوں سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اس حوالے سے تمہیں یہاں کچھ مشکلات پیش آسکتی ہیں۔"

کلے نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "کیا تم مجھے جوئے کی شخصیت کے منفی پہلو کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

"وہ ہماری ٹیم کا کچھ زیادہ مقبول کھلاڑی نہیں تھا۔ تم نے اسکول کے ریکارڈ میں اس کی جو تصویریں دیکھی ہیں وہ اس وقت لی گئی تھیں جب میں نے اسے فٹ بال اور باسکٹ بال ٹیموں سے باہر نہیں کیا تھا۔"

"کیوں؟"

"وہ اچھا اسپورٹس مین نہیں تھا بلکہ میں تو اسے گندا کھلاڑی کہوں گا۔ وہ جان بوجھ کر فاؤل کرتا تھا جنہیں میں بہت سنجیدہ سمجھتا ہوں۔ ایک بار تو اس نے مخالف ٹیم کے کھلاڑی کی آنکھ میں انگلی ماردی۔ اگر بروقت طبی امداد نہ ملتی تو اس کی ایک آنکھ ضائع ہوجاتی۔ جوئے کے غیر ذمے دارانہ رویے اور کھیل کی وجہ سے ہم کئی جیتے ہوئے میچ ہار گئے۔ اسی وجہ سے وہ یہاں کے لوگوں کے لیے ناپسندیدہ شخصیت بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس کے مرنے کی اطلاع آئی تو کسی نے ایسا ردعمل ظاہر نہیں کیا جو کسی سپاہی کے مرنے پر کیا جاتا ہے۔"

کلے کو یہ سب باتیں سن کر بڑی حیرت ہو رہی تھی لیکن وہ کوچ سے اختلاف نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے بڑے محتاط انداز میں کہا۔ "میں جس جوئے کو جانتا ہوں وہ تمہاری بتائی ہوئی تفصیل سے بالکل مختلف تھا اس لیے میرا حیران ہونا فطری ہے۔"

"حالات کے ساتھ ساتھ انسان کی شخصیت میں تبدیلی آجاتی ہے۔" کوچ نے فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ فوج میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ڈسپلن آگیا ہو اور وہ پہلے سے بہتر انسان بن گیا ہو۔"

ایمی کے آجانے کے بعد ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن میکس کلے کے دماغ میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ اس کے لیے کوچ کی باتوں کو نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا۔

کلے کو مسز ملر کے یہاں رہتے ہوئے کئی دن گزر چکے تھے لیکن ابھی تک وہ گلوریا سے نہیں مل پایا تھا۔ ایمی ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح چپکی رہتی۔ وہ خود بھی پہلے جیسی اجنبیت محسوس نہیں کررہا تھا۔ البتہ ایمی کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی سے وہ خائف تھا۔ وہ سترہ سال کی تھی لیکن اپنے آپ کو وقت سے پہلے بالغ سمجھنے لگی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے دوران وہ اس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھتی۔ جب کبھی وہ باہر گھومنے جاتے تو وہ بہانے سے اس کا ہاتھ تھام لیتی اور کئی بار اس کا بازو کلے کے کندھوں پر آجاتا۔ کلے نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اپنے کسی ردعمل سے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ اشاروں اشاروں میں اسے جتانے کی کوشش کی کہ اسے یہ حرکتیں پسند نہیں۔

ایک رات کلے بستر پر لیٹا کافی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھا اور چپکے سے باہر آگیا۔ پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ جوئے کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوچ کی باتیں اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ جوئے ایک گندا کھلاڑی تھا۔ جان بوجھ کر سنجیدہ نوعیت کے فاؤل کرتا تھا۔ قصبے کے لوگ اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ جوئے تو نہیں جسے وہ جانتا تھا۔

اچانک ہی غیر متوقع طور پر اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایمی نائٹ گاؤن میں ملبوس اس کے عقب میں بیٹھی تھی۔ وہ تھوڑا سا مڑی اور اس نے اپنا ایک بازو کلے کی گردن کے گرد حمائل کردیا۔ اس کے بدن کا لمس محسوس کرتے ہی وہ گڑبڑا گیا۔

"بے بی! تمہیں اس وقت باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے تمہاری ماں جاگ رہی ہو۔"

"وہ صبح سے پہلے نہیں اٹھیں گی۔" ایمی نے اطمینان سے کہا۔ "میری طرف غور سے دیکھو۔ میں بچی نہیں ہوں۔"

کلے نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنی گردن سے ہٹایا اور بولا۔ "تم بچی ہی ہو جبھی ایسی احمقانہ حرکتیں کررہی ہو، جاؤ اچھے بچوں کی طرح بستر میں سو جاؤ۔"

"کیا میں کچھ دیر رک کر تمہاری قربت سے لطف اندوز نہیں ہوسکتی؟"

کلے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے سامنے آتے ہوئے بولی۔ "یہاں سے رخصت ہونے کے بعد تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں نہیں جانتا۔" کلے نے بے رخی سے جواب دیا۔

"کیا تم مزید کچھ عرصہ یہاں نہیں رک سکتے؟"

"ایسا ممکن نہیں ایمی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "مجھے ایک قرض چکانا ہے۔"

"میکس! تم مجھے پسند کرتے ہو نا؟" وہ اس کے قریب آکر سرگوشی میں بولی۔

"ہاں کیونکہ تم جوئے کی چھوٹی بہن ہو۔"

ایمی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھوں پر رکھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی پیش قدمی کرتی، کلے نے اسے آہستہ سے دھکیلا اور دھیمی لیکن سخت آواز میں کہا۔ "رات بہت ہوچکی ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ ایمی اسے غصے اور بے بسی کے عالم میں دیکھتی رہی۔

☆☆☆

اگلے روز سوموار تھا۔ ایمی کا اسکول موسم بہار کی تعطیلات کے بعد کھل رہا تھا۔ کلے بستر پر لیٹے لیٹے ہی ایمی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ علی الصباح تیار ہوئی۔ اپنے لیے ناشتا بنایا اور گاڑی لے کر چل دی۔ مسز ملر ابھی تک سو رہی تھیں۔ کلے بھی تیار ہو کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے ریستوران نظر آیا۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ اس اسٹور کی طرف روانہ ہوگیا جہاں گلوریا کام کرتی تھی۔ یہ ایک چھوٹے قصبے کا بڑا اسٹور تھا جہاں ضرورت کی تمام اشیا ارزاں نرخوں پر دستیاب تھیں۔ کاؤنٹر پر گلوریا کے علاوہ ایک اور درمیانی عمر کا سیلز مین بھی موجود تھا۔ میکس نے گلوریا کو غور سے دیکھا۔ وہ بالکل اس تصویر جیسی تھی جو میکس نے جوئے کے ہیلمٹ سے نکالی اور اب اس کے والٹ میں تھی۔ یہی چہرہ اس نے اسکول کے ریکارڈ میں بھی دیکھا تھا اور اب وہی گلوریا اس سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی۔

گلوریا کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی جب وہ اس کے قریب پہنچا تو بے اعتنائی سے بولی۔ "تم جوئے کے دوست ہو؟"

"ہاں، اور تم اس کی محبوبہ ہو؟"

"مجھے تمہاری آمد کا علم ہوگیا تھا۔" وہ اس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" کلے نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے اپنے کندھے اچکائے اور بولی۔ "یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور یہاں خبریں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں۔ کیا میں تمہارے آنے کا مقصد جان سکتی ہوں؟"

"میں تمہیں قتل کرنے آیا ہوں۔" میکس نے دل میں کہا پھر اس نے مکاری سے کہا۔ "میرے پاس جوئے کی کچھ تصویریں تھیں وہ اس کی ماں کو دینے آیا ہوں۔ ایک تصویر تمہارے لیے بھی ہے۔"

"اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے جوئے کی کوئی تصویر نہیں چاہیے۔"

"وہ تصویر اس کی نہیں بلکہ تمہاری ہے۔" یہ کہہ کر میکس کلے نے اپنا والٹ نکالا اور تصویر اسے تھمادی۔

اس نے تیوری چڑھاتے ہوئے وہ تصویر اپنے ہاتھ میں لی اور بولی۔ "ہاں مجھے یاد آگیا۔ یہ تصویر ہم نے ایک نمائش میں بنوائی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے وہ تصویر اپنی جیب میں رکھ لی۔

کلے نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"کیا......؟" وہ تعجب سے بولی۔

"تم نے اسے وہ خط کیوں لکھا تھا؟" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں تلخی گھل گئی۔ اس نے سوچا کہ اس کی گردن آسانی سے توڑی جاسکتی ہے۔ وہ اسے کام سے واپس جاتے ہوئے راستے میں کہیں بھی دبوچ لے گا اور اپنا کام ختم کرکے رات ساڑھے نو بجے والی ٹرین سے نکل جائے گا۔

"میں نے اسے یہ خط اس لیے لکھا تھا کہ وہ مجھے اپنانے کے ارادے سے واپس نہ آئے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ وہ تو تم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"وہ مجھے اس بے دردی سے تھپڑ مارتا تھا جیسے میں اس کی غلام ہوں۔ کون سی جسمانی اذیت ہے جو اس نے مجھے نہیں دی۔ وہ انسان نہیں درندہ تھا۔"

"تم جوئے کے بارے میں ایسا کہہ رہی ہو؟" کلے نے یقین نہ کرنے والے انداز میں کہا۔

گلوریا کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اسی لیے میں نے کسی دوسرے شخص سے ملنے اور اس سے شادی کرنے کی کہانی گھڑی۔"

"گویا یہ من گھڑت کہانی تھی؟" کلے نے پوچھا۔

"ہاں، میں اس کے واپس آنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ محاذ سے آنے کے بعد وہ دوبارہ اپنی پرانی ملازمت پر چلا جائے گا اور ساری عمر غربت کی چکی میں پستا رہے گا۔ میں زندگی بھر محرومی کی آگ میں نہیں جلنا چاہتی تھی اور یہ تبھی ممکن تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں اس قصبے سے نکل کر کسی دوسرے شہر کا رخ کروں اور اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنے کی کوشش کروں۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ اگر اسے یہ بتادیا جائے کہ میں نے کسی دوسرے شخص سے شادی کرلی ہے تو وہ میرا خیال دل سے نکال دے گا۔ میں نے کئی بار اپنا سامان پیک کیا لیکن اس قصبے سے باہر نہ جاسکی کیونکہ میری کوئی منزل نہ تھی۔"

میکس کلے کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر نمایاں تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے اور وہ کچھ کہے بغیر اسٹور سے باہر آگیا۔

اسی شام ایبی نے کلے سے باہر چلنے کی فرمائش کی۔ موسم بے حد خوش گوار تھا اور سرما کی ہوا چلنے سے فضا میں ہلکی ہلکی خنکی اتر آئی تھی۔ کلے انکار نہ کرسکا اور ایبی اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر آگئی۔ وہ دونوں باتیں کرتے سڑک کے کنارے چلے جارہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ ایبی رک گئی اور اپنا سر میکس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے بولی۔

"میں رات کے واقعے کے لیے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ واقعی میں نے تمہارے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرو۔"

"میں اس طرح نہیں سوچتا۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں اسی وقت پسند کرلیا تھا جب تم پہلی بار ہمارے دروازے پر آئے تھے اور میں امید کررہی تھی کہ تم میرے لیے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کروگے۔"

"میں تمہیں پسند کرتا ہوں ایبی لیکن ایسے نہیں جس طرح تم سوچ رہی ہو۔ اگر تم مجھے اچھی طرح جانتی ہوتیں تو کبھی ایسا نہ سوچتیں۔ تم میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ میں کیا کچھ کرتا رہا ہوں تمہیں کچھ معلوم نہیں۔"

"میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔" ایبی بولی۔ "جوئے ہر خط میں تمہارا ذکر کرتا تھا اور تمہارے بارے میں ایک ایک بات تفصیل سے لکھا کرتا تھا۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ ہم دونوں کتنے قریب تھے۔ ہم دونوں صرف بہن بھائی نہیں تھے میکس۔"

میکس کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ کپکپاتے ہوئے بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ......"

"ہاں، میرا مطلب وہی ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مجھے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔"

کلے ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ وہ کچھ دیر تک ساتھ چلتے رہے پھر میکس بولا۔ "اب ہمیں واپس چلنا چاہیے، بہت دیر ہوگئی ہے۔"

☆☆☆

دوسری صبح وہ ایک بار پھر گلوریا کے پاس گیا جو حسب معمول کاؤنٹر پر کھڑی کچھ پیکٹ الگ کررہی تھی۔ میکس اس کے قریب جاکر بولا۔ "کیا اب بھی تم اپنے سوٹ کیس کی پیکنگ کرتی رہتی ہو؟"

"تم یہ بات کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"کیا اب بھی تمہیں اس قصبے سے جانے کی خواہش ہے؟" میکس نے دوسرا سوال داغ دیا۔

"یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"دو گھنٹے بعد ایک بس یہاں سے جنوب کی طرف جانے والی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کروگی؟"

وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کہاں...... تم کہاں جارہے ہو؟"

"میں نے کہا نا جنوب کی طرف۔ نیواورلینس، میامی، میمفس ہم کہیں بھی جاسکتے ہیں۔"

"کیا میں یقین کرلوں کہ تم میرے ساتھ جوئے جیسا سلوک نہیں کروگے؟"

"تمہیں یقین کرلینا چاہیے۔ میں بالکل بھی جوئے جیسا نہیں ہوں۔"

وہ اس کے قریب گیا اور گال پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "دو گھنٹے بعد میں تمہیں بس اسٹیشن پر ملوں گا۔"

گلوریا اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسے اس جگہ گرمی اور لطافت کا احساس ہوا جسے میکس نے اپنی انگلی سے چھوا تھا۔ شاید وہ کبھی یہ نہ جان سکے گی کہ جو شخص اس کی جان لینے کے درپے تھا وہ کس طرح اس کی زلف کا اسیر ہوگیا۔ میکس نے جوئے کے ساتھ رہ کر تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھا تھا اور اگر وہ اس قصبے میں نہ آتا تو کبھی دوسرا رخ نہ دیکھ پاتا۔ وہ گلوریا کو جوئے کی موت کا ذمے دار سمجھ رہا تھا لیکن جب اسے جوئے کے گھناؤنے کردار کا علم ہوا تو اس کے دل میں گلوریا کے لیے انتقامی جذبہ سرد پڑ گیا اور اس کی جگہ ہمدردی نے لے لی۔ گلوریا کو اس قصبے سے نکلنے کے لیے کسی سہارے کی تلاش تھی۔ وہ جوئے کو واپس تو نہیں لاسکتا تھا لیکن اس کی جگہ تو لے سکتا تھا۔ جوئے کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں تھا۔

◇

جب دنیا میں محبت اتاری گئی تو عجیب تاثیر بھی اس میں رکھ دی گئی جس کا اثر اس کی شدتوں میں چھپا دیا گیا... ایسی ہی ایک داستان جس کا لفظ لفظ اس تاثیر سے معمور تھا مگر... حالات اسے مختلف روپ میں ڈھالتے رہے۔ کہیں پانے کا جنون تو کہیں کھو دینے کا خوف... کہیں حق ملکیت قائم رکھنے کی جنگ تو کہیں اشتراک کا غم... وہ جو بہت معصوم نظر آتی تھی... محبت کے تقاضے نبھانا بھی خوب جانتی تھی... دل جیتنے کے فن سے واقف تھی... پھر بھی محبت کی معراج سے محروم رہی... یہی ادھورا پن اس کی زندگی کا حاصل ٹھہرا۔

قدرت کے ستم کا نشانہ بننے والی حسینہ کا عجیب انتقام

معصومہ

اسما قادری

"اچھا حبیب بھائی اجازت دیجیے۔ انشاءاللہ کل پھر حاضر ہوں گے۔" میرے خالہ زاد بھائی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا تو میں فقط سر ہی ہلا سکا۔ اعصاب اتنی بری طرح ٹوٹے ہوئے تھے کہ کچھ بولنے کی ہمت ہی نہیں ہو پارہی تھی اور میں بالکل بے دست وپا دیوار سے ٹیک لگائے اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا جس میں کافی دیر پہلے کچھ لوگوں نے مجھے بٹھایا تھا۔

"ہمت کیجیے بھائی صاحب۔ اب ہمت اور صبر سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ جس نے جانا تھا وہ تو چلی گئی لیکن اب آپ کو اس غریب کا خیال کرکے خود کو سنبھالنا ہوگا جس کے لیے آپ ہی سب کچھ ہیں۔" میری حالت اتنی خراب تھی کہ کسی کے لیے بھی میری دلی کیفیت کو سمجھنا مشکل نہیں تھا اور اسی وجہ سے میرے کزن کی بیوی نے مجھے سمجھاتے ہوئے میری توجہ اس کی طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

مبذول کروائی تھی جو پچھلے کئی گھنٹوں میں مجھ سے کہیں زیادہ روئی دھوئی تھی اور اب بھی نڈھال سی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور اسے دیکھ کر صاف پتا چل رہا تھا کہ شدت گریہ کے سبب اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ میرے علم میں یہ بات بھی آئی تھی کہ جس وقت جنازہ اٹھایا گیا تھا وہ غم کی شدت سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اسے ہوش میں لانے کے لیے باقاعدہ ڈاکٹر کو بلوانا پڑا تھا۔ اس کی یہ محبت اور خلوص میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس بار میں ان دونوں چیزوں کے سبب شرمندگی کی دلدل میں گھٹنوں گھٹنوں دھنس گیا تھا۔ مجھ سے میرا جو قیمتی اثاثہ چھن گیا تھا اس کے چھن جانے کا دکھ اپنی جگہ بہت شدید تھا لیکن رگوں کو کاٹ دینے والا ایک احساس ندامت اور بڑی حد تک حیرانی بھی تھی، جس نے مجھے سکتہ زدہ سا کر دیا تھا۔ کفن اور غسل کا انتظام، نماز جنازہ کی ادائیگی، تدفین اور تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کو نمٹانے کے تمام مراحل خود انجام دینے کے باوجود میں عجیب سی بے یقینی کا شکار تھا اور بار بار آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا تھا کہ میری آنکھیں جو کچھ دیکھتی رہی ہیں وہ منظر سچ وہی ہے یا میں کسی دماغی خلل یا غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہوں لیکن بدقسمتی سے یہ سب سچ ہی تھا۔ میری زندگی میں آنے والے اس قیامت خیز دن کا بھی بالآخر اختتام ہو ہی گیا اور تمام دوست اور عزیز واقارب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ صرف میری اکلوتی بہن اور اس کے بچے جو اس اندوہناک واقعے کی خبر سن کر آج دوپہر کو ہی حیدرآباد سے یہاں پہنچے تھے میرے گھر میں رکے ہوئے تھے اور شاید ان کا ارادہ سوئم کر کے واپس جانے کا تھا۔ آنے والے آ کر چلے گئے تو اس نے ہی اپنی بیٹیوں کے ساتھ بکھرے گھر کو ممکنہ حد تک سمیٹا اور سب کو تسلی تشفی دے کر سونے کی ہدایت کرنے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ شدید تھکن کے باوجود آج کی رات میرے لیے سونا ممکن نہیں ہو گا لیکن پھر بھی بہن کے کہنے پر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ خواب گاہ خالی تھی اور شاید میں بھی تنہائی ہی چاہتا تھا۔ اس لیے چپ چاپ جا کر بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تنہائی میں آنکھیں بند کرتے ہی میرے دماغ میں ماضی کی ایک فلم سی چل پڑی۔

☆☆☆

میں حبیب احمد ولد توفیق احمد میر پور خاص کا رہنے والا تھا۔ میں اور میری بہن عافیہ اپنے والدین کی بس دو ہی اولادیں تھیں۔ چنانچہ والد کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہ ہونے کے باوجود ہماری گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی۔ میں پڑھنے میں بچپن ہی سے خاصا اچھا تھا اور امید تھی کہ ایف ایس سی کے امتحانات میں اتنے نمبر حاصل کر لوں گا کہ آرام سے کسی میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا لیکن تقدیر کو یہ منظور نہیں تھا، عین سیکنڈ ایر کے امتحانات کے زمانے میں، میں زبردست ٹائیفائیڈ بخار کا شکار ہو گیا۔ اس بیماری سے پوری پامردی سے لڑتے ہوئے میں نے اپنا سال تو ضائع نہیں ہونے دیا لیکن اس معیار کے پرچے نہیں دے سکا جس کی مجھ جیسے طالب علم سے توقع رکھی جا رہی تھی۔ نتیجہ نکلا تو میرے اتنے نمبر نہیں آ سکے جن کی بنیاد پر میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکے۔ لہٰذا میں نے بجائے دل چھوڑ کر بیٹھ جانے کے سوچ لیا تھا کہ اگرچہ میں ڈاکٹر نہیں بن سکا لیکن کسی نہ کسی طور شعبہ طب سے خود کو جوڑ کر رکھ سکتا ہوں۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے میرے نزدیک فارمیسی کا شعبہ سب سے زیادہ مناسب تھا۔ میں نے بی فارمیسی میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے جامعہ کراچی کو فوقیت دی۔ میری والدہ نے بھی میرے اس فیصلے کی تائید کی کیونکہ کراچی میں ان کے بھائی یعنی میرے سب سے بڑے ماموں مقیم تھے اور میری رہائش کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو سکتا تھا۔ امی نے اس سلسلے میں ٹیلی فون پر ماموں اور ممانی سے سرسری انداز میں بات کی تو ان دونوں نے ہی نہایت خوش دلی سے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ زور دیا کہ اگر ہمارا گھر ہوتے ہوئے حبیب نے ہاسٹل میں قیام کیا تو ہمیں بہت برا لگے گا۔ ان کے مطابق حبیب یعنی میں گھر کا بچہ تھا اور گھر کا بچہ ہاسٹل کے غیر آرام دہ ماحول میں رہ کر الٹے سیدھے کھانے کھاتا تو انہیں شدید دکھ ہوتا چنانچہ میں اپنا سامان پیک کر کے بڑے اطمینان سے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن پر ماموں خود مجھے لینے آئے تھے۔ میں کم و بیش پانچ سال بعد کراچی آیا تھا اور ظاہر ہے اس دوران بڑھتی ہوئی عمر کا ایک بچہ تبدیلی کے بہت سے مراحل تیزی سے طے کر کے ہلکی ہلکی مونچھوں والے ایک نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا، اس لیے ماموں جان کے لیے پہلی نظر میں مجھے پہچاننا ممکن نہیں ہوا۔ البتہ میں نے انہیں فوراً پہچان لیا اور قریب جا کر ادب سے انہیں سلام کیا۔

"ارے واہ حبیب میاں! تم تو اچھے خاصے جوان ہو گئے ہو۔" انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور حیرت

اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولتے ہوئے گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔ ماموں کے پاس ان دنوں ایک ویسپا ہوا کرتی تھی اور کراچی کے حالات بھی اس نہج پر نہیں پہنچے تھے کہ آئے دن ڈبل سواری پر پابندی لگتی رہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے میرے بڑے سے بیگ سمیت آرام سے اپنی ویسپا پر سوار کیا اور لے کر گھر پہنچ گئے۔ گھر پر ممانی میرے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ "ماشاءاللہ۔ حبیب میاں تم نے تو خوب قد کاٹھ نکالا ہے۔" سلام دعا کے مراحل طے ہونے کے بعد انہوں نے بھی اسی حیرت اور خوشی کا اظہار کیا جس کا مظاہرہ ماموں جان نے اسٹیشن پر کیا تھا۔ "اصل میں آپ لوگ مجھے بہت عرصے بعد دیکھ رہے ہیں نا اس لیے ایسا لگ رہا ہے۔" میں نے کچھ جھینپتے ہوئے وضاحت کی۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو میاں! تم اتنے بے مروت نکلے کہ دونوں بہنوں کی شادی میں شرکت کے لیے بھی کراچی نہ آئے۔" انہوں نے پہلے سے تیار کردہ شربت کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں شکوہ کیا تو میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ماموں جان کا کوئی بیٹا نہیں تھا اور صرف تین بیٹیاں تھیں۔ ان تین میں سے دو مجھ سے بڑی اور ایک چھوٹی تھی۔ دونوں بڑی لڑکیوں میمونہ اور عالمہ کی شادیاں تقریباً ایک سال قبل اکٹھی ہوئی تھیں لیکن میں اس تقریب میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔

"بس ممانی جان۔ آپ کو تو پتا ہی ہو گا کہ میں پڑھائی میں کتنا مصروف رہتا تھا۔ میمونہ باجی اور عالمہ باجی کی شادی کے وقت میرے فرسٹ ایر کے امتحان ہونے والے تھے اس لیے میں دل چاہنے کے باوجود شرکت کے لیے نہیں آ سکا تھا۔" میں نے ذرا شرمندہ سے لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

"چلو جانے دو بچے۔ ہم تمہاری ماں نفیسہ کی زبانی سنتے رہے ہیں کہ تمہیں پڑھنے لکھنے کا کتنا شوق ہے۔ ان پانچ سالوں میں وہ شادی میں شرکت کے علاوہ جب کبھی چھٹیوں میں بھی یہاں آئی تو یہی بتاتی رہی کہ تم چھٹیوں میں بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتے اور کوئی نہ کوئی کورس وغیرہ کرتے رہتے ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ تمہارے اپنے اندر شوق اور لگن ہے ورنہ تو ہم نے لڑکوں کے ماں باپ کو ہمیشہ یہی شکوہ کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ پڑھنے میں دھیان نہیں دیتے اور ادھر ادھر کے شغل میلوں میں لگے رہتے ہیں۔" ممانی جان نے کھل کر میری تعریف کی تو میں شرما گیا۔

"تم بھی کمال کی عورت ہو عارفہ! بچہ سفر کر کے آیا ہے بجائے اس کے کہ اسے نہا دھو کر آرام کرنے کا موقع دو باتوں میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔" ماموں جان نے اچانک گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے انہیں ٹوکا اور پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ "برا مت ماننا بیٹا! تمہاری ممانی کو ذرا زیادہ باتیں کرنے کی عادت ہے اور اس عادت کی وجہ سے یہ دوسرے کے آرام کا خیال کرنا بھی بھول جاتی ہیں۔"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو انتظار کر رہی تھی کہ یہ شربت ختم کر لے تو اس سے کہوں کہ نہا دھو لے۔ اتنے میں معصومہ بھی اسکول سے آ جائے گی تو سب مل کر کھانا کھا لیں گے۔ میں نے اتنی محبت سے اپنے بچے کے لیے کھانا بنایا ہے۔ وہ کھا کر آرام سے سوئے گا یا آپ اسے بھوکے پیٹ ہی سلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" ممانی نے چہک کر ماموں جان کو جواب دیا اور پھر مجھے اپنی راہنمائی میں غسل خانے تک لے گئیں۔ میں غسل کر کے فارغ ہوا تو تازگی کا احساس ہونے لگا۔ میرپور سے کراچی کا فاصلہ چند گھنٹوں پر ہی مشتمل تھا لیکن گرمی کی وجہ سے حالت خاصی خراب ہو گئی تھی۔ ٹھنڈے میٹھے شربت کے بعد نہانے کا بھی موقع مل گیا تو طبیعت خاصی بشاش ہو گئی۔ میں گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کر کے تولیا رسی پر پھیلا رہا تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی اور ماموں جان "معصومہ اسکول سے آ گئی" بولتے ہوئے دروازے کی طرف لپکے۔ میں نے بھی اپنی ماموں زاد بہن کو دیکھنے کے اشتیاق میں نظریں دروازے پر جما دیں لیکن دروازہ کھلتے ہی جو چودہ پندرہ سالہ لڑکی اسکول یونیفارم میں اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کیا واقعی وہ میری ماموں زاد معصومہ تھی۔ حقیقت ہونے کے باوجود مجھے اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

پانچ سال قبل میں نے معصومہ کو دیکھا تھا تو وہ تقریباً دس سال کی گلابی رنگت والی دبلی پتلی نازک سی بچی تھی جس کے بھورے بال اور بلی کی سی بھوری آنکھیں گلابی رنگت کے ساتھ خوب جچتی تھیں۔ اسے بنا کسی جھجک کے تینوں بہنوں میں سب سے خوب صورت قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ اور عافیہ تقریباً ہم عمر تھیں اور دونوں میں خوب بنتی تھی۔ دونوں اکثر گھر کے کسی گوشے میں ایک گڑیا کے ساتھ کھیلتی پائی جاتی تھیں۔ یہ ولایتی گڑیا تھی جو کم و بیش معصومہ ہی جیسے رنگ و روپ کی مالک تھی۔ البتہ معصومہ کو اپنی شوخ و معصوم اداؤں اور چہچہاہٹ کی وجہ سے اس گڑیا پر فوقیت حاصل تھی۔ گڑیا اور اس میں پائی جانے والی مشابہت کی بنیاد پر میں نے معصومہ کو مذاق میں ڈولی پکارنا شروع کر دیا تھا اور میری

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی اسے اس نام سے بلانے لگے تھے۔ اس کے بعد پانچ سال تک میرا کراچی آنا نہیں ہوا نہ ہی ماموں جان اور ان کے اہل خانہ میں سے کوئی ہمارے ہاں آیا۔ سچ یہ ہے کہ اس عرصہ میں، میں بھی اتنا مصروف رہا کہ معصومہ تو کیا کسی کا بھی خیال نہیں آیا لیکن اب جبکہ میں ماموں جان کے گھر میں تھا اور معصومہ کا ذکر چل پڑا تھا تو میری یادداشت بھی بحال ہو گئی تھی اور فطری طور پر میں یہ سوچے بیٹھا تھا کہ دس سال کی عمر میں نازک گڑیا جیسی دکھائی دینے والی بچی جوانی کی دہلیز کے پاس پہنچنے پر تو خاصی قیامت خیز ہو گئی ہوگی لیکن معصومہ کے نام سے جو لڑکی گھر میں داخل ہوئی اسے دیکھ کر مجھے بہت زبردست دھچکا لگا۔ لڑکی کیا تھی بس ہڈیوں کا پنجر تھی جس کی گہری سانولی رنگت پر بھورے بال اور بھوری آنکھیں بہت بری اور بے جوڑ لگ رہی تھیں اور چہرہ...... اف خدا! اس کا چہرہ تو چھوٹے بڑے کئی گڑھوں سے بھرا پڑا تھا جس میں الجھنے کے بعد آدمی ناک نقشے پر غور کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا چہرہ تھا جسے دیکھ کر طبیعت میں عجیب سی کراہیت محسوس ہوتی تھی۔

”بیٹا حبیب! معصومہ تمہیں سلام کر رہی ہے۔“ ماموں جان کی آواز نے مجھے سکتہ زدہ سی کیفیت سے باہر نکالا تو میں نے سنبھل کر سلام کا جواب دیا ویسے حقیقت میں، میں اس کا سلام سن ہی نہیں سکا تھا۔

”رہنے دیں ابا! کیوں بے چارے حبیب بھائی کو ڈسٹرب کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایسا عجوبہ زندگی میں پہلی بار دیکھا ہوگا نا اس لیے حیران رہ گئے ہیں۔“ میرے جوابی سلام کو نظر انداز کرتی ہوئی وہ تلخ لہجے میں ماموں جان سے بولی اور پھر تیزی سے اندر گھس گئی۔ میں اپنی جگہ شرمندہ سا ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ تلخی کے ساتھ ساتھ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی۔

”آجاؤ میاں! تمہاری ممانی کھانے کے لیے آواز دے رہی ہیں۔“ مجھے گم صم سی کیفیت سے نکالنے کا فریضہ اس بار بھی ماموں جان نے انجام دیا۔ میں خاموشی سے ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ممانی جان دسترخوان سجائے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے میرے لیے بہت پرتکلف کھانا تیار کیا تھا۔

”اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی ممانی جان! میں کوئی مہمان تھوڑا ہی ہوں۔ بہت لمبے عرصے تک رہنا ہے مجھے یہاں۔“ اتنا اہتمام دیکھ کر میں کہے بنا نہ رہ سکا۔

”جم جم رہو بیٹا۔ جو تمہارا نصیب ہوگا۔ ملتا رہے گا لیکن آج تو پہلا دن ہے نا تمہارا ہمارے گھر میں اس لیے میں نے خاص انتظام کیا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا اور ساتھ ہی میرے سامنے پلیٹ رکھ کر اشارہ کیا کہ میں کھانا نکالوں۔

”معصومہ کا انتظار کر لیتے ہیں۔“ میں نے دبی زبان سے کہا۔

”تم شروع کرو بیٹا! مشکل ہی ہے کہ اب وہ کھانا کھائے۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا ہے۔“ ماموں جان نے آہستہ سے بتایا تو میں مزید شرمندہ ہو گیا۔ معصومہ کو دیکھ کر اپنا حیرت زدہ رہ جانا اور جواب میں اس کا ردعمل ابھی چند لمحے پہلے ہی کی تو بات تھی اس لیے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کا موڈ میری وجہ سے خراب ہوا ہے۔ شرمندگی کی وجہ سے میں کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہ بڑھا سکا۔ ”تم پریشان مت ہو بیٹا! وہ ایسی ہی ہو گئی ہے۔ بہت جلد برا مان جاتی ہے۔“ ماموں جان نے میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے رسان سے تسلی دی۔

”لیکن کیوں؟ اس کے ساتھ آخر ہوا کیا۔ بچپن میں تو وہ بہت خوش شکل......“ میں کہتے کہتے رک گیا۔

”بس میاں۔ سارے نصیب کے کھیل ہیں۔ میری یہ بچی اپنی دونوں بہنوں سے زیادہ خوب صورت تھی لیکن پچھلے برس اتنے زبردست طریقے سے چکن پاکس کی لپیٹ میں آئی کہ جان بچنی مشکل ہو گئی کہنے کو اتنی بڑی بیماری نہیں تھی لیکن بگڑی تو ایسی بگڑی کہ بچی کی خوب صورتی اور صحت کو کھا گئی۔ دیکھو تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ میری وہی سرخ و سفید بچی ہے۔ اسے خود بڑا صدمہ ہے، کتنے عرصے تک تو کسی کے سامنے جانے کے لیے راضی نہیں ہوتی تھی۔ بڑی مشکل سے سب نے سمجھا بجھا کر دوبارہ اسکول جانے پر راضی کیا ہے لیکن اسکول کے علاوہ اب بھی کہیں جانے آنے کو راضی نہیں ہوتی۔ چڑچڑی بھی بہت ہو گئی ہے۔ کھانے پینے پر توجہ دیتی ہے نہ پہلے کی طرح ہنستی بولتی ہے ورنہ کم از کم صحت تو ٹھیک ہو ہی سکتی تھی۔ ہم تو خود بہت پریشان ہیں دن رات دعا کرتی ہوں کہ اللہ میری بچی کا نصیب کھولے اور وہ اس صدمے سے باہر آئے۔“ اس بار جواب دینے کا فریضہ ممانی جان نے انجام دیا تھا اور ان کے لہجے کی اداسی بتا رہی تھی کہ وہ سچ مچ بہت دکھی اور پریشان ہیں۔ میں خود بھی اپنے آپ کو افسردہ محسوس کرنے لگا۔ ایک ایسی لڑکی کے لیے جو ہمیشہ اپنی شکل و صورت کی بنیاد پر سراہی گئی ہو، خوب صورتی سے محروم ہو جانا واقعی ایک بڑا صدمہ تھا اور میرے لیے افسوس کا مقام تھا کہ میں انجانے میں اس کی دل آزاری کا سبب بن گیا تھا۔ افسوس کے باعث میں ماموں اور ممانی کے اصرار پر پرتکلف اور لذیذ کھانا بھی رغبت سے نہیں کھا سکا۔

☆☆☆

اپنی ذات سے معصومہ کو ہونے والے دکھ کی تلافی کے لیے میں نے پہلی فرصت میں ہی اس سے معافی مانگ لی تھی۔ میرے معافی مانگنے پر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور کئی دنوں تک مجھ سے کھنچی کھنچی رہی لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑنا ہے۔ میری مستقل مزاجی کے سامنے آخرکار اسے ہار ماننا پڑی اور وہ آہستہ آہستہ مجھ سے بے تکلف ہوتی چلی گئی۔ میرا معمول تھا کہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا پھر ایک دو جگہ ٹیوشنز دینے چلا جاتا۔ رات کے کھانے کے بعد دیر تک پڑھنا بھی میرے معمول کا حصہ تھا۔ یوں تو گھر کا زیادہ تر کام کاج ممانی جان خود کرتی تھیں لیکن میرے بہت سے کام معصومہ نے خود سنبھال لیے۔ مجھے وقت پر کھانا دینا، وقتاً فوقتاً چائے بنا کر پلانا، کپڑوں کی استری اور چھوٹی موٹی مرمت کے ساتھ ساتھ کمرے کی باقاعدگی سے صفائی جیسے سارے کام اس نے اپنے ذمے لے لیے۔ سچ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے ماموں جان کے گھر میں اپنے گھر سے بھی زیادہ آرام ملتا تھا۔ ورنہ کپڑوں کی استری اور وقت بے وقت کی چائے کی سہولت تو مجھے میری اپنی ماں اور بہن کی طرف سے بھی حاصل نہیں تھی۔ بدلے میں، میری بھی کوشش ہوتی تھی کہ معصومہ کے لیے کچھ کر سکوں۔ میں کبھی کبھار اس کے لیے کوئی چھوٹا موٹا تحفہ یا کھانے پینے کی چیز لا دیتا تھا۔ پڑھائی میں بھی وہ اکثر میری مدد لے لیا کرتی تھی۔ ممانی جان خوش تھیں کہ میری آمد کی وجہ سے ہر وقت چپ چپ رہنے اور زیادہ تر اپنے کمرے میں وقت گزارنے والی معصومہ میں تبدیلی آنے لگی ہے۔ شاید اسی تبدیلی کو محسوس کر کے خاندان میں ہونے والی ایک شادی میں شرکت کی خاطر وہ معصومہ کے لیے ایک خوب صورت لباس لے آئیں اور اس سے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرنے لگیں لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ ممانی جان نے مجھ سے اس سلسلے میں مدد چاہی۔ اصل میں شادی ان کے خاندان میں تھی اور ان کی بھانجیوں، بھتیجیوں کا شدید اصرار تھا کہ معصومہ کو بھی ساتھ لایا جائے۔ انہوں نے مجھ سے مدد کی درخواست کی تو میں نے رات کو اس وقت جب وہ میرے مطالعے کے دوران چائے پہنچانے آئی تو اسے گھیر لیا۔

”ہاں بھئی۔ یہ کیا قصہ ہے؟ ممانی جان اتنی محبت سے تمہارے لیے اتنا خوب صورت سوٹ لے کر آئی ہیں اور تم شادی میں جانے سے انکاری ہو۔“ میں نے براہ راست اس سے پوچھا۔

”میرا دل نہیں چاہتا جانے کا۔“ اس نے منہ بسور کر جواب دیا۔

”کیوں نہیں چاہتا۔ وہاں تمہیں اپنی اتنی ساری کزنز ملیں گی۔ لڑکیاں تو موقع ڈھونڈتی ہیں کہ خوب صورت کپڑے پہن کر دوسروں کے سامنے شو مار سکیں اور تم جانے کو راضی نہیں ہو۔“ میں نے بحث کی۔

”وہ دوسری لڑکیاں ہوتی ہیں حبیب بھائی! میں اتنے خوب صورت کپڑے پہن کر بھلا کیسے شو مار سکتی ہوں؟ میرے پہننے سے تو ان کپڑوں کی خوب صورتی بھی ماند پڑ جائے گی۔“ اس نے نہایت افسردگی سے جواب دیا۔

”کیوں؟ تم میں کیا خرابی ہے؟“ میں نے اسے ڈپٹا۔

”جیسے آپ کو تو کم نظر آتا ہے؟ کتنی بدصورت ہو گئی ہوں میں۔ اس شکل کو لے کر میرا کسی کے سامنے جانے کا دل نہیں چاہتا۔“ اس کے لہجے میں اس کا احساس کمتری بول رہا تھا۔ مجھے اس سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی اور میں نے بالکل بے ساختگی میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پھر نرمی سے سمجھانے لگا۔ ”دیکھو معصومہ! بدصورت وہ ہوتا ہے جس کا دل بدصورت ہو اور تم تو بہت ہی خوب صورت دل کی مالک ہو۔ ویسے بھی بیماری نے تمہارے رنگ روپ کو ذرا سا گہنایا ہے۔ ناک نقشہ تو تمہارا اب بھی وہی ہے اگر تم تھوڑی توجہ اپنی صحت پر دو تو مزید بہتر لگنے لگو گی لیکن بہرحال اس بات کا میں تمہیں اب بھی یقین دلاتا ہوں کہ تم بدصورت نہیں لگتیں کم از کم میری نظروں کو تو تم بالکل بھی بدصورت نہیں لگتیں اور یہ میرا حکم ہے کہ تم شادی میں جاؤ گی کیونکہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چل رہا ہوں۔“ میں نے چند جملوں میں ہی بات ختم کر دی اور یہ محسوس بھی نہیں کر سکا کہ میری بات نے معصومہ کے دل میں کتنی گہرائی تک جا کر اثر کیا ہے۔ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس نے نہ صرف شادی میں شرکت کی بلکہ اپنی صحت پر بھی توجہ دینے لگی۔ نتیجے میں اس کے بے رونق ہو جانے والے بالوں اور جلد میں مثبت تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور وہ قدرے بہتر لگنے لگی۔ تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہوئی معصومہ کے ساتھ ساتھ وقت بھی آگے بڑھتا رہا اور ہمارے تعلیمی مدارج بھی طے ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ میرا فائنل سمسٹر آ گیا۔ معصومہ بھی بی اے میں پہنچ چکی تھی اور فطری طور پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

ممانی جان کو اس کی شادی کی فکر بھی لگ گئی تھی لیکن اس فکر کے ساتھ ایک دوسری فکر بھی تھی جو انہیں مدد مانگنے میرے پاس لے آئی۔

''میں بڑی پریشان ہوں بیٹا! معصومہ کے رشتے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہی ہوں چند جاننے والوں کے توسط سے دو ایک لوگ رشتے کے لیے آئے بھی تھے لیکن یہ نگوڑی کسی کے سامنے جانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی۔ اب بھلا کوئی لڑکی کو دیکھے بغیر تو رشتہ کرنے سے رہا۔ تمہاری بہت سنتی ہے تم ہی اسے سمجھاؤ۔'' انہوں نے کئی بار کی طرح ایک بار پھر معصومہ کے حوالے سے ایک ذمے داری میرے سر پر ڈال دی مجھے بھی اپنے قیام کے ان چند سالوں میں عادت ہو گئی تھی معصومہ سے متعلق چھوٹے موٹے مسئلے سلجھانے کی اور یہ زعم بھی تھا کہ وہ میری بات ماننے سے انکار نہیں کر سکتی، چنانچہ اسی روز اس سلسلے میں بات چھیڑ دی۔

''میں نے ہمیشہ آپ کی ہر بات مانی ہے حبیب بھائی لیکن اس سلسلے میں آپ مجھ پر زور نہ دیں۔'' اس نے پہلے مرحلے میں ہی سختی سے مجھے ٹوک دیا۔

''لیکن کیوں بھئی، دنیا میں ساری لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہی ہیں اور اسی طریقے سے ہوتی ہیں۔ لوگ لڑکی کو دیکھتے ہیں اس کے بعد ہی آگے کے مراحل طے ہوتے ہیں۔'' میں نے ہار ماننے کے بجائے اس سے بحث جاری رکھی۔

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے بھانت بھانت کے لوگوں کے سامنے جا کر اپنی نمائش کرنے اور ریجیکٹ ہونے کا۔'' اس نے تلخی سے جواب دیا۔

''طریقہ تو واقعی یہ اچھا نہیں ہے لیکن ہمارے معاشرے میں عموماً اسی طریقے سے رشتے طے ہوتے ہیں۔'' میں نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے رسانیت سے سمجھانے کا فریضہ جاری رکھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ اس طریقۂ کار سے گزرنا تمہارے لیے تکلیف دہ ہوگا لیکن اگر تم اپنے والدین کی پریشانی کا سوچو گی تو خود کو راضی کر لو گی۔ ریجیکٹ ہونے کے ڈر سے خود پر یہ الزام کیوں لیتی ہو کہ تم اپنے والدین کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی ہو۔''

''آپ مجھے کسی کنویں یا کھائی میں کود جانے کا حکم دیں میں انکار نہیں کروں گی لیکن اس سلسلے میں میں مجبور ہوں۔'' وہ قطعیت سے کہتی ہوئی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا رویہ اپنایا تھا۔ ورنہ تو میرے کہنے پر جلد ہی مان جایا کرتی تھی۔

''اور ہاں اس بات کو بھول جایئے کہ میں ریجیکٹ ہونے کے ڈر سے کسی کے سامنے نہیں جاتی...... سچ یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے مجھے پسند کر بھی لیا تو میں خود اسے ریجیکٹ کر دوں گی۔'' وہ کہہ کر جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی اور میں الجھن میں پڑ گیا کہ اس نے اتنی عجیب بات کیوں کی ہے۔ ایسا تو عموماً اس صورت میں ہوتا ہے جب لڑکی کی زندگی میں کوئی پہلے سے موجود ہو اور معصومہ مجھ سے اتنی قریب تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اگر ایسا کوئی شخص ہوتا تو وہ باقاعدہ چاہے مجھے نہ بھی بتاتی لیکن کسی نہ کسی حوالے سے تذکرہ ضرور کرتی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ میری یہ الجھن دو دن بعد ہی دور ہو گئی۔ وہ چھٹی کا دن تھا جب میمونہ باجی اپنے بچوں کے ساتھ ملنے چلی آئیں۔ ان کے تین عدد شرارتی بچوں کی وجہ سے گھر کی فضا میں ایک خوشگوار سا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ اس ہنگامے میں سکون کا وقفہ اس وقت آیا جب دوپہر کے کھانے کے بعد میمونہ باجی نے پکڑ دھکڑ کر اپنے بچوں کو سونے کے لیے لٹا دیا۔ میں بھی اس وقفے کو غنیمت جان کر اپنے لیے مخصوص کمرے میں آ کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میمونہ باجی دستک دے کر میرے کمرے میں چلی آئیں۔

''میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' میرے روبرو بیٹھتے ہوئے انہوں نے تکلفاً پوچھا۔

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میں نے سامنے کھلی کتاب بند کر دی اور اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ ان کے اس طرح میرے کمرے میں آنے کا سبب کیا ہے۔ کیونکہ یہ تو ان کے چہرے پر لکھا تھا کہ وہ بلاسبب نہیں آئی ہیں۔

''پڑھائی کیسی چل رہی ہے تمہاری؟ اب تو لاسٹ سیمسٹر ہے نا؟'' انہوں نے جیسے بہت سوچتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی ہاں، بس کچھ ہی عرصہ باقی ہے پھر آپ کے بھائی کو ڈگری مل جائے گی۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں ان کی بات کا جواب دیا تاکہ وہ بے تکلفی سے گفتگو کر سکیں کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے آئی ہیں کہتے ہوئے جھجک رہی ہیں۔

''ماشاءاللہ۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' انہوں نے خوشی کا اظہار کیا پھر پوچھنے لگیں۔

''اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟ یہیں کراچی میں رہ کر ملازمت کرو گے؟''

''جی۔ اس کے سوا چارا بھی کیا ہے۔ میرپور خاص میں تو مجھے میری مرضی کی جاب مل نہیں سکتی اس لیے مجبوری ہے۔ خوش قسمتی سے ایک دوست کے ذریعے ایک میڈیسن کمپنی کے ساتھ معاملات بھی طے ہو گئے ہیں جیسے ہی میں اپنے آخری پیپر سے فارغ ہوں گا فوراً وہاں جوائن کر لوں گا۔'' میں نے انہیں خوش خبری سنائی۔

''ارے یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' انہوں نے کھل کر اپنی خوشی کا اظہار کیا پھر چھیڑنے والے انداز میں بولیں۔ ''پھر تو شادی بھی کراچی کی لڑکی سے ہی کرو گے۔''

''ابھی اس بارے میں کچھ سوچا نہیں ہے۔ ویسے بھی اس معاملے میں تو زیادہ امی کی رضا ہی چلے گی۔ اب دیکھیں وہ میرے لیے کہاں کی لڑکی پسند کرتی ہیں۔'' میں نے کچھ جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ یونیورسٹی کے آزاد ماحول میں پڑھنے لکھنے کے باوجود میں ان لڑکوں میں سے نہیں تھا جو اس قدر بے باک ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی خاندانی اقدار و روایات یاد نہیں رہتیں۔ ''خوش نصیب ہیں پھپھو کہ انہیں ایسا سعادت مند بیٹا ملا۔ آج کل تو لڑکیاں بھی ایسی سعادت مند نہیں رہی ہیں۔ معصومہ ہی کو دیکھ لو کتنا پریشان کر رکھا ہے اس نے امی کو۔'' ان کا لہجہ افسردہ سا ہو گیا۔

''پریشان نہ ہوں۔ سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ۔'' میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی، ورنہ میں اس کا جو اٹل انداز دیکھ چکا تھا اس کے بعد مجھے خود بھی کوئی امید نہیں تھی کہ وہ کسی کی سنے گی۔

''نہیں سمجھے گی وہ۔ اس کے سر پر جو بھوت سوار ہے وہ اسے کچھ سمجھنے نہیں دے گا۔'' میمونہ باجی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ان کے لہجے کی تلخی نے میرے اندر پھر وہی شک اٹھایا جو پہلے بھی معصومہ سے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں ابھر چکا تھا۔

''کیا وہ...... کہیں انٹرسٹڈ ہے؟'' میں بہت جھجکتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''ہاں۔'' انہوں نے تسلیم کرنے میں لمحہ بھی نہ لگایا۔

''کون ہے وہ۔ اس نے اس سلسلے میں آپ لوگوں کو کچھ بتایا؟'' میں یکدم بہت متجسس ہو گیا۔ شک ہونے کے باوجود میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ میرے علم میں آئے بغیر کوئی شخص معصومہ کی زندگی میں آ چکا ہے۔ جواب میں میمونہ باجی کچھ دیر تک مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتی رہیں پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انکشاف کیا۔

''تم۔ وہ شخص تم ہو حبیب۔'' میرے تو سر پر گویا بم

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھٹ گیا۔

”مم...... میں...... مگر باجی۔ میں نے تو کبھی اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ میں بوکھلا کر اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

”میں جانتی ہوں۔ معصومہ نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا کہنا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور تمہارے علاوہ کسی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی بلکہ اس نے تو یہاں تک کی دھمکی دی ہے کہ......“ وہ کہتے کہتے ذرا سا رکیں۔

”اس کا کہنا ہے کہ اگر حبیب کی کسی اور لڑکی سے شادی ہوئی تو وہ خودکشی کرلے گی۔“

ان کی بات سن کر میں نے سر تھام لیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ معصومہ اس طرح کی بھی باتیں کرسکتی ہے۔ پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ میں شرمندہ بھی تھا کہ جانے ماموں جان اور باقی گھر والے کیا سوچتے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے دلوں میں یہ خیال آیا ہو کہ میں نے خود ہی معصومہ کے دل میں ایسے جذبات پیدا کیے ہیں لیکن اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے معصومہ کو جو اہمیت اور توجہ دی تھی وہ انسانی ہمدردی اور کزن ہونے کے ناتے دی تھی، میرے دل میں دور دور تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا جو معصومہ نے سوچ لیا تھا اور سب کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کردیا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے حبیب لیکن اگر امی ابو کا خیال کرکے تم معصومہ کے بارے میں تھوڑا غور کرلو تو یہ تمہارا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ اگر وہ کسی معاملے میں ضد پر اڑ جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کی ضد سے نہیں ہٹا سکتی۔ اس کی اسی فطرت نے مجھے تمہارے سامنے زبان کھولنے کے لیے مجبور کیا ہے، ورنہ شریفوں میں کب ایسا ہوتا ہے کہ اپنے ہی منہ سے اپنی لڑکی کا رشتہ لے کر کسی لڑکے سے......“ وہ جملہ پورا نہ کرسکیں اور سسکتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں بھی اپنی جگہ سکتہ زدہ بیٹھا رہ گیا۔

☆☆☆

میمونہ باجی سے ہونے والی گفتگو نے مجھے بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس الجھن کو دور کرنے کے لیے میں نے معصومہ کو بھی سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا بلکہ بات اتنی بڑھ گئی کہ میرپور خاص میرے گھر تک بھی جا پہنچی۔ امی نے اس سلسلے میں مجھ سے بات کی تو میں نے انہیں بھی صاف بتا دیا کہ میرے اور معصومہ کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا جواب سن کر وہ صرف اتنا بولیں۔

”خیال رکھنا بیٹا! معصومہ میرے اس بھائی کی اولاد ہے جنہوں نے والدین کے انتقال کے بعد مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میرا میکا نہیں رہا ہے۔ کل کو اگر میرے بیٹے کی وجہ سے انہیں کوئی دکھ پہنچا تو مجھے بہت شرمندگی ہوگی۔“

ابو سے بات ہوئی انہوں نے کہا۔ ”یہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہے۔ تم جو فیصلہ کروگے ہمارے لیے قابلِ قبول ہوگا۔“

عافیہ نے لیکچر دیا۔ ”آپ خود کو بالکل بے قصور ثابت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کسی نامحرم لڑکی کو غیر معمولی توجہ دیتے ہوئے آپ کو یہ خیال آنا چاہیے تھا کہ آپ کی اس ہمدردی اور توجہ کا کوئی اور نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔ نتیجہ نکل گیا ہے اور کوئی ایسا غیر فطری بھی نہیں ہے۔ البتہ آپ خود کو بے قصور ظاہر کرکے جان چھڑانا چاہیں تو بالکل چھڑا سکتے ہیں لیکن میں پوچھتی ہوں کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ معصومہ میں کیا برائی ہے۔ خاندان کی لڑکی ہے، پڑھی لکھی اور سلیقہ مند بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ سے بے حد و حساب محبت کرتی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ دلہن بن کر ہمارے گھر میں آئے گی تو سب رشتوں کو بہت اچھی طرح نبھائے گی اور ہم اس روایتی چپقلش سے بچ جائیں گے جو ساس بہو وغیرہ میں چلتی رہتی ہے۔ اتنی اچھی لڑکی کو محض اس کی شکل و صورت کی بنیاد پر ٹھکرا دینا کوئی انصاف نہیں ہوگا۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو خود کو ضمیر کی اس خلش سے کس طرح بچائیں گے جو معصومہ کی زندگی برباد ہونے یا سرے سے ختم ہوجانے کی صورت میں کبھی آپ کو نہیں چھوڑے گی۔“ عافیہ کی معصومہ سے دوستی تھی اور اس موقع پر اس نے حق دوستی خوب ادا کیا تھا۔ اس سے ہونے والی گفتگو کے بعد میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا اور ایسے بہت سے لمحات میری گرفت میں آگئے جب میں نے بے شک معصومہ کے احساسِ کمتری کو دور کرنے کی نیت سے اس کی بے جا تعریف و توصیف کی تھی۔ میری نیت جو بھی تھی اس کے نتیجے میں ایک نوعمر لڑکی کے جذبات میں تغیر آنا فطری بات تھی اور یہاں معاملہ اس لیے شدت اختیار کر گیا تھا کہ معصومہ کے اپنے مزاج میں شدت پسندی اور ضدی پن کے عناصر موجود تھے اور اس بات میں کسی کو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس پر عمل بھی کر گزرے گی اور میرے جیسے حساس آدمی کے لیے اس صورتِ حال کو برداشت کرنا بھی ممکن نہیں تھا دوسری طرف مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ عافیہ کی طرح کھل کر معصومہ کے حق میں ووٹ نہ دینے کے باوجود امی کی بھی خواہش ہے کہ میں معصومہ کو قبول کرلوں۔ البتہ ان کی اس خواہش کے پیچھے معصومہ سے زیادہ ماموں جان کی محبت کارفرما تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ بیٹے کو دامادی میں دے کر وہ بھائی کے احسانات کا قرض چکا سکیں۔

چنانچہ میں نے ہار مان لی اور میرے عملی میدان میں قدم رکھتے ہی معصومہ میری زندگی میں آگئی۔ وہ ہر اعتبار سے ایک مثالی بیوی اور بہو تھی اور مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کی وجہ سے کبھی گھریلو مسائل میں نہیں الجھنا پڑا۔ امی کی وہ اگر پھپھو ہونے کی حیثیت سے عزت کرتی تھی تو عافیہ کو بھی ہمیشہ بہنوں کی نظر سے دیکھا اور اس کی شادی کے بعد بھی اس کا ہر موقع پر خیال رکھتی رہی۔ یہاں تک کہ عافیہ کے تینوں بچوں کی پیدائش بھی ہمارے گھر میں رہتے ہوئے ہوئی اور معصومہ نے اس کا بھرپور خیال رکھا۔ امی اور ابا کا بھی اس نے بہت خیال رکھا اور وہ اسے دعائیں دیتے ہوئے ہی اس دنیا سے گئے اس کی ان تمام تر خوبیوں کے اعتراف کے باوجود مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ اس کی رفاقت نے مجھے وہ بھرپور خوشی نہیں دی جس کا میں ازدواجی زندگی میں تصور کرتا تھا اور جو شاید ایک خوب صورت ساتھی کی خواہش کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اس کسک کا شاید ازالہ ہو بھی جاتا اگر معصومہ کے بطن سے مجھے اولاد کی خوشی مل جاتی۔ ہزار کوششوں اور علاج معالجے کے باوجود اس سے مجھے اولاد کی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ میں دوسری محرومیوں کی طرح اس محرومی پر بھی صبر کرکے بیٹھ جاتا، اگر مجھے وہ نہ مل جاتی۔

☆☆☆

اس کا نام روحی تھا اور وہ اتنی حسین تھی کہ میں اسے دیکھ کر دیکھتا رہ گیا۔ سچ یہ ہے کہ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میرے ذوقِ جمال کو جس حسن کی خواہش رہی روحی کی صورت میں وہ مجسم ہوکر میرے سامنے آگیا ہے۔ اپنے غیر معمولی حسن کے ساتھ وہ پہلے ہی دن سے میری غیر معمولی توجہ کی مستحق ٹھہری اور میں اپنے جونیئرز میں سے اسے سب سے زیادہ اہمیت دینے لگا۔ اس کے حسن کے آگے میرا یہ رویہ اتنا انوکھا نہیں تھا وہاں تو سب ہی لوگ اس پر مرتے تھے لیکن کمال یہ ہوا کہ تقریباً پندرہ سال کے فرق کے باوجود روحی کا دل مجھ پر آگیا اور ہم نے بہت تیزی سے عشق کی منزلیں طے کرتے ہوئے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے اس فیصلے سے میں نے معصومہ کو ان الفاظ میں آگاہ کیا۔

”میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم میری اس خوشی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کرو گی اور اگر کروگی تو یاد رکھنا کہ میں سترہ سال پہلے کی طرح تمہاری کسی دھمکی سے نہیں ڈروں گا۔ اب اس دنیا میں

سرگزشت کا ایک اور معرکتہ الآرا خاص شمارہ

بینا نابینا نمبر

بے بصارتی کے اندھیرے میں روشن ستارہ بن کر چمکنے والوں کی داستانیں۔ وہ نابینا تھا لیکن مظاہر فطرت کی تصاویر ایسے بناتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ وہ اندھا ضرور تھا لیکن اس کی بنائی ہوئی دھنیں ہندو پاک میں مقبولیت پاتیں۔ وہ پیدائشی نابینا ہیں لیکن ان سے امریکا بھی ڈرتا ہے۔ ایسے بہت سارے دل کو دکھا دینے والے قصے، سچ بیتیاں، حقیقی واقعات

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ مجلد کرا کر رکھیں گے

بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ بک کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے اور تمہارے وہ والدین زندہ نہیں رہے جن کی شرم اور مروت میں، میں نے اپنے گلے میں طوق پہننا قبول کرلیا تھا۔" میرے الفاظ کے جواب میں معصومہ نے حیرت انگیز ردعمل کا مظاہرہ کیا اور نہایت رسان سے بولی۔

"مجھے دوسری شادی کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں جانتی تھی کہ اولاد کی خاطر آپ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور کریں گے اور میں آپ سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ آپ کی اولاد بھی مجھے دل وجان سے عزیز ہوگی۔ وہ عورت جو بھی ہے آپ خوشی سے اسے بیاہ کر اس گھر میں لاسکتے ہیں۔ میں کھلے دل سے اس کا استقبال کروں گی۔" اور واقعی اس نے اپنے کہے پر عمل کر دکھایا۔ شادی تو سادگی سے ہوئی لیکن روحی کے لیے خوب صورت زیورات وکپڑوں کی تیاری کے ساتھ ساتھ گھر میں شاندار بیڈروم بھی اس نے اپنی نگرانی میں تیار کروایا۔ اس موقع پر ہر ایک اس کی وسعت قلبی پر دنگ رہ گیا۔ میری بہن عافیہ کو ہمیشہ کی طرح اس سے سب سے زیادہ ہمدردی تھی اور شادی سے ایک دن قبل اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں روحی کو پاکر معصومہ سے ناانصافی نہیں کروں گا اور اصول کے مطابق دونوں بیویوں میں وقت کی تقسیم میں ڈنڈی نہیں ماروں گا۔ میں نے وعدہ کرلیا لیکن روحی کے اپنے گھر میں آنے کے بعد اس وعدے کی پاسداری گراں محسوس ہونے لگی۔ خوب صورت وجوان رفاقت کو ہر ایک دن بعد چھوڑ کر بدصورت، ڈھلتی ہوئی عمر کی عورت کے پاس جانا مشکل لگنے لگا لیکن ایک طرف پیروں میں وعدے کی زنجیر تھی تو دوسری طرف روحی کا اصرار جو مجھے ڈنڈی بھی نہیں مارنے دیتا تھا۔ معصومہ نے ہر ایک کی طرح روحی کا دل بھی اس طرح اپنی مٹھی میں لے لیا کہ اگر میں کبھی معصومہ کی باری میں ٹال مٹول کی کوشش کرتا تو روحی خود مجھے اس کی طرف دھکیلتی۔ اپنے اندر کی اسی جنگ سے گزرتے مجھے خوش خبری ملی کہ روحی ماں بننے والی ہے۔ فطری طور پر میری توجہ کچھ اور بھی اس کی طرف مبذول ہوگئی لیکن ایک ایک رات کا اصول اپنی جگہ قائم رہا اور میرے لیے بھاری سے بھاری ہوتا چلا گیا۔ روحی نے اس سلسلے میں ہمیشہ بہت اصول پسندی دکھائی۔ دوسری طرف ہر طرح کی وسعت قلبی دکھانے کے باوجود معصومہ نے کبھی ایسی کوئی پیشکش نہیں کی کہ روحی کی حالت کے پیش نظر میں روحی کو اس سے زیادہ وقت دے دیا کروں بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اپنی باری والی رات مجھے اپنے کمرے میں پاکر وہ کھل اٹھتی ہے اور اس کی یہ خوشی مجھے اندر سے کھولا کر رکھ دیتی تھی۔ مجھے سترہ سال پہلے کا وہ وقت یاد آجاتا تھا جب اس نے زور زبردستی مجھے حاصل کیا تھا۔ اس وقت میں اخلاقی اور معاشرتی دباؤ میں آگیا تھا لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ اس کے تمام تر اچھے سلوک کے باوجود میرے دل میں کہیں بہت اندر دبی اس کے لیے نفرت نے سر ابھارنا شروع کردیا تھا اور یہ نفرت اس حد تک بڑھی کہ میں نے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کا فیصلہ کرلیا۔ فیصلہ کرنے کے بعد طریقۂ کار کا تعین کرنا میرے لیے کیا مشکل تھا؟ معصومہ کی عادت تھی کہ ناشتے میں کچھ اور چاہے نہ کھائے لیکن ایک گلاس دودھ ضرور پیتی تھی۔ میں نے نہایت چالاکی سے دودھ میں ایک ایسی دوا ملانی شروع کردی جو دھیرے دھیرے اسے موت کی آغوش میں لے جاتی۔ اس دوا کا کمال یہ تھا کہ آہستگی سے اپنا مہلک وار کرنے کے باوجود کسی ٹیسٹ کے ذریعے اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔ شکار ہونے والا جب بھی مرتا وجہ ہارٹ فیل قرار دی جاتی۔ دودھ میں دوا ملا کر معصومہ کو پلانا اس لیے آسان تھا کہ ہمارے گھر میں لیکوئڈ دودھ محدود مقدار میں آتا تھا۔ روحی ہزار اصرار کے باوجود دودھ پینے کے لیے راضی نہیں ہوتی تھی۔ میں رات سونے سے پہلے دودھ پینے کا عادی تھا اور بچا ہوا دودھ صبح معصومہ پی لیتی تھی، چائے کے لیے ہم پاؤڈر ملک پسند کرتے تھے۔

ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر مجھے معصومہ پر دوا کے اثرات نظر آنے لگے۔ اس کی صحت گرنے لگی اور وہ نڈھال اور تھکی تھکی سی نظر آنے لگی۔ مجھے امید تھی کہ بچے کی پیدائش سے پہلے پہلے میں اس سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ پھر میں اور روحی ہوتے اور ہمارا بچہ۔ میں آنے والی اس خوش کن زندگی کے خیال سے مسرور تھا جب مجھے میری پسند کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع ملتا لیکن اچانک ہی میرے سارے خواب بکھر گئے۔ میں کمپنی میں تھا کہ گھر سے معصومہ کی گھبرائی ہوئی آواز میں کال آئی۔ وہ مجھے بتارہی تھی کہ اچانک ہی روحی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے اور وہ اسے ڈرائیور کے ساتھ اسپتال لے جارہی ہے۔ میں بھی فوراً اسپتال کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہاں جاکر مجھے پتا چلا کہ روحی اور ہمارا ہونے والا بچہ دونوں ہی اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق بچہ پہلے ہی مرچکا تھا اور اس کی وجہ سے ہی روحی کے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔ مجھ پر تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی اور اب میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی خواب گاہ میں ٹوٹا بکھرا ہوا پڑا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

قارئین
کے
محبوب
اور
مقبول
مصنف
احمد اقبال
کے قلم سے
ایک نئی
تجسس آمیز
اور تحیر خیز کہانی
جواری
جو شکاری ہے
نہ مداری
اناڑی ہے نہ کھلاڑی
ہر سطر میں دلچسپی
لیے ہوئے ایک
ہنگامہ خیز داستان
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
کے صفحات پر بہت جلد

ساری تدبیریں الٹنے کے بعد تقدیر میرے سامنے وہ لے آئی تھی جس نے میری سازشوں کا نتیجہ ٹوٹے ہوئے خوابوں کی صورت میں نکالا تھا۔

''حبیب بھائی۔'' دروازے پر دستک کے ساتھ مجھے عافیہ کی آواز سنائی دی تو میں ماضی کے سفر سے واپس لوٹا۔

''آجاؤ عافیہ۔'' بے اختیار آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے میں نے جواب دیا تو وہ اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔

''آپ نے پورے دن سے کچھ بھی نہیں کھایا پیا۔ یہ تھوڑا سا دودھ پی لیں۔'' اس نے محبت سے کہا اور گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس تھام کر سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ دودھ کا بھرا ہوا گلاس دیکھ کر ایک بار پھر مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں کیسے روحی کے ساتھ تنہا زندگی گزارنے کی خواہش میں دودھ کے ذریعے معصومہ کو سلو پوائزن دے رہا تھا۔ قدرت نے مجھے اس عمل کی سزا دی اور معصومہ سے پہلے مجھ سے روحی چھین لی گئی۔

''آپ میرے سامنے دودھ پئیں بھائی۔ آپ دودھ پی لیں گے تب ہی میں یہاں سے جاؤں گی۔'' عافیہ نے اصرار کیا تو میں نے دودھ کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن فوراً ہی ابکائی آ گئی اور میں نے گلاس واپس رکھ دیا۔ اسی وقت عافیہ کی بیٹی دوڑی ہوئی وہاں آئی۔

''امی! آپ آ کر معصومہ آنٹی کو دیکھیں۔ وہ بہت بری طرح رو رہی ہیں۔'' اس نے عافیہ سے کہا تو وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں بھی بے اختیار اس کے پیچھے چل پڑا۔ اگلے ہی لمحے ہم تینوں اس کمرے میں تھے جو آنے والے بچے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ معصومہ اس کمرے میں کاٹ کے پاس بیٹھی بری طرح بلک رہی تھی۔

''معصومہ! حوصلہ کرو میری پیاری دوست۔ اللہ کے فیصلوں میں کس کا دخل ہے۔ اللہ کی مرضی نہیں تھی کہ وہ یہاں آئے تو ہم اور تم صبر کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔'' عافیہ بلکتی ہوئی معصومہ کو اپنی بانہوں میں لے کر سمجھا رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان سترہ برس گزر جانے کے باوجود دوستی کا رشتہ جوں کا توں قائم تھا اور کبھی نند بھاوج والے رشتے کی روایتی چپقلش کا سایا بھی نظر نہیں آیا تھا۔

''اللہ نے اسے کیوں نہیں آنے دیا عافیہ۔ وہ آ جاتا تو میری سونی گود بھی بھر جاتی۔ میں بھی ماں ہونے کی لذت محسوس کر لیتی۔'' وہ اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگی اور میرا احساس جرم مزید بڑھ گیا۔ اندر کہیں سے آواز آئی کہ جو کچھ ہوا میرے گناہ کا نتیجہ تھا، میں نے معصومہ کی محبت کی قدر نہ کی اور اسے اپنی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر اس کی جان کے درپے ہو گیا۔ اب میری خوشیاں تتلی کے رنگوں کی طرح ہاتھ سے اڑ چکی تھیں اور میں خالی ہاتھ کھڑا تھا لیکن نہیں...... میں خالی ہاتھ کہاں تھا؟ معصومہ کی بے لوث محبت میرے ساتھ تھی اور میں باقی زندگی اس محبت کا حق ادا کرتے ہوئے گزار سکتا تھا۔ دل میں آنے والے اس خیال نے میرے قدموں کو حرکت دی اور میں نے معصومہ کے نزدیک جا کر اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ وہ فوراً ہی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

''بس کرو معصومہ۔ تقدیر میں جو لکھا تھا ہو چکا۔ میں اپنی زندگی کے اس دکھ کو یہ سوچ کر جھیل لوں گا کہ کم از کم تم تو میرے پاس ہو، ہم ایک بار پھر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے لیے ایک دوسرے کا ساتھ مرتے دم تک کافی ہوگا میں اب کسی خوشی کے تعاقب میں تم سے دور نہیں جاؤں گا۔ یہ میرا احساس جرم تھا جو معصومہ کو ایسی یقین دہانیاں کروا رہا تھا۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے جملے بولتا ہوا میں اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے خواب گاہ میں واپس آیا اور بستر پر لٹا دیا۔

''آپ یقین کریں حبیب میں نے ہمیشہ روحی کا بہت خیال رکھا۔ خاص طور پر اس کے ماں بننے کی خوش خبری سن کر تو میں اسے سگی بہنوں سے زیادہ چاہنے لگی تھی۔ وہ آپ کو وہ نعمت دینے والی تھی جو میں نہ دے سکی تھی تو پھر مجھے وہ کیسے پیاری نہ ہوتی۔ آپ شاید یقین نہیں کریں گے کہ میں اس حد تک اس کا خیال رکھتی تھی کہ خود دودھ پینے کے بجائے اپنے حصے کا دودھ اسے قسمیں دے دے کر اور سمجھا بجھا کر کہ یہ بچے کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے زبردستی پلا دیتی تھی پھر بھی نہ جانے اس کو کیا ہو گیا؟'' میں اس کے برابر میں آ کر لیٹا تو وہ بڑی معصومیت سے مجھے بتانے لگی جبکہ میں اس بری طرح اچھلا جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔

''کیا کہا تم نے؟ تم روحی کو دودھ پلاتی تھیں لیکن کیسے؟ وہ تو دودھ پیتی ہی نہیں تھی؟'' میں نے ہیجان زدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''آپ کو معلوم ہے نا کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی تھی۔ میں اسے اپنی قسم دیتی تو وہ مجبوراً پی لیتی تھی لیکن آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں کیا روحی کو دودھ پلانے میں کوئی حرج تھا؟'' وہ بے حد سادگی سے پوچھ رہی تھی جبکہ میں اپنی جگہ بوکھلا کر رہ گیا تھا۔

''نہیں۔ نہیں۔ وہ بس اسے دودھ پسند نہیں تھا نا تو میں حیران ہو رہا تھا۔'' میں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور خود سر تھام کر بیٹھ گیا۔ میں نے جس گڑھے میں معصومہ کو گرانا چاہا تھا خود اس میں گر گیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ احساس جرم اب ساری زندگی مجھے چین سے جینے نہ دے گا۔

''کیا بات ہے حبیب؟ آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے کیا، لائیں میں دبا دیتی ہوں۔'' وہ فکرمندی اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سو جاؤ۔'' میں نے اسے جواب دیا اور خود بھی اس کی تسلی کے لیے آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ جلد ہی وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ میرے سینے پر سر رکھے یوں سوتی ہوئی وہ بالکل کسی بچے کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے بے حد احتیاط سے اسے تکیے پر لٹاتے ہوئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ چیچک زدہ سانولی رنگت والا چہرہ سترہ سال بعد پہلی بار مجھے بہت خوب صورت لگا کیونکہ آج پہلی بار ہی میں نے اس کے اندر کی خوب صورتی اور اپنے لیے بے تحاشا محبت کو صحیح معنوں میں محسوس کیا تھا۔ اس سے پہلے تو ہمارے رشتے میں بس ہمدردی، روا داری اور مصلحتیں ہی تھیں ورنہ میں اس سے اتنی شدید نفرت کرتا تھا کہ اس کی موت کا فیصلہ کرنے میں ذرا نہ جھجکا تھا اور اپنی اس بری نیت کا پھل مجھے مل گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ معصومہ نے جو کچھ کیا انجانے میں کیا اور اصل مجرم میں خود تھا سوائے مزید کوئی سزا نہیں دی جا سکتی تھی۔ ہاں میں اتنا کر سکتا تھا کہ باقی کی زندگی اس کی محبت کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے جرم کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتا رہوں سو میں اس کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

اور میں ہوں معصومہ حبیب احمد! جس نے حبیب سے محبت کی تو انتہا کر کے اس کے سامنے سب بھول گئی۔ میری اس دیوانی محبت نے اپنی دیوانگی کے سہارے اسے پا بھی لیا اور سترہ سال تک اس خوشی میں کولہو کے بیل کی طرح اس کے گھر کو جنت بنانے اور اس کے پیاروں کو اپنانے میں لگی رہی۔ میں سمجھتی تھی کہ میری اتنی محبت اور خدمات نے حبیب کے دل میں میرے لیے بے پناہ قدر پیدا کر دی ہوگی لیکن میرے اس یقین کو اس وقت دھچکا لگا جب اس نے روحی سے شادی کا فیصلہ کیا۔ میری اس سے بے پناہ محبت اس شراکت داری کے لیے تیار نہیں تھی لیکن میں اس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتی تھی اور مجھ پر یہ بات واضح تھی کہ اگر میں نے اس کے ارادے کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو وہ بہت آسانی سے مجھے ٹھوکر مار کر آگے نکل جائے گا۔ اسے مکمل طور پر کھونے کے بجائے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ روحی کو قبول کر لوں اور دل پر پتھر رکھ کر سوکن کو برداشت کرنے لگی۔ روحی خوب صورت اور کم عمر تھی اور مجھے معلوم تھا کہ عافیہ سے وعدہ کرنے کے باوجود حبیب مجھے چھوڑ کر پوری طرح اس میں انوالو ہو سکتا ہے۔ اس لیے پہلے دن سے ہی میں نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ روحی کے ساتھ بے حد محبت اور شفقت سے پیش آنے لگی۔ میرے اس رویے کی لاج نے روحی کو کبھی ناانصافی کے لیے راضی نہ ہونے دیا اور حبیب معاہدے کے مطابق ایک ایک رات باری باری ہم دونوں کے ساتھ گزارتے رہے لیکن صرف جسمانی طور پر ورنہ میں جانتی تھی کہ ان کا دل و دماغ تو روحی کے پاس ہی ہوتا ہے۔ میں شدید کرب اور دکھ کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرتی رہی اور اپنی کیفیت کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کرب میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب روحی کو ماں بننے کی خوش خبری سننے کو ملی۔ حبیب کا قلبی جھکاؤ کچھ اور بھی اس کی طرف ہو گیا۔ ادھر میں نے بھی روحی پر اپنے لطف و کرم میں شدید اضافہ کر دیا اور یوں وقت کی تقسیم میں کوئی فرق نہیں پڑا لیکن ایک صبح جب میں نے حبیب کو کچن میں جاتے اور دودھ میں کچھ ملاتے دیکھا تو احساس ہوا کہ پانی سر سے کتنا اونچا ہو چکا ہے۔ میرے اندر کی پاگل عورت اس کی اس حرکت پر مزید پاگل ہو گئی اور میں نے انتقاماً وہ دودھ روحی کو پلانا شروع کر دیا۔ یہ سچ تھا کہ وہ دودھ نہیں پیتی تھی لیکن میری محبت سے مجبور ہو کر پینے لگی۔ حبیب پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مجھ پر اس کی دی ہوئی دوا کا اثر ہو رہا ہے میں نے کھانا پینا بہت کم کر دیا جس کے نتیجے میں میرا وزن کم ہونے لگا اور میں کمزور نظر آنے لگی۔ حبیب اس صورت حال پر مطمئن تھا لیکن دوسری طرف روحی کی حالت بھی اسے پریشان کرتی تھی۔ اچھی سے اچھی غذا اور دواؤں کے استعمال کے باوجود وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی اور آخرکار وہ ہو گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ حبیب پر تو گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا دکھ مجھے بھی تھا۔ میں نے جس طرح اس کی محبت میں اس کے ہر رشتے کو اپنایا تھا اس کی بیوی اور بچے کو بھی اپنانے کے لیے تیار ہو گئی تھی لیکن اس نے...... اس نے اپنے انتہائی قدم سے مجھے قاتل بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی بھی شخص قاتل بن کر خوش نہیں ہوتا میں بھی نہیں ہوں لیکن مجھے یہ اطمینان ضرور ہے کہ میں نے حبیب کو اس کے سکوں میں ادائیگی کر دی ہے اور وہ یہ جان لینے کے باوجود کہ روحی اور اس کے بچے کی موت کا کیا سبب ہے کبھی مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا اور اب میں زندگی بھر اس کے وجود کی واحد حق دار بنی اس کی نظر میں بے گناہ اور معصوم رہوں گی، آخر میرا نام معصومہ جو ہوا۔

⌘

WWW.PAKSOCIETY.COM

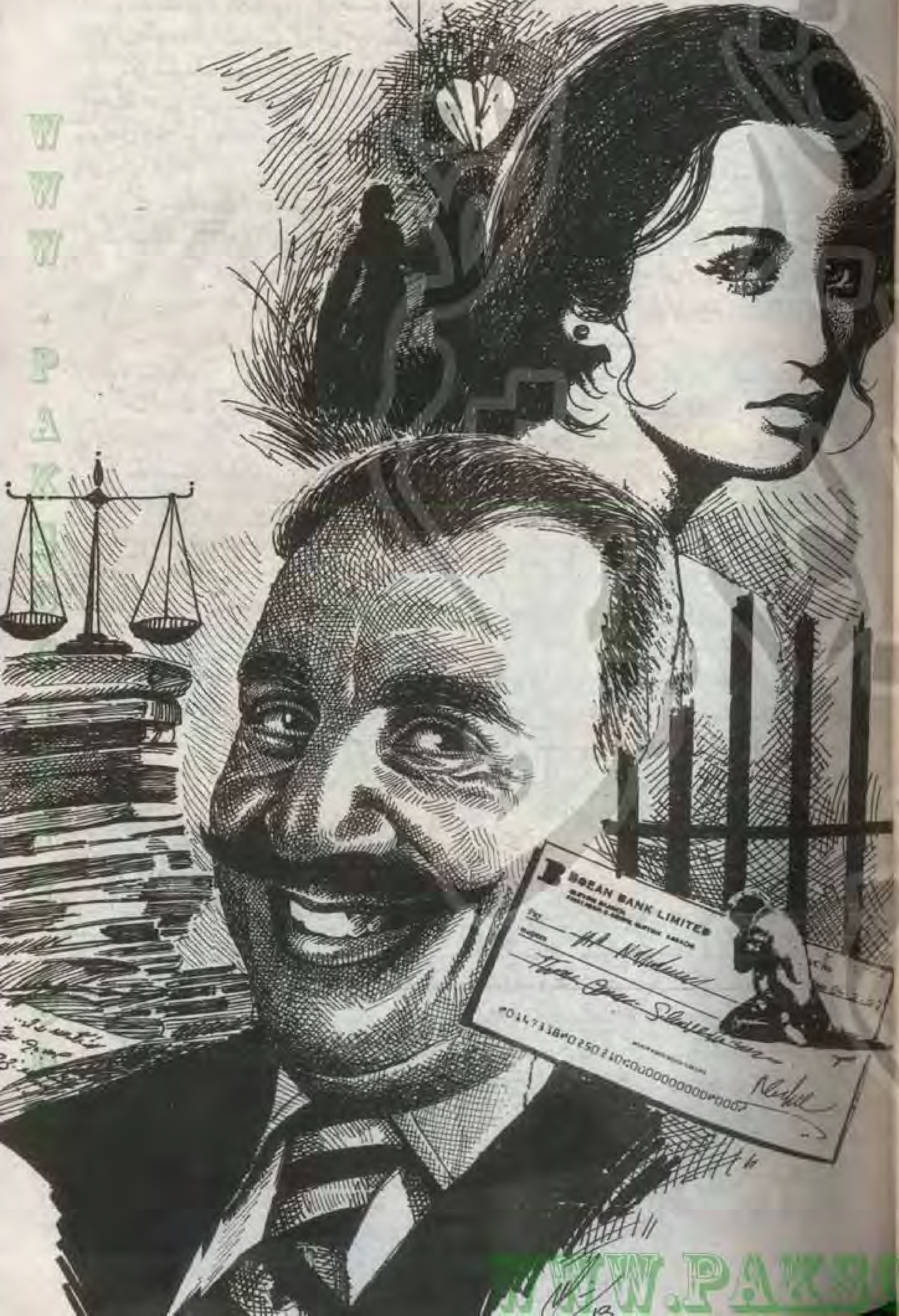

مرچ مسالا

مرزا امجد بیگ

خوش ذائقہ پکوان اور چٹ پٹا مرچ مسالا... بھوک کا احساس بڑھا دیتا ہے مگر... جب دلوں کے زخموں پر کوئی نمک چھڑک کر چٹخارے لینے کی کوشش کرے تو نم آنکھیں انتہائی خاموشی سے آسمان کی جانب اٹھتی ہیں اور اپنے رب سے انصاف مانگتی ہیں۔ ایسے ہی ایک موڑ پر بہ ظاہر اس کا دل بھی ٹوٹا تھا مگر خوش قسمتی سے مقدر پھوٹتے پھوٹتے رہ گیا۔ جب کوئی گہری کھائی میں گرنے سے بال بال بچ جائے تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے... اس نے بھی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان برداشت کر لیا تھا مگر اس کے باوجود بہت کچھ کھو دیا تھا۔

عدالت کے کٹہرے میں انصاف سے معمور وکالت کی

کرشمہ سازیاں

اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب یہ اس کے حکم سے حرکت میں آتی ہے تو دولت کے پہاڑ بے وقعت ذرّوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن انسان نے کبھی اپنے ماضی سے سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے طور پر نیا تجربہ کر کے دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے بڑی شدت کے ساتھ یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ اگر پہلے کسی سے کچھ غلط ہو گیا تھا تو اب ویسا نہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے، اب ویسا نہیں ہوتا مگر اس سے بھی کہیں بڑھ کر برا ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کے پاس بے اندازہ دولت ہوتی ہے وہ ہر کام کو پیسے کی طاقت کے بل پر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس عادت کی وجہ سے وہ غلط صحیح کی پہچان اور جائز و ناجائز کی تمیز بھول جاتے ہیں، پھر قانونِ قدرت حرکت میں آ جاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں......

گیارہ فروری کی سہ پہر جو پہلا شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا اس پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں فٹ بال کا تصور ابھرا۔ وہ پستہ قامت نہیں تھا تاہم میانہ قد کے ساتھ ہی وہ اس قدر فربہ تھا کہ اس کی لمبائی چوڑائی میں تمیز کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

”السلام علیکم وکیل صاحب!“ اندر آ کر اس نے مجھے سلام کیا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد ان کرسیوں کی طرف بڑھ گیا جو میری میز کے سامنے وزیٹرز کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ چکا تو میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”میرا نام امین ہے......“ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے چھوٹے بھائی کے سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

میرے سامنے موجود اس فٹ بال نما امین کی عمر پینتالیس کے اریب قریب نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر دو تین روز کا بڑھا ہوا شیو موجود تھا اور جب وہ بولا تو اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

دانتوں نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ وہ پان کھانے کا عادی تھا تاہم اس وقت وہ اس نوعیت کے شغل میں مصروف نہیں تھا۔

میں نے رف پیڈ کو اپنے سامنے رکھا اور قلم کو سنبھالتے ہوئے امین سے پوچھا۔ ''امین صاحب! آپ کے بھائی کا نام کیا ہے اور اس کی وجہ سے آپ کو میرے پاس کیوں آنا پڑا؟''

''میرے چھوٹے بھائی کا نام ناصر ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ناصر کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے......''

''ناصر کو پولیس نے کب گرفتار کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''یہ دو دن پہلے کا واقعہ ہے......'' امین نے بتایا۔ ''نو فروری کو سہ پہر میں۔''

آج فروری کی گیارہ تاریخ تھی اور امین کے بھائی کی گرفتاری دو روز پہلے عمل میں آئی تھی۔ میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے استفسار کیا۔

''ناصر کو پولیس نے کس الزام میں گرفتار کیا ہے؟''

امین نے فٹ بال بدن پر رکھے فٹ بال سر کو ایک بے معنی سی جنبش دی اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے بھائی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک سیدھا سادا اور اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان ہے۔''

''میں نے آپ کے بھائی کی شرافت کا سرٹیفکیٹ نہیں مانگا امین صاحب۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پولیس نے آپ کے چھوٹے بھائی کو کس الزام کے تحت گرفتار کیا ہے......؟''

''پولیس نے ناصر پر بڑا گھناؤنا الزام لگایا ہے وکیل صاحب!'' وہ نظر کے چشمے کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اسے ایک نامحرم لڑکی کے ساتھ فحش حرکتیں کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔''

''اور وہ نامحرم لڑکی کون ہے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''اس حرام زادی کا نام سیما ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے، آپ سیما کو اچھی طرح جانتے ہیں؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' اس نے گول مول سا جواب دیا۔

''پولیس نے ناصر اور سیما کو کس جگہ فحش حرکتیں کرتے دیکھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، ان لوگوں کو کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے وکیل صاحب!'' امین نے اپنے گھونگریالے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ناصر اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔''

''امین صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی طرف سے آپ کے بھائی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہا۔ آپ کہتے ہو، ناصر بے قصور ہے تو یقیناً وہ بے قصور ہی ہوگا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں، اس کیس میں پولیس کا اسٹینڈ کیا ہے تاکہ بہتر انداز میں آپ کے بھائی کی مدد کی جاسکے۔''

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے معقولیت سے بولا۔ ''پولیس نے ناصر اور سیما کو ''سی ویو'' کے علاقے سے گرفتار کیا ہے۔''

''آپ کی رہائش کہاں پر ہے امین صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''پی آئی بی کالونی......!''

''پی آئی بی...... یعنی پیر الٰہی بخش کالونی!'' میں نے زیرلب دہرایا پھر سوال کیا۔ ''اور سیما کہاں کی رہنے والی ہے؟''

''سولجر بازار......'' امین نے بتایا۔ ''نشتر پارک کے قریب سیما کے باپ کا عالی شان بنگلا ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہے، آپ صرف سیما ہی کو نہیں بلکہ اس کے باپ کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔

''جی ہاں......!'' اس نے ایک مرتبہ پھر مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

میں نے اپنے قلم کو گاہے بہ گاہے حرکت میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس نے ناصر اور سیما کو سی ویو کے علاقے میں نازیبا اور فحش حرکات کرتے دیکھ کر گرفتار کیا ہے۔ اس سے ایک بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں جائے وقوعہ پر موجود ضرور تھے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ وہ دونوں کوئی بھی مخربِ اخلاق حرکت نہیں کر رہے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دونوں کس ضروری کام سے ساحلِ سمندر پر موجود تھے...... ایک کا گھر پی آئی بی کالونی میں اور دوسرے کا نشتر پارک کے قریب......؟''

میں نے لحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کمبی نیشن میری سمجھ میں نہیں آرہا امین صاحب......؟''

''میں سمجھتا ہوں، میرے بھائی کو اس مصیبت میں پھنسانے کے لیے اس حرافہ سیما نے ایک سوچی سمجھی سازش سے کام لیا ہے۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں، سیما...... سلمیٰ کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔''

''یہ سلمیٰ کون ہے؟'' میں نے اس کے انکشاف کے جواب میں پوچھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! سلمیٰ، سیما کی سوتیلی ماں ہے۔''

''سیما کی سوتیلی ماں کی آپ کے بھائی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے امین صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ ناصر کو پھنسانے کے لیے اپنی سوتیلی بیٹی کو کیوں استعمال کرے گی؟''

''اصل میں......'' وہ ایک مرتبہ پھر اپنے گھونگریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''سلمیٰ کو ناصر سے نہیں بلکہ مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔''

میں چونک اٹھا اور پوچھا۔ ''سلمیٰ کا آپ سے کیا تعلق؟''

''ساڑھے تین سال پہلے تک وہ میری بیوی تھی۔'' اس نے ایک اور انکشاف کیا۔ ''ہمارے درمیان بن نہ سکی اور میں نے اسے طلاق دے دی۔ بعد میں اس نے ایک مال دار آدمی رمضانی بھائی سے شادی کرلی۔ یہ سیما رمضانی کی پہلی بیوی سے ہے اور رمضانی بھائی کی اکلوتی اولاد بھی......''

اب معاملہ کچھ کھل کر سامنے آیا تھا۔ میں نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''امین صاحب! آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''جناب......'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ میرے بھائی کو پولیس کے جھمیلے سے نکال لیں۔''

''ہوں......!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میری نظر میں وہ معاملہ اتنا پیچیدہ یا سنگین نہیں تھا کہ اسے حل کرنے کے لیے کسی وکیل کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اگر امین چپ چپاتے پولیس والوں کی حسبِ منشا حرارت سے ان کی مٹھی گرم کر دیتا تو بہ آسانی ناصر کی گلوخلاصی ہو جاتی۔ میں نے اس حوالے سے امین کو بریفنگ دی اور کہا۔

''اس طرح آپ میری بھاری فیس اور عدالتی اخراجات سے بچ جائیں گے۔ علاوہ ازیں، عدالت کے دروازوں چکر کاٹنے میں نہ تو وقت برباد ہوگا اور نہ ہی ذہنی کوفت برداشت کرنا پڑے گی۔''

اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تو گویا آپ مجھے پولیس کو رشوت دینے کا مشورہ دے رہے ہیں......؟''

''آپ اسے میرا مشورہ جان کر اپنے ذہن کو الجھانے کی کوشش نہ کریں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کل یہ چلن عام ہے اور لوگ عدالتی بکھیڑوں میں ملوث ہونے کے بجائے پولیس سے مک مکا کرکے اپنا الو سیدھا کر لیتے ہیں۔''

''لوگ تو پتا نہیں، کیا کیا کرتے پھر رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اور انہی لوگوں کی وجہ سے ہمارے ملک میں قانون بے توقیر ہوا ہے...... تھانوں میں بھی اور عدالتوں میں بھی۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما پھر بڑے عجیب سے انداز میں بولا۔

''اور معذرت کے ساتھ کہ...... یہ خرابی پیدا کرنے میں پولیس اور وکیل دونوں کا ہاتھ ہے۔''

''ہنڈریڈ پرسنٹ ایگریڈ......!'' میں نے توصیفی نظر سے امین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے احساسات اور سوچ نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں خود بھی انہی خیالات کا حامل ہوں اسی لیے میں نے کبھی ان وکلا کا حصہ بننے کی کوشش نہیں کی جو قانون کے ہاتھ مضبوط کرنے کے بجائے اس میں چور دروازے تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں اور...... یہ بات عملاً اس وقت ثابت ہوگی جب آپ مجھے ناصر کے کیس کی پیروی کرتے ہوئے دیکھیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ نے ناصر کا کیس لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اگر مجھے یقین ہو جائے گا کہ ناصر بے گناہ ہے تو میں ضرور اس کا کیس اپنے ہاتھ میں لوں گا ورنہ میری طرف سے تو معذرت ہی سمجھیں۔ میں صرف اپنی جیب بھرنے کے لیے ہر قسم کے کیس نہیں لیا کرتا۔''

''مجھے آپ کے اصول نے بہت متاثر کیا ہے وکیل صاحب۔'' وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آپ ناصر کا کیس ضرور لیں گے۔ اب بتا دیں کہ میں ناصر کی بے گناہی کے سلسلے میں آپ کو کیسے مطمئن کروں؟''

''میں آپ سے چند اہم سوال کروں گا۔ ان کا مجھے سچا اور کھرا جواب چاہیے۔'' میں نے واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے جوابات نے اگر مجھے مطمئن کر دیا تو سمجھ لیں کہ میں آپ کے بھائی کو باعزت بری کرانے میں اپنا تمام تر تجربہ لگا دوں گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''تھینک یو وکیل صاحب......!'' وہ ممنونیت سے بولا۔ ''پوچھیں، آپ کو مجھ سے کیا پوچھنا ہے......''

''پولیس نے سیما اور ناصر کو دو دن پہلے سی ویو کے علاقے سے نازیبا حرکات کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، اب تک انہیں عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کرلیا ہوگا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''گزشتہ روز صبح یعنی دس فروری کو پولیس نے ان دونوں کو عدالت میں پیش کیا تھا۔ اب وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہیں۔''

''وہ کون سے تھانے کی حوالات میں بند ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتادیا۔

میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ تھانے جا کر ناصر سے ملاقات کر چکے ہیں؟''

''جی...... جس دن انہیں گرفتار کیا گیا، میں اسی رات ناصر سے ملنے تھانے گیا تھا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ریمانڈ کے بعد بھی میں نے ناصر سے ملاقات کی کوشش کی لیکن پولیس والوں نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔''

''جب نو فروری کی رات آپ ناصر سے ملنے گئے تھے تو اس وقت پولیس والوں نے رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کی تھی؟'' میں نے دریافت کیا۔

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں، پولیس کی اس دریا دلی کا ایک خاص سبب تھا۔''

''کیسا سبب؟'' میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہی...... جو تھوڑی دیر پہلے آپ نے بھی بیان کیا تھا۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

''اوہ......!'' میں امین کی بات کی تہ میں پہنچ گیا۔ ''مطلب......رشوت؟''

''جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے......''

''بات کس طرح ہوئی تھی؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''جب مجھے پتا چلا کہ میرے چھوٹے بھائی کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے تو میں بھاگا بھاگا سیدھا تھانے پہنچا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے قسمیں کھا کر پولیس والوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ناصر ایک انتہائی شریف النفس اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ لیکن وہ ناصر کی بے گناہی کے حوالے سے میری کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں ہوئے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جب کوئی پکڑا جاتا ہے تو اس کے ورثا تھانے آکر اس کی بے گناہی کے لیے ایسے ہی شور مچاتے ہیں اور ہم نے تو تمہارے بھائی کو رنگے ہاتھوں، رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا ہے لہٰذا ان دونوں کی بے گناہی اور گناہ گاری کا فیصلہ اب عدالت ہی میں ہوگا۔''

''پھر آپ نے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے کیا کہنا تھا جناب۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''جب میں شور مچا مچا کر تھک گیا تو ایک کانسٹیبل پکڑ کر مجھے سائڈ میں لے گیا اور اسی نے مجھ سے رشوت والی بات کی تھی......''

''اس کانسٹیبل نے آپ سے کیا کہا تھا......؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اس نے دوٹوک اور کھلے ڈلے الفاظ میں مجھ سے رشوت دینے کی بات کی تھی۔'' امین نے بتایا۔ ''بولا، اگر میں صبح ہونے سے قبل پچاس ہزار روپے کا بندوبست کرلوں تو وہ لوگ اس کیس کو کورٹ میں نہیں لے کر جائیں گے۔ معاملہ یہیں پر رفع دفع کرلیا جائے گا......'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! پہلی بات تو یہ کہ میں کسی بھی قیمت پر رشوت کے حق میں نہیں ہوں۔ جب انسان بے گناہ ہو تو اسے اس قسم کے گندے راستے اختیار کرنے کے بجائے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔ خدا خود ہی مدد کا کوئی دروازہ کھول دیتا ہے اور اگر بالفرض، میں ایسے کٹر خیالات کا حامل نہ بھی ہوتا تو بھی میرے لیے ایک رات میں پچاس ہزار روپے جمع کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر میں اپنا میڈیکل اسٹور فروخت کرنے کے بارے میں بھی سوچتا تو اس میں بھی دو چار دن لگ ہی جاتے اور یہ کوئی عقل مندانہ فیصلہ نہ ہوتا۔ انسان بے گناہ بھی ہو اور پھر بھی خود کو چھڑانے کے لیے وہ اپنا چلتا ہوا کاروبار بیچ دے، یہ سراسر حماقت کا سودا اور گناہ عظیم ہوگا......''

آج سے پینتیس چالیس سال پہلے پچاس ہزار روپے کی بڑی قدر و قیمت ہوا کرتی تھی اس لیے مجھے بھی حیرت ہوئی کہ پولیس نے منہ پھاڑ کر اتنی زیادہ رقم کیسے مانگ لی تھی۔ میں نے اس کے جواب کے آخری جملے کو تھام کر سوال کیا۔

''امین صاحب! آپ نے جو گناہ عظیم کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ذرا ان کی وضاحت کردیں گے؟''

''جناب! سیدھی سی بات ہے۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

''جو گناہ یا قصور آپ نے کیا ہی نہیں اس میں خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے آپ کو رشوت دینا پڑے، یہ تو سیدھا سیدھا خدا کے وجود اور اس کے نظام انصاف سے انکار ہے۔''

''آپ کی دلیل بہت ٹھوس ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''پولیس کی رشوت خوری کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، ناصر والے معاملے میں انہیں دس پندرہ ہزار سے کام چلا لینا چاہیے تھا۔ پچاس ہزار تو انہوں نے بہت زیادہ مانگ لیے تھے۔ آپ نے ان سے رقم کے زیادہ ہونے کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی؟''

''میں نے ان سے پوچھا تھا کہ اتنے زیادہ پیسے کس بات کے؟'' امین نے بتایا۔

''پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟''

''انہوں نے کہا کہ اگر صبح ہونے سے پہلے رقم کا انتظام نہ ہوا تو وہ ناصر کو عدالت میں پیش کرنے کے بعد ایسا مضبوط چالان بنائیں گے کہ اگر اسے سنگسار نہ بھی کیا گیا تو اتنے کوڑوں کی سزا ضرور ہوجائے گی کہ اس کا زندہ رہنا ناممکن ہوگا۔'' امین نے بتایا۔

''ایک دم بکواس بات ہے۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اس نامراد کانسٹیبل نے آپ کے سامنے سزا کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ حدود آرڈی نینس کے دائرے میں آتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ آج کل سنگسار یا کوڑوں والی سزا مروج بھی نہیں رہی۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے عدالتی نظام میں حدود آرڈی نینس کے کیس کو ثابت کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے اور ناصر کا معاملہ دور دور تک حدود آرڈی نینس کو نہیں چھوتا۔ میں سمجھتا ہوں، بدبخت کانسٹیبل نے محض آپ کو خوف زدہ کرنے کے لیے یہ ایشو اٹھایا ہے تاکہ آپ گھبرا کر رقم کے بندوبست میں لگ جائیں۔''

''ہاں...... میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔'' امین نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''اس کے علاوہ بھی مجھے ایک بات دکھائی دے رہی ہے......''

''کون سی بات امین صاحب؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''ان لوگوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ سیما کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ہے اس لیے انہوں نے کچھ زیادہ ہی منہ کھول لیا تھا۔'' امین نے اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''لیکن یہی لگتا ہے کہ سیما کے باپ رمضانی بھائی کے ساتھ کوئی ڈیل ہو نہیں سکی اسی لیے پولیس نے دونوں ملزموں کا ریمانڈ حاصل کرلیا ہے۔ اب تو یہ کیس عدالت ہی میں جائے گا۔''

''آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اب یہ کیس عدالت میں جائے یا تھانے میں رہے، میں ناصر کی وکالت ضرور کروں گا۔''

وہ خوش ہوگیا پھر فرمائشی انداز میں بولا۔ ''میں چاہتا ہوں، آپ ایک بار تھانے جا کر ناصر سے بھی ملاقات کرلیں۔ ہوسکتا ہے، اس کی زبانی آپ کو کوئی اہم بات پتا چل جائے۔''

''یہ تو بہت ضروری ہے امین صاحب!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صرف ناصر ہی سے نہیں، میں باری باری دونوں سے ملاقات کرنا چاہوں گا......''

''دونوں...... مطلب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''دونوں مطلب...... ناصر اور سیما!'' میں نے جواب دیا۔

''سیما سے آپ کیوں ملیں گے؟'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

''ایک بات بتائیں امین صاحب......!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔

''نازیبا حرکات کے الزام میں پولیس نے کیا صرف ناصر کو گرفتار کیا ہے؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ناصر کے ساتھ سیما کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔''

''کیا یہ مقدمہ صرف ناصر پر چلنے والا ہے؟''

''دونوں پر چلنے والا ہے جناب۔''

''کیا صرف ناصر عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے؟''

''دونوں ہیں جی۔''

''جب ہر معاملے میں شروع سے اب تک وہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں تو اس کیس کے اختتام تک وہ ساتھ ساتھ ہی دکھائی دیں گے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''جب دونوں پر ایک ساتھ مقدمہ چلے گا اور ہر پیشی پر انہیں ایک ساتھ عدالت لایا جائے گا تو میری ان دونوں سے ملاقات بہت ضروری ہے۔ میں، ممکن ہے، کوئی اور ہی چکر چلا ڈالوں......''

''کیسا چکر وکیل صاحب؟'' وہ ہکا بکا ہو کر مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔ ''امین صاحب! کیا آپ کے علم میں ہے کہ پولیس نے سیما کے باپ رمضانی بھائی سے کتنی رقم کا مطالبہ کیا تھا؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نہیں جناب، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں......!"

"پتا نہیں ہے تو پتا لگانے کی کوشش کریں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور کسی طرح رمضانی بھائی کو گھیر کر میرے دفتر لے آئیں۔"

"جناب! آپ تو ایک ناممکن کام کے لیے کہہ رہے ہیں۔" وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "رمضانی بھائی کو سلمٰی کبھی بھی ادھر نہیں آنے دے گی۔"

"نہ آنے دے مگر کوشش کرنے میں کیا حرج ہے......"

وہ کچھ تذبذب میں نظر آنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "امین صاحب! کوئی پریشانی ہے؟"

"جناب! اس طرح تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔" وہ بہ دستور الجھن زدہ انداز میں بولا۔

"کیسی گڑبڑ امین صاحب؟" میری حیرت دوچند ہو گئی۔

"جناب! اگر آپ دونوں طرف کے معاملات میں ایک جیسی دلچسپی لینے لگیں گے تو ناصر کے ساتھ ساتھ سیما بھی چھوٹ جائے گی۔"

"تو اس میں کون سی قباحت ہے۔" میں نے متعجب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرے خیال میں اگر ناصر اور سیما کا وکیل کوئی ایک ہی شخص ہو تو استغاثہ کے غبارے کی ہوا ایک ہی پیشی میں نکل جائے گی۔"

"لیکن میں ایسا نہیں چاہتا......" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب امین صاحب......؟"

"میں چاہتا ہوں......" وہ دل کی بات زبان تک لاتے ہوئے بولا۔ "ناصر چھوٹ جائے اور سیما کو رگڑا لگتا رہے......"

"آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔" میں نے قدرے برہمی سے کہا۔ "سیما سے آپ کو کیا دشمنی ہے۔ اگر وہ نادانستگی میں اپنی سوتیلی ماں سلمٰی کے ہاتھوں کا کھلونا بن بھی گئی ہے تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

"ایک بات ذہن نشین کر لیں امین صاحب۔ ناصر اور سیما کے فعل کی سنگینی ایک سی ہے۔ اگر سزا پائیں گے تو دونوں اور باعزت بری ہوں گے تو بھی دونوں بلکہ اس نوعیت کے معاملات میں لوگوں بلکہ عدالت کی ہمدردیاں بھی عورت کے ساتھ ہوتی ہیں اور عموماً یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ساری بدمعاشی لڑکے کی ہوگی۔ وہی لڑکی کو ورغلا کر کہیں ویرانے میں لے گیا ہوگا۔ آپ اپنی پوزیشن کی نزاکت اور معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔"

میری بات شاید اس کی عقل میں بیٹھ گئی تھی۔ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!"

"آپ کے اور آپ کی سابق بیوی سلمٰی کے درمیان جو بھی رنجش اور چپقلش ہے اسے فی الحال ایک طرف رکھ دیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس وقت آپ دونوں پارٹیوں کا دشمن پولیس یعنی استغاثہ ہے۔ اگر آپ دونوں فریق کندھے سے کندھا ملا کر استغاثہ سے فائٹ کریں گے تو جیت بھی آپ دونوں ہی کے حصے میں آئے گی ورنہ یہ کیس چوں چوں کا مربا بن کر رہ جائے گا۔"

"وکیل صاحب! میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔ "ویسے مجھے امید نہیں کہ سلمٰی اینڈ کمپنی میری بات ماننے کے لیے تیار ہو۔ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے دماغ کا ہر پیچ الٹا کسا ہوا ہے۔"

"آپ کو ان سے اپنی کوئی بھی بات منوانے کی کوشش نہیں کرنا امین صاحب!" میں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ "آپ صرف کسی بھی طرح رمضانی بھائی کو میرے پاس لے آئیں۔ سلمٰی سے تو بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ سیما، رمضانی بھائی کی سگی بیٹی ہے لہٰذا بات بھی اسی سے ہوگی اور...... جو بات بھی ہوگی، میں خود ہی کروں گا۔ آپ کو ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔ میں نے اپنی فیس وصول کر کے اسے رسید بنا کر دے دی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اس معاملے پر غور کرنے لگا۔

***

امین ویسے تو ہر لحاظ سے مجھے معقول انسان ہی لگا تھا لیکن جہاں تک وہ سیما کو رگڑا لگانے کے حق میں تھا تو اس کا یہ رویہ نامعقولیت کی حدود میں داخل ہو جاتا تھا اور میں نے اپنے خیالات کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا جس پر اسے خاصی ندامت بھی ہوئی تھی۔

میری معلومات کے مطابق سلمٰی امین کی سابق بیوی تھی۔ واضح رہے کہ میں نے اپنی جن معلومات کا حوالہ دیا ہے، وہ امین سے پہلی ملاقات پر تو نہ ہونے کے برابر تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا رہا تھا لیکن

چونکہ یہ کہانی مذکورہ واقعے کے بعد لکھی جا رہی ہے لہٰذا آپ کی آسانی اور سہولت کے لیے میں بہت سی بعد کی باتیں پہلے بیان کر رہا ہوں۔

امین کے مطابق سلمٰی ایک طرح دار، پرکشش اور خوب صورت عورت تھی لیکن اس کا سب سے بڑا عیب حد سے بڑھی ہوئی خواہشات اور بدکلامی تھا۔ امین کی جو آمدنی تھی اس کے مطابق علاقے ہی میں اس نے رہائش اختیار کر رکھی تھی مگر سلمٰی کو شہر کے کسی پوش علاقے میں وسیع و عریض بنگلے اور چمچماتی گاڑیوں کی خواہش تھی۔ قیمتی ملبوسات، بیش بہا جیولری، گھومنا پھرنا، پارٹیاں اٹینڈ کرنا وغیرہ وغیرہ، اس کے دلی شوق تھے اور امین یہ سب کچھ مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ تین ہٹی کے قریب اس کا ایک چھوٹا سا میڈیکل اسٹور تھا جہاں سے محدود آمدنی ہوتی تھی اور اس محدود آمدنی میں وہ سلمٰی کی خواہشات من و عن پوری نہیں کر سکتا تھا۔

جب طلب و رسد میں بہت بڑا تضاد یا فرق آجائے تو جھگڑا لازمی قرار پاتا ہے لہٰذا امین اور سلمٰی میں صبح شام لڑائی ہونے لگی۔ امین، سلمٰی کے نت نئے مطالبات یا فرمائشوں سے اتنا زیادہ پریشان نہیں ہوتا تھا جتنا اس کی بدکلامی اور بدزبانی سے۔ سلمٰی کی ساری خوب صورتی اس کے خاموش رہنے تک تھی۔ جیسے ہی وہ زبان کھولتی، اس کی اصلیت کھل جاتی تھی۔

بہرحال، ان کی گاڑی زیادہ عرصے تک چل نہ سکی اور زچ ہو کر امین نے ایک روز سلمٰی کو طلاق دے دی۔ وہ جتنا عرصہ بھی ایک چھت کے نیچے رہے، ان کی اولاد وجود میں نہ آسکی۔ طلاق کے فوراً بعد امین نے سائرہ نامی ایک خاتون سے شادی کر لی تھی جس سے اس کی ایک دو سالہ بیٹی کومل تھی۔ امین کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ امین سے چھوٹی دو بہنیں اپنے اپنے گھروں میں خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھیں۔ چھوٹا بھائی ناصر، امین کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ وہ گریجویشن کر رہا تھا اور پڑھائی سے جتنا بھی وقت مل جاتا، وہ میڈیکل اسٹور والے کام میں امین کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ وہ عموماً شام پانچ بجے کے بعد میڈیکل اسٹور پر آجاتا تھا۔

دوسری طرف سلمٰی نے امین سے طلاق پانے کے بعد کچھ عرصہ آرام کیا پھر اس نے رمضانی بھائی سے شادی کر لی۔ رمضانی کی بیوی فوزیہ چھ سات سال پہلے انتقال کر گئی تھی اور سیما اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ رمضانی کا عالیشان بنگلا نشتر پارک کے قریب

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ مئی 2013ء کی جھلکیاں

عقل کل
ماضی بعید کی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

غازی
اس پاکستانی جانباز کا قصہ جس نے عالمی شہرت حاصل کی

فنکار
ایک پاکستانی مصور کا کمال اس نے فن کا لوہا اک عالم سے منوایا

گونگی محبت
وہ گونگا تھا مگر محبت کی خاطر اس نے بہت بڑی قربانی دی

اس کے علاوہ
لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل کہانی سراب، فلمی دنیا کی کہی ان کہی باتیں فلمی الف لیلیٰ مگر اس بار الگ انداز بیاں، ترکی کی دلچسپ سفر کہانی اور بھی بہت کچھ

بس ایک بار پڑھنے کی دیر ہے آپ خود سرگزشت کے گرویدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

واقع تھا۔ رمضانی کا طارق روڈ پر آٹو اسپیئر پارٹس کا بزنس تھا جو ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ سلمٰی اور رمضانی بھائی کی عمروں میں لگ بھگ پندرہ سال کا فرق تھا۔ رمضانی، سلمٰی کے معیار کا سیٹھ تھا یا نہیں، بہرحال اس نے اپنی مرضی اور پسند سے رمضانی بھائی سے شادی کی تھی اور یقیناً خوش بھی ہوگی۔

میں نے اگلے روز تھانے جا کر حوالات میں ناصر اور سیما سے ایک بھرپور ملاقات کرلی۔ دونوں کو حوالات کے الگ الگ کمروں میں رکھا گیا تھا۔ اس امر کا بیان ضروری نہیں کہ میں نے حوالاتیوں تک رسائی کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کیا تھا۔ یہ کارروائی متعدد بار تفصیلاً بیان کی جا چکی ہے۔

میں چونکہ اپنے ذہن میں ایک مخصوص پلان لے کر گیا تھا لہٰذا میں نے پہلے سیما سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں کو الگ الگ حوالات میں رکھا گیا ہے۔

سیما کی عمر پچیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس نے تازہ تازہ ماسٹرز کیا تھا۔ وہ ایک قدآور اور صحت مند لڑکی تھی۔ رنگت سانولی، آنکھیں موٹی اور ان موٹی آنکھوں پر نظر کا چشمہ بھی موجود تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر چونکی اور سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگی۔

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ہے اور میں ایک وکیل ہوں......''

''وکیل......!'' اس نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔

''کیا آپ کو پاپا نے یہاں بھیجا ہے......؟''

سیما کی آنکھوں میں ایک خاص نوعیت کی ہوشیاری پائی جاتی تھی۔ میں نے اسے چکر دینے کی غرض سے کہا۔

''کیا تمہارے پاپا نے ایسا کوئی ذکر کیا تھا......؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''جبھی تو مجھے حیرت ہو رہی ہے۔''

''تم حیران ہونا چھوڑ دو۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے کسی نے یہاں نہیں بھیجا۔ بس، مجھے پتا چلا کہ پولیس نے تم دونوں بے گناہوں کو زبردستی ایک بے ہودہ الزام کے تحت حوالات میں بند کر رکھا ہے تو میں خبر لینے آ گیا......''

''تو آپ کوئی خدائی فوج دار قسم کے وکیل ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

ایک بات سے مجھے شدید حیرت ہوئی تھی کہ سیما ذرا بھی گھبرائی ہوئی نظر نہیں آتی تھی، ورنہ اسے جس نوعیت کے سنگین الزام میں حوالات میں رکھا گیا تھا اس کی روشنی میں اسے بے حد ہراساں اور وحشت زدہ دکھائی دینا چاہیے تھا۔

اب یا تو وہ آہنی اعصاب کی مالک تھی یا تو پھر اسے کسی اور بات سے بڑی بھرپور تسلی تھی کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... تم مجھے کچھ اسی قسم کا وکیل سمجھ لو۔ میں تم دونوں کو قانونی تحفظ فراہم کر کے اس جھمیلے سے نکالنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ، یہ قصہ ہے کیا؟''

مجھے امید تو یہی تھی کہ ''مدد'' کا سن کر وہ فوراً مجھ سے تعاون کے لیے تیار ہو جائے گی لیکن اس نے میری توقع کے برعکس جواب دے کر مجھے حیران کردیا۔

''وکیل صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کو نہیں جانتی۔ میں کسی اجنبی شخص سے اپنا معاملہ ڈسکس نہیں کر سکتی۔ پہلے آپ اپنا مکمل تعارف کرائیں۔ پھر میں فیصلہ کروں گی کہ مجھے آپ سے کچھ شیئر کرنا چاہیے یا نہیں۔''

تعلیم یافتہ تو وہ تھی ہی لیکن اپنی باتوں سے وہ ذہین بھی ثابت ہو رہی تھی ورنہ میں نے بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو بھی بڑی جہالت کی باتیں کرتے دیکھا ہے۔ میں نے زیادہ گھماؤ پھیراؤ مناسب نہ سمجھا اور معتدل انداز میں کہا۔

''میں ابھی تک تو ناصر کا وکیل ہوں۔ تم چاہو گی تو تمہارا وکیل بھی بن جاؤں گا۔''

''ناصر......!'' اس نے ناصر کا نام لیتے ہوئے ایسا منہ بنایا جیسے کسی غلیظ اور بدبودار چیز کا ذکر کر رہی ہو۔ ''سوری وکیل صاحب...... مجھے کسی قسم کی قانونی مدد کی ضرورت نہیں۔ آپ خود کو اپنے موکل تک ہی محدود رکھیں تو آپ کی نوازش ہوگی......''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہیں قانونی مدد کی ضرورت نہیں؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''جب کوئی انسان پولیس کی کسٹڈی میں آتا ہے اور عدالتی بکھیڑوں میں پھنستا ہے تو اسے لازماً کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔''

''آپ کو میرے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں وکیل صاحب!'' وہ قدرے چڑ کر بولی۔ ''میرے لیے میرے پاپا ہی کافی ہیں۔ وہ اگر مناسب سمجھیں گے تو میرے لیے کوئی چوٹی کا قابل وکیل کرلیں گے۔ آپ جا کر اپنے موکل کو سنبھالیں......''

اس کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر پہلے مجھے اس پر جو شک ہوا تھا وہ اس جواب سے یقین میں بدل گیا۔ ''میرے لیے میرے پاپا ہی کافی ہیں۔'' تو گویا سیما کے

پاپا نے آسانی سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرلیا تھا۔

''لگتا ہے، تمہارے پاپا نے تمہاری رہائی کے لیے کوئی بندوبست کر رکھا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ بتانا پسند کروگی؟''

''سوری وکیل صاحب!'' اس نے مجھے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ ایک ایسے آدمی کے وکیل ہیں جس کی وجہ سے میں مصیبت میں پھنسی ہوں۔ میں اس کم بخت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ پلیز...... آپ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔''

''کمال ہے!'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''ناصر کے بھائی امین کا یہ دعویٰ ہے کہ تمہاری سوتیلی ماں سلمٰی کی وجہ سے ناصر اس بکھیڑے میں پھنسا ہے اور تم ناصر ہی کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو۔''

''وہ دونوں بھائی اول درجے کے جھوٹے ہیں۔'' سیما نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور جہاں تک سلمٰی کا تعلق ہے تو...... سوتیلی ہی سہی، وہ میری ممی ہیں۔ میں ان کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی۔''

سیما کے دوٹوک انداز نے بتا دیا کہ ناصر کی کہانی الٹ چکی ہے۔ سیما اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر کنارے پر پہنچنے کی کوشش میں دکھائی دیتی تھی لیکن میں نے بھی ٹھان لی کہ اسے فرار کا موقع نہیں دوں گا تاہم اس نے جس روکھے پھیکے انداز میں مجھے جواب دیا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں اس کے پاس سے ہٹ جاؤں۔

میں سیما کو چھوڑ کر ناصر کے پاس آ گیا۔

ناصر نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا تو میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ تمہارے بھائی امین نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں اس مصیبت سے نجات دلاؤں گا جس میں اس وقت تم گرفتار ہو لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیسی شرط وکیل صاحب؟''

''یہ شرط کہ میں تم سے جو بھی سوال کروں تم اس کا سیدھا اور سچا جواب دو گے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اگر مجھے تمہارے بیان پر کسی غلط بیانی کا گمان ہوا تو میں تمہاری وکالت سے ہاتھ کھینچ لوں گا۔''

''جناب! آپ تو میرے لیے نجات دہندہ ہونے والے ہیں۔'' وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ سے جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''ٹھیک ہے!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''باتیں بعد میں، پہلے ایک ضروری کام......''

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنا بریف کیس کھول لیا۔ ناصر غیر یقینی نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اسے تذبذب ہو کہ میں بریف کیس کے اندر سے پتا نہیں، کون سی اہم چیز نکالنے والا ہوں۔ ناصر کی عمر بیس کے آس پاس تھی۔ وہ اپنے بھائی کا ریورس تھا یعنی امین کے مقابلے میں وہ پستہ قامت اور انتہائی دبلا پتلا بلکہ تختی سا تھا۔ اس کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی لڑکی سے عشق پیچا لڑا رہا ہوگا......

میں نے جلدی جلدی ناصر کی درخواست ضمانت، اپنے وکالت نامے اور چند دیگر کاغذات پر ناصر کے دستخط لیے پھر ان ضروری دستاویزات کو دوبارہ بریف کیس میں رکھنے کے بعد ناصر کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''ہاں بھائی ناصر!'' میں نے بڑے دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا سلسلہ ہے جوان...... مرے تھے جن کے لیے، وہ رہے وضو کرتے...... بلکہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے......؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور فوراً ہی بات کی تہ میں پہنچ گیا، جلدی سے بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ کا اشارہ سیما کی طرف ہے نا......؟''

ویسے یہ ہے کہ مخدوش صحت پر میں نے اسے جو ''جوان'' کہہ دیا تھا اس سے وہ اچھا خاصا خوش ہوگیا تھا۔ وہ اس نوعیت کے خطابات سننے کو ترس گیا ہوگا۔ میں نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے ناصر۔ میں تمہارے پاس آنے سے پہلے سیما سے دو چار باتیں کر کے آیا ہوں۔ سمجھو پیار محبت تو دور کی بات، وہ تو تمہیں پہچاننے سے بھی انکاری ہے......''

''بس جناب! ایسی ہی بات ہے۔'' وہ افسردہ سے لہجے میں بولا۔ ''میں نے بھی اس کے رویے میں کچھ ایسی ہی بات محسوس کی ہے۔''

اس بات کا مجھے یقین تھا کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے سیما سے جو گفتگو کی تھی وہ ناصر نے نہیں سنی ہوگی۔ اس کا سبب دونوں کے حوالاتی کمروں کے مابین پایا جانے والا فاصلہ اور زاویہ تھا۔ وہ نہ تو ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی ایک دوسرے کی باتیں سن سکتے تھے۔ میں نے ناصر کی زبان کو رواں کرنے کے لیے ایک جذباتی وار کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یار ناصر! مجھے تو لگتا ہے، تمہاری محبت میں زیادہ دم نہیں تھا ورنہ لڑکی نے اتنی آسانی سے کیسے پٹری بدل ڈالی......؟"

"میری محبت میں کوئی کمی نہیں تھی وکیل صاحب۔" میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔ ناصر جذبات میں آ گیا تھا "وہی کم ظرف اور بے وفا نکلی۔ تھانے پہنچنے تک سب ٹھیک تھا۔ یہاں آ کر اس نے نظر پھیر لی ہے۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی ناصر!" میں اسے دوستانہ انداز میں اس لیے مخاطب کر رہا تھا کہ وہ مجھ پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کرنے لگے۔ "تمہارے بھائی کا کہنا ہے کہ سیما کی سوتیلی ماں سلمٰی نے ایک گہری سازش کے تحت سیما کو تمہارے قریب کیا اور پھر پولیس کی مٹھی گرم کر کے تمہیں اس مصیبت میں پھنسا دیا۔ تم کیا کہتے ہو؟"

"میں امین بھائی کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور سیما کے حالیہ رویے نے یہ بات ثابت بھی کر دی ہے۔ ہم ایک جیسے الزام میں گرفتار ہو کر ایک ساتھ تھانے پہنچے تھے، پھر عدالت میں بھی ایک ساتھ پیش ہوئے لیکن یہاں دوبارہ آنے کے بعد وہ بالکل ہی بدل گئی ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس میں سلمٰی ہی کی کوئی چال چھپی ہوئی ہے۔"

"اور سیما کا دعویٰ ہے کہ تمہارے بھائی امین نے کسی گہری سازش کے تحت اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں بھائی اول درجے کے جھوٹے اور دغاباز ہو......"

"وہ بکواس کرتی ہے، جھوٹ بولتی ہے۔" ناصر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "دھوکا تو میرے ساتھ ہوا ہے وکیل صاحب......!"

"کیسا دھوکا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی دھوکا......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "کہ میں سمجھ رہا تھا کہ میری محبت کے جواب میں سیما بھی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن حالات اور وقت نے آج ثابت کر دیا ہے کہ اس کی محبت کھوکھلی بلکہ ایک سوچے سمجھے ڈرامے سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ مجھے اس مصیبت میں ڈالنے کے لیے قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ میں امین بھائی کی بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ یہ سارا ناٹک سلمٰی نامی اس عورت کے اشارے پر رچایا گیا ہے۔ وہ میری بھابی ہوا کرتی تھی۔ میں جانتا ہوں، سلمٰی ایک فتنہ پرور اور مغلوب الغضب عورت ہے۔ وہ جب تک ہمارے گھر میں رہی، اس نے امین بھائی کی زندگی کو عذاب بنائے رکھا تھا۔"

میں نے بڑے تحمل سے اس کے دکھی دل کی فریاد سنی اور اس کے خاموش ہونے پر ایک نہایت ہی اہم اور سنجیدہ سوال کیا۔

"ناصر! یہ بتاؤ، سیما کے ساتھ تمہارا یہ محبت کا معاملہ کب سے چل رہا تھا؟"

"جناب!" وہ کڑوے لہجے میں بولا۔ "یہ پوچھیں کہ سیما مجھے کب سے الو بنانے میں لگی ہوئی تھی؟"

"ایک ہی بات ہے...... یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم میرے سوال کا جواب دو......؟"

"یہی کوئی چھ، سات ماہ ہوئے تھے ہمیں ملتے ہوئے۔" ناصر نے بتایا۔

"کیا تمہیں یہ بات پتا تھی کہ سیما اس شخص کی بیٹی ہے جس نے تمہاری سابق بھابی سلمٰی سے شادی کی ہے؟"

"جی نہیں، شروع میں مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "چند روز پہلے ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا۔"

"اس انکشاف کا تم پر کیا ردعمل ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ابتدائی ردعمل کے طور پر میرے ذہن کو ایک جھٹکا تو لگا تھا۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن پھر میں فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ میرے لیے اطمینان اور سکون کا پہلو یہ تھا کہ سیما مجھے دل و جان سے چاہتی تھی۔ مجھے اس کی محبت کے سامنے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔"

"یہ محبت ریت کی ایک دیوار سے زیادہ کچھ بھی ثابت نہ ہو سکی۔" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری موجودہ دلی حالت اور ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں ناصر......!"

اس نے تشکر آمیز نظر سے میری طرف دیکھا پھر شکستہ سے انداز میں بولا۔ "اب ان باتوں کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے وکیل صاحب......!"

"ایک بات سچ سچ بتاؤ ناصر!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم دونوں نو فروری کی سہ پہر سی ویو کے علاقے میں فحش حرکتیں کر رہے تھے؟"

"بالکل نہیں جناب۔" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہم دونوں تو سمندر کے کنارے بیٹھے بس، باتیں کر رہے تھے۔ میری بائیک بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ ہم ایک دوسرے میں مگن تھے کہ اچانک دو پولیس والے ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی صفائی میں کچھ کہتے، انہوں نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ ہم پہلے بھی تین چار بار سی ویو آ چکے تھے لیکن اس قسم کا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔"

"تم لوگ سی ویو کے علاوہ اور کہاں کہاں ملتے رہے ہو پچھلے چھ سات مہینوں میں؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کبھی ہم سی ویو کی طرف نکل جاتے تو کبھی قائداعظم کے مزار پر جا کر بیٹھ جاتے تھے۔" اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "کبھی کبھار صدر کے کسی ہوٹل میں بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ ویسے زیادہ تر ہماری کوشش یہی ہوتی تھی کہ کسی ایسی جگہ پر جائیں جہاں ہمارے دیکھ لیے جانے کا امکان نہ ہو۔ ویسے پاس بائیک ہے لہٰذا آمد و رفت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔"

"کیا تم دونوں کے بیچ یہ میل ملاقاتیں سوکھی ہی چل رہی تھیں یا......؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بے ساختہ بولا۔ "کیا مطلب جناب؟"

"مطلب یہ کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ آپس میں تحفے تحائف کا تبادلہ بھی کیا کرتے تھے؟"

"جی ہاں، یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہتا تھا۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔ "کبھی میں نے اسے پرفیوم یا کوئی میک اپ کا آئٹم دے دیا اور کبھی اس نے مجھے کوئی شرٹ دلا دی یا کوئی اچھا سا فاؤنٹین پین۔"

"اور کیا روایتی عاشقوں کی طرح خط کتابت بھی ہوا کرتی تھی؟"

"جی ہاں...... ہوتی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"تم سیما کے خطوط تو بڑی محبت اور حفاظت سے سنبھال کر رکھتے ہو گے؟" میں نے پوچھا۔

"جی، اس کا اپنا ہی ایک مزہ ہے مگر......" وہ کچھ بولتے بولتے رک گیا اور اس کے چہرے پر کوفت ابھر آئی۔

میں سمجھ گیا کہ ان لمحات میں وہ سیما کے حوالے سے کیا سوچ رہا ہو گا۔ میں نے اس کے دکھتے دل کے تاروں کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی اور ایک بہت ہی سودمند سوال کیا۔

"سیما کے چند خطوط تو اب بھی تمہارے پاس گھر میں محفوظ رکھے ہوں گے؟"

"جی ہاں، دو تین ہیں......" اس نے جواب دیا۔

میں نے اس سے پوچھ لیا کہ مذکورہ "لو لیٹرز" گھر میں کہاں رکھے تھے۔ اس نے مطلوبہ مقام کی درست نشاندہی کر دی۔ میں نے مزید دو چار اہم سوالات کے بعد اس کا انٹرویو ختم کر دیا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"ناصر! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم بے گناہ ہو۔ سیما نے بڑی چالبازی سے تمہیں پولیس کے چکر میں پھنسایا ہے لیکن تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں بڑی توجہ سے تمہارا کیس لڑوں گا اور جلد از جلد تمہیں اس مصیبت سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

میرے ان حوصلہ افزا الفاظ سے اس کی ڈھارس بندھی۔ میں نے عدالتی معاملات کے حوالے سے اسے کچھ ہدایات دیں اور واپس آ گیا۔

٭٭٭

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں جس بات کی توقع کر رہا تھا وہ پوری ہو کر رہی۔ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ حوالات میں سیما اتنی زیادہ پُراعتماد اور نڈر کیوں نظر آتی تھی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس کے پاپا اس کی بچت کی کوئی محفوظ راہ ضرور ڈھونڈ نکالیں گے اور رمضانی بھائی نے اپنی اکلوتی دختر نیک اختر کے لیے ایک "سیف پیچ" تلاش کر لیا تھا جو استغاثہ کی رپورٹ یعنی چالان کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ رمضانی بھائی نے ایک تگڑی رقم خرچ کر کے پولیس کی مدد سے ایک ایسا چالان تیار کرایا تھا جس میں سیما معصوم اور ناصر بدمعاش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑے شاطرانہ انداز میں سیما کو اس کیس میں سے اس طرح باہر نکال لیا تھا جیسے مکھن میں سے بال کو کھینچ کر باہر نکالا جاتا ہے۔ پولیس نے سراسر سیما کی حمایت اور ناصر کی مخالفت میں چالان پیش کیا تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے ناصر کی درخواست ضمانت کے ساتھ اپنا وکالت نامہ دائر کر دیا۔ میں نے عدالت میں قدم رکھنے سے پہلے اس کیس کے حوالے سے مکمل تیاری کر لی تھی۔ یہ کیس ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں لگا تھا اور چالان ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ سرکاری وکیل سیما کو بے گناہ اور ناصر کو قصوروار ٹھہرانے کے لیے زور مارے گا۔

مجسٹریٹ نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے اپنے موکل ناصر کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! میرا موکل اس معاشرے کا ایک امن پسند اور باکردار شہری ہے۔ اس بے چارے کو ایک گہری سازش

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ذریعے اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کو ضمانت پر رہا کرنے کے احکام صادر کیے جائیں۔"

میرے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ نے طنزیہ نظر سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل ناصر کی طرف دیکھا اور استہزائیہ انداز میں بولا۔

"باکردار شہری...... سبحان اللہ...... ملزم اتنا امن پسند اور باکردار شہری ہے کہ یہ ایک لڑکی کو ورغلا کر سی ویو جیسے الگ تھلگ مقام پر لے گیا اور بڑی دیدہ دلیری سے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ اس جیسے شریف شہریوں نے ہی تو ہمارے معاشرے کو چار چاند لگا رکھے ہیں۔"

چالان کے اندر پولیس نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ملزم دھوکا دہی سے سیما کو ساحل سمندر پر لے گیا تھا اور وہاں پہنچ کر اس نے سیما سے دست درازی کی کوشش کی۔ تھوڑے فاصلے پر دو پولیس اہلکار موجود تھے۔ انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو بروقت کارروائی کر کے ان دونوں کو تھانے پہنچا دیا۔

میں نے وکیل استغاثہ کی چوٹ کے جواب میں کہا۔ "یور آنر! یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ سیما، ملزم کے ساتھ کہیں گئی ہو لہٰذا دھوکا دہی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"بیگ صاحب!" مجسٹریٹ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں......؟"

"یور آنر......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ ملزم اور سیما ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن اس واقعے کے بعد سیما کی محبت کی حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ ملزم یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی طرح سیما بھی محبت کے معاملے میں مخلص اور سنجیدہ ہے۔ وہ ہفتے دس دن میں سیما کو اپنی بائیک پر بٹھا کر کسی پرسکون مقام پر لے جاتا تھا جہاں بیٹھ کر وہ ڈھیروں پیار بھری باتیں کرتے تھے۔ میرے موکل کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیما اسے کسی مصیبت میں پھنسانے کے لیے یہ محبت والا ناٹک کر رہی تھی۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ "سیما اور ملزم کے درمیان کبھی کوئی سنجیدہ تعلق نہیں رہا۔ وکیل صفائی خوامخواہ الٹی سیدھی باتیں کر کے سیما کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟" مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔

"یور آنر! میں نے تو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ دیا اور یہی حقیقت بھی ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں مجسٹریٹ کے استفسار کا جواب دیا۔ "میں اپنے کہے کو ثابت بھی کر سکتا ہوں اور وقت آنے پر اس سازش کو بھی بے نقاب کر سکتا ہوں جو ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت میرے موکل کو اس مصیبت میں پھنسانے کے لیے بنی گئی تھی۔ دیٹس آل یور آنر۔"

"ہوں......" مجسٹریٹ نے گہری نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"

"جناب عالی! سیما اور ملزم کے بیچ محبت والی کہانی ایک فرضی داستان ہے جو میرے فاضل دوست کے ذہن کی اختراع ہو سکتی ہے۔" وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں، بس اتنا ہے کہ ان دونوں کے بیچ جان پہچان ضرور تھی اور سیما بھروسا کر کے اسی لیے ملزم کے ساتھ چلی بھی گئی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہاں پہنچ کر یہ شیطان بے ہودگی پر اتر آئے گا۔"

"یور آنر......!" میں نے پراعتماد انداز میں کہا۔ "میں اپنے موقف پر قائم ہوں کہ سیما اپنی مرضی سے میرے موکل کی بائیک پر بیٹھ کر سی ویو جیسے پرسکون مقام پر گئی تھی۔ اگر وکیل استغاثہ اپنے دعوے میں راسخ ہیں تو پھر ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ وضاحت کریں، میرے موکل نے کس بہانے سیما کو اپنے ساتھ ایک الگ تھلگ مقام تک جانے کے لیے راضی کر لیا تھا......؟" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور جہاں تک میرے موکل کے بے ہودگی پر اتر آنے یا سیما سے دست درازی کرنے کا تعلق ہے تو جب پولیس نے انہیں جائے وقوعہ سے گرفتار کیا تو پولیس کا موقف کچھ اور تھا اور آج کچھ اور ہے......"

"اس کا کیا مطلب ہوا بیگ صاحب؟" مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ "پولیس نے ابتدائی کارروائی کے نتیجے میں دونوں پر فحش اور نازیبا حرکات کا الزام لگایا تھا۔ اس بات میں دو آرا نہیں ہو سکتیں کہ فحش اور نازیبا حرکات ہمیشہ دونوں فریقوں کی مرضی اور منشا سے ہوتی ہیں یعنی "سی ویو" پر اچھا برا جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ سیما اور میرے موکل کی رضامندی کا نتیجہ تھا لیکن پھر نوٹوں کی جھلک نے معاملہ پلٹ کر رکھ دیا اور پولیس کا فوکس محض اس نقطے تک محدود ہو کر رہ گیا کہ ملزم سیما کو ورغلا کر سی ویو لے گیا اور وہاں پہنچتے ہی اس نے سیما کے ساتھ بدتمیزی اور دست درازی شروع کر دی۔"

"آپ نے نوٹوں کی جھلک کا تذکرہ کیا ہے۔" مجسٹریٹ نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ "یہ کیا معاملہ ہے بیگ صاحب؟"

"بہت سیدھا سادا معاملہ ہے جناب عالی!" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "گرفتاری کے فوراً بعد پولیس نے میرے موکل کے بڑے بھائی امین کو یہ راہ سجھائی تھی کہ وہ اگر صبح ہونے تک پچاس ہزار روپے کا بندوبست کر دے تو اس کیس کو تھانے ہی میں رفع دفع کر دیا جائے گا۔ امین نے پولیس کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ ممکن ہے، سیما کے پاپا کی سمجھ میں پولیس والوں کی بات آ گئی ہو جبھی یہ کیس سراسر میرے موکل کی مخالفت میں چلا گیا ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ استغاثہ سیما کو بچانے اور ملزم کو پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

پولیس کی رشوت ستانی کے معاملات کوئی نئی بات نہیں اور عدالت بھی ان ہتھکنڈوں سے بہ خوبی آگاہ ہے لہٰذا مجسٹریٹ نے اس ایشو پر زیادہ توجہ نہیں دی اور وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب! آپ وکیل صفائی کے سوالات کے جواب میں کیا کہیں گے۔ انہوں نے تھوڑی دیر پہلے آپ پر جو فرض عائد کیا ہے اس کی وضاحت بھی ضروری ہے؟"

وکیل استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "جناب عالی! ملزم نے سیما کو بتایا تھا کہ اس کے پاس سیما کی ذات کے حوالے سے چند ایسے دستاویزی ثبوت ہیں جو اگر منظر عام پر آ گئے تو اس کی اور اس کے پاپا کی عزت پر حرف آ سکتا ہے لہٰذا وہ ملزم کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گئی......"

"ویری گڈ!" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "سیما اتنی ننھی بچی تھی کہ وہ چپ چاپ ملزم کی بائیک پر بیٹھ کر سی ویو پہنچ گئی۔ دستاویزی ثبوت حاصل کرنے کے لیے شہر کے آخری کنارے تک جانے کی کیا ضرورت تھی......؟"

اس موقع پر مجسٹریٹ نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور ملزم ناصر سے پوچھا۔ "ایسے کون سے ثبوت تھے تمہارے پاس جو سی ویو جائے بغیر سیما کو فراہم نہیں کیے جا سکتے تھے؟"

اگرچہ یہ سوال میرے موکل سے کیا گیا تھا اور استغاثہ کی حمایت میں کیا گیا تھا لیکن میرے نزدیک مجسٹریٹ کے اس اقدام سے مجھے ملزم کو ڈیفنڈ کرنے کا ایک اور راستہ مل گیا تھا۔

ناصر نے مجسٹریٹ کے استفسار کے جواب میں بتایا۔ "جناب عالی! سیما کا بیان جھوٹ کا پلندا ہے۔ میں نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"تم نے سیما سے دستاویزی ثبوت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔" مجسٹریٹ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "پھر تم کس مقصد کی خاطر اسے اپنے ساتھ سی ویو لے گئے تھے؟"

"محبت!" ناتواں ناصر نے بڑی توانائی سے جواب دیا۔ "ہمارے ایک ساتھ سی ویو جانے اور وہاں تنہائی میں بیٹھ کر راز و نیاز کرنے کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے...... کم از کم میں تو اپنے تئیں ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن گرفتاری کے بعد سیما نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت میرے قریب آئی تھی۔ اس نے میرے ساتھ محبت کا ناٹک رچایا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کے دام میں گرفتار ہو چکا ہوں تو ایک سنسنی خیز ڈرامے کے بعد اس نے مجھے مصیبت میں دھکیل دیا اور خود معصوم بن کر ایک طرف کھڑی ہو گئی ہے......"

مجسٹریٹ نے ملزم کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارے وکیل صاحب نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ تم اس سے پہلے بھی سیما کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتے رہے ہو۔ اس بات میں کس حد تک صداقت ہے؟"

"جناب عالی! میرے وکیل صاحب نے عدالت میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے وہ سب میں نے ہی وکیل صاحب کو بتایا تھا۔" ناصر نے میری ہدایات کے مطابق جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بات سو فیصد سچی ہے کہ میرے اور سیما کے بیچ محبت کا معاملہ پچھلے سات ماہ سے چل رہا تھا اور اس دوران میں ہم آٹھ دس بار آپس میں ملے ہیں۔ کبھی سی ویو، کبھی قائداعظم کے مزار، کبھی میوزیم اور کبھی صدر کے ریسٹورنٹس میں۔ ہم دو بار پکچر ہاؤس میں فلم دیکھنے بھی گئے تھے......"

"یور آنر!" میں نے اس موقع پر مداخلت ضروری جانی۔ "سیما اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں سیما سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

اجازت نہ دینے کی کوئی وجہ نہیں تھی لہٰذا مجسٹریٹ نے فراخ دلی سے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ سیما سے سوال

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرسکتے ہیں۔"

میں سیما والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔ آج اس کیس کی پہلی پیشی تھی لیکن یہ معاملہ کچھ اس انداز میں پھیلتا چلا جارہا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا، آج ہی اس کیس کا فیصلہ بھی ہوجائے گا۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں ابھی کافی دیر تھی اور میری کوشش تھی کہ عدالت برخاست ہونے سے پہلے میں اس کیس کے دھارے کو ایسے موڑ پر لے آؤں کہ اگر کیس کا فیصلہ نہ بھی ہو تو کم از کم میرے موکل کی ضمانت ضرور ہوجائے۔

میں نے سیما کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "سیما جی! کیا یہ بات درست ہے کہ آپ کے اور ناصر کے درمیان پچھلے سات ماہ سے عشق و محبت کا معاملہ چل رہا تھا؟"

"بالکل غلط!" اس نے بڑے مضبوط انداز میں تردید کرتے ہوئے کہا۔ "اس بکواس کی کوئی حقیقت نہیں۔"

"اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ آپ ناصر کی بائیک پر بیٹھ کر دور دراز کے پرسکون مقامات پر ملاقاتیں کرتی رہی ہیں؟" میں نے آہستہ آہستہ اسے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، یہ بات بھی سراسر غلط ہے۔" اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔ "یہ ساری جھوٹی کہانی ناصر نے مجھے بدنام کرنے کے لیے گھڑی ہے۔"

"تو گویا آپ دونوں کے بیچ پیار و محبت کا کوئی سلسلہ تھا ہی نہیں؟"

"جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا سی ویو والے واقعے سے پہلے بھی آپ کی کبھی ناصر سے ملاقات ہوئی تھی؟" میں نے اپنے نادیدہ جال کو آہستہ آہستہ سمیٹتے ہوئے کہا۔

"بس، ایک آدھ بار......!"

"مطلب، آپ ناصر کو جانتی تو تھیں نا......؟"

"جی ہاں، جانتی تھی۔"

"آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ ناصر کسی زمانے میں آپ کی سوتیلی ممی سلمٰی کا دیور رہا تھا؟" میں نے اسے پکا کرنے کی غرض سے سوال کیا۔

"جی ہاں، یہ بات میرے علم میں تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "جبھی میں اس دغاباز کے ساتھ سی ویو تک چلی بھی گئی تھی کیونکہ اس نے جن دستاویزی ثبوت کا ذکر کیا تھا وہ میری سوتیلی ممی سلمٰی کی پچھلی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔"

"اچھا ہوا، آپ نے خود ہی ذکر کردیا ورنہ میں آپ سے اگلا سوال یہی کرنے والا تھا۔" میں نے بڑی رسان سے کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ ناصر کے پاس آپ کی سوتیلی ممی کے حوالے سے کون سے دستاویزی ثبوت تھے جن کے منظرعام پر آجانے سے آپ کی اور آپ کے پاپا کی عزت پر حرف آسکتا تھا؟"

"میں ان کے بارے میں ضرور عدالت کو بتاتی اگر وہ مجھے حاصل ہوجاتے تو......" اس نے طنزیہ انداز میں ناصر کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے بتایا۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "ناصر نے آپ کو وہ دستاویزی ثبوت فراہم نہیں کیے تھے......؟"

"وہ تو اس کا ایک بہانہ تھا۔" سیما نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ "سی ویو پہنچنے کے بعد جب میں نے اس سے وہ دستاویزی ثبوت مانگے تو اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھر آئی اور میری بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے مجھ سے بدتمیزی شروع کردی...... وہ تو میری خوش قسمتی رہی کہ وہاں قریب ہی پولیس والے موجود تھے۔ انہوں نے اس کی بے ہودہ حرکات دیکھ لیں اور موقع پر پہنچ کر ہم دونوں کو گرفتار کرلیا۔"

"ویری بیڈ......" میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی۔ "اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو میں یہی کہوں گا کہ بہت برا ہوا......"

"میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں وکیل صاحب۔" وہ اصراری لہجے میں بولی۔ "میں نے جو بیان کیا ہے، بالکل ویسا ہی ہوا تھا۔"

"قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے آنکھیں بند کرکے آپ کی بات کا یقین کرلیا، آپ پر بھی لازم ہے کہ آنکھیں اور دماغ کھول کر میرے آخری چند سوالات کے ٹھیک ٹھیک جواب دے دیں۔"

"جی پوچھیں، مزید کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ آپ نے حال ہی میں ماسٹرز کیا ہے؟"

"جی ہاں...... یہ بات درست ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"آپ نے کون سے سبجیکٹ میں ماسٹرز کیا ہے؟"

"ایجوکیشن میں!"

"گویا...... آپ اردو لکھنا پڑھنا بہ خوبی جانتی ہیں؟"

"یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ "میں اردو لکھنا پڑھنا ہی نہیں بلکہ بولنا بھی جانتی ہوں......"

"بول تو ماشا اللہ! آپ ٹھیک ٹھاک رہی ہیں۔" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن لکھنے پڑھنے کے بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا آپ اس سلسلے میں معزز عدالت کو کوئی مصدقہ ثبوت فراہم کرسکتی ہیں......؟"

"یہ کیسا مذاق ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "جس شخص نے ماسٹرز کر رکھا ہو، وہ بھلا اردو لکھنا، پڑھنا اور بولنا کیسے نہیں جانتا ہوگا۔ میرے فاضل دوست فضول قسم کی باتوں میں پڑ کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں۔ انہیں ایسے تاخیری حربوں سے روکا جائے......"

واقعی، میں نے سیما سے جس نوعیت کا مطالبہ کیا تھا، جو بھی سنتا تو یہی کہتا کہ میں نے انتہائی بچکانا بات کی تھی لیکن اس کے پیچھے میرا ایک خاص مقصد چھپا ہوا تھا۔

وکیل استغاثہ کے اعتراض کے جواب میں مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! کیا آپ واقعی سیما کا کوئی ٹیسٹ وغیرہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"یس، یور آنر!" میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔ "مجھے شک ہے کہ سیما صاحبہ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتیں۔ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو یہ معزز عدالت کے روبرو ثابت کرکے دکھادیں۔"

"سیما صاحبہ کو کاغذ اور قلم دیا جائے۔" وکیل استغاثہ نے کراری آواز میں کہا۔ "یہ ابھی ثابت کرکے دکھادیں گی......"

مجسٹریٹ کے حکم پر سیما کو ایک رف پیڈ اور قلم مہیا کردیا گیا۔ عدالت میں موجود سامعین و ناظرین میں چہ میگوئیاں ہورہی تھیں۔ میں نے بات ہی ایسی کردی تھی کہ ہر شخص تفریحی انداز میں سوچ رہا تھا اور اس منظر کا منتظر تھا جب وہ میرے پیش کیے گئے کسی آئٹم سے محظوظ ہو۔

کٹہرے میں کھڑی سیما نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "وکیل صاحب! آپ مجھے ڈکٹیٹ کرائیں گے یا میں اپنی مرضی ہی سے کچھ لکھ دوں......؟"

"میری کیا مجال کہ میں آپ کو ڈکٹیٹ کراؤں۔" میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنی مرضی ہی سے دو سطریں گھسیٹ دیں۔ لکھائی اتنی صاف ضرور ہو کہ آپ آسانی سے اسے پڑھ کر خود کو لکھا پڑھا ثابت کرسکیں۔"

> ## اعصابی بیماری
>
> ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آپ کی اعصابی بیماری کا کیا حال ہے؟"
>
> جواب ملا۔ "ٹھیک ہے۔ آج کل میکے گئی ہوئی ہے۔"
>
> مرسلہ: حجاب کنول خان، ملکوال

وہ گردن جھکا کر لکھنے میں مصروف ہوگئی۔ لگ بھگ ایک منٹ کے بعد اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ڈن!"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "اب براہ مہربانی، اپنی اس مختصر سی تحریر کو معزز عدالت کے سامنے بہ آواز بلند پڑھ کر بھی سنادیں۔"

سیما نے پڑھنا شروع کیا۔ "جانوروں سے تو وفا کی توقع کی جاسکتی ہے مگر انسان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں......"

"واہ وا...... سبحان اللہ!" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "آپ نے تو موجودہ حقیقت کی ترجمانی کردی ہے۔ کیا میں آپ کی اس تخلیق کو دیکھ سکتا ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا، سیما نے پیڈ اور قلم میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "لیں...... دیکھ کر تسلی کرلیں کہ میں نے کاغذ پر کچھ گھسیٹا بھی ہے یا محض ڈائیلاگ بولا ہے؟"

میں نے مذکورہ کاغذ کو لے کر بہ غور دیکھا اور پڑھ کر اس بات کی تسلی کرلی کہ اس نے جو کچھ پڑھ کر سنایا تھا، لکھا بھی وہی تھا اور...... یہ سیما ہی کا طرزِ تحریر تھا۔ میں نے مذکورہ پیڈ مجسٹریٹ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"یور آنر! سیما صاحبہ نے اس تحریر اور اس سے متعلقہ مختصر سی تقریر سے یہ تو ثابت کردیا ہے کہ وہ اردو لکھنا پڑھنا بخوبی جانتی ہیں۔ اب ان کی تحریر کے معانی کا ٹیسٹ باقی ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس ٹیسٹ کے بعد یہ کیس روزِ روشن کے مانند کھل کر معزز عدالت کے سامنے آجائے گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بیگ صاحب! آپ کس قسم کے ٹیسٹ کی بات کر رہے ہیں؟" مجسٹریٹ نے حیرت بھری نظر سے مجھے گھورا۔

"کوئی نیا ناٹک شروع ہونے والا ہے۔" وکیل استغاثہ نے ناگوار نظر سے میری جانب دیکھا۔ "میرے فاضل دوست کو عدالت کا وقت برباد کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے......"

میں نے وکیل استغاثہ کے معاندانہ تبصرے پر توجہ نہیں دی اور مجسٹریٹ کے سوال کے جواب میں کہا۔

"جناب عالی! سیما صاحبہ کی تحریر یعنی "ہینڈ رائٹنگ" کا ایک تازہ ترین نمونہ آپ کے سامنے حاضر ہے۔ ایسا ہی ایک سیمپل میرے پاس بھی ہے جو محترمہ نے چند ماہ پہلے تحریر فرمایا تھا۔ معزز عدالت سے میری پرزور اپیل ہے کہ وہ باریک بینی سے دونوں نمونوں کا موازنہ کرکے اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچائے کہ دونوں نمونہ جات ایک ہی شخصیت کی ہینڈ رائٹنگ ہے۔"

عدالت کے کمرے میں بڑی پراسرار خاموشی طاری تھی۔ وکیل استغاثہ سمیت وہاں موجود ہر شخص کی نگاہ مجھ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ یہ دیکھنے کو مشتاق تھے کہ میں اپنی فائلوں میں سے کون سا سانپ برآمد کرنے والا ہوں۔ میں نے نہایت ہی سسپنس خیز انداز میں ایک فائل کے اندر سے ایک فل اسکیپ کا پرچہ نکالا اور اسے لے جاکر مجسٹریٹ کی خدمت میں پیش کردیا۔

"یہ کیا ہے......؟" مجسٹریٹ نے مجھ سے سوال کیا۔

"یہ ایک "لو لیٹر" ہے یور آنر!" میں نے کھنک دار آواز میں کہا۔ "جو چند ماہ پہلے محترمہ سیما نے اپنے محبوب اور اس کیس کے ملزم ناصر کو لکھا تھا۔ ایسے ہی دو خطوط اور بھی میری فائل کے اندر موجود ہیں۔ اگر عدالت محسوس کرے گی تو میں ثبوت کے طور پر انہیں بھی پیش کردوں گا......"

میں نے بات ختم کرتے ہی فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر میری چبھتی ہوئی نگاہ سیما کی جانب اٹھ گئی۔ وکیل استغاثہ تو مجھے سخت پریشانی میں نظر آیا اور سیما کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میرے اس کاری وار نے استغاثہ کے غبارے سے ساری ہوا نکال دی تھی۔ ان لو لیٹرز کے بارے میں ناصر نے مجھے حوالات میں بتادیا تھا اور میری نشان دہی پر امین نے مذکورہ خطوط ناصر کے کمرے سے نکال کر میرے حوالے کردیے تھے۔

مجسٹریٹ نے بڑی باریک بینی سے اس عشقیہ خط کا معائنہ کیا پھر سیما کی حالیہ تحریر سے اس کا موازنہ کرنے کے بعد زیر لب بڑبڑایا۔ "تحریر تو ہو بہو ایک جیسی ہے۔" اس نے نگاہ اٹھا کر سیما کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔

"کیا یہ خط تم نے ہی ملزم ناصر کو لکھا تھا......؟"

"نن...... نہیں...... آں...... ہاں......" وہ بری طرح بوکھلا کر رہ گئی۔ "مم...... مگر...... اس نے تو مجھے بتایا تھا کہ میرے سارے خطوط ضائع کردیے ہیں......" بات کرکے سیما پریشان نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگی۔

"دی ڈرٹی گیم از اپ......!" میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "سیما کے اقرار نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا ہے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے سیما معزز عدالت کے سامنے مسلسل جو غلط بیانی کررہی ہے اس کا پول کھل گیا ہے۔ یور آنر! حقیقت یہ ہے کہ......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

"یور آنر...... سیما کا یہ کہنا کہ "ناصر نے اسے تمام عشقیہ خطوط ضائع کردینے کے بارے میں بتایا تھا" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ملزم کی محبت میں مبتلا تھی۔ بہ الفاظ دیگر سیما پچھلے چھ سات ماہ سے میرے موکل کے ساتھ محبت کا ناٹک کررہی تھی۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ملزم ماضی میں اس کی سوتیلی ماں سلمٰی کا دیور رہا تھا۔ ان وجوہات سے بھی واقف تھی جو ملزم کے بھائی اور سیما کی سوتیلی ماں سلمٰی کی علیحدگی کا سبب بنی تھیں۔ اس تناظر میں بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سیما ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ملزم کے قریب ہوئی۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس مذموم سازش کے پیچھے اس کی سوتیلی ماں سلمٰی کا ہاتھ تھا یا کسی اور کا، بہرحال یہ بات ثابت ہوگئی کہ میرا موکل محبت کے معاملے میں سیما کے ساتھ انتہائی سنجیدہ تھا اور اسی سنجیدگی نے اسے آنکھیں بند کرکے سیما پر بھروسا کرنے کے لیے مجبور کردیا تھا تاہم سیما کے اختتامی رویے نے اس کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اس کا محبت پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ بے گناہ و بے قصور ہے لہٰذا میں معزز عدالت سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ ملزم ناصر کو ضمانت پر رہا کرنے کے احکام صادر کیے جائیں۔ دیٹس آل یور آنر......!"

میری اس مدافعتی تقریر کے اختتام پر وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت رکوانے کے لیے زور مارنا چاہا تاہم زور مارنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کے دلائل میں خم نظر نہیں آتا تھا۔ مجسٹریٹ نے خفگی آمیز نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وکیل صاحب! آپ اپنی پہلے کہی ہوئی باتوں کو دُہرا رہے ہیں۔ ضمانت کو رکوانے کے لیے کوئی ٹھوس دلیل آپ کے پاس ہے تو پیش کریں......؟"

وہ آئیں، بائیں، شائیں کرنے لگا۔ مجسٹریٹ نے ناگواری سے کہا۔

"وکیل صاحب! یہ عدالت آپ کو پندرہ دن کا ٹائم دیتی ہے۔ اس دوران میں آپ استغاثہ پر اچھی طرح غور وفکر کرلیں۔ اگر آپ ملزم کے مبیّنہ جرم کے ذیل میں ٹھوس ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو آیندہ پیشی پر انہیں عدالت میں پیش کریں۔ بصورت دیگر عدالت اگلی پیشی پر اس کیس کو خارج کرنے کا قانونی اختیار رکھتی ہے۔"

وکیل استغاثہ نے بڑے یتیمانہ انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

"مسٹر بیگ!" مجسٹریٹ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "عدالت آپ کے موکل کی عبوری ضمانت منظور کرتی ہے......"

میں نے مؤدبانہ انداز میں گردن کو خم دیا اور کہا۔ "تھینک یو یور آنر!"

"اس کے ساتھ ہی آپ پر یہ ذمے داری بھی عائد کی جاتی ہے کہ......" مجسٹریٹ اضافہ کرتے ہوئے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "آیندہ پیشی پر آپ اپنے موکل کو عدالت میں حاضر کرنے کے پابند ہوں گے۔"

"میں اپنے فرائض اور ذمے داری کا پورا خیال رکھوں گا جناب عالی۔" میں نے فرماں برداری سے کہا۔ "انشااللہ! اس سلسلے میں، میں معزز عدالت کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

مجسٹریٹ نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔ "دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!"

٭٭٭

مجسٹریٹ نے آیندہ پیشی کے لیے پندرہ دن بعد کی تاریخ دی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اتمام حجت تھا ورنہ اصولی طور پر تو پہلی ہی پیشی پر اس کیس کا فیصلہ ہوگیا تھا۔ میں نے جس ڈرامائی انداز میں سیما کے جھوٹ کا پول کھولا تھا اس سے اس کی اصلیت عدالت کی نظر میں واضح ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی تھی کہ سیما نے کسی خاص مقصد کی خاطر ناصر کے ساتھ پیار محبت کا کھیل کھیلا تھا اور اس سازشانہ کھیل کے اختتام پر وہ "مقصد" بھی واضح ہوگیا تھا۔ ناصر اگر سیما کو "سی ویو" لے گیا تھا یا اس سے پہلے وہ اسے قائداعظم کے مزار، عجائب گھر یا دیگر مقامات پر گھمانے پھرانے لے جاتا رہا تھا تو وہ اس میں حق بجانب تھا۔ اس کی نیت میں کوئی فتور یا کھوٹ نہیں تھا کیونکہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ سیما اس سے محبت کرتی ہے۔

عدالت نے پچھلی پیشی پر ناصر کے علاوہ سیما کو بھی ضمانت پر رہا کردیا تھا۔ عدالت کا منشا یہی تھا کہ آیندہ پیشی سے پہلے فریقین باہمی افہام وتفہیم سے اس مسئلے کو کورٹ کے باہر ہی حل کرلیں جسے سادہ زبان میں "راضی نامہ" کہا جاتا ہے۔

مجھے اس کیس کے سلسلے میں مزید کسی نوعیت کی کوئی تیاری نہیں کرنا تھی۔ میں اپنی دانست میں یہ کیس جیت چکا تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ آیندہ پیشی پر استغاثہ میرے موکل کے خلاف کسی قسم کا کوئی مواد مہیا نہیں کرسکے گا لہٰذا پندرہ روز کے بعد تو اس کیس کو لامحالہ خارج ہونا ہی تھا تاہم پھر بھی میں نے امین کو ہدایت کردی تھی کہ اگر مخالف پارٹی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے تو وہ اسے گھیر کر میرے پاس لے آئے۔ جب دو روز گزرنے کے بعد بھی امین میرے پاس نہیں آیا تو میں یہی سمجھا کہ رمضانی بھائی اینڈ کمپنی نے اس سے رابطے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی۔ میں بھی اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ میری سیکریٹری نے مجھے بتایا کہ کوئی مسز نرگس مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ میں نے پوچھا "کیا مسز نرگس کا اپائنٹمنٹ تھا؟"

"نو سر......!" سیکریٹری نے جواب دیا۔

"وزیٹرز کی کیا پوزیشن ہے؟"

"ابھی آخری کلائنٹ آپ سے مل کر گیا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "مسز نرگس کو میرے پاس بھیج دیں۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد نرگس نامی وہ عورت میرے سامنے بیٹھی تھی۔

نرگس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس اور چالیس کے درمیان قائم کیا۔ وہ خوب صورت بدن کی مالک ایک جاذب نظر اور پُرکشش عورت تھی جس نے بوائے کٹ بال رکھے ہوئے تھے۔ اپنے پہناوے اور زیورات سے وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کی خاتون نظر آتی تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے کہا۔ "جی نرگس صاحبہ! فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں......؟"

"بات چیت کے آغاز سے قبل میں دو اہم کام کرنا چاہوں گی۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولی۔

"کون سے دو اہم کام......؟" میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

"نمبر ایک، میں آپ کی تعریف کرنا چاہوں گی۔" وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ "اور نمبر دو، مجھے آپ سے ایک معذرت کرنا ہے......"

"میں آپ کی بات بالکل نہیں سمجھ پایا ہوں مسز نرگس۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "کیسی تعریف اور کون سی معذرت......؟"

"آپ بڑے زبردست وکیل ہیں۔" وہ میری تعریف کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے آپ کا کام دیکھا ہے۔ آپ سونے میں تولے جانے کے قابل ہیں۔"

"یہ تو ہوگئی میری تعریف۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب یہ بھی بتادیں، آپ مجھ سے کس بات کے لیے معذرت کرنے آئی ہیں؟"

"اس بات کی معذرت کہ......" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ "میں نے آپ تک رسائی کے لیے ایک جھوٹ بولا ہے۔"

"کیا مطلب!" میری حیرت دوچند ہوگئی۔ "کیسا جھوٹ......؟"

وہ بہ دستور معنی خیز انداز میں بولی۔ "میں مسز نرگس نہیں ہوں......"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ "پھر......؟"

"میرا نام سلمٰی ہے۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ "مسز رمضانی!"

"اوہ......!" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اگر میں آپ کی سیکریٹری سے اپنا درست تعارف کرادیتی تو مجھے خدشہ تھا، آپ مجھ سے ملنے سے انکار کردیں گے۔" اس نے وضاحت کی۔

"ایسی بات نہیں ہے مسز سلمٰی!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں لوگوں سے ملنے کے لیے ہی بیٹھا ہوں۔ کوئی اپنی پارٹی کا ہو یا فریق مخالف، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"آپ دل کے بھی بہت صاف اور کھلے ڈلے ہیں۔" وہ ایک بار پھر بڑے والہانہ انداز میں میری تعریف کرتے ہوئے بولی پھر اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے بے ساختہ اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے میری جانب بڑھادیا۔

مجھے اس کا یہ عمل عجیب سا تو لگا لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ اسے اپنی انسلٹ کا احساس نہ ہو، میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چند لمحے پہلے مجھے کھلے ڈلے دل کا مالک قرار دے چکی تھی اور اب اس مقابلے میں مجھ پر بڑی بھاری سبقت لے گئی تھی۔ میں نے ابھی تک سلمٰی کا صرف ذکر ہی سنا تھا۔ بالمشافہ بلکہ بالمصافحہ آج پہلی مرتبہ ملاقات ہورہی تھی۔ پچھلی پیشی پر وہ عدالت میں موجود نہیں تھی ورنہ میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بڑی نمایاں اور پُرکشش شخصیت کی مالک تھی۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی بیگ صاحب!" وہ بے تکلفی سے بولی۔

"سیم ٹو یو......" میں نے بھی خوش اخلاقی کے تقاضے نبھاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "تھوڑی دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ آپ نے میرا کام دیکھا ہے جبھی آپ مجھ سے اتنی متاثر ہیں۔ میں پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے کہاں میرا کام دیکھا ہے؟"

"پچھلی پیشی پر آپ نے مجسٹریٹ صاحب کے سامنے جو کام دکھایا ہے، میں اس کی بات کررہی ہوں۔" وہ دلچسپ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی پھر اچانک اپنائیت بھرے لہجے میں بولی۔ "بیگ صاحب! آپ کے آفس میں چائے کافی وغیرہ نہیں ملتی......؟"

وہ زبردستی سوار ہوجانے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کی بے باکی پائی جاتی تھی۔ میں نے فوری طور پر اس کے لیے چائے کا آرڈر دیا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن گزشتہ پیشی پر تو آپ عدالت کے کمرے میں موجود نہیں تھیں، پھر آپ نے میرا کام کیسے دیکھ لیا؟"

"رمضانی صاحب کی آنکھ سے۔" وہ بڑے ناز سے بولی۔ "انہوں نے مجھے آپ کی کارکردگی کی مکمل رپورٹ دے دی تھی۔"

"اوہ......!" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور پوچھا۔ "رمضانی صاحب خود کہاں ہیں؟"

"باہر گاڑی میں بیٹھے ہیں۔" سلمٰی نے بتایا۔

"باہر کیوں!" اس کی بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ "وہ آپ کے ساتھ اندر کیوں نہیں آئے......؟"

"انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "کہہ رہے تھے، میں زیادہ اچھے انداز میں آپ کو ہینڈل کرلوں گی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

”تو آپ مجھے ہینڈل کرنے آئی ہیں۔“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”کیا آپ نے مجھے کوئی مشین وغیرہ سمجھ لیا ہے؟“

”ہاں...... ایک اہم مشین۔“ وہ بڑے اسٹائل سے بولی۔

”میں کچھ سمجھا نہیں مسز رمضانی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی بات میرے اوپر سے گزر گئی ہے......“

”میں سمجھاتی ہوں......“ وہ کسی استانی کے مانند بولی پھر ایک ماہر نرس کی طرح مجھے سمجھانے لگی۔ ”اس دنیا میں صرف دو مشینیں اہمیت کی حامل ہیں......“

”کون سی دو مشینیں؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”نمبر ایک کامیابی دلانے والی مشین۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”نمبر دو، نوٹ چھاپنے والی مشین اور دلچسپ بات یہ ہے کہ......“ لمحاتی توقف کر کے وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی۔

”کامیابی دلانے والی مشین کا ایندھن دوسری مشین تیار کرتی ہے، یعنی نوٹ چھاپنے والی مشین۔ آپ میری بات کا مطلب تو سمجھ رہے ہیں نا؟“

”بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”آپ مجھے ان دونوں میں سے کون سی مشین سمجھ رہی ہیں؟“

”کامیابی دلانے والی مشین!“ وہ نظر کے راستے میری آنکھوں میں گھستے ہوئے بولی۔ ”نوٹ چھاپنے والی مشین تو باہر گاڑی میں بیٹھی ہے......!“

اس کا اشارہ رمضانی بھائی کی طرف تھا۔ اصولی طور پر مجھے سلمٰی سے اتنا زیادہ کھل مل کر باتیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ اس کیس میں مخالف پارٹی کی حیثیت رکھتی تھی لیکن اس نے جس ڈرامائی انداز میں انٹری دی تھی اور اس کے بعد جیسی سنسنی خیز باتیں وہ کر رہی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں اس کی بات پوری توجہ سے سنوں تاکہ اس کے مقاصد کی تہ تک رسائی حاصل کر سکوں۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے، آپ رمضانی صاحب کی دولت میری جیب میں بھر کر اپنے لیے کوئی کامیابی خریدنے آئی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، آپ مجھے خریدنے آئی ہیں؟“

”خریدنے اور بیچنے کے الفاظ بڑے چیپ اور عامیانہ سے ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”بیگ صاحب! میں تو آپ سے ایک ڈیل کرنے آئی ہوں۔“

”کیسی ڈیل؟“ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

وہ اب کھلنے ہی والی تھی۔ میں نے اس سے تعارف حاصل کرنے کے بعد جو اندازہ قائم کیا تھا وہ سو فیصد اس پر پورا اترتی نظر آتی تھی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بڑی گہری نظر سے میرے چیمبر کا جائزہ لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”بیگ صاحب! آپ کا آفس کسی بھی عدالت کے کمرے سے زیادہ پرسکون اور آرام دہ ہے......“

”اس میں کیا شک ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا اس چھوٹے موٹے کیس کا فیصلہ ہم یہاں بیٹھ کر نہیں کر سکتے؟“

”کیوں نہیں کر سکتے!“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”میں نے ابتدا میں یہ بات امین سے کہی بھی تھی کہ وہ رمضانی بھائی کو اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آجائے۔ لیکن شاید آپ لوگوں کے بیچ رابطہ نہیں ہو سکا۔“

”وہ گدھے کا بچہ ہے۔“ سلمٰی برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اس میں اتنی عقل کہاں......؟“

امین کے لیے اس نے ”گدھے کا بچہ“ کے الفاظ استعمال کیے تھے جس سے اس کی نفرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کے خیالات پر کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور بڑی رسان سے کہا۔

”اچھا ہوا آپ میرے پاس آگئیں۔ آیندہ پیشی سے پہلے ہم یہیں پر ایک جوائنٹ میٹنگ رکھ لیتے ہیں۔ میں امین کو بھی بلوا لیتا ہوں۔ انشاء اللہ! اگلی پیشی پر یہ کیس خارج ہو جائے گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا......!“

”آپ نے جس شخص کو بلوانے کی بات کی ہے نا، مجھے اس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں۔“ وہ قدرے برہمی سے بولی۔ ”اور آیندہ میٹنگ کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ کے پاس آگئی ہوں۔ جو بات بھی طے کرنا ہے، ہم آپس میں مل کر طے کر لیتے ہیں۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے مسز رمضانی!“ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔ ”کسی بھی قسم کی مصالحت کے لیے دونوں پارٹیوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔“

”مصالحت کا لفظ آپ نے بہت اچھا استعمال کیا ہے بیگ صاحب!“ وہ اپنے پیور لیدر بیگ کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اس کے لیے امین کی موجودگی ضروری نہیں۔ یہ مصالحت ہم دونوں کے بیچ بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ آپ اس کیس کو میری مرضی کے مطابق ٹوئسٹ دیں......“ وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اور میں آپ کی مرضی کے مطابق چیک لکھ دیتی ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی مسز سلمٰی نے اپنے قیمتی ہینڈ بیگ میں سے چیک بک اور پین برآمد کر لیا۔ مجھے اس کا یہ انداز سخت ناگوار گزرا۔ وہ سیدھا سیدھا اپنی دولت کے بل پر مجھے خریدنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ امین کے لیے اس کے دل و دماغ میں موجود نفرت مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ یقیناً وہ مجھے کوئی تگڑی رقم آفر کر کے امین کو کسی چکر میں پھنسانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن ظاہر ہے، میں کوئی بکاؤ مال نہیں تھا تاہم میں نے اس کھیل میں ڈراپ سین تک اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ چیک بک تو بیگ میں سے باہر آہی گئی تھی، یہ دیکھنا بھی ضروری تھا کہ بلی تھیلے میں سے کب باہر آتی ہے۔

”میں سمجھا نہیں......“ اس کی بات کے جواب میں، میں نے کہا۔ ”آپ کون سے ٹوئسٹ کی بات کر رہی ہیں؟“

وہ میز پر تھوڑا سا آگے کو جھک آئی پھر رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ”کیس کی موجودہ صورت حال تو یہی ظاہر کرتی ہے کہ اگلی پیشی پر عدالت اس کیس کو خارج کر دے گی لیکن میں ایسا نہیں چاہتی......“ وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لیے رکی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کیس کے اندر کوئی ایسا ٹوئسٹ ڈالیں کہ مزید پانچ دس پیشیوں تک یہ کیس چلتا رہے اور ان دونوں بھائیوں کو رگڑا لگتا رہے......“

سیما کو رگڑا لگانے کی بات ابتدا میں امین نے بھی کی تھی لیکن اس کی خواہش میں وقتی غصے کا عکس تھا جبکہ سلمٰی جس خواہش کا اظہار کر رہی تھی اس میں بڑی معاندانہ شدت پائی جاتی تھی۔

میں نے چوہے بلی کا کھیل جاری رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اگرچہ آپ کی مخالف پارٹی کا وکیل ہوں، اصولی طور پر مجھے آپ کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہیے لیکن آپ کی پیشکش کو نظرانداز کرنا بھی عقل مندی نہیں ہوگی۔“

”اور آپ ایک عقل مند وکیل ہیں۔“ وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وکیل جس پارٹی سے فیس لیتا ہے اسی کی وکالت کرتا ہے۔ آپ نے امین سے فیس پکڑی، اس کے بھائی کی وکالت کی اور اسے بے قصور ثابت کر کے دکھا دیا۔ سمجھیں کہ آپ کا کام ختم ہو گیا گویا آپ نے فیس حلال کر دی۔ اب آپ یوں سمجھیں کہ ناصر سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں رہا اور......“

”میں ایسا کیسے سمجھ سکتا ہوں۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”جب تک یہ کیس عدالت میں ہے، میں ناصر کا وکیل ہوں اور اس کے حق کا تحفظ کرنا میری ذمے داری ہے۔“

”آپ نے اپنی ذمے داری پوری کر دی ہے بیگ صاحب!“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ”آپ کا موکل ضمانت پر رہا ہو کر آزاد گھوم رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں، آج کے بعد آپ میرے وکیل کا کردار ادا کریں۔ میں آپ کو اس سے دوگنی فیس ادا کروں گی جو امین نے آپ کو دی تھی۔“

”آپ کے وکیل کا کردار......!“ میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی الجھن طاری کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے اپنے کیس کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں......؟“

”کیس وہی ہے سیما والا......“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے عرض کیا ہے نا، آپ نے اس کیس میں کوئی ایسا پیچ ڈالنا ہے کہ دو تین ماہ تک مزید امین عدالت کے چکر کاٹتا رہے۔ مجھے ناصر سے کوئی عداوت نہیں ہے بیگ صاحب...... میں بس، امین کو ذلیل و خوار ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں۔“

اس کے دل کی بات من و عن زبان تک آگئی تھی۔ اس کے بارے میں میرے تمام تر اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ اس کمبخت منتقم المزاج عورت نے اپنے دلی جذبات کی تسکین کے لیے سیما کو بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ اس کا اصل ٹارگٹ، اس کا سابق شوہر امین تھا۔ یہ سچ ہے کہ انتقام کا جذبہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ امین نے سلمٰی کی بدزبانی سے تنگ آکر اسے طلاق دے دی تھی۔ وہ اپنی اسی انسلٹ کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ پہلے اس نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت سیما کو اس خطرناک کھیل میں کسی مہرے کے مانند آگے بڑھایا اور جیسے ہی دیکھا کہ میری وکالت نے اس کا مہرہ پیٹ ڈالا ہے تو وہ مجھے خریدنے کے لیے پوری آب و تاب کے ساتھ خود میدان میں اتر آئی تھی۔ یہ تو کسی بھی قیمت پر ممکن نہیں تھا کہ میں اس نامعقول عورت کے ہاتھ کا کھلونا بن جاتا، البتہ اسے اندھیرے میں رکھ کر اپنا کام نکالنے کی ضرورت تھی تاکہ جب تک عدالت اس کیس کو خارج نہیں کر دیتی، سلمٰی کی مزید ان دیکھی فتنہ پردازیوں سے محفوظ رہا جا سکے۔

میں نے مصنوعی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا۔ ''کیس کے اندر میں ٹوئسٹ تو ڈال دوں گا مگر......!''

''مگر کیا؟'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔

''ڈبل فیس والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی......؟''

''اگر یہ کم ہے تو میں زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں نہیں جانتی، آپ کی فیس کتنی ہے میں آپ کو ایک بلینک چیک دے دیتی ہوں۔ میرے اس اکاؤنٹ میں کم از کم دو لاکھ روپے موجود ہیں۔ چیک کے اندر رقم آپ اپنی مرضی سے بھر لیجیے گا لیکن کام میرے حسب منشا ہونا چاہیے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر نفرت بھرے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''آپ نے کیس کے مختلف حصوں میں ایسا مرچ مسالا بھرنا ہے کہ کیس ختم ہونے کے بعد کئی سال تک امین اپنے جسم کے ریشے ریشے میں جلن محسوس کرتا رہے......''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مرچ مسالے کے سلسلے میں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''انشاء اللہ! میں بھی زندگی بھر آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔'' وہ بلینک چیک میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے دونوں طرف دستخط کر دیے ہیں۔ آپ اپنی مرضی کی رقم بھر کر یہ چیک کیش کرا لیجیے گا اور...... اکاؤنٹ کی لسٹ تو میں نے آپ کو بتا ہی دی ہے۔''

''وہ لسٹ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ مطمئن رہیں، میں آپ کی دی ہوئی لسٹ کو کراس نہیں کروں گا......''

اس نے بڑے جوش و خروش سے میرا شکریہ ادا کیا پھر ایک دل آویز مسکراہٹ میری جانب اچھال کر وہ دفتر سے رخصت ہو گئی۔

یہ میری مسز رمضانی یعنی سلمیٰ سے پہلی ملاقات تھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہو رہا کہ اس عورت کے پاس دولت حسن بھی تھی اور دولت دنیا بھی اور...... اس نے مجھے اپنا ہم نوا بنانے کے لیے یہ دونوں دولتیں خرچ کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

ꕥꕥꕥ

منظر اسی عدالت کا تھا اور مجسٹریٹ کرسی انصاف پر پورے طمطراق کے ساتھ براجمان تھا۔ جب تمام متعلقہ افراد حاضر ہو چکے تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مجسٹریٹ نے حاضرین پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وکیل صاحب! آپ پچھلے پندرہ دن میں ملزم ناصر کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں تو اسے عدالت میں پیش کیا جائے۔''

میں جانتا تھا۔ پندرہ دن کیا، اگر اس کام کے لیے استغاثہ کو پندرہ ماہ کا وقت بھی دیا جاتا تو وہ ناکام ہی رہتا۔ وکیل استغاثہ نے بڑے بھونڈے انداز میں گزری ہوئی باتوں کو دہرانے کی کوشش شروع کی ہی تھی کہ مجسٹریٹ نے اسے ابتدائی مرحلے پر ہی روک دیا اور قدرے درشت لہجے میں کہا۔

''اگر آپ نے پچھلی باتوں کو دہرا کر عدالت کا وقت ہی خراب کرنا ہے تو پھر عدالت اس کیس کو خارج کرنے پر مجبور ہو جائے گی......''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''اگر معزز عدالت مزید دس دن کی مہلت دے تو ملزم کے خلاف ٹھوس شواہد حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''گزشتہ پندرہ دن میں آپ کی کارگزاری کیا رہی؟'' مجسٹریٹ نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اس سے پہلے ریمانڈ کے سلسلے میں بھی عدالت نے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔ جب ان پچیس دنوں میں ملزم کے خلاف ایسی کوئی بھی جاندار بات سامنے نہیں لائی جا سکی جس پر عدالت کی کارروائی کو آگے بڑھایا جا سکے تو مزید دس دن میں کیا ہو جائے گا......؟''

''جناب عالی!'' وہ مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ''پولیس کو بعض معاملات کی چھان بین کے لیے مناسب وقت درکار ہوتا ہے۔ میری معزز عدالت سے التماس ہے کہ اس کیس کو ڈسس کرنے میں عجلت سے کام نہ لیا جائے۔''

''عجلت......! مجسٹریٹ نے حیرت بھری نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ ''آپ اسے عجلت کا نام دے رہے ہیں۔ معزز عدالت نے پچھلی پیشی پر آپ کو پندرہ دن کی مہلت محض اس لیے دی تھی کہ انصاف کے تقاضے پورے ہونے میں کوئی کمی باقی نہ رہ جائے لیکن آپ اپنی کوشش میں بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔''

مجسٹریٹ کی ان سچی اور کھری باتوں کے جواب میں وکیل استغاثہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اور وہ خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

مجسٹریٹ نے میری جانب دیکھا اور استفسار کیا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو اس سلسلے میں کچھ کہنا ہے......؟''

اس روز مسز سلمیٰ بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھی اور اس کی نظر مجھی پر لگی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ اپنے بلینک چیک کی تاثیر دیکھنے کی منتظر تھی۔ جب میں عدالت کی طرف آ رہا تھا تو باہر راہ داری میں میرا اس سے سامنا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے چیک کیش نہیں کرایا؟'' سلمیٰ کے اس سوال کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس نے عدالت آنے سے پہلے بینک جا کر اپنے اکاؤنٹ کا احوال معلوم کر لیا تھا جبھی اس کے استفسار میں حیرت کی آمیزش تھی۔ وہ تو توقع کر رہی ہوگی کہ میں اس کے دیے ہوئے بلینک چیک سے پہلی فرصت میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ جب میں نے ایسی کوشش نہیں کی تو اسے اچنبھا ہونا ہی تھا۔ میں اس کے سوال کا جواب دیے بغیر عدالت کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا اور عدالت کے اندر بھی میں نے ایک مرتبہ بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ میرا یہ رویہ اس کی ذہنی کیفیت میں ہیجان برپا کرنے کے لیے کافی تھا۔

مجسٹریٹ کے استفسار کے جواب میں، میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یور آنر! سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے...... حقیقت جو بھی ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ اگر موجودہ حالات و واقعات کی روشنی میں دیانت داری کی نگاہ سے دیکھا جائے تو میرا موکل سراسر بے قصور اور بے گناہ دکھائی دیتا ہے۔ استغاثہ کے جھوٹ کی قلعی کھل چکی ہے۔ اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ ملزم ناصر کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! یہ بات ہر انداز سے کھل چکی ہے کہ استغاثہ کی پشت پر جس پولیس کا ہاتھ ہے وہ بھی اس سازش میں پوری طرح ملوث ہے۔ پولیس اور استغاثہ کے تمام تر دعوے عدالت میں ریت کی دیوار ثابت ہو چکے ہیں۔ میرے موکل کو اس دوران میں جس کوفت اور ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا اس کا مداوا بھی ضروری ہے۔ اس کیس میں الجھنے کے باعث ملزم کی نیک نامی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اس کے ورثا کو جو مالی اور جذباتی نقصان اٹھانا پڑا وہ الگ ہے۔ میں اپنے موکل کے لیے معزز عدالت سے پرزور ہمدردی کی اپیل کرتا ہوں......''

بات ختم کر کے میں نے کن انکھیوں سے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ کینہ توز نظر سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کا اگر بس چلتا تو مجھے کچا ہی چبا ڈالتی۔ وہ مجھے بلینک چیک تھما کر مطمئن ہو گئی تھی اور اس یقین کے ساتھ آج عدالتی کارروائی دیکھنے آئی تھی کہ میں ملزم کے بھائی امین کی راہ میں بارودی سرنگیں بچھا ڈالوں گا لیکن جب میری جانب سے اس نے کیس کے اندر کوئی ٹوئسٹ پیدا ہوتے نہیں دیکھا تو پہلے وہ حیران ہوئی پھر اس کی حیرانی پریشانی میں بدل گئی اور اب تو مجھے اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نظر آ رہے تھے جیسے عدالت کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ اپنے خطرناک ناخنوں سے میرا چہرہ ادھیڑ ڈالے گی۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ عدالت کے کمرے کے اندر میرے خلاف کسی بھی حوالے سے زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ وہ کہتی بھی تو کیا کہتی...... یہ کہ اس نے کیس کا پانسا پلٹنے کے لیے مجھے رشوت میں ایک بلینک چیک دیا تھا۔ اگر وہ اس حوالے سے منہ سے ایک لفظ بھی نکالتی تو اگلے ہی لمحے وہ اکیوزڈ باکس میں کھڑی نظر آتی۔

میری پرزور اور ہمدردانہ اپیل کے جواب میں مجسٹریٹ نے کہا۔ ''عدالت کو ملزم ناصر کی پوزیشن اور حیثیت کا پوری طرح خیال ہے لہٰذا وہ اسے اس کیس سے باعزت بری کرتے ہوئے کیس کو خارج کرتی ہے......''

''تھینک یو یور آنر!'' میں نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''میں عدالت کے اس مبنی بر انصاف و عدل کے فیصلے کا خیر مقدم کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی معزز عدالت سے میری ایک چھوٹی سی استدعا ہے۔''

مجسٹریٹ نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ مزید کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''یور آنر!'' میں نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ''میرے موکل نے گرفتاری سے لے کر اب تک جس ذہنی اذیت اور معاشرتی خفت کا سامنا کیا ہے اس کا بروزن ازالہ تو ممکن نہیں مگر میں چاہوں گا کہ استغاثہ کی جانب سے ملزم کو معقول ہرجانہ ادا کیا جائے تاکہ اس کے زخموں پر مرہم لگایا جا سکے...... دیٹس آل یور آنر......!''

مجسٹریٹ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کسی بھی شخص کو قانوناً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی عزت کو اچھالے اور کسی جھوٹے مقدمے میں کسی کو عدالت میں گھسیٹے لہٰذا یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ اس کیس نے ناصر کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی ہے، عدالت استغاثہ کے توسط سے سیما کے والدین کو اس بات کا پابند کرتی ہے کہ وہ ہتک عزت کے زمرے میں ناصر کو مبلغ بیس ہزار روپے سکہ رائج

WWW.PAKSOCIETY.COM

الوقت پاکستان بہ طور ہرجانہ ادا کریں۔ عدالت کے اس حکم پر فوری عمل درآمد کیا جائے......"

مجسٹریٹ کے اس دوٹوک اور حتمی فیصلے کے بعد استغاثہ اور سیما کے والدین میں سے کسی کو کوئی اعتراض اٹھانے یا کوئی جواز پیش کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اس حکم عدالت کو سن کر استغاثہ پارٹی کے تمام ارکان کے چہرے پھس ہونے والے غبارے کے مانند لٹک گئے تھے۔ بہ الفاظ دیگر انہیں اس کیس میں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ سلمٰی کی حالت دیدنی تھی۔ میں نے ان آخری مراحل پر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا ضروری سمجھا۔

سلمٰی اور رمضانی وکیل استغاثہ کی درخواست پر فوراً ہرجانے کی ادائیگی کے پروسیس میں لگ گئے۔ اس کا ایک باقاعدہ قانونی طریقۂ کار ہوتا ہے۔ کچھ ضروری قسم کی کاغذی کارروائی کرنا ہوتی ہے۔ بہرحال، آدھے گھنٹے میں یہ مرحلہ مکمل ہوگیا۔

میں نے کوشش کی تھی کہ عدالت کے کمرے سے باہر نکلتے وقت امین کے ساتھ رہوں تاکہ سلمٰی کے کسی جذباتی اٹیک سے محفوظ رہ سکوں۔ وہ مجھ پر بہت زیادہ ادھار کھائے بیٹھی تھی۔

پارکنگ تک میں امین اور ناصر سے باتیں کرتے ہوئے پہنچ گیا۔ جب میں انہیں رخصت کرکے اپنی گاڑی کی جانب بڑھا تو پتا نہیں، کہاں سے مسز سلمٰی آندھی کے مانند نکل کر میرے سامنے آگئی۔ میں اسے اچانک اپنے روبرو دیکھ کر چونک اٹھا۔

وہ طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "بیگ صاحب! اب یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی ہے کہ آپ نے اتنے دن میں میرا دیا ہوا وہ چیک کیش کیوں نہیں کرایا تھا۔ آپ کی نیت میں پہلے سے فتور موجود تھا یا میں نے آپ کی قیمت کم لگائی تھی۔ آپ مجھے بتا دیتے، میں آپ کو خریدنے کے لیے دو لاکھ سے زیادہ بھی دے سکتی تھی۔"

میں نے اس کی ترش کلامی کے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "مسز سلمٰی! آپ شدید نوعیت کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہر انسان کو خریدنا ممکن نہیں ہوتا۔"

میں نے کوشش کرکے اپنے لہجے کو نارمل اور مہذب رکھا تاکہ وہاں کوئی نیا تماشا نہ لگ جائے۔ سلمٰی چوٹ کھائی ہوئی ایک زخمی ناگن تھی، وہ بپھر جاتی تو کوئی نیا ہنگامہ کھڑا ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی اس کی بدکلامی و بدزبانی کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔

وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ آپ کی نیت میں شروع ہی سے فتور تھا۔ آپ نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے وہ چیک لے کر اپنے پاس رکھ لیا تھا......؟"

"آپ بار بار چیک کا ذکر کر رہی ہیں تو اتنا بتا دوں......" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ کا دیا ہوا وہ بلینک چیک جوں کا توں میری میز کی دراز میں رکھا ہے۔ کبھی سٹی کورٹ آنا ہو تو میرے آفس کا ایک چکر لگا لیجیے گا، آپ کا چیک میں واپس کردوں گا۔ آج تشریف لانا چاہیں تو چار بجے کے بعد میں آپ کو آفس ہی میں ملوں گا......"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ کے آفس آنے یا آپ سے ملنے کا۔" وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرے پاس ایسے کاموں کے لیے فالتو ٹائم نہیں ہے۔"

"لیکن وہ بلینک چیک......؟" میں نے چٹکی لینے والے انداز میں کہا۔

"اب وہ ردی کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔" وہ حقارت آمیز لہجے میں بولی۔ "میں نے بینک جا کر اس چیک کو کینسل کرا دیا ہے......"

"میں آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں......"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پاؤں پٹخ کر جانے لگی۔ میں نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ "مسز سلمٰی! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میں نے آپ کی فرمائش پوری کردی ہے۔"

وہ رکی اور گردن گھما کر عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ "کون سی فرمائش......؟"

"مرچ مسالا لگانے والی فرمائش......!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کی خوشی کی خاطر اس کیس میں مرچ مسالا بھرنے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن مجھ سے ایک غلطی ہوگئی......"

"کیسی غلطی؟" اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

"یہ غلطی کہ میں نے اس مرچ کاری کا کام آپ کے ہاتھوں سے کرا ڈالا۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "اور نادانستگی میں آپ سے چوک یہ ہوگئی کہ مرچ والا ہاتھ آپ نے اپنی آنکھوں میں لگا لیا...... یہ ساری جلن اسی وجہ سے ہے......"

"اونہہ......!" اس نے مجھ پر ایک غصیلی نگاہ ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف بڑھ گئی۔

میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔

(تحریر حُسام بٹ)

نشانیاں مٹانے والے ایک مکار چور کی بے وقوفی

علی بابا، چالیس چور... اگرچہ فارمولا پرانا اور وہی دلچسپ کردار... اور مقصد بھی وہی کہ اصل مجرم تک کیسے پہنچا جائے... یہاں ایک بہت بڑی واردات مجرم کی ہوشیاری کے سبب سب کے لیے ایک چیلنج بن گئی تھی... بس ایک ذرا سی چوک نے سب کو چونکا دیا... مغرب کی یہی ایک خوبی دل کو بھاتی ہے کہ وہاں قانون بے بس نہیں ہے۔

نشان

سلیم انور

فرینکی نے اپنے سیکیورٹی گارڈ یونیفارم کے کالر کو درست کیا اور ڈائمنڈ ڈیلکس کے عقبی کارنر میں دوبارہ اِدھر سے اُدھر ٹہلنا شروع کردیا۔

نیم روشن اسٹور کے وسط میں شیشے کے کیس میں رکھا ہوا لنڈیک یاقوتی آویزہ پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔

فرینکی کو اس یاقوت اور اس سے وابستہ حکایات سے بہ خوبی آگاہی تھی۔ یہ لنڈیک یاقوت شہر بھر کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس ہیرے کا تعلق کئی صدیوں پہلے سے تھا۔ ایک حکایت یہ تھی کہ یہ یاقوت ایک بے حد خوب صورت شہزادی کی ملکیت تھا۔ اس شہزادی کی شادی سے ایک روز قبل کسی نے وہ یاقوت چرا لیا تھا۔ شہزادی کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے اپنی شادی منسوخ کردی اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اسی غم اور پریشانی کے عالم میں اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

فرینکی نے سنا تھا کہ اسٹور کے مالک نے اس یاقوت کے ڈسپلے کے ذریعے اضافی شہرت حاصل کرنے کی خاطر یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

یاقوت چند دنوں کے لیے مستعار لیا تھا۔ تین روز قبل اس ہیرے سے متعلق خبریں اخبارات کے صفحۂ اول کی زینت بن گئی تھیں جب کسی چور نے اسے چرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

فرینکی نے یہ داستان مقامی اخبارات میں پڑھ لی تھی۔ پولیس کے مطابق وہ چور اسٹور کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے مکمل سیاہ لباس، سیاہ عینک اور سیاہ رنگ کے بھاری جوتے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے شیشے کے ڈسپلے کیس کو ایک وزنی پتھر سے توڑ دیا تھا جس میں وہ اینٹیک یاقوت رکھا ہوا تھا۔ فوراً ہی الارم بجنا شروع ہو گیا تھا اور وہ چور ہیرا چرائے بغیر ڈر کے مارے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اگلے روز صبح شہر کے ریسٹورنٹس اور کافی شاپس میں مقامی افراد ایک دوسرے کو نت نئی کہانیاں سنا رہے تھے۔ کئی ایک کا کہنا تھا کہ انہوں نے رات گئے اس روبی چور کو اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک عورت نے قسم کھا کر کہا کہ وہ چور اچانک اچھل کر اس کی کار کے سامنے آ گیا تھا اور پھر دوڑتا ہوا درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا تھا۔ ایک اور عورت نے بتایا کہ اس نے اس روبی چور کو ایک ہیئر ڈریسنگ شاپ میں تاک جھانک کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

آج فرینکی کی اس اسٹور میں ڈیوٹی کی پہلی رات تھی اور اس چھوٹے سے شہر میں ہونے والی اس سنسنی خیزی نے فرینکی کو بھی متاثر کیا ہوا تھا۔ وہ اس اسٹور کے فرش پر چوکنے انداز میں ٹہل رہا تھا۔

اس نے الارم، سیکیورٹی کیمرے، سینسرز اور نئے ڈسپلے کیس کا بہ خوبی جائزہ لینے کے بعد دوبارہ ٹہلنا شروع کر دیا۔

وہ اس یاقوت کے حسن دل پذیر سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اسے اس خوب صورت ہیرے کے بیش قیمت ہونے کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ وہ یقینی طور پر کسی عام جوہری کے پاس فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا بہ آسانی سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ اگر اسے چرایا جاتا تو پھر اسے زیرِ زمین ہی فروخت کیا جا سکتا تھا۔

فرینکی نے ڈسپلے کیس کے نزدیک جا کر اس یاقوتی آویزے کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور اسے چند لمحوں تک ستائشی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر دوبارہ ٹہلنا شروع کر دیا۔

اسٹور کے داخلی حصے کے سامنے موجود دوسرے گارڈ نے فرینکی کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو فرینکی نے ہاتھ لہراتے ہوئے اسے سب ٹھیک ہے کا اشارہ کیا۔ فرینکی کو یہ بھی معلوم تھا کہ دو پولیس افسران اس اسٹور کی حفاظت کے لیے تعینات ہیں لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں کیونکہ وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ڈائمنڈ ڈیلکس نامی اس اسٹور کے سیکیورٹی پلان کے مطابق خود وہ اور دوسرا گارڈ اس طرح ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے کہ سب کی نظروں کے سامنے رہیں اور سب کو نظر آتے رہیں جبکہ پولیس جس کے پاس اسلحہ بھی تھا، وہ نظروں سے اوجھل تھی۔

طے یہ ہوا تھا کہ اگر فرینکی کی کوئی مشتبہ بات دکھائی یا سنائی دے تو وہ فوراً چھپ جائے اور پھر موقع ملتے ہی چور پر اچانک حملہ کر دے۔

اخبارات نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ یاقوت چور آج کی رات پھر قسمت آزمائی کرے گا۔ پولیس کو یقین تھا کہ وہ چور کوئی آوارہ گرد ہے اور مقامی نہیں لگتا۔ اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو سکے گا وہ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے گا۔

اچانک فرینکی کو ایسا لگا جیسے اس نے انگوٹھیوں والے کاؤنٹر کے نزدیک کسی سائے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ فوراً ہی تیزی سے دبک گیا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ خود اس کا اپنا سایہ تھا۔ اسے مزید احتیاط سے کام لینا ہو گا۔

فرینکی اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی سیکیورٹی پوزیشن پر واپس آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سامنے لاتے ہوئے اپنی کمر سیدھی کی اور محتاط نگاہوں سے ڈسپلے کیس میں رکھے ہوئے یاقوت کو دیکھنے لگا۔

وہ خود کو ساکت رکھنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کے کان پر زخم کے نشان میں کھجلی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ زخم کا نشان پچھلے دنوں سے اسے تنگ کر رہا تھا۔ شاید یہ ذہنی تناؤ کا نتیجہ تھا۔ یہ زخم اسے ماضی میں اسی قسم کے کام کے دوران لگا تھا۔ وہ ایک خطرناک کام تھا اور وہ اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

فرینکی نے اپنی کلائی کی گھڑی پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ نصف شب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔

تب اسے اسٹور کے داہنے حصے سے ایک کھٹکا سا سنائی دیا۔ وہ فوراً ہی ڈسپلے کیس کے بائیں جانب کاؤنٹر کے نیچے دبک گیا۔ مدھم روشنی میں اسے ایک دراز قامت آدمی دکھائی دیا۔ اس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے بھاری بوٹ بھی سیاہ رنگ کے تھے لیکن اس نے کوئی سیاہ عینک نہیں پہنی ہوئی تھی۔ وہ شخص قدرے جھک کر دبے پاؤں چل رہا تھا۔

فرینکی بہ دستور کاؤنٹر کے پیچھے دبکا رہا۔

وہ دراز قامت دبے پیروں چلتا ہوا شیشے کے اس ڈسپلے کیس کے پاس پہنچ کر رک گیا جس میں وہ اینٹیک یاقوت رکھا ہوا تھا۔ اس شخص نے جھک کر اپنی جیب میں سے ایک چابی نکالی اور اسے ڈسپلے کیس کے تالے میں داخل کر کے چابی گھما دی۔

تالا ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔

تب اس شخص نے نہایت احتیاط کے ساتھ شیشے کے کیس کو دھیرے دھیرے اوپر اٹھا کر قریبی کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ پھر پلٹ کر اس نایاب یاقوت کو اٹھانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ فرینکی نے اسے للکارا۔ ”رک جاؤ!“ ساتھ ہی وہ عقب سے اس شخص پر جھپٹ پڑا۔

پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئے۔ اچانک فرینکی نے موقع پاتے ہی اس دراز قامت کے پیٹ میں ایک گھونسا جڑ دیا۔ وہ دراز قامت زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ فرینکی نے آس پاس کا جائزہ لیا لیکن اسے کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیا۔

اسٹور میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

فرینکی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے وہ اینٹیک یاقوتی آویزہ جھپٹ لیا اور اسے اپنی قمیص کے اندر چھپا لیا۔

یہ اس کے پلان کا حصہ نہیں تھا لیکن اس کے نیکلی نے اس کا کام زیادہ آسان کر دیا تھا...... بے حد آسان!

اب اسے بس یہ کرنا تھا کہ دوسروں کو یہ بتائے کہ اس چور کا ایک اور پارٹنر بھی تھا جو وہ یاقوتی آویزہ لے کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

پھر وہ دبے پاؤں اس عقبی دروازے کی جانب چل دیا جہاں اس کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ اس نے خاموشی کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔

دروازے کے کھلتے ہی تیز روشنی نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نصف درجن پولیس افسران اور مقامی اخبارات کے فوٹوگرافرز نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

”وہیں رک جاؤ!“ پولیس کے چیف افسر نے اسے للکارا۔ پھر لپک کر اس کی قمیص کے اندر سے وہ اینٹیک یاقوتی آویزہ نکالتے ہوئے بولا۔ ”ہر کوئی دیکھ لے۔ لگتا ہے ہم نے روبی چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔“

”نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ فرینکی نے چیختے ہوئے کہا۔ ”اس روبی چور کو میں نے ابھی ابھی پکڑا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ چور میں ہوں۔“ سیاہ لباس والے نے فرینکی کے عقب سے نکل کر سامنے آتے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہی وہ چور ہے۔“ فرینکی نے اس سیاہ لباس میں ملبوس دراز قامت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

”جب تم نے سیکیورٹی گارڈ کی ملازمت کے لیے درخواست دی تھی تو ہم جان گئے تھے کہ وہ روبی چور تم ہی ہو۔“ اس دراز قامت نے اپنے سیاہ لباس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا در پردہ کام تھا جس کا مقصد تم پر نظر رکھنا مقصود تھا۔“

فرینکی نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ روبی چور تم ہو!“

”ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔“ انڈر کور افسر نے فرینکی کو ہتھکڑیاں پہناتے ہوئے کہا۔ ”مقامی اخبارات میں تمام مبالغہ آمیز تشہیر تمہارے فائدے کے لیے تھی۔ البتہ ہم نے ایک کلیو چھوڑ دیا تھا۔ اس رات جس کسی نے بھی روبی آویزہ چوری کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے کیمرے سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ لیکن جب اس نے فرار ہوتے وقت اپنا چہرہ گھمایا تھا تو ہمیں اس کی ایک جھلک دیکھنے کو مل گئی تھی جس میں اس کے کان پر زخم کا ایک نشان تھا۔ چونکہ کیمرا پرانا تھا اس لیے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ واقعی کسی زخم کا نشان تھا یا فلم پر کسی دھبے کا نشان تھا۔“

فرینکی نے افسوس کے انداز میں سر ہلا دیا۔ اس نے ایک بھرپور انڈر کور پلان تیار کیا تھا...... لیکن اس پلان کو ایک اور انڈر کور ایجنٹ نے تباہ کر دیا تھا۔

”اسٹور کے مالک نے اس وقت فوری طور پر تمہارے کان کے زخم کے نشان کو نوٹ کر لیا تھا جب تم نے سیکیورٹی گارڈ کے لیے درخواست دی تھی۔ پھر ہم نے تمہارے بارے میں کچھ چیکنگ بھی کی۔ پتا چلا کہ تم جواہرات کی دیگر چوریوں کی وارداتوں میں بھی مطلوب ہو۔ ہم جب سے تم پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ بلکہ پورا شہر تمہیں اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔“ اس افسر نے فوٹوگرافر کو اشارہ کیا تو اس نے فرینکی کی تصویریں اتارنا شروع کر دیں۔ ”لگتا ہے کہ اس مرتبہ اخبارات میں تمہارے بارے میں خبریں آخری مرتبہ شائع ہوں گی۔“

فرینکی سر جھکائے پولیس کار کی جانب چل پڑا۔ اب اس کے کان کے زخم میں کھجلی شدت اختیار کر چکی تھی۔ وہ بے ساختہ اپنا کان کھجانا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر ہتھکڑیوں میں بند تھے۔

وہ تلملا تا رہ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

محفلِ شعروسخن

❋ محمد امجد ریاض......چیچہ وطنی
روشن چہرہ، بھیگی زلفیں، کس کو کس پر ترجیح دوں
ایک قصیدہ رات کا لکھوں، ایک غزل بارش کے نام

❋ محمد جاوید شبیر بربرہ......علی پور، مظفر گڑھ
جس دن سے اپنا طرز فقیرانہ چھٹ گیا
شاہی تو مل گئی دل شاہانہ چھٹ گیا
دنیا تمام چھٹ گئی پیمانے کے لیے
وہ مے کدے میں آئے تو پیمانہ چھٹ گیا

❋ عاصم اقبال جسپال......جیل سرگودھا
میری زندگی ہے سوکھے ہوئے پتوں کی طرح
کسی نے سمیٹا بھی تو جلانے کے لیے

❋ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

❋ گل ناز رئیس......گلستان جوہر، کراچی
گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

❋ سعید عباسی......بہاولپور
سنا ہے ٹوٹے ہوئے ساز خوب بجتے ہیں
بڑے خلوص سے دل کا رباب لایا ہوں

❋ تفسیر عباس بابر......اوکاڑہ
زخموں کا کاروبار کرتے رہے
ہم تو کانٹوں سے بھی پیار کرتے رہے
ایسے بھی لوگ تھے جو ہم سے وفا کی جنس!
نقد لیتے رہے ادھار کرتے رہے

❋ رزاق شاہد کوہلہ......ڈیرہ اسمٰعیل خان
دیکھو سورج ڈھلنے لگا ہے
سایا قد سے نکلنے لگا ہے
میں بھی پیار سے آگیا عاجز
وہ بھی آنکھ بدلنے لگا ہے

❋ وحید عباسی......بہاولپور
زخموں کے باوجود میرا حوصلہ تو دیکھ
تو ہنس دیا تو میں بھی تیرے ساتھ ہنس دیا

❋ نوید عباسی......بہاولپور
دھڑکتا ہے دل یہ نظر فریاد کرتی ہے
دل حوصلہ نہیں پاتا محبت یاد کرتی ہے

❋ احسان سحر......میانوالی
اس دل کے چند اثاثوں، اک موسم ہے برساتوں کا
اک صحرا ہجر کی راتوں کا، اک جنگل وصل کے خوابوں کا
اس چودھویں رات کے سائے میں جب آخری بار ملے تھے ہم
پاگل دل کب بھولتا ہے وہ باغ سفید گلابوں کا

❋ طاہرہ یاسمین......سرگودھا
نظر میں کوئی سمایا جو خواب کی صورت
مہک اٹھی مری ہستی گلاب کی صورت

❋ محمد بشارت......کنگر دودرہ
نظر نظر بیقرار سی ہے نفس نفس پر سرار سا ہے
میں جانتا ہوں کہ تم نہ آؤ گے پھر بھی کچھ انتظار سا ہے

❋ گلزار خان درویش......شانگلہ، سوات
یہ حسن، یہ ادا، یہ نزاکت، یہ بانکپن
سب خوبیاں ہیں تجھ میں مگر بے وفا تو ہے

❋ توصیف احمد......پٹھان کالونی، کراچی
ٹک میر، جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا چراغِ سحری کا

❋ اظہر حسین پچار......ہزاری، جتوئی
حسین سانپ کے نقش ونگار خوب سہی
نگاہ زہر پہ رکھ خوشنما بدن پہ نہ جا

❋ رضوان تنولی کریڑوی......اورنگی ٹاؤن، کراچی
حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریبان ہونا

❋ حسنین عباس، کمیل عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
مری محبت کے واہموں سے پرے تھا تیرا وجود ورنہ!
جہاں جہاں تیرا عکس ٹھہرا میں ہو کے آیا وہاں وہاں سے
تو ہم نفس ہے نہ ہمسفر ہے کسے خبر کہ تو کدھر ہے
میں دستکیں دے کے پوچھ بیٹھا مکیں مکیں سے مکاں مکاں سے

❋ محمد ندیم ملتانی......کراچی
کہاں تلک کوئی دست کرم کو زحمت دے
تمام شہر ہی دست سوال رکھتا ہے

❋ رشید بابا......حافظ آباد
انساں کے کسی روپ کی تحقیر نہ کرنا
ملتا ہے زمانے میں "خدا" بھیس بدل کر

❋ اشفاق شاہین......کراچی
قریب تھے تو فقط واسطہ تھا آنکھوں سے
جدا ہوئے ہیں تو دل میں اتر گئے ہیں لوگ

❋ داؤد اشفاق......اوکاڑہ
وہ مجھ میں ایسے سمایا کہ مل سکا نہ کبھی
مرے وجود سے ہوتا جدا تو مل بھی جاتا

❋ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ
پھر یوں ہوا کہ کوئی بھی منزل نہ مل سکی
بچ کر ذرا چلے تھے تری راہ گزر سے ہم

❋ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
نہ عیاں ہوئی تم سے، نہ بیاں ہوئی ہم سے
بس سلجھی ہوئی آنکھوں میں الجھی رہی محبت

❋ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
کوئی زنجیر نہیں پھر بھی گرفتار ہوں میں
کیا خبر تھی کہ تجھے یہ بھی ہنر آتا ہے

❋ رانا رضوی......اولڈ ٹریفورڈ، مانچسٹر
ہر جنگ میں سکندر رہا ہے مگر
تیری یاد کی لڑائی میں میر جعفر ہے میرا دل

❋ محمد عقیل چٹھہ......حافظ آباد
یوں تیری چاہتیں سنبھالی ہیں میں نے
جیسے عیدی ہو میرے بچپن کی

❋ محمد وسیم زاہد زرگر......نئی منڈی سکھیکی
سارا ہی شہر تھا اس کے جنازے میں شریک
تنہائیوں کے خوف سے جو شخص مرگیا

❋ بابر عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
الفاظ تلخ بات کا انداز سرد ہے
پچھلا ملال آج بھی گویا نہیں گیا!
اب بھی کہیں کہیں پر ہے کالک لگی ہوئی
رنجش کا داغ ٹھیک سے دھویا نہیں گیا

❋ محمد رشید سیال......روہڑی، ضلع سکھر
لوگ کھلتے ہوئے پھولوں کو مسل دیتے ہیں
ہم نے کانٹوں کو بھی پہلو میں سجا رکھا ہے

❋ عنصر محمود کرڑ......ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

❋ احمد حسن عرضی خان......قبولہ شریف
اس نے چھو کر مجھے پتھر سے انسان کیا
مدتوں بعد مری آنکھوں میں آنسو آئے

❋ رحیمہ سرور......ساہوواڑی، لاہور
مثال شیشہ ہیں ہمیں تھام کے رکھنا
تیرے ہاتھ سے چھوٹے تو بکھر جائیں گے

❋ یاسر علی راجپوت......ڈیفنس، کراچی
سانپ ڈس لے تو تریاق کا امکان بہت
آدمی ڈس لے تو ہر سانس بکھیر جاتا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

❊ سید محی الدین اشفاق......فتح پور، لیہ
بھول جانے کا تجھے کیسے تصور کرلوں
میری ہر سانس سے وابستہ ہیں یادیں تیری

❊ راجا افتخار علی افقی......چوآسدن شاہ، موہڑہ
معلوم ہوتا ہے بھول گئے ہو شاید
یا پھر کمال کا صبر رکھتے ہو

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
چوما ہے اپنی آنکھوں کو رکھ رکھ کر آئینہ
جب بھی ہوئی ہے، خواب میں زیارت جناب کی

❊ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
تاریخ ہر اک موڑ پہ دیتی ہے گواہی
اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
ایک نہ ایک دن ہجر کا موسم گزر ہی جائے گا
روک سکا ہے کب کوئی وقت کی رفتار کو

❊ عادل خان......چارسدہ
ہم بھی پھولوں کی طرح اکثر تنہا ہی رہتے ہیں
کبھی خود سے ٹوٹ جاتے ہیں کبھی کوئی توڑ جاتا ہے

❊ محمد اقبال اداس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
بچھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی
اب روزن زنداں سے ہوا کیوں نہیں آتی

❊ بشیر احمد بھٹی......فوجی بستی، بہاولپور
خزاں کی ہواؤں نے ایسا ڈاکا ڈالا
تمام شجر اپنے پتوں سے محروم ہوگئے

❊ مرزا طاہر الدین بیگ......میر پور خاص
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

❊ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
ذرا سی بات کبھی تیرا یاد آجانا
ذرا سی بات بہت دیر تک رلاتی ہے

❊ ریاض بٹ......حسن ابدال
تم ترک تعلق کا کہیں ذکر نہ کرنا
میں لوگوں سے کہہ دوں گا کہ فرصت نہیں ملتی

❊ احمد خان توحیدی......اسٹیل مل، کراچی
آنسو بھی خشک ہوگئے آہوں کی آنچ سے
ہونٹوں پہ جب سے ضبط کے پہرے لگا دیے

❊ صوبیہ تفسیر......اوکاڑہ
سکون کی اک سانس کی فرصت نہیں ملتی
اس شہر میں جینے کی اجازت نہیں ملتی

❊ آستر رندھاوا......صدر، کراچی
تم نے تو کہہ دیا کہ محبت نہیں ملی
مجھ کو تو یہ بھی کہنے کی مہلت نہیں ملی

❊ محمد طارق کلیرا......نور پور تھل
دنیا کے سب کارن چھوڑے نام پہ تیرے، انشا نے
اور اسے کیا تھوڑے غم تھے تیرا عشق مزید ہوا

❊ فوجی صابر علی......حیدرآباد کینٹ
تیرے چہرے میں اتنی کشش تھی کہ پلٹ کر دیکھا
ورنہ سورج کو دوبارہ دیکھا نہیں جاتا

❊ عادل عاصی خٹک......کرک
تیری عظمت کی جھلک دیکھ کے معراج کی رات
کب سے جبرئیل کی خواہش ہے کہ بشر ہوجائے

❊ عرفان احمد عاجز......آڑہ، چکوال
میں جانتا تو ہوں مگر پھر بھی چاہتا ہوں
کہ تو آئینہ دیکھ کر بتا میرا انتخاب کیسا ہے

❊ آسیہ تبسم......فیصل آباد
محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں
تیرا مجبور کر دینا میرا مجبور ہوجانا

❊ حسنین ہاشمی......سینٹرل جیل گوجرانوالہ
مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح

کوپن برائے شمارہ جون 2013

مُحفلِ شعر و سُخن

نام : --

پتا : --

ستم اگر

منظر امام

مشہور قول ہے... جو بھی کھری بات کہے، سب کے من سے اترا رہے مگر... یہ کیسی کھری کھری باتیں ہیں کہ لوگ سن کر واہ واہ کر رہے ہیں یہ اور بات کہ... یہ سب ایک دیوانے کا خواب ہیں... الیکشن کا زمانہ، گہما گہمی کا ماحول... پُرجوش تقاریر... رنگ برنگ تقاریب... منشور کی حکایتیں، عوام کی شکایتیں... دولت بہانے کے حیلے، مشیروں کے بہانے اور سیاستدانوں کی دریا دلی... جود و سخاوت کا میلا اور آخر میں ڈھاک کے تین پات... بس یہی نتائج... وہی مہنگائی، وہی بے روزگاری اور دہشت کا وہی عالم... اور پھر الیکشن ختم۔

انتخابات کا کھیل "ڈگڈگی اور مداری کا دلچسپ تماشا"

نہ جانے کس طرح میرے ذہن میں خیال آگیا کہ اب مجھے بھی سیاست کے میدان میں کودنا چاہیے اور ایک عدد سیاسی پارٹی بنالینی چاہیے۔ یہ حوصلہ اس لیے بھی ہوا کہ محلے کے لوگ میرا بہت احترام کیا کرتے ہیں۔ اپنے اچھے برے میں مجھ سے مشورے بھی لیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میرے مشوروں پر عمل کے بعد ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ لیکن میں مشورے ضرور دیتا ہوں۔ اور وہ میرے پاس ضرور آیا کرتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسری بات یہ تھی کہ میں خاصا چرب زبان واقع ہوا تھا۔ روز رات کو محلے کے ہوٹل میں ایک بیٹھک ہوا کرتی۔ محلے کے بہت سے لوگ میرے اردگرد بیٹھ جایا کرتے اور میں انہیں ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر لیکچر دیا کرتا۔

سب کے سب مجھ سے بہت مرعوب تھے۔ میری بصیرت افروز تقریر ان کی آنکھیں کھول دیا کرتی۔

اسی عالم میں ایک رات مبین بھائی نے مجھ سے کہا۔ ”نوید بھائی، اگر آپ سیاست میں حصہ لیں تو بہت آگے چلے جائیں گے۔“

مبین بھائی میرے محلے ہی کے تھے۔ کبوتر بازی میں پورے شہر میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان کے پاس صرف پچاس کبوتر تھے۔ اور ان ہی پچاس کبوتروں سے ان کی روزی چل رہی تھی۔

وہ مہینے میں ایک بار اپنے سارے کبوتر بیچ دیا کرتے۔ خدا جانے انہوں نے اپنے کبوتروں کو کیسی پٹی پڑھا رکھی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتے اُڑ کر مبین بھائی کے پاس واپس آجایا کرتے۔

بیان کرنے والوں نے تو یہاں تک بتایا ہے کہ ایک بار ایک بندہ ان کے سارے کبوتروں کو اپنے ساتھ حیدر آباد لے گیا تھا لیکن وہ وہاں سے بھی اُڑ کر واپس آگئے تھے۔

بہر حال، مبین بھائی کا یہ بیش بہا مشورہ میرے دل کو لگ گیا تھا اور میں نے سنجیدگی سے اس پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کون سی پارٹی جوائن کی جائے۔

مبین بھائی سے مشورہ کیا تو انہوں نے ایک پارٹی کا نام بتایا۔ ”یہ پارٹی بہت تیزی سے آگے آرہی ہے نوید بھائی، تم اس پارٹی میں شامل ہو جاؤ۔“

”اس پارٹی کا منشور کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جو ہر پارٹی کا ہوا کرتا ہے۔“ مبین بھائی نے کہا۔ ”ملک اور قوم کی ترقی، مہنگائی اور کرپشن کا خاتمہ، وغیرہ وغیرہ۔“

”اب دو باتیں ہیں مبین بھائی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی پارٹی اپنے منشور پر عمل نہیں کرتی۔ سب جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کا عمل منافقت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔“

”یہ تو ہے۔“ مبین بھائی نے اپنی گردن ہلائی۔

”اور دوسری بات یہ ہے کہ ان پارٹیوں کے منشور میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ سب پرانی باتیں ہوتی ہیں، گھسی پٹی ہوئی۔ اس لیے منشور ایسا ہونا چاہیے جو چونکا کر رکھ دے۔“

”پھر تو بھائی نوید، تم اپنی کوئی الگ پارٹی بنالو۔“

”الگ پارٹی تو بہت مشکل کام ہے۔“ میں نے کہا۔

”مشکل تو ہے لیکن ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں ہوسکتا۔“ مبین بھائی نے کہا۔ ”ہم محلے والے تمہارا ساتھ دیں گے۔ بھائی گیارہ ووٹ تو میرے گھر کے پکے ہیں۔“

”یار، گیارہ ووٹوں سے میں وزیر اعظم کیسے بن جاؤں گا۔“

”بسم اللہ تو کرو۔ بس منشور اتنا زبردست ہو کہ سب حیران ہو کر رہ جائیں۔“

میں نے اب اس لائن پر سوچنا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے تو پارٹی کا نام تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میری پارٹی کا نام ایسا ہو جو سب سے الگ ہو... اور جس کا نام سنتے ہی اندازہ ہو جائے کہ یہ پارٹی کم از کم منافق تو نہیں ہوگی۔

بہت سوچنے کے بعد اس پارٹی کا نام ”ستم گر پارٹی“ رکھ دیا۔ مبین بھائی اور دوسرے محلے دار اس نام کو سن کر پریشان ہو گئے تھے۔

”یار نوید بھائی، یہ کیسا نام ہے؟“

”بہت اچھا نام ہے۔ اس میں منافقت نہیں ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”بدقسمتی سے پاکستان کی ہر پارٹی ستم گر ہے۔ سب کے سب ستم گری کیے چلے جارہے ہیں۔ لیکن منافقت کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہے۔ جبکہ ہم نے نام ہی ستم گر رکھا ہے۔ ہم جیسے ہیں، ویسے ہی سب کے سامنے ہیں۔“

”یہ بات تو ہے۔“ سب میری بات سے متفق ہو گئے۔ ”اور اس کا منشور کیا ہوگا؟“

”وہ بھی میں تیار کر چکا ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اگر کہو تو پڑھ کر سنا دوں۔“

ہماری یہ زبردست میٹنگ اس وقت ہوٹل میں ہی ہو رہی تھی۔ مبین بھائی کے علاوہ محلے کے اور بھی سات آٹھ افراد اس اہم میٹنگ میں شامل تھے۔

”بسم اللہ، بسم اللہ۔“ انہوں نے کہا۔

میں نے منشور پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔ ”نمبر ایک، ستم گر پارٹی کی تعلیمی پالیسی، اس پارٹی کی کوئی تعلیمی پالیسی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس ملک کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔

جس ملک میں ڈگری کے لیے کہا جائے کہ ڈگری تو ڈگری ہوتی ہے، چاہے، اصلی ہو یا جعلی۔ وہاں اصلی ڈگری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

سب نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔

میں نے تعلیم کے ضمن میں آگے بتایا۔ ”دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس ملک میں اساتذہ کی اتنی قدر اور عزت نہیں ہوتی، جتنی کبڈی یا کرکٹ کھیلنے والوں کی ہوتی ہے وہ بے چارے مفلس ہی رہتے ہیں۔ چاہے پروفیسر ہوں یا لیکچرر ہوں یا پرائمری ٹیچر ہوں۔ سب کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔ اس لیے تعلیم بے کار کی چیز ہے۔ اصل چیز ہے کبڈی اور کرکٹ۔“

اس پر بھی تالیاں بجائی گئیں۔ میرا حوصلہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔

”اب آگے آئیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے ملک سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ان پر خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے... اور جہاں تک ملازمت وغیرہ کا تعلق ہے تو اس کے لیے بھی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ سفارش اور رسوخ زندہ باد۔ یہاں علم سے زیادہ سفارش اور رسوخ کا زور ہے۔ اس لیے ہماری پارٹی کو کسی بھی تعلیمی پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”لیکن نوید بھائی، ایک پہلو اور بھی ہے۔“ ایک نے کہا۔ ”فرض کریں ہم تعلیم کا چکر ہی ختم کر دیتے ہیں تو پھر اس ملک کے بیمار کہاں جائیں گے۔ ان کا کون علاج کرے گا۔“

”خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں نے اس موضوع پر سوچا ہوا ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہہ دیا۔ ”جس ملک میں جگہ جگہ سو سالہ حکیم اور دو سو سالہ سنیاسی باوا اور جنتوں کی مدد سے آپریشن کرنے والے، ٹوٹکے بتانے، ہر مرض کے لیے تعویذ اور گنڈے دینے والے موجود ہیں۔ اس ملک میں ڈاکٹرز کی کیا ضرورت ہے؟“

ایک بار پھر زوردار تالیاں بجائی گئیں۔ میرا حوصلہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔

”اب اسی ضمن میں ایک بات اور سن لیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے یہاں خوش قسمتی سے ہر شخص ڈاکٹر ہے۔ آپ کسی سے بھی اپنا کوئی مسئلہ بتائیں وہ فوراً آپ کو کوئی نہ کوئی دوا کا نام بتادے گا۔ اور وہ بھی نہ ملے تو کسی بھی میڈیکل اسٹور پر چلے جائیں۔ وہ بھی آپ کا مرض سنتے ہی اپنی طرف سے آپ کو دوا دے دے گا۔“

”نوید سائیں نے بالکل ٹھیک بولا ہے۔“ محلے میں رہنے والے اکبر ابڑو نے میری تائید کی۔

”سائیں، یہ تو ہوگئی تعلیمی پالیسی، اب دوسری پالیسیاں کیا ہوں گی؟“

”میں پالیسیوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ صرف یہ بتاؤں گا کہ ہماری پارٹی کو کیا کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے یہاں کرپشن پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔“

”یہ کیا بات کردی نوید بھائی۔“ مبین بھائی نے کہا۔

”سامنے کی بات ہے، تم یہ بتاؤ، کیا کوئی پارٹی ایسی ہے جو کرپشن سے پاک ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، کوئی بھی نہیں ہے۔“

”اور سب یہی کہتے ہیں کہ ہم کرپشن کی اجازت نہیں دیں گے، کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”بالکل، سو فیصد درست۔“

”تو جب اجازت نہ ہونے کے باوجود ہر پارٹی میں دبا کے کرپشن ہوتی ہے۔ تو ہم اجازت ہی کیوں نہ دے دیں۔ منافقت سے کیوں کام لیں۔“

ایک بار پھر زوردار تالیاں بجنے لگیں۔ جس کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا تھا۔

”اب ایک بات یہ بتاؤ! ہماری پارٹی کا نشان کیا ہوگا؟“ کسی نے پوچھا۔

”یہ بھی سامنے کی بات ہے۔ خدا کے فضل سے ہر پارٹی قوم کی پیٹھ میں چھرا گھونپ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن کسی نے بھی اپنا نشان چھرا نہیں رکھا ہوگا مگر ہم اعلانیہ طور پر چھرا ہی رکھیں گے۔ کیونکہ ہم منافق نہیں ہیں۔“

”نوید بھائی...!“ کسی نے نعرہ لگایا۔

”پورا ہوٹل زندہ باد زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ذرا سی دیر میں پورے محلے میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ ایک نئی سیاسی پارٹی وجود میں آگئی ہے۔ جس کا نام ستم گر پارٹی ہے اور یہ پارٹی اسی محلے میں بنی ہے۔ پورا محلہ پُرجوش ہوا جارہا تھا۔

پہلی بار اس محلے کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ سب ہی خوش تھے۔ لوگ آپس میں تبصرے بھی کرنے لگے۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ اور چاہے کچھ ہو یا نہ ہو، ستم گر پارٹی جھوٹی اور منافق نہیں ہے۔

محلے کے کچھ لوگوں نے ایک وفد کی صورت میں مجھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے ملاقات کی۔ وہ پارٹی کی مالی مدد کرنا چاہتے تھے۔ ان کے لیڈر نے مجھ سے کہا۔ ”نوید بھائی، آپ تو جانتے ہوں گے کہ ہم سب اسی محلے کے دکاندار ہیں۔ ہم میں سے کسی کی مٹھائی کی دکان ہے، کوئی ہوٹل چلا رہا ہے۔“

”ہاں سب معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”فرمائیں میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کرسکتا ہوں!“

”ہم آپ کی پارٹی کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔“ اس لیڈر نے بتایا۔ ”لیکن ہماری ایک شرط ہے۔“

”چلیں، وہ شرط بھی بتادیں۔“

”وہ شرط یہ ہے کہ آپ کی پارٹی ہمیں بجلی چوری کی اجازت دے دے گی۔ ہم تو ویسے بھی کنڈا سسٹم سے کام چلا رہے ہیں۔ لیکن ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت لائن کٹ جائے۔ بس آپ ہمیں اجازت دے دیں گے۔“

”دیکھو میرے معصوم بھائیو! پہلی بات تو یہ ہے کہ بجلی چوری کرنے کے بعد تم لوگ تو ویسے ہی ہماری پارٹی کے ممبر بن چکے ہو اور اس کے لیے تمہیں کوئی ممبر شپ فارم وغیرہ بھرنے کی ضرورت نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا ضروری ہے کہ ہماری پارٹی کامیاب بھی ہو جائے۔ ابھی تو منزل بہت دور ہے۔“

”منزل دور تو ہے لیکن یقین بھی کوئی چیز ہے۔“ لیڈر نے کہا۔ ”ہمیں ستم گر پارٹی کا منشور معلوم ہو چکا ہے ایسا زبردست منشور کسی بھی پارٹی کا نہیں ہوگا۔ بالکل سچا اور کھرا۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ آپ دیکھتے ہی دیکھتے کامیاب ہو جائیں گے۔“

”اور اگر نہ ہوئے تو؟“

”کوئی بات نہیں۔ ہم یہ سمجھیں گے کہ ہم نے ایک جوا کھیلا تھا جس میں ہار گئے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔“

”تو چلیں بسم اللہ کریں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ لوگوں کو جو کچھ بھی دینا ہو وہ مبین بھائی کو دیں۔ وہی پارٹی کا فنانس دیکھ رہے ہیں۔“

اسی وقت دس ہزار روپے جمع ہو گئے۔ یہ بہت حوصلہ افزا صورت حال تھی۔ ہم کئی دنوں سے ایک عدد پریس کانفرنس کی سوچ رہے تھے لیکن پیسے نہیں ہو رہے تھے۔ اب اتنے پیسے ہو گئے تھے کہ پریس کانفرنس ہو سکے۔

اس کانفرنس کا سارا انتظام اکبر ابڑو کے پاس تھا۔ وہ سندھ میں ایک ناکام قسم کی این جی او چلا چکا تھا۔ کھانے پینے کا انتظام بھی اسی کو کرنا تھا۔

پریس کانفرنس کے نام پر پورے محلے میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پورے محلے والے صاف صاف کپڑے پہنے ادھر سے اُدھر گھومتے پھر رہے تھے۔

اب تو ہماری پارٹی میں چار پانچ جوان لڑکیاں بھی شامل ہو چکی تھیں۔ وہ بھی اپنا مستقبل روشن دیکھ کر ہمارے پاس آئی تھیں۔

پہلے دن پانچ لڑکیوں کا ایک گروپ اپنی تسلی کرنے میرے پاس آیا تھا۔ ”جناب، یہ فرمائیں، آپ کی پارٹی ہم جوان لڑکیوں کے لیے کیا سوچ رہی ہے؟“

”جوان لڑکیوں کے لیے ہمارے پاس پورا پیکج ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”مثال کے طور پر لڑکیوں کو محبت کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔“

”تڑتڑ“ تالیاں بجائی گئیں۔

”اس سلسلے میں موبائل فون پر لو پیکج لکھ کر بھیج دیا جائے تو رات دس بجے سے لے کر صبح تک کال فری ہوگی۔“

”واہ، یہ بہت زبردست ہے۔“

”دوسری بات یہ ہے کہ آپ لوگ پارک یا ہوٹلز میں بیٹھ کر کچھ بھی کرتے رہیں۔ کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔“ ایک بار پھر تالیاں۔

”اول تو تعلیم وغیرہ جیسی چیز کا خاتمہ ہی کر دیا جائے گا۔ پھر بھی اگر پڑھنا ہی پڑے تو محبت کرنے کے مختلف طریقے بتائے جائیں گے۔“

اس پر لڑکیوں نے شرمانے کی کوشش بھی کی تھی۔

”اور پسند کی شادیاں، اس کا کیا اسکوپ ہوگا؟“

”اس کا تو سینما اسکوپ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”حوصلہ افزائی کی جائے گی۔“

اس پر وہ ساری لڑکیاں ستم گر پارٹی میں شامل ہو گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسی منفرد اور بیش قیمت پارٹی پوری دنیا میں کہیں نہیں ہوگی۔

ایک بار ڈاکوؤں کا بھی ایک وفد مجھ سے ملنے آ گیا تھا۔ وہ سب کے سب خونخوار قسم کے لوگ تھے۔ ”ہاں بابا، یہ بتاؤ، ہم ڈاکوؤں کے لیے تمہاری پارٹی کے پاس کیا ہے؟“

”بہت کچھ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم کو پولیس نہیں پکڑے گی۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ۔“

”وہ شرط کیا ہے بابا؟“

”شرط یہ ہے کہ اکیلے ڈاکے ڈالنے کی اجازت کسی کو نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”کم از کم پانچ کا گروہ ہونا چاہیے۔“

”بالکل جائز بات ہے۔“

”اور دوسری شرط یہ ہے کہ ہر گروپ کو سال میں زیادہ سے زیادہ تین ڈاکے ڈالنے ہوں گے۔ اس سے زیادہ پر گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ اس لیے کہ سارے ڈاکے اگر ایک یا دو گروپ مارتے رہے تو دوسروں کو کیسے چانس ملے گا۔“ میں نے کہا۔ ”انصاف کا تو یہی تقاضا ہے نا بھائی۔“

اس بار ڈاکوؤں نے بھی بہت زوردار تالیاں بجائی تھیں پھر وہ سب مطمئن ہو کر چلے گئے۔ بہرحال اس سے یہ بات ثابت اور ظاہر ہو رہی ہے کہ ہماری پارٹی کا پیغام دور دور تک پھیلتا جا رہا ہے۔

اکبر ابڑو نے بہت سے صحافیوں کو گھیر لیا تھا۔ محلے کی ایک گلی میں کرسیاں وغیرہ لگا دی گئی تھیں۔ کھانے پینے کا بھی بہت معقول انتظام تھا۔

جب میں نے تقریر کی اور اپنا منشور پیش کیا تو شروع میں تو سب مذاق اُڑانے لگے لیکن جب میں نے تشریح کرنی شروع کر دی اور انہیں بتایا کہ ہماری پارٹی بالکل کھری پارٹی ہے تو سب ہی سنجیدہ ہوتے چلے گئے۔

پھر جب سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک صحافی نے دریافت کیا۔ ”جناب، آپ کی پارٹی ہم صحافیوں کے لیے کیا کر رہی ہے؟“

”بہت کچھ۔“ میں نے بتایا۔ ”آپ دیکھیں۔ صورت حال یہ ہے کہ آپ اگر سیدھی سیدھی خشک اور بے جان قسم کی خبریں شائع کریں گے تو اسے کون پڑھے گا۔ لوگوں کو تو چٹ پٹا مواد چاہیے۔ فرض کریں، اگر کسی گھر کی کوئی ایک لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہے تو دوسری کے بھی بھاگنے کا امکان ظاہر کر دیں۔ اور اس کے چاہنے والوں کی پوری بھیڑ سامنے لے آئیں۔ اگر کسی جگہ چار افراد ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہو گئے ہوں تو یہ ہرگز نہ لکھیں کہ چار آدمی مر گئے۔“

”تو پھر کیا لکھا جائے جناب!“

”یہ لکھیں چار پٹھان مر گئے یا چار اردو بولنے والوں کو مار دیا گیا یا چار سندھی مر گئے یا چار شیعہ یا سنی مر گئے۔ اس سے آپ کی رپورٹنگ بھی زبردست ہو جائے گی۔ اور آپ کا اخبار بھی بہت چلے گا۔“

اب صحافیوں نے بھی تالیاں بجا ہی دیں۔ میری اس بے باکی اور کھری تقریر نے ان پر بہت زبردست اثرات ڈالے تھے۔

خود کئی صحافیوں کا یہ اعتراف تھا کہ انہوں نے ایسی کھری اور بے لاگ باتیں پہلے کبھی نہیں سنی ہوں گی۔ اور وہ سب میری اور میری پارٹی کی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملائے جا رہے تھے۔

سب سے زیادہ خوشی محلے والوں کو ہو رہی تھی۔ میں اپنے محلے کا ہیرو بنا ہوا تھا۔ کیونکہ انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ میرا مستقبل روشن دکھائی دے رہا ہے۔

ایک صحافی نے بہت بے ڈھنگی سی بات کر دی۔ ”جناب! یہ بتائیں کیا آپ کی پارٹی ملک دشمنی نہیں کر رہی ہے؟“

”چلیں، آپ مجھے ایسی پارٹی بتا دیں جو ملک دوستی کر رہی ہو؟“ میں نے الٹا سوال کر ڈالا۔

اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”دیکھیں بھائی،“ میں ایک بار پھر واضح کر دوں کہ ہر پارٹی کوئی نہ کوئی آڑ لے کر کرپشن کر رہی ہے۔ جبکہ ہم کوئی آڑ نہیں لے رہے۔ ہم نے اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ڈالا ہے۔ جو کچھ ہے وہ سامنے ہے۔“

اس پر ایک بار پھر زوردار تالیاں بجائی گئیں۔ ویسے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ عام آدمیوں سے زیادہ ان اخبار والوں کو مطمئن کرنا مشکل ہے۔ یہ لوگ بال کی کھال نکالنے لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں نے بھی اپنا ہوم ورک مکمل کر رکھا تھا اس لیے اس محاذ پر ڈٹا ہوا تھا۔

ایک اور سوال کیا گیا۔ وہ بھی کچھ بے ڈھب قسم کا صحافی دکھائی دے رہا تھا۔ ”جناب، یہ فرمائیں، آپ کی پارٹی کی فارن پالیسی کیا ہوگی؟“

”جیسا دیس ویسا بھیس“ میں نے بتایا۔ ”اول تو ہمیں فارن پالیسی وغیرہ کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہمیں خود اپنے ملک کو دیکھنا ہے۔ بیلجیم، ہالینڈ اور فرانس وغیرہ سے ہمیں کیا لینا دینا اور اگر ضرورت پڑ بھی جائے تو وہی پالیسی ہوگی... جو وہ کہیں گے۔ وہ جیسا کہیں گے ہمیں ویسا ہی کرتے چلے جانا ہے۔“

”ہاں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔“

”دیکھیں، ابھی تک تو یہی ہوتا آیا ہے کہ ہماری فارن پالیسی دوسرے ہی بنایا کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ جیسا کہتے ہیں، ہم اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ تو پھر ہمیں اتنا لمبا چوڑا جھنجھٹ کرنے کی کیا ضرورت

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ وزیر خارجہ، خارجہ سیکریٹری، ڈیلی گیشن اور نہ جانے کیا کیا۔ خوا مخواہ کے اخراجات۔ ان سے بچنے کے لیے بہتر یہی ہے کہ کوئی فارن پالیسی ہی نہ ہو۔"

سب کے سب واہ واہ کرنے لگے۔ انہوں نے ایسی پریس کانفرنس پہلے کہاں اٹینڈ کی ہوگی۔

"صاحب، ملک میں امن وامان کی صورت کیسے بحال کریں گے؟"

"یہ حکومت کا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ کام خود عوام کا ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"سامنے کی بات ہے۔ یہاں کیا ہوتا ہے۔ کوئی ڈاکو پکڑا جاتا ہے تو مہینوں اس کا کیس چلتا رہتا ہے۔ پھر وہ بری ہوجاتا ہے۔ لیجیے صاحب قصہ ختم۔ ہماری پارٹی کی حکومت کی طرف سے عوام کو اجازت ہوگی کہ مجرم کو پکڑتے ہی ماردیں۔ دس بارہ کیس ایسے ہوگئے تو ملک سے جرائم کا خاتمہ ہوجائے گا۔"

سب پھر تالیاں بجانے لگے۔ میری باتوں نے ان پر بہت زوردار اثرات ڈالے تھے۔ بہت مثبت اثرات مرتب کیے تھے۔

دوسرے دن کے اخبارات میں میری ستم گر پارٹی کی خبریں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہا گیا تھا کہ اس دور کی سب سے مقبول پارٹی یہی ہونے والی ہے۔

اس پارٹی کی ترقی کے امکانات بہت روشن نظر آرہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مبین بھائی سمیت کسی کو بھی اس بات کی امید نہیں تھی کہ میری یہ ستم گر پارٹی اتنی جلدی اتنی مقبولیت حاصل کرلے گی۔ پورے محلے میں اس کا چرچا ہورہا تھا۔ اور میں سمجھ گیا تھا کہ جب محلے میں چرچا ہورہا ہے تو شہر میں بھی ہورہا ہوگا۔ اور جب شہر میں ہورہا ہے تو صوبے اور ملک میں بھی ہورہا ہوگا۔

ابھی تک سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ ایک دن ایک آدمی مجھ سے ملنے میرے گھر پہنچ گیا۔ وہ بہت ہی معقول قسم کا بندہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔ بہت زبردست قسم کا سوٹ پہن رکھا تھا اس نے۔ اس نے اپنا تعارف مشیر کہہ کر کروایا تھا۔

"جناب، میرا نام مشیر عالم ہے۔" اس نے بتایا۔

"جی مشیر صاحب فرمائیں۔" میں نے پوچھا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"جناب، میں خود آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔" اس نے کہا۔ "لیکن جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ تنہائی میں عرض کروں گا۔"

اس وقت کمرے میں مبین بھائی کے علاوہ اور بھی دو چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اسے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے آیا۔

"جی مشیر صاحب، اب فرمائیں۔"

"سر جی، میں آپ کو اپنی خدمات دینا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اس لیے میرا نام مشیر ہے، میں مشورے دیا کرتا ہوں۔ خاص طور پر سیاست دانوں کو، آپ مجھے اپنا پروموٹر رکھ لیں۔ دنیا کے جتنے بڑے بڑے سیاست دان ہیں، وہ سب اسی طرح کام کرتے ہیں۔ ان کے اپنے پروموٹر ہوتے ہیں، جو ان کی ٹیم کو پروموٹ کرتے ہیں۔"

مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہورہا تھا۔ "مشیر صاحب، آپ مجھے کس طرح پروموٹ کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو مشورے دے کر۔" اس نے بتایا۔ "آپ ان پر عمل کریں، پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"کیا آپ اس کا معاوضہ بھی لیں گے؟"

"ظاہر ہے جناب، میں تو بالکل پروفیشنل قسم کا انسان ہوں۔" اس نے کہا۔ "لیکن فی الحال آپ اور آپ کی پارٹی کی حالت کو دیکھتے ہوئے صرف تیس ہزار روپے مہینا لوں گا۔"

"تیس ہزار کچھ زیادہ نہیں ہیں؟"

"بالکل نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں تو تیس لاکھ مہینے کا آدمی ہوں۔" اس نے کہا۔ "آپ کے لیے تیس ہزار لے رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے آپ خود ہی اضافہ کردیں گے۔"

"چلیں، میں نے آپ کو رکھ لیا۔"

"اس طرح نہیں سرکار، آپ مجھے ایڈوانس کے طور پر دس ہزار دے دیں۔ تاکہ مجھے یقین ہوجائے کہ آپ میری خدمات لینے کے لیے سنجیدہ ہیں۔"

اس وقت میری جیب میں چندے کے کچھ روپے تھے جو میں مبین بھائی کو دینا بھول گیا تھا۔ میں نے ان میں سے دس ہزار نکال کر اس کے حوالے کردیے۔

اس نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب، اس وقت سے میری خدمات آپ کے لیے شروع ہورہی ہیں۔"

"مشیر یہ بتاؤ کہ فوری طور پر مجھے کیا کرنا چاہیے؟" میں اب اسے تم کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔

"جناب، پہلی بات تو یہ ہے کہ لوگ آپ اور آپ کی پارٹی میں دلچسپی تو لے رہے ہیں لیکن کسی کو آپ سے ہمدردی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب، ذرا وضاحت سے بتاؤ۔"

"جناب، دلچسپی اور چیز ہے۔ ہمدردی اور چیز۔" اس نے کہا۔ "لوگ آپ کو ووٹ تو کبھی نہیں دیں گے۔ البتہ مذاق ضرور بنالیں گے۔"

"تو پھر مشیر بتاؤ۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟" میں نے اس کی بات سے پریشان ہوکر پوچھا۔

"قاتلانہ حملہ۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"قاتلانہ حملہ...!" میں سٹپٹا گیا تھا۔ "کیا پاگل ہوگئے ہو؟ میں کس پر قاتلانہ حملہ کروں۔"

"دوسرا حملہ آپ نہیں کریں گے آپ پر ہوگا۔" اس نے کہا۔

"کیوں مجھے مارنا چاہتے ہو؟ یہ کیسا مشورہ ہے۔"

"میری بات تو سنیں۔" اس نے کہا۔ "اس حملے میں آپ بال بال بچ جائیں گے۔ یہ پلاننگ ہی ایسی ہوگی کہ آپ کو چوٹ بھی نہ آئے۔ لیکن پوری میڈیا کی توجہ آپ کی طرف ہوجائے گی۔ اس طرح آپ پبلک کی ہمدردیاں سمیٹ لیں گے۔"

"سمجھ گیا۔" اس کی تجویز پر میں پُرجوش ہوگیا تھا۔ "یعنی یہ حملہ صرف ڈراما ہوگا۔"

"ہاں، صرف ڈراما۔"

"لیکن وہ کون لوگ ہوں گے؟"

"آپ اس کی پروا نہ کریں۔ لوگوں کا بندوبست بھی میں ہی کروں گا۔"

ظاہر ہے کہ اس ڈرامے میں پیسے بھی خرچ ہونے تھے۔ اس نے پورے سیٹ اپ کے لیے پچاس ہزار طلب کیے تھے۔ اتنی زبردست پبلسٹی کے لیے پچاس ہزار کچھ زیادہ نہیں تھے۔

میں نے اس میٹنگ میں مبین بھائی کو بھی شامل کرلیا۔ کیونکہ پارٹی کے پیسے ان ہی کے پاس رکھے رہتے تھے۔ میں نے مشیر عالم کی بتائی ہوئی تجویز ان کے سامنے بھی رکھ دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ بھی سن کر اچھل پڑے تھے۔ ”زبردست! سیاست میں تو اس قسم کے ڈرامے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ارے بھائی‘ سارے سیاست دان اسی قسم کی حرکت کرتے ہیں۔“

”تو پھر مشیر عالم کی تجویز مان لی جائے۔“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ مبین بھائی نے کہا۔ ”اس میں تو دیر ہی نہیں کرنی۔ الیکشن قریب آتے جا رہے ہیں۔ ہمیں تو زیادہ سے زیادہ رولا مچانا ہے۔“

مبین بھائی نے اسی وقت مشیر عالم کے ہاتھ پر پچاس ہزار گن کر رکھ دیے۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ اب ہمارے پاس فنڈنگ بھی ہونے لگی تھی۔ پارٹی کے پاس دس بارہ لاکھ روپے آچکے تھے۔

دوسرے دن مشیر عالم نے بتایا۔ ”سرجی‘ آپ پر قاتلانہ حملے کا پورا بندوبست ہو چکا ہے۔ کل شام کو آپ پانچ بجے گھر سے نکلیں گے اور ایک بوڑھی عورت ایک بڑا سا تھیلا لیے آپ کے سامنے سے گزرے گی۔ وہ اتنا بڑا تھیلا ہوگا کہ اس سے چلا نہیں جا رہا ہوگا۔“

اس وقت میں اور مبین بھائی دونوں موجود تھے۔ مشیر عالم بہت ہی پُرجوش انداز میں اپنی اسکیم بتا رہا تھا۔

”کیا ضروری ہے کہ وہ بوڑھی عورت اس وقت وہاں سے گزرے۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہر حال میں گزرے گی۔“ مشیر عالم نے کہا۔ ”کیونکہ اس کا گزرنا بھی اسکیم کا حصہ ہے۔ جب وہ لڑکھڑانے لگے تو آپ فوراً آگے بڑھ کر اسے سہارا دیں گے اور اس کا سامان خود اٹھا لیں گے۔ وہ آگے آگے جا رہی ہوگی‘ آپ اس کے پیچھے ہوں گے۔ اور اسی وقت آپ پر حملہ کر دیا جائے گا۔ گولیاں چلیں گی۔ لیکن اس طرح کہ آپ کو خراش تک نہ آئے اور نہ ہی کوئی اور زخمی ہو۔“

”بھائی، تمہاری یہ اسکیم میری تو سمجھ میں آگئی۔“ مبین بھائی نے کہا۔ ”لیکن اس بوڑھی عورت کا کیا فائدہ۔“

”بہت بڑا فائدہ ہے جناب! اپنے سرجی کو غریبوں کا ہمدرد ظاہر کرنا ہے۔ یہ بتانا ہے کہ اتنے بڑے لیڈر ہونے کے باوجود غریبوں کی کس طرح مدد کرتے ہیں۔“

”واہ...!“ میں اور مبین بھائی دونوں ہی یہ سن کر خوش ہو گئے تھے۔ ”اس کم بخت نے میرے لیے کیا راستہ نکالا تھا۔ دوسری شام کو سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا۔

ہاں ایک بات اور۔ میں نے مشیر سے پوچھا تھا کہ بازار جا کر صرف آلو لانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس پر اس نے جواب دیا تھا۔ ”سرجی، دنیا کو یہ بھی تو بتانا ہے کہ آپ ایک غریب انسان ہیں۔ آپ کوئی صنعت کار جاگیردار یا وڈیرے وغیرہ نہیں ہیں۔ خود غریب ہیں اس لیے غریب قوم کی محبت آپ کے دل میں ہے۔“

یہ بھی اس شاندار اسکیم کا بہت جان دار حصہ تھا۔

میں نے پروگرام کے مطابق بازار سے آلو خریدے۔ مجھے گھر کے قریب وہ بوڑھی عورت دکھائی دے گئی جو سامان سر پر اٹھائے چلی آرہی تھی۔

اس کا سامان واقعی بہت وزنی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے تھیلے لے لیے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔

سب کچھ پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ اچانک پروگرام کے مطابق گولیاں بھی چلنے لگیں۔ لیکن جب گولی میری ایک ٹانگ پر آکر لگی تو... میں چیختا ہوا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ یہ پروگرام کے مطابق نہیں تھا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد ہوش آیا ہوگا۔

میں ہاسپٹل میں تھا۔ میری ایک ٹانگ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور تکلیف سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میرے بستر کے پاس ہی مشیر عالم اور مبین بھائی بھی کھڑے ہوئے تھے۔ مشیر عالم کے ہاتھ میں کئی اخبارات تھے۔

”یہ دیکھیں سرجی‘ پورے ملک میں آپ کی دھوم مچ گئی ہے۔“ اس نے اخبارات لہرائے۔

”یہ بات تو ہے۔“ مبین بھائی نے بھی تصدیق کی۔ ”ہر طرف واہ واہ ہو رہی ہے۔“

”واہ واہ کے بچو اور میں جو لنگڑا ہو گیا۔ اس کا کیا ہوگا؟“

”آپ ہمیشہ کے لیے لنگڑے نہیں ہوئے ہیں سرجی۔“ مشیر عالم نے کہا۔ ”بس دو چار ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”لعنت ہو! تم نے کیسا نشانہ باز لیا تھا، کم بخت نے مجھ ہی کو گولی مار دی۔“

”سرجی‘ نشانہ باز نے تو اپنا کام پورا کیا ہے۔“ مشیر عالم نے کہا۔ ”اس نے تو آپ کی ٹانگ پر بالکل صحیح نشانہ لگایا ہے۔“

”کیا مطلب۔“ میں بھنا گیا تھا۔

”مطلب یہ ہے سرجی کہ یہ بھی اسکیم کا حصہ تھا کہ آپ کو گولی لگے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو اس لیے نہیں بتایا گیا کہ آپ کبھی تیار نہیں ہوتے۔“

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ اس وقت وہ شخص مجھے زہر لگ رہا تھا۔ اگر بس چلتا تو اس کم بخت کی گردن ہی دبا دیتا۔ بہرحال میں نے اس کے ہاتھ سے اخبارات لے لیے۔

تقریباً ہر اخبار نے میری تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملا دیے تھے۔ یہ لکھا گیا تھا کہ ایک عرصے کے بعد اس قوم کو ایک سچا، کھرا اور منافقت سے پاک سیاست دان ملنے والا تھا۔ لیکن دشمنوں نے اس کو گولی مار کر زخمی کر دیا۔

اپنے بارے میں خبریں پڑھ پڑھ کر میں اتنا خوش ہوا کہ اپنے زخمی ہونے کا صدمہ ہی بھول گیا۔ مشیر عالم واقعی کمال کا آدمی تھا۔ اس نے راتوں رات مجھے اتنا مشہور کر دیا تھا کہ میں برسوں کی جدوجہد کے بعد بھی نہیں ہو پاتا۔

ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ مجھے صرف ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد مجھے ریلیز کر دیا جائے گا۔ چلیں، اتنی شہرت کے عوض اتنی سی چوٹ کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

مبین بھائی آکر بتایا کرتے کہ کس کس طرح میں اور پارٹی مشہور ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ کس طرح مجھے کامیاب دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔

ایک شام مبین بھائی اور مشیر جب میرے پاس آئے تو مبین بھائی بہت اداس اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی صورت ہی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنک اٹھا تھا۔

”کیا ہو گیا مبین بھائی‘ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت برا ہوا ہے نوید بھائی۔“ مبین بھائی نے کہا۔

”کیا برا ہو گیا ہے؟“

”ہماری پارٹی جیسی ایک اور پارٹی میدان میں آگئی ہے۔“ مبین بھائی نے بتایا۔ ”جس کا نام ہے تباہ کن پارٹی۔“

”اور وہ پارٹی بہت تیزی سے مقبول ہوتی جا رہی ہے۔“ مشیر عالم نے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارا منشور تو سب سے الگ ہے۔“

”اس پارٹی کا منشور بھی تقریباً ہماری پارٹی ہی جیسا ہے۔“ مبین بھائی نے کہا۔ ”لیکن انہوں نے اپنے منشور میں ایک ایسی شق شامل کر رکھی ہے جو ہمارے منشور میں نہیں ہے۔“

”آخر وہ شق کیا ہے؟“

”وہ یہ ہے کہ پارٹی ہر حال میں ملک توڑنے کی کوشش کرے گی۔“ مبین بھائی نے بتایا۔ ”ہم نے اپنے منشور میں یہ بات کہیں نہیں لکھی۔“

”کیا کہہ رہے ہو مبین بھائی۔“ میں حیران ہو گیا۔ ”یعنی لوگ اس پر راضی ہیں؟“

”ہاں۔ اسی لیے تو پارٹی پاپولر ہو گئی ہے۔ کیونکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس ملک کی ہر پارٹی کی یہی کوشش اور خواہش ہے۔ لیکن منافقت کی وجہ سے کوئی کھل کر نہیں بول رہا۔ جبکہ اس پارٹی نے منافقت کے بغیر یہ خواہش صاف صاف ظاہر کر دی ہے۔ اس لیے لوگ اس کی سچائی سے متاثر ہو گئے ہیں۔“

”او خدا...!“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری ساری کوشش رائگاں ہو گئی۔“

”ہاں نوید بھائی۔“ مبین بھائی نے کہا۔ ”ہم اس پارٹی کے سامنے ناکام ہو گئے ہیں۔“

”اور میری قربانی بھی ضائع ہو گئی۔ میں خواہ مخواہ میں اپنی ٹانگ تڑوا کر لیٹ گیا۔“

”پریشان نہ ہو۔“ مبین بھائی نے دلاسا دیا۔ ”ہم اگلے الیکشن میں یہ شق بھی شامل کریں گے۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خیال ہمیں کیوں نہیں آیا۔ اس پارٹی کو کیسے آگیا؟“ میں نے پوچھا۔

”سرجی‘ سچ بات تو یہ ہے کہ اس پارٹی نے مجھ سے مشورہ کیا تھا اور میں نے ہی انہیں یہ ٹپ دی تھی۔“ مشیر عالم نے بتایا۔

”کیا...!“ میں غصے سے اور حیرت سے پاگل سا ہو گیا تھا۔ ”تم نے۔“

”ہاں‘ کیونکہ اس پارٹی نے مجھے ایک لاکھ روپے مہینا کی آفر دی تھی۔“ مشیر عالم نے بتایا۔ ”اچھا، سرجی۔ اب مجھے اجازت دیں۔“

تباہ کن پارٹی جیت چکی ہے۔ الیکشن کے نتائج سامنے آگئے ہیں۔

ابھی کچھ اور دیکھتا کہ بیگم نے مداخلت کر دی اور مجھے زبردستی اٹھا دیا۔ تب سے میں ایک بات سوچے جا رہا ہوں۔ اب آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کریں کہ اس ملک میں جیت جانے والی پارٹیاں تباہ کن ہیں یا نہیں؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

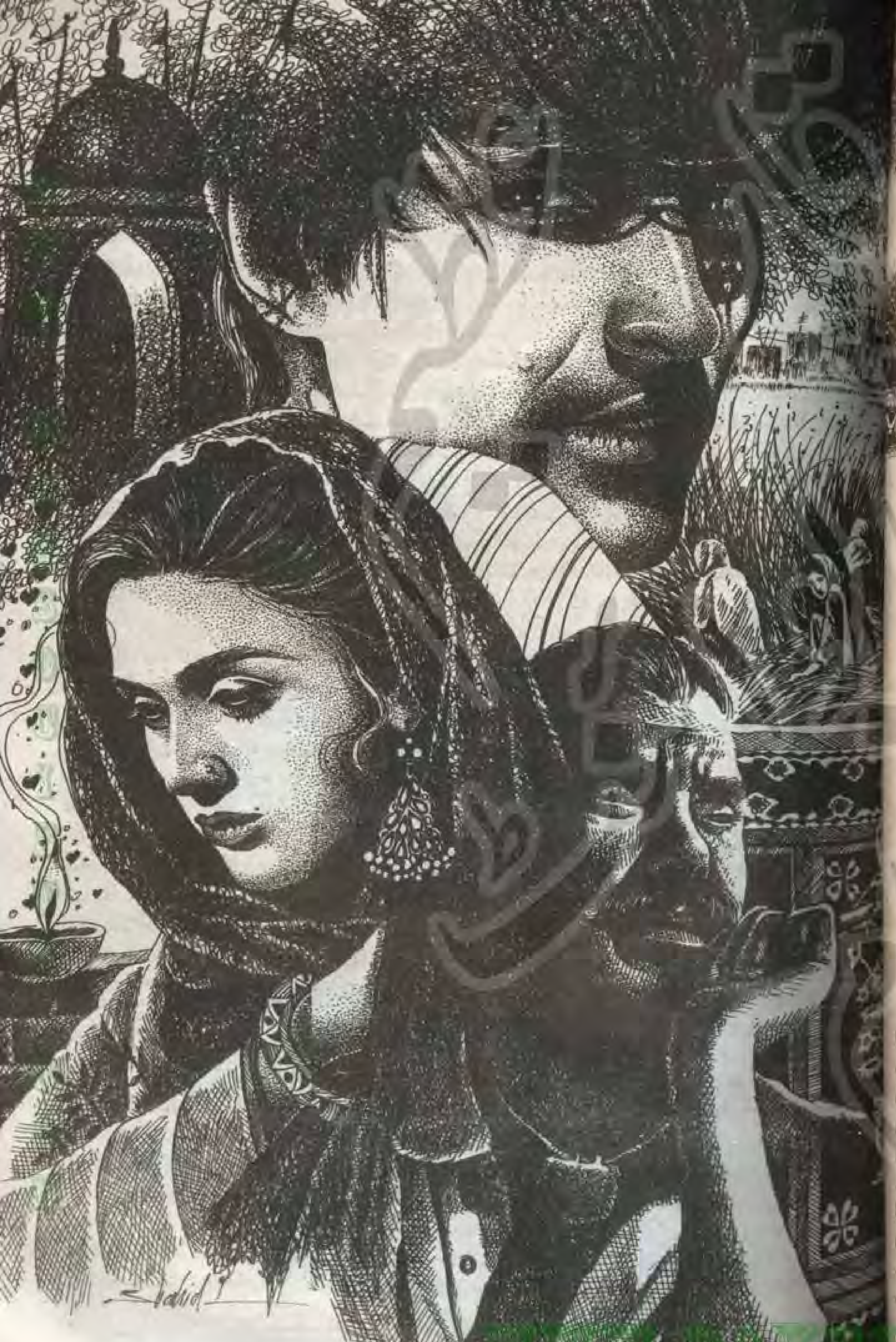

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر : 15

گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کی چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے :... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبری رہتی تھی جنھوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر واپس آ گیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا، جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص، لیکن نڈر مگر کچھ قنوطی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات

WWW.PAKSOCIETY.COM

خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کردیا وریام خان چونکہ ایک مختم مزاج شخص تھا اس لیے اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالا نے اسے ناکام بنا دیا۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہوگئی۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہوگیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا غلط فہمی میں اس نے مجھے مارنا چاہا مگر حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہوگیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا نوجوان وہاں آگیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہوگئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہوگیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی۔ یہاں سے فارغ ہوکر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ ایک دن میڈم کے اڈے پر میں نے ایک کمرے میں اسما کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا، اس دوران اس کے اڈے پر حملہ ہوگیا ہے۔ اس وقت وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ وہ میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ہیلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آگیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرلیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دلجیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کرکے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کرکے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کرکے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً میر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس دوران ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجو کو لے آیا تھا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائداد کی خاطر، بخت جان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کردیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہم ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کرکے رقم وصول کرنے کی ذمہ داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کردیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا وہ میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا وہاں سے واپسی پر اچانک مجھے اغوا کرلیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے موبی کا دوست زورآور تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کر چکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہوگئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہوگیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہد نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو درحقیقت چاچا کی جائداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے شکریہ ادا کرکے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم کو ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کردی میں نے ضد کرکے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور پیرو ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔

اس کے بعد ہمارا ٹاکرا پولیس سے ہوگیا۔ اس سے گلوخلاصی کے بعد کچھ فرصت کے لمحات میسر آئے تھے کہ پیرو ماچھی کا غنڈا امداد بخش میڈم پر ایک ڈنڈے سے وار کر گیا۔ اس پر بہ مشکل قابو پا کر میڈم کی طرف متوجہ ہوا۔ میڈم کی حالت کافی خراب تھی۔ راستے میں ایک مقامی ڈسپنسری میں میڈم کو دکھایا وہاں ڈاکٹر عالیہ اور اس کے شوہر صدیق سے ملاقات ہوئی جنہوں نے طبی امداد کے ساتھ ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ میڈم کو ہمدرد پا کر عالیہ نے اسے ایک مظلوم لڑکی کینیڈا پلٹ نگینہ کی کہانی سنائی جو اپنے چچا وڈیرا انور بھٹی اور رفاقت بھٹی کے ظلم کا شکار تھی پناہ کی درخواست پر میڈم نے ساتھ دیا اور نگینہ کو اپنے بنگلے پر لے آئی۔ پھر ہم میڈم کی ماں اور بھائی سیمو کی تلاش پر روانہ ہوئے۔ ہم دریا پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی پر سوار کرا رہے تھے کہ پیرو ماچھی نے ہمیں للکارا جو دریا پار سے واپس آچکا تھا اور ملاح دینا کے کیبن میں سو گیا تھا۔ میڈم نے اپنے روایتی انداز میں اسے زچ کیا اور ایک خونی لڑائی میں ہم اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق میڈم کے عزیزوں کو سردار یارن خان نے اغوا کرایا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف ہی تھا کہ یارن خان میڈم کا عاشق تھا کیونکہ میں اسے ایک تارک الدنیا شخص سمجھتا تھا۔ میڈم نے مجھے نور پور جا کر یارن خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپی، میاں جی نے پھیری لگا کر سامان بیچنے والے پٹھان گلاب خان کا گیٹ اپ دیا اور میں اس سوانگ میں نور پور پہنچا۔ کھالا مجھے پہچان گیا۔ وہیں میری ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جو مجھے پہچان نہ سکی۔ ایک رات میں یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہاں خوفناک بل ٹیریر کتوں سے میرا سامنا ہوا لیکن میں ان پر بہ مشکل تمام قابو پانے میں کامیاب رہا اور اس کوشش میں زخمی ہوگیا وہیں ایک بندے سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور مقابلے کے بعد اس نے مجھے زیر کرکے چاقو سے فیصلہ کن ضرب لگانا چاہی تو ایک نسوانی چیخ سنائی دی جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز خانزادہ کی تھی۔ پرویز پر قابو پانے کے بعد میں نے تہ خانے کا دہانہ تلاش کیا۔ تہ خانے میں برکت مسیح سے مڈبھیڑ ہوئی اسے سخت تگ ودو کے بعد یرغمال بنا کر ماں جی اور سیمو کے بارے میں دریافت کیا اس کے مطابق وہ دونوں آغا نوان کے پاس تھے۔ یارن خان کے سلسلے میں ناکامی ہوئی وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا باہر پولیس نے گھیرا ڈال لیا تھا یہاں برکت میرے کام آیا میں خانزادی کو لے کر ایک سرنگ کے ذریعے باہر آگیا۔ خان زادی کو میں نے کھالے کے حوالے کیا اور ماں اور سیمو کی تلاش میں توون آغا کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اسے بے ہوش کرکے ان دونوں کو ساتھ لے کر میڈم کے پاس پہنچا مگر میڈم میری توقع کے برخلاف ناراض تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی لیکن میڈم نے اپنے رویے کی وضاحت اور ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میرے ماں باپ کے قاتل رنگو قسائی کو اس نے اٹھوا لیا تھا۔ کھالے نے بتایا کہ حیدر خان سخت پریشان ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے میڈم سے مشورہ کرکے اس ہوٹل میں ملاقات طے کرلی حیدر خان یارن کی بیٹی کو اٹھوا لینا چاہتا تھا۔ میں نے میڈم کی مرضی کے مطابق دو کروڑ میں سودا طے کیا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں میڈم میری منتظر تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ مقتل سجائے نیم باز آنکھوں سے مجھے پکار رہی تھی۔

میرا خمیر دیہات کی سوندھی اور قدامت پسند روایات میں گندھی ہوئی مٹی سے اُٹھا تھا۔ میں نے آج تک جس بھی عورت کو چاہے جانے کے قابل دیکھا، وہ پکارتی نہیں تھی، شہرِ عشق میں دیوانہ وار پکاری جاتی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر سر جھکاتی تھی، ایک ادا سے آنکھیں چراتی مگر بولتی نہیں تھی۔ 'نہیں نہیں' کے دل فہم پردے میں 'ہاں ہاں' کی تال پر بیگانا دل کی طرح دھڑکتی اور اپنے دیوانے مور کے پیروں میں رقص کی بجلیاں بھر دیتی تھی۔ یہاں معاملہ برعکس تھا۔ مجھ پر بجلیاں گرانے والی میرے خیالاتی پیچ وخم سے ناشناس، اپنی آتشیں دنیا میں دہک رہی تھی۔ سرخ ہو رہی تھی۔ تاخیر پر برہمی سے بلا رہی تھی۔ "آؤ بھی......"

تابِ پیش رفت کہاں؟ مجال انکار کہاں؟...... پیش و پس بحال، پُر قدموں نے اس کی دعوت پر سر تسلیم خم کیا اور میں گویا ہوا میں تیرتا ہوا قریب پہنچ کر اُس پر جھک گیا۔ اُس نے اپنے مرمریں جمال کے دیوانے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا پھر شعلہ زر و نوک پر گرا لیا۔

وہ عجیب ماس تھا جو جلنے کے بجائے جلا رہا تھا۔ یکبارگی یوں لگا جیسے میں برف میں لپٹی ہوئی کسی سنسان پہاڑی پر سیکڑوں میل دوڑتا ہوا اچانک آگ کے دریا میں آن گرا تھا۔ میڈم نے مجھے اپنی طرف کھینچا تھا یا وقت نے مجھے اس کی طرف دھکیل دیا تھا، یاد نہیں...... مگر اتنا یاد ہے کہ اس نے میری دیوانگی کو بڑی نرمی سے قبول کرلیا تھا۔ میں نے اُسے زور سے بھینچا، اتنا کہ اگر وہ عام لڑکی ہوتی تو اس کی پسلیاں چیخ جاتیں۔ اچانک اُس نے اپنے نخلِ جاں کی سطوتیں سمیٹ لیں اور مجھے بیڈ پر ایک جانب دھکیل دیا۔ بکھری ہوئی سانسوں میں بولی۔ "تم تو نرے پاگل ہو یار!"

یوں لگا جیسے اُس نے کہا ہو۔ "انعام لے رہے ہو یا لوٹنے کا ارادہ ہے؟"

مجھے شرمندگی ہوئی۔ بانہوں پر چہرہ رکھے اوندھے منہ لیٹ گیا اور اپنی منتشر سانسیں سنبھالنے لگا۔ وہ کروٹ بدل کر دور ہوئی، پھر قریب آگئی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ بے ربط بولنے لگی۔ "سوری شہریار! میں بھول گئی کہ تم بن بلائے نہیں آئے۔ تمہیں بلا کر دھکے دینے لگی مگر کیا ہے کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایسا کرتی ہوں۔ بلاتی ہوں، پھر اپنے آپ کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر تمہیں پرے دھکیل دیتی ہوں۔ محبت کرتی ہوں مگر محبت کرنے والے سے ڈر جاتی ہوں۔ شاید میں بہت خود غرض ہوں۔ ہے ناں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی انگلیوں کی پوروں سے کیف و سرور کی الوہی لپٹیں نکل کر میرے پورے وجود میں سرایت کر رہی تھیں۔ دل کی سرمئی سلیٹ پر چاک سلیٹی گدگدا کر ہولے ہولے پھسل رہی تھی اور نئے نئے لفظ نقش کر رہی تھی جن کا مفہوم عمر تمام ہونے تک کھلتا رہتا ہے۔

جواب نہ پا کر اُس نے کہا۔ ”تم نہیں بولتے۔ نہ بولو۔ کیونکہ تم نے جو کچھ بولنا تھا، بول دیا۔ میں نے جو کچھ سننا تھا، سن لیا۔ دنیا میں اور کہنے سننے کے لیے ہے بھی کیا؟“

ایک طرف میں اپنی زیروزبر ہوتی ہوئی دنیا کو اُس کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف اس کے وجود کی مخصوص مہک مجھے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ میری انگلیاں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ ایسے میں دروازے پر دستک ابھری۔ یاد آیا کہ اُس نے کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ موقع غنیمت تھا۔ سو جلدی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ کھانے کے لوازمات سے لدے پھندے دو باوردی روم بوائز گیلری میں کھڑے مودبانہ انداز میں اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ اجازت پا کر اندر آئے اور مشاقانہ انداز میں چند ہی لمحوں میں کھانے کی میز سجانے لگے۔

کھانے کے دوران میڈم بہت سنجیدہ تھی مگر چہرہ سرخی مائل تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ کبھی نورپور گئی ہیں؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ ”کب؟“

اس نے سوپ کا چمچ منہ میں ڈالا، بولی۔ ”مدت پہلے۔“

وہ کھانے میں منہمک تھی۔ میں نے چور نظروں سے اُسے دیکھا۔ اس کے بدن کی نزاکتوں کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ کہاں بیٹ خیرپور کا جفاکش ماحول، کچا اور زبوں حال گھر، کہاں بابا گامن، اس کی بیوی اور سیمو...... کہاں میرے سامنے بیٹھی طرح دار اور بے انتہا امیر لڑکی؟ ایک ہی ذات میں دکھائی دینے والا زمین و آسمان کا ملاپ نہ صرف مجھے حیران کر دیتا بلکہ مشکل میں بھی ڈال دیتا تھا۔

اُس نے اتالک 'وی' شکل کے گلے والی دورنگی قمیص پہن ہوئی تھی۔ آدھی آتشیں سرخ، آدھی زرد۔ دونوں رنگوں کے ملاپ پر سنہری پتیوں والی بیل گلے سے نیچے تک چلی گئی تھی۔ سفید کروشیائی پٹی دائیں کندھے کی طرف جا کر بالوں کے نیچے غائب ہو جاتی تھی۔ سیاہ بالوں اور سرخ قمیص سے جھلکتی ہوئی گلابی سفید گردن پر نظریں بے اختیار پھسل پھسل جاتی تھیں...... اُسے دیکھے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔

آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ کہتے ہیں کہ خوب سے خوب صورت تر انسان بھی ہر نظر کو حسین نہیں لگتا۔ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ دنیا میں ایسی بھی کوئی نظر ہو گی جسے میڈم شکیلہ خوبصورت نہیں لگے گی؟...... غیر ارادی طور پر میرا سر نفی میں ہل گیا اور دل نے کہا۔ ”نہیں! ایسا کوئی بینا نہیں ہو گا جسے وہ اچھی نہیں لگے گی۔“

میرے وسیب کے لوگ کہتے تھے کہ عورت کے نین نقوش کا تیکھا پن حسن ہوتا ہے۔ غزالہ کا حسن تیکھا تھا۔ اس کی ناک ستواں تھی۔ آنکھیں ہرنی جیسی۔ انگلیاں لمبی اور مخروطی جن کے سروں پر لمبے خم دار ناخن چسپاں تھے۔ باریک ہونٹ اور چھریری جلد والا چہرہ۔ اسما اُس سے دو چار گام آگے تھی۔ اس کے نقوش بھی قاتل تھے۔ خانزادوں کی ساری اولاد ایسی ہی تھی۔ مگر میڈم ایسی نہیں تھی۔ اس کی ناک لمبی اور ستواں نہیں تھی۔ ناخن لمبے نہیں تھے، ننھے منے اور گول گول جبکہ آنکھیں بھی بچوں کی طرح بڑی اور گول تھیں۔ ہونٹ نسبتاً موٹے تھے۔ میرے ذہن پر بچپن سے نقش حسن کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھی مگر وہ ہر معیار پر بھاری پڑ گئی تھی۔ کیوں اُسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا......

تب سمجھ میں آیا کہ حسن کا کوئی معیار ہوتا ہے، نہ پیمانہ۔ وہ اپنے حسن سے بے نیازانہ سلوک روا رکھنے کے باوجود گداز اور دل کش تھی۔

اس نے ٹشو پیپر کھینچا۔ مجھ پر نظر ڈالی۔ شرارت سے بولی۔ ”اب چھوڑو بھی! سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ اب کھانا کھالو۔“

میں ٹھٹکا۔ اپنی چوری پکڑے جانے پر تھوڑا سا گھبرایا، بولا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں دل ہی دل میں آپ کا موازنہ دوسری لڑکیوں سے کر رہا ہوں؟“

وہ مسکرائی۔ ”مرد جب بھی کسی لڑکی کو دیکھتا ہے تو وہ غیر اختیاری طور پر اس کا تقابل پہلے دیکھی ہوئی لڑکیوں سے کرنے لگتا ہے۔ شاید لڑکیاں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔“

میں نے سر جھکا لیا۔ وہ اُٹھی اور پردہ ہٹا کر بالکونی میں چلی گئی۔ وہ میرے حواس پر بار بار یلغار کر رہی تھی اور میں اُسے ذہن سے جھٹکنے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھا۔ تبھی اچھی طرح کھانا بھی نہ کھا سکا۔

وہ بولی۔ ”کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو روم بوائے کو بلا لینا۔ وہ برتن لے جائے گا۔“

تھوڑی دیر بعد، میرے بلائے بغیر، روم بوائے جھوٹے برتن سمیٹنے کے لیے آ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میڈم نے مجھے بلایا۔ ”شہریار! ادھر آؤ، دیکھو تو یہ شہر کتنا

خوب صورت ہے۔“

میں بالکونی میں آیا جو بیک وقت بالکونی بھی تھی اور چھوٹی سی لابی بھی۔ کمرے کی عقبی دیوار بڑی سی نصف دائروی کھڑکی پر مشتمل تھی جس کے پار، نیچے، روشنیوں کا جہان آراستہ تھا۔ وہ کھڑکی کھولے کھڑی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُس کے بالوں سے کھیل رہے تھے۔ نظریں آڑے رُخ متحرک روشنیوں سے سجی ہوئی شاہراہ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے قرب کو محسوس کر کے بولی۔ ”کتنا بڑا شہر ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے، بتیاں دکھائی دیتی ہیں۔ گاڑیاں ہی گاڑیاں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس شہر کا ہر شخص کار میں بیٹھ کر شام کا منظر دیکھنے نکل پڑا ہو۔“

وہ درست کہہ رہی تھی۔ شہر کا نظارہ بڑا روح پرور تھا۔ ایسے ہی وقت میں ہوا کا جھونکا شریر ہو گیا اور پہلو بدل کر ہم سے ٹکرایا۔ اس نے دو تین لمبی سانسیں پھیپھڑوں میں اُتاریں، بولی۔ ”خدا نے آکسیجن کو بڑے روپ دے رکھے ہیں۔ صحرا میں برہم اور سیخ پا ہوتی ہے، پہاڑوں پر سرسراتی، چکراتی اور ڈراتی ہوئی آوارہ پھرتی ہے...... واؤ...... شہریار! انسان بھی ہوا جیسا ہے۔ آتا ہوا نظر آتا ہے۔ جاتا ہوا دکھائی تک نہیں دیتا۔ جھونکے کی طرح من چلا...... ہے ناں؟“

میں اپنے ہاتھ ونڈو کی سرخ پٹی پر رکھ کر جھک گیا، بولا۔ ”عام شخص اتنی گہری اور پیاری باتیں نہیں کر سکتا۔ ایسے لفظوں کی ادائیگی کی آبیاری فنکارانہ آنکھ کرتی ہے۔ آپ کی ہر ادا شاعرانہ ہے، اتنے نفیس خیالات کا مالک کیونکر جرم کرتا ہے؟ کیونکر گینگسٹر بن جاتا ہے؟...... بتائیں! آپ کی شخصیت میں اتنا بڑا تضاد کیوں ہے؟“

وہ ہنسی۔ فضا میں جلترنگ بج اُٹھے۔ نہ جانے کیا ہوا کہ ہنستے ہنستے بدحال ہو گئی۔ دُہری ہو کر سیدھی ہوئی تو اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ چہرہ بجھ سا گیا تھا اور لہجہ گلوگیر، ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ”ہاں! فنکار معصوم ہوتا ہے۔ فطرت کو بدصورت نہیں کرتا مگر میں ایسی ہی ہوں۔ دنیا کو خوبصورت دیکھنا چاہتی ہوں مگر ظلم کرتی ہوں۔ زندگی سے پیار کرتی ہوں اور اسے قتل بھی کرتی رہتی ہوں۔ مجھ میں دولت کی ہوس نہیں ہے مگر میں دونوں ہاتھوں دولت سمیٹتی ہوں۔ میرا بینک بیلنس ایفل ٹاور کی طرح بلند ہو چکا ہے اور تم میری دولت کا اندازہ تک نہیں کر سکتے مگر......“

اس نے بچوں کی طرح اپنا بازو آنکھوں پر رکھ دیا اور سسکنے لگی۔ ہچکیاں لینے لگی۔ میں ایک دم بوکھلا گیا۔ بے سوچے سمجھے اُس کی بانہہ پکڑ کر آنکھوں سے ہٹائی اور اس کی تر آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ”پلیز میڈم! میرے سامنے مت روئیں۔ مجھے آپ کا رونا اچھا نہیں لگتا۔ کمزور لوگ رویا کرتے ہیں۔“

اس کا رونا جیسے یک لخت شروع ہوا تھا، ایسے ہی ایک دم تھم گیا۔ آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی، بولی۔ ”تم نے ٹھیک کہا۔ میں کمزور نہیں ہوں۔ مگر کیا میں انسان بھی نہیں ہوں؟ کیا میرے سینے میں دل نہیں ہے جس میں بھرا ہوا غبار رونے سے ہلکا ہوتا ہے؟“

وہ بہت معصوم اور ملول تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھنے والا یہ یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ وہی میڈم شکیلہ تھی جس کے رعب و دبدبے سے پولیس گھبراتی تھی۔ جس کے نام پر حوالات کے آہنی دروازے چشم زدن میں کھل جایا کرتے تھے اور سرکاری روزنامچوں کے اوراق پھٹ جاتے تھے۔

میں نے اس کا سوگوار چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا اور احترام آمیز محبت کے ساتھ کہا۔ ”میڈم! میں آپ سے محبت کرتا ہوں تبھی آپ کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ آپ اپنا دکھ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔ میرا وعدہ رہا کہ میں کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا اور آپ کے تمام کانٹے آنکھوں سے چن لوں گا۔ پلیز! مجھ پر بھروسا کریں۔“

اس نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ چند لمحے یک ٹک دیکھتی رہی پھر آزردہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر گلوگیر آواز میں بولی۔ ”شہریار! اگر مجھے تم پر بھروسا نہیں تو میں کیوں تمہیں اتنا قریب کر لیتی ہوں؟ تم نے کبھی نہیں سوچا۔ اعتبار محبت کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ میں یہ مرحلہ تمہیں پہلی نظر دیکھتے ہی عبور کر گئی تھی ورنہ تم سے زیادہ بہادر اور خوب صورت اس شہر میں موجود تھے۔ مگر...... مگر یہ دل ہر کسی پر نہیں کھلنا چاہتا تھا۔“

اس کے بولنے کا انداز میرے دل میں اُتر گیا۔ مجھے خود پر اختیار نہیں رہا۔ ہاتھ پھسلنے لگے۔ سینہ فرطِ انبساط سے پھیلنے لگا اور میں نے اُسے سینے میں چھپانے کی پوری کوشش کر ڈالی۔ وہ اپنا متورم چہرہ میرے سینے پر رگڑنے لگی، لمبی لمبی سانسیں لینے لگی، بولی۔ ”شہریار! تم بہت اچھے ہو۔ اتنا، کہ کوئی بھی نہیں، دنیا بھر میں شاید...... ہاں! تبھی کہتی ہوں کہ میں مشین نہیں ہوں، روبوٹ نہیں ہوں۔ سوچتی اور سوچ سوچ کر کڑھتی بھی ہوں۔ آج تمہیں بتاتی ہوں کہ میں کن راستوں سے گزر کر اس مقام تک پہنچی تھی۔ کم آن...... آج کی رات صرف میری اور تمہاری ہے۔ اس میں کوئی تیسرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

شخص موجود نہیں ہے۔ میں نے ارادتاً اس پرسکون ہوٹل کا انتخاب کیا ہے کیونکہ کوٹھی میں اتنا لمبا تخلیہ میسر نہیں آتا۔“

وہ مجھ سے چپکی رہ کر بیڈ تک گئی۔ ایک جھٹکے سے علیحدہ ہوئی اور مجھے بیڈ پر دھکا دے کر کمرے کے دروازے کے قریب رکھے شیشے کے ڈور والے فریج کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پلٹی تو اس کے ہاتھ میں نارنجی اور سرخ رنگ کے لیبل والی ’اسکاچ‘ کی بوتل، گلاس اور ڈسپوزیبل پلیٹ میں رکھے ہوئے شفاف برف کے چند چوکور ٹکڑے نظر آئے۔ تب سمجھ آئی کہ میری اور اس کی ملاقات حادثاتی نہیں، اہتمام شدہ تھی۔ وہ خود کو بہلانے کے تمام ہتھکنڈے ساتھ لائی تھی۔

مجھے دیکھے بغیر اُس نے جام تیار کیا۔ آئس کیوب گلاس میں ڈالا، لبوں سے لگایا اور ننھی سی سپ لے کر مجھے دیکھنے لگی۔ ”آگ میں برف ملا کر پینا اچھا لگتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ شراب نہ پیا کریں میڈم! یہ انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو نگل جاتی ہے۔“

”نہیں...... یہ تم نے نہیں، ڈاکٹر منور شاہ نے کہا ہے۔ تم اس کی زبان بولتے ہو۔ اس کے رٹائے ہوئے سبق دُہراتے ہو۔“

میں بری طرح چونکا۔ ”آپ ڈاکٹر شاہ جی کو جانتی ہیں؟“

وہ مسکرائی۔ ”ہاں! وہ بڑا آدمی ہے۔ بہت بڑا...... اتنا کہ میری نظریں اُس کے قد کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اُسے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ تم نے اُسے صرف مردم بیزار ڈاکٹر کے روپ میں دیکھا ہے جبکہ میں نے اُسے حقیقی رنگ میں دیکھا تھا۔ وہ بہت بڑا بہروپیا ہے۔ تمہارے خانزادوں سے بھی بڑا......“

میں الجھی ہوئی نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔

وہ بولی۔ ”ہاں تو...... اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ وہ بے خوف ہے۔ ڈرتا نہیں ہے۔ گن، گولی، موت اور عورت...... وہ کسی سے ہارتا نہیں ہے۔“

اس کی بے خوف سرشت کا تو میں ازخود قائل تھا۔ پھر بھی میڈم کے ہونٹوں پر یہ باتیں غیر یقینی اور عجیب لگیں۔ خاموش رہا۔ اس نے مجھے لیٹنے کا اشارہ کیا۔ میں تکیے کی ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا تو وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور پینے لگی، گھونٹ گھونٹ۔ پینے سے اُس کے ہونٹ بہت زیادہ سرخ ہو جایا کرتے تھے۔ آج نیلے پڑنے لگے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ شرابیں زہریلی بھی ہوتی ہیں۔ دل میں ڈرا کہ وہ شراب بھی زہریلی نہ ہو جو اس کے حلق میں اُتر رہی تھی۔ میں نے اپنے وہم کا اظہار کیا۔ وہ ہنسی۔

”نہیں ڈیئر! زہر دیسی شرابوں میں ہوتا ہے، ولایتی میں نہیں۔ ڈرو مت، مجھے کچھ نہیں ہوتا۔“

اس نے ایک اور گلاس تیار کیا اور تھام کر میرے قریب کھسک آئی۔ بغیر کچھ کہے گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا تو وہ مسکرانے لگی۔ آنکھوں میں نمی، چہرہ متورم اور لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ...... قوسِ قزح کے تمام رنگ اُس کے چہرے پر رقص کر رہے تھے۔ میں نے گلاس لبوں سے نہیں لگایا۔ اس نے بھی پینے کا حکم نہیں دیا بلکہ میری ٹائی کی ناٹ کھولنے لگی۔ کوٹ اور شرٹ کے بٹن بھی کھول دیے۔ سینے پر باریک بنیان رہ گئی۔ وہ اُٹھ کر صوفوں کے بیچ رکھی میز کے پاس گئی۔ پھل کاٹنے کی ننھی سی کند چھری تھامے بیڈ پر چڑھ آئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری بنیان کاٹ کر سینہ عریاں کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے چند ہی لمحوں میں میرے اندازے کی توثیق کر دی۔

کھلونے کے ساتھ بے رحمی سے کھیلا جائے، مجنونانہ انداز میں توڑنے کی کوشش کی جائے، نرمی اور محبت کا سلوک کیا جائے، وہ خاموش رہتا ہے۔ میں بھی خاموشی سے اُس کی اضطراری حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے گلاس تھاما، ایک گھونٹ بھرا، ایک مٹھی میں میرے سینے کے بال بھرے...... بولی۔ ”شہریار! تم نے کہا تھا کہ تم میرا دکھ کسی پر عیاں نہیں کرو گے۔ تھینک یو...... مگر کیوں؟“

میں متذبذب ہو گیا۔ کوئی جواب نہ دے پایا۔ وہ گویا ہوئی۔ ”تم اگر میری کہانی کو اشتہار بنا دو گے، زبان زدِ عام کر دو گے، تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اس نے ایک ذرا توقف کیا، گھونٹ بھرا، بولی۔ ”کیا میں اس شہر کی عزت اور عظمت کا ٹاور ہوں؟ کیا میں بہت نیک نام اور پردہ دار خاتون ہوں؟...... نہیں میری جان! میں ایک بدنام گینگسٹر ہوں۔ پولیس میرے نام سے کانپتی ہے۔ نام نہاد عزت دار سیاست دان میری دہلیز پر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اپنا اپنا مطلوبہ مال مانگتے ہیں۔ کسی کو جوانی چاہیے۔ کسی کو جوانی قائم رکھنے والا جام چاہیے۔ کسی کو دشمن کی جوانی نگلنے والی بلٹ چاہیے تو کسی کو بلٹ پروف جیکٹ۔ میں سب کو دیتی ہوں۔ بیچتی ہوں۔ ایک کی عزت دوسرے کے ہاتھ پر رکھ کر دام کھرے کرتی ہوں۔ ایک کی جان لیتی ہوں۔ دوسرے کی خباثت میں جان ڈالتی ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ میری باتیں کریں۔ پہلے کیا کم کرتے ہیں؟ ہر کوئی سوچتا ہے کہ میں کون ہوں اور اچانک کہاں سے نمودار ہو کر اس شہر کو مٹھی میں لے بیٹھی ہوں۔ سنو! میرو

شاہ کے سینے میں میرا ایک ایک راز چھپا ہے۔ وہ بولنے بھی لگ جائے تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ آپ اتنی بلندی پر پہنچ چکی ہیں کہ بدنامی کی گرد آپ تک نہیں پہنچ سکتی۔“

”شاید۔“

وہ سر جھکا کر گلاس سے کھیلنے لگی۔ کافی دیر گزر گئی۔ وہ مجھے ہمراز کرنے کا فیصلہ کر کے یہاں آئی تھی۔ لبِ بام پھر سوچنے لگی تھی۔ نال سے نکلی گولی، کمان سے نکلا تیر اور زبان سے نکلی بات پر اختیار نہیں رہتا۔ اپنی سوچ کو منطقی انجام دینے کے بعد سر اُٹھا کر بولی۔ ”جو محبت کرنا چاہتا ہے، وہ اتھاہ کے اندھے کنویں میں چھلانگ لگاتا ہے۔ اگر کنواں پناہ دے دے تو محبت امر ہو جاتی ہے ورنہ انسان اندوہناک حالات کا شکار ہو جاتا ہے۔ میرے من میں محبت کی طلب تھی۔ اتنی، جتنی عام آدمی میں نہیں ہوتی۔ مگر میں بھٹکنا نہیں چاہتی تھی مگر بھٹک گئی۔ کنواں مجھے سنبھال نہیں پایا اور میں چندو ماہی سے میڈم شکیلہ بن گئی۔ کہانی طویل، راز مختصر...... بس اتنا سا!“

اس نے اپنے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے مجھے ’راز‘ کا چھوٹا سا سائز بنا کر دکھایا جیسے راز اپنا مختصر سا مادی وجود رکھتا ہو۔ میں نے بے اختیار پوچھا۔ ”راز کیا؟“

اس نے گلاس میرے لبوں پر رکھ دیا۔ گلاس کا ملائم پیندا میرے لبوں پر ہولے ہولے رگڑنے لگی پھر اُسے ہٹا کر مجھ پر گر گئی۔ اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا کر بولی۔ ”مرد کا سینہ کنواں ہوتا ہے۔ اندھا۔ پناہ دینے پر آئے تو دنیا کو سمیٹ لے۔ یوں جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پروں تلے سمیٹ لیتی ہے۔ نگلنے پر آئے تو دنیا کے سب سے بڑے جذبے، جسے محبت کا نام دیا جاتا ہے، کو نگل جاتا ہے۔ صرف بدن کا قلعہ فتح کرنے کے لیے...... چند گرم سانسوں کے حصول کے لیے...... اپنی تخلیق کے ابتدائی فطری لمحے کو دیکھنے کے لیے...... ہاں! میں تمہارے سینے پر لیٹ کر سکون لیتی ہوں۔ مزہ آتا ہے۔ پناہ کا احساس ملتا ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم انسان ہو۔ پناہ دینے والے کی طرح اعلیٰ ظرف ہو۔ میں بولتے بولتے سو بھی گئی تو تم مجھے جگاؤ گے نہیں۔ مجھے کھیلنے دو گے مگر اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو گے۔ یہی اعتماد ہے جو محبت کی کلیدی کنجی ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“

اس کی آواز بتدریج مدھم ہو رہی تھی۔ ”شہریار! مجھے بولنے دینا۔ بھلے رات گزر جائے، بھلے دن ہو جائے...... مجھے نہ روکنا۔ میرو شاہ سمیت آج تک مجھے کسی نے نہیں سنا، نہ سننے کی آرزو کی...... تمہاری آرزو کو سلام، تمہاری محبت کو سلام......“

اس نے میرے سینے پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھے، پھر گال، پھر ہولے ہولے بولنے لگی۔ ایک کہانی ترتیب دینے لگی جس کا مرکزی کردار وہ خود ہی تھی۔ چونکہ سنانے والی دنیا کی خوب صورت لڑکی تھی اور کہانی کا ہر ایک کردار مجھے حیران کر دینے والا تھا، اس لیے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کمرے کے دیوار و در سمیت ہر چیز سے اُس کی خمار آلود سرگوشیاں پھوٹنے لگی تھیں اور میرا پورا وجود پردۂ سماعت بن کر اسے سننے لگا تھا۔

☆☆☆

کہانی اچھی بھی ہوتی ہے، بری بھی جو ایک ہی معاشرے میں جنم لیتی ہیں۔ جس طرح زندگی ایک ہی طریقے سے جنم لیتی ہے۔ مور جھومتا ہے۔ مورنی پکارتی ہے۔ انتشار کے انتہائی لمحات میں تخلیق کا بیج نمو پاتا ہے۔ انسان کی تخلیق کے لیے بھی قدرت نے یہی طریقہ وضع کر رکھا ہے مگر اس پر کھنچی ہوئی مذہب اور اخلاق کی حدیں اس پر جائز اور ناجائز کی پیشانیاں آویزاں کرتی ہیں۔ آنے والا اپنے لائے جانے کے طریقے سے لاعلم اور بے نیاز ہوتا ہے مگر اس کے چہرے پر کلنک کا بدنما دھبا پیدا ہوتے ہی ثبت ہو جاتا ہے۔

اس کی زندگی اور کہانی کی پیشانی پر لکھی ہوئی تحریر میں اس کی منشا شامل نہیں تھی۔ اس کے گورے اور گداز چہرے پر سیاہ بدنما داغ دور سے دکھائی دیتا تھا۔ یہ کلنک کس پر یمی جوڑے کی تھی، یہ نہ تو اُسے علم تھا اور نہ دیکھنے والوں کو۔ وہ دریا میں بہتی ہوئی آئی تھی اور قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اس نے دریا میں بہت کم وقت گزارا تھا۔ کم سفر طے کیا تھا۔ نوزائیدہ بچی کا مختصر سا وزن لکڑی کی اُس چوکی نے بہ آسانی سہار رکھا تھا جس پر اُسے کمبل میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا ورنہ اس کی زندگی کی پہلی سانسیں ہی گھٹ جاتیں اور وہ آنے جانے کی حد تک زندگی کا سفر طے کر پاتی۔ اُسے کس ماں نے الوداع کیا تھا؟ معلوم نہیں۔ وہ کس باپ کا لختِ جگر تھی؟ معلوم نہیں۔ بس! یہ طے تھا کہ وہ اُسی علاقے کی جنونی کہانی کا انجام تھی۔

دریا جوبن پر تھا جب چاند والی شام حبس آلود فضا کو اپنی چادر میں چھپانے لگی۔ تاحدِ نگاہ بے چین لہریں ٹھاٹیں مار رہی تھیں۔ زمین کے کٹاؤ کی مہیب آوازیں گاہے بہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

گا ہے سنائی دیتی تھیں۔ غلام محمد عرف گامن دریا کے کنارے کنڈیاں ڈالے بیٹھا تھا۔ تب معاشرہ اتنا بے ایمان اور منافق نہیں ہوا تھا کہ یہ مزدوری بند ہو جاتی۔ علاقے میں کوئی مچھلی گھر نہیں بنا تھا جہاں مہینا بھر میں مچھلیوں کا پور جوان ہو جاتا ہے۔ دریا سے پکڑی گئی مچھلیاں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ ٹھیکیدار کم تھے، جال کم تھے، اس لیے پونگا (نوزائیدہ مچھلیاں) پکڑنے اور مرنے سے بچ جاتا تھا۔ گامن کی طرح کئی مچھیروں کی روزی بنی ہوئی تھی۔

دریا کا پانی تیز ہونے کی وجہ سے وہ خاصا مایوس تھا۔ جب بھی کنڈی جھٹکے لیتی، وہ ڈور کھینچتا، دیکھتا تو چہرہ بجھ جاتا۔ کوئی چھوٹا یا بڑا کچھوا اس کی محنت پر پانی پھیر دیتا۔ اُسے کنڈی پر ٹانکے گئے ملپ ضائع ہونے کا دکھ ہوتا۔ ایسے ہی وقت میں جب اس نے دو کنڈیاں سمیٹ لی تھیں، ایک کو مخصوص جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ بیزاری سے دیکھ رہا تھا، دریا کے گدلے پانی پر رنگ برنگ کپڑا تیر کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے آنکھیں پھیلائیں، غور سے دیکھا مگر سمجھ نہ پایا۔ طغیانی کے دنوں میں دریا میں بہت کچھ دیکھنے کو ملتا تھا۔

اُسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا چیز تھی جو تیرتی ہوئی چلی آرہی تھی اور بہتی ہوئی اس کے برابر سے آگے گزر گئی۔ اُس کا فطری تجسس بیدار ہوا۔ ڈور کو ایک درخت کی باہر کو نکلی ہوئی جڑ سے باندھا، لنگوٹ کسا اور کٹاؤ دار کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا اس تیر کر آتی ہوئی رنگین شے سے کافی آگے نکل گیا۔ پھر فاصلے کا اندازہ کر کے دریا میں کود گیا۔ زندگی انہی لہروں کے ساتھ کھیلتے گزری تھی۔ اعصاب مہم پسند اور فولادی تھے۔ جسم میں جان تھی۔ چند لمحوں میں ہی باہیں مارتا ہوا اس نہ سمجھ میں آنے والی کپڑوں کی پوٹلی تک پہنچ گیا۔ چھوٹی سی چوبی چوکی پر سمیٹ کر رکھا ہوا ننھا سا مخملیں کمبل اُس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کمبل میں سنبھالی ہوئی چیز سے نا آشنا نہیں تھا۔ چار سال قبل اس کی دبلی پتلی بیوی تاجاں نے ایسی ہی ایک گوشت پوست کی گڑیا کو جنم دیا تھا۔

ناف تک جسم پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ باقی آدھا جسم ایک دم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ کافی دیر تک دونوں ہاتھوں میں چوکی اُٹھائے کھڑا رہا۔ سوچتا رہا۔ اُسے دریا میں ڈال کر پلٹ جائے یا دریا سے نکال کر زندگی کی طرف لے جائے۔ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ بچی تھی یا بچہ...... چونکہ اُسے دیکھتے ہی گامن کے شعور میں اس کی چار سالہ بیٹی سرداراں کا چہرہ ابھر آیا تھا، اس لیے اس نے تصدیق کیے بغیر اُسے بچی قرار دیا۔ بچی کے نقوش دھندلے تھے مگر رنگ اتنا سفید تھا کہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس کے منہ میں ننھی سی چوسنی دبی ہوئی تھی جسے وہ 'چُچ چُچ' کر کے چوس رہی تھی اور اس سے دودھ کے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا انتظار کبھی رنگ لانے والا نہیں تھا۔

گامن کے ہاتھ کانپنے لگے۔ نادان نہیں تھا۔ جان چکا تھا کہ بچی حادثاتی طور پر دریا کی نذر نہیں ہوئی بلکہ اُسے کسی نے اہتمام سے دریا میں ڈال کر الوداع کیا تھا۔ چوکی، کمبل، کمبل کی مخصوص گرہیں اور چمک دار چوسنی...... اس کی ماں کے دل میں بچی کو خالی ہاتھ موت کے سفر پر روانہ کرنے کا یارا نہیں تھا اس لیے اس نے جہیز بھی ساتھ روانہ کر دیا تھا۔

گامن نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ بڑبڑایا۔ "مولا سائیں! ایہڈیاں رمزاں اساں نمانیاں دے وَسّوں باہر ہن......"

(مولا سائیں! تیری باتیں ہم بے کسوں سے بالاتر ہیں)

وہ اس بچی کی ماں کی طرح اُس کی چوکی کو سطحِ آب پر نہ رکھ سکا اور ہاتھوں میں بلند کیے پتن پر آ گیا۔ چوسنی بچی کے منہ سے نکل گئی اور وہ اپنی باریک آواز میں چلانے لگی۔ اس نے چوسنی اُس کے منہ میں ڈالی اور اپنی ڈور کھول کر کھینچنے لگا اور اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی جب ایک بڑی سنگھاڑا مچھلی سطحِ آب پر "شڑاپ" کی زوردار آواز کے ساتھ تڑپی۔ پہلی نظر میں ہی گامن کو اندازہ ہو گیا کہ وہ سات آٹھ کلو وزنی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ڈور کھینچتے ہوئے دل ہی دل میں اس کو شہر میں بیچنے سے ملنے والی تگڑی رقم کا شمار کرنے لگا۔ مچھلی ہاتھ میں آ گئی تب بھی حلق سے کنڈی نکالنے کے لیے مچل رہی تھی۔ گامن مچھیرے کے ہاتھ سے کئی مرتبہ پھسلی پھر اس کے گلپھڑے جواب دینے لگے۔ ایسے میں گامن کی نظر آسمان پر اظہارِ تشکر کے لیے اُٹھی۔ متشکر آنکھوں نے خلا میں جگمگاتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ کتنا اجلا اور پیارا لگ رہا تھا۔ ایک نظر چاندنی میں چمکتی ہوئی مچھلی پر ڈالی۔ اوپر آسمان کا راجا ناچ رہا تھا۔ نیچے دریا کی رانی اپنی آخری تڑپ کا زور توڑ رہی تھی۔

گامن کی بے اختیار نظریں کمبل میں لپٹی ہوئی چوسنی کو زور زور سے چوستی ہوئی بچی پر پڑیں۔ اس کے منہ سے نکلا۔ "چاند جیسا رنگ ہے، مچھلی جیسا وجود...... مولا سائیں! ایہ تو نری چاند ماہی ہے۔"

چاند ماہی کا وجود مچھیروں کی چشمِ تصور پر جگمگاتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر دریا میں ایک مچھلی ایسی ہوتی ہے جس کا روپ چاند سے بھی اجلا ہوتا ہے۔ قسمت سے ملتی ہے اور جس کو ملتی ہے، اس کی دنیا لمحوں میں بدل جاتی ہے۔ تصوراتی

مچھلی، چاند ماہی، جس کا بالائی آدھا دھڑ عورت کا، زیریں نصف سنہری مچھلی کا، کسی شوخ آرزو کا نام تھا۔ تشنہ کام خواہش کا مگر گامن کی آرزو بر آئی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ سوچا۔ "گامن! تیری قسمت سوہنے رب نے چمکا دی ہے۔ دیکھ! یہی تو چاند ماہی ہے۔ چل چندو ماہی...... میرے کچے گھر میں اپنی روشنی لے چل......"

گامن اور تاجاں نے کئی دن ڈرتے ڈرتے گزارے۔ ہر آن دھڑکا لگا رہا کہ چندو ماہی کے وارث آ کر اُسے لے نہ جائیں لیکن دریا میں پھینکنے والے نے اُس کا تعاقب کرنا ہوتا تو پھر اپنی روح کے جزوِ معتبر کو موجوں کے حوالے کرتا ہی کیوں......؟

دونوں میاں بیوی سادہ لوح تھے۔ جھوٹ بولتے تھے تو ان کے چہروں پر تذبذب جھلکنے لگتا تھا۔ ہزار چھپانے اور باتیں بنانے کے باوجود لوگوں نے بھانپ لیا کہ کالے بدنوں والے گامن اور تاجاں کے گھر میں کسی امیر زادی کا لختِ جگر آن گرا ہے۔ شہروں میں بندے بولتے ہیں مگر کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ دیہاتوں میں فضائیں بولنے لگتی ہیں اور ہر کان ہمہ تن ہو جاتا ہے۔ بدنامی کی بات راتوں رات میلوں کا سفر طے کر جاتی ہے۔ چندو ماہی کی خوبصورتی کا قصہ بھی دنوں میں آدھے ضلعے میں گونجنے لگا۔ دریا پار بھی ڈھول بج گئی۔

ابھی وہ ڈیڑھ ماہ کی تھی کہ دریا پار کے جاگیردار رب نواز کے خصوصی کارندے امام بخش عرف ماموں نے گامن کو پتن پر آن گھیرا۔ گھما پھرا کر چندو ماہی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اس نے اپنا رٹا رٹایا جملہ دہرایا۔ "او میڈی دھی ہے، تساں لوک اوندا ناں کیوں چیندے ہوے؟"

(وہ میری بیٹی ہے۔ تم لوگ اس کا نام کیوں لیتے ہو؟)

ماموں نے آنکھیں دکھائیں۔ بات نہ بنتی دیکھی تو براہِ راست اور کھلم کھلا بات کرنے کا فیصلہ کیا، کہا۔ "دیکھ گامن! تو غریب آدمی ہے۔ ساری عمر ایسے ہی مچھلیاں پکڑتا اور بیچتا رہے گا۔ کبھی آگا ننگا تو کبھی پیچھا۔ میری مان! میرے بھاگ وند کا بانہہ بیلی بن جا۔ میرے بھاگ وند (مالک) کو تو جانتا ہے۔ شمال سے جنوب تک اس کی زمینیں پھیلی ہوئی ہیں۔ مٹی کو ہاتھ لگاتا ہے، مٹی سونا بن جاتی ہے۔ وہ تجھے بھی چھو کر سونا بنانا چاہتا ہے۔"

گامن کچھ نہ سمجھا۔ ہونقوں کی طرح دیدے گھما کر بولا۔ "پر ماموں بھرا! ڈسا...... ذرا کھل کے ڈسا تاں میکوں کجھ پتا لگسی۔"

(مگر ماموں بھائی! بتا، ذرا کھل کے بتا تو مجھے کچھ پتا چلے گا)

ماموں کھل کر بتانے اور اپنی بات منوانے آیا تھا۔ بولنے لگا۔ "دیکھ گامن! بھاگ وند کو پتا چلا ہے کہ تجھے دریا سے ایک بچی ملی ہے۔ اس کا نام تو نے چندو ماہی رکھا ہے۔ کیا تجھے پتا ہے کہ اُسے میر کریم بخش جام کی کنواری بیٹی نے جنم دیا ہے۔ میر کریم کا بانہہ بیلی نورا رات دن اس کے گھر آتا جاتا ہے۔ میری بات سمجھ رہا ہے ناں؟"

اس کی سمجھ میں ماموں کی بات نہیں آئی، بولا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

ماموں رازدارانہ انداز میں سر جوڑ کر بولا۔ "گامن! یہ سچ ہے کہ یہ بچی میر کریم بخش کا ہی گندا خون ہے۔ میرا بھاگ وند چاہتا ہے کہ تو اور تیری تریمت (بیوی) ہر پوچھنے والوں کو یہی بتایا کرے۔ دیکھ ناں! جس کا گند ہو، اس کے ویہڑے میں ہی ڈالا جائے تو اچھا ہوتا ہے۔"

گامن نے پیش و پس سے کام لیا۔ وہ میر کریم بخش جام کو جانتا تھا۔ سردار رب نواز کے پائے کا زمیندار تھا۔ دونوں کے خاندان دریا پار کے بیٹ میں رہتے تھے۔

اس کے تامل پر ماموں نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی، زبردستی تھمائی اور کہا۔ "سردار نے تیرے لیے اتنے سارے پیسے بھیجے ہیں۔ اور چاہئیں تو منہ سے پھوٹ۔ کل بھاگ وند سے لے آؤں گا۔ اور دیکھ گامن! تو سردار رب نواز سے یاری گانٹھ لے گا تو ہڈ پیر ہلائے بغیر عیش کی زندگی گزارے گا۔"

اس کے ہاتھ سے نوٹوں کی گڈی چھوٹ کر ریت پر گر گئی۔ سختی سے نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں ماموں بھرا! میں اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتا۔ اِدھر میرے منہ سے یہ بات نکلے، اُدھر میر صاحب کی پگڑی زمین پر دھڑام سے گر جائے گی۔ مجھے اس بات کا پک ہوتا، تب بھی منہ پر نہ لاتا کیونکہ میر صاحب مجھے زمین میں گاڑ کر چھتے کتے چھوڑ دے گا۔ نہیں نہیں! تو اپنے بھاگ وند کو جا کر بتا دے کہ چندو ماہی میری اپنی بیٹی ہے۔"

ماموں نے ہر حیلے سے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ میر کریم بخش جام کے خوف سے انکار کرتا رہا۔ اس نے سردار رب نواز کے غصے کی کہانیاں سنائیں اور ڈرایا دھمکایا تو گامن نے گڈی پکڑ لی اور مردہ دلی سے ہامی بھر لی۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ گامن نے ڈر کر ہامی تو بھر لی تھی مگر اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سردار رب نواز کی فرمائش پوری نہیں کرے گا کیونکہ وہ میر کریم بخش جام کے ہاتھوں ذلیل ورسوا نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اگلی شام کو میر کریم بخش اپنی کار میں بیٹھ کر اُس کے جھونپڑی جیسے گھر کی دہلیز پر پہنچ گیا۔ وہ دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ میر صاحب نے کار سے اُتر کر اُسے بازو سے پکڑا اور ایک طرف درختوں تلے لے گیا، بولا۔ ”دیکھ گامن! تیری قسمت جاگ گئی ہے کہ میر زادہ تیرے بوہے پر چل کر آ گیا ہے۔“

میر صاحب کو دیکھ کر گامن کے منہ سے ادب کے مارے بات نہیں نکل رہی تھی۔ میر صاحب کہہ رہا تھا۔ ”میں جانتا ہوں کہ کسی کی دھی بھین کی بات کرنا ہم میر زادوں کی شان کے خلاف ہے۔ ہم ہر ایک کو اپنی بیٹی بہو سمجھتے ہیں مگر بعض اوقات سچ بولنا مجبوری بن جاتی ہے۔ توں میڈی گالھ سمجھدا پیا ہیں؟“

(تو میری بات سمجھ رہا ہے؟)

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا مبادا کہ دیر ہو جائے اور میر صاحب کا پارہ چڑھ جائے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ میر کریم بخش غصے کا بڑا تیز تھا۔

میر صاحب نے اپنے مخصوص رعب دار انداز میں چند باتیں کرنے کے بعد اپنا مدعا بیان کیا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ تیرے گھر میں ایک حرام کی پھوئی پہنچ گئی ہے۔ سردار رب نواز کی بہن جسے اُس نے بن بیاہے گھر میں بوڑھا کر دیا ہے، کی بچی دریا میں بہتی ہوئی تیرے ہاتھ لگ گئی ہے۔ سردار کی بہن بڑی خوب صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بچی بھی چاند کا ٹکڑا ہو گی۔ ہیں؟“

گامن کی ٹانگیں کانپنے لگی۔ بولا۔ ”میر صاب! اُہ میڈی دھی ہے۔ میں قسم......“

(میر صاحب! وہ میری بیٹی ہے۔ میں قسم......)

میر زادے نے گامن کے بازو کی مچھلی میں اپنی انگلیاں پیوست کرنے کی کوشش کی، بولا۔ ”ناں سئیں! رہن ڈے...... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تیری بچی نہیں ہے۔ سکینہ اور سردار کے نکڑے (چھوٹے) سالے کے گناہوں کی شامت ہے۔ میں تجھے یہی بتانے کے لیے آیا ہوں۔“

اس نے سر ہلایا اور بولا۔ ”جی سائیں...... میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی مگر آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہو گا۔“

اس نے اپنے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے۔ اس کے سرد اور مفلوج ہاتھ پر رکھے اور بولا۔ ”بس بابا! یہ نوٹ تیرے ہوئے۔ فکر نہ کر، اور بھی دوں گا۔ معمولی سا کام ہے۔ بس تجھ سے کوئی پوچھے تو بول دینا کہ یہ سکینہ اور مراد خان کی فلم کا ڈراپ سین ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟“

اس نے چاہا کہ وہ نوٹ واپس کر دے مگر جرأت نہ ہوئی۔ تھوک نگل کر ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے میر صاحب کو دیکھنے لگا۔ خاموشی کو اقرار جان کر میر کریم بخش نے اُس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا۔ ”گامن! تو آج سے میرا یار ہوا۔ تجھے کوئی ضرورت پڑے، کسی پنچھی کے ہاتھ سنیہا (پیغام) بھیج دینا، ضرورت پوری ہو جائے گی۔ اس بے غیرت سردار رب نواز یا مراد خان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔ وہ تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ بندہ بندے کا دارُو ہوتا ہے ناں!“

سردار کے بعد میر کریم بخش بھی اس کی غربت کے ہاتھ پر خدمت کا عوضانہ رکھ کر چلا گیا تو وہ جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ اپنی بیوی کے پاس چولھے پر آ بیٹھا۔

وہ اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر بولی۔ ”کیا کہا میر صاب نے؟“

اس نے طویل آہ بھری اور کہا۔ ”میر صاب بھی وہی سودا مانگتا ہے جو سردار صاب مانگتا ہے۔ یہ لو۔“ اس نے مٹھی میں دبے ہوئے نوٹ اس کی جانب اچھالے۔

وہ کانپتے ہاتھوں سے چننے لگی، بولی۔ ”گامن! ہم اس منحوس ماری کی وجہ سے مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ بڑے بیلوں کی لڑائی میں آن کودے ہیں۔ میری مانو تو اس سے چوک (دامن) چھڑا لو ورنہ ہم سب بن موت مارے جائیں گے۔“

وہ متردد انداز میں بولا۔ ”تاجاں! یہ مدعا ہمارے گلے پڑ چکا ہے۔ چوک کیسے چھوٹے۔ اسے دریا میں پھینک بھی آؤں تو کیا ہو گا؟ سردار صاب اپنی بات منوانے کے لیے ماموں کو بھیجتا رہے گا۔ میر صاب اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے سر پر آن دھمکے گا۔ یہ رہے نہ رہے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو اس کے نام پر دوسروں کی پگڑی اچھالنا چاہتے ہیں۔“

تاجاں کا منہ کھل گیا۔ سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب چندو ماہی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ دونوں بڑے اس غلاظت کی پوٹ کو دوسرے کے آنگن میں پھینک کر اپنی دشمنی کو تسکین دینا چاہتے تھے۔

وہ ڈرتے ڈرتے مستفسر ہوئی۔ ”پھر اب کیا ہو گا؟“

گامن کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ روٹی کے نوالے چباتے ہوئے چندو ماہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ نہ صرف کسی ایک خاندان پر قیامت بن کر ٹوٹے گا بلکہ اُس کے خاندان کی تباہی کا نوحہ بھی سنائے گا۔ دونوں بڑے خاندان نے۔ مارا ماری کرنا خوب جانتے تھے۔ کئی سالوں سے دونوں خاندان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے چلے آ رہے تھے۔ پانچ خون پی کر بھی دشمنی کے اس دیو کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ ایسے میں اگر وہ کسی ایک کے ماتھے پر کلنک کا داغ سجاتا، دوسرے کے گھر جشن بپا ہو جاتا اور سیاہ ماتھے والا رات ہونے سے قبل اس پر غضب ناک بیل کی طرح ڈکراتا ہوا چڑھ دوڑتا۔ چٹکی بجانے کی سی دیر میں اس کے چھوٹے سے خاندان کو خون میں نہلا دیتا۔

سردار رب نواز اور میر کریم بخش کے خاندان جدی پشتی جاگیردار تھے۔ ان کی عورتیں گوری چٹی اور ہاتھ لگانے سے میلا ہونے والا حسن رکھتی تھیں۔ چندو ماہی کا رنگ بھی کچی لسی کی طرح سفید تھا جبکہ نقوش بچپنے کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ گامن نے سردار رب نواز کی بن بیاہی بہن سکینہ کو، نہ میر کریم بخش جام کی بیٹی رضیہ کو دیکھ رکھا تھا مگر اسے یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ دونوں ایک دوجی سے بڑھ کر خوبصورت ہوں گی۔ اس کے لبوں پر کوئی بھی نام آتا، دیکھنے والوں نے چندو ماہی کے پوپلے چہرے پر اُسی کے نقوش سجا کر دیکھ لینے تھے۔

اس نے اپنے ایک مچھیرے یار کو ہم راز بنایا۔ اس پر اپنی پریشانی عیاں کرتے ہوئے مشورہ چاہا۔ وہ گامن کی طرح غریب تھا۔ اپنی اوقات دیکھ کر چلتا تھا۔ اس نے فی الفور اُسے مشورہ دیا۔ ”یار گامن! میری مان تو اسے دریا میں بہا دے۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔“

وہ تشویش سے بولا۔ ”نہیں یار شیدیا! پہلی بات تو یہ ہے وہ مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سرداراں کے بعد مولا سائیں نے اُسے میری بیٹی بنا کر بھیجا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر میں چندو ماہی کو دریا میں پھینک دوں یا کسی بھی طریقے سے اوڈھر (اوجھل) کر بھی دوں تب بھی اس معاملے پر مٹی نہیں پڑے گی۔ دونوں پارٹیوں کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ وہ تو اس کا تعلق اپنے دشمن سے جوڑ کر اُس کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔“

اپنے یار کو پریشان دیکھ کر شیدا سوچ میں پڑ گیا۔ کافی دیر بعد آہ بھر کر بولا۔ ”تو پھر اللہ کا نام لے کر بیٹ سے نکل جا۔ اگر تو چندو ماہی سے اتنا ہی پیار کرنے لگا ہے تو اُسے اتنی دور لے جا کہ بدنامی کی چھاپ اور ان فرعونوں کی طاقت اس کا پیچھا نہ کر سکے۔“

وہ بوکھلا گیا، بولا۔ ”مگر کہاں؟ میں نے تو آج تک شجاع آباد اور کبیر والا کے سوا کوئی شہر بھی نہیں دیکھا اور نہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں۔ تازہ مزدوری کرتا ہوں اور شام کو کھا پی کر ہاتھ جھاڑ لیتا ہوں۔“

شیدا مصر ہوا۔ ”میرا تو یہی مشورہ ہے۔ رہی بات پیسوں کی، دس ہزار تجھے سردار نے بھیجے تھے۔ دو ہزار میر کریم بخش نے دیے۔ بارہ ہزار کوئی تھوڑی رقم تو نہیں ہوتی ناں؟ ملتان چلا جا۔ ہڈ پیر سلامت ہیں۔ دو وقت کی روٹی تو کما ہی لے گا ناں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں شیدیا! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تو کوئی اور ترکیب سوچ۔ ایسی کہ دونوں شیش ناگ مر جائیں اور لاٹھی بھی بچ جائے۔“

شیدے نے کہا۔ ”اگر تو یہاں ہی رہنا چاہتا ہے تو پھر اسے اپنی بہن کے پاس چھوڑ آ۔ جب لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ وہ مر کھپ گئی ہے تو اسے بھول جائیں گے۔“

گامن کی بہن کا بیاہ کبیر والا میں ہوا تھا۔ گامن نے شیدے کی بات مانتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا اور چندو ماہی کو اپنی بہن کے پاس چھوڑ آیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ چندو کو ماں کا دودھ نصیب ہو گیا کیونکہ گامن کی بہن کے ہاں دو ماہ پہلے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام فاطمہ تھا۔ فاطمہ اُس کی صورت پر ریجھ گئی۔ جھٹ سے گود میں ڈالا، قمیص کا پلو اُٹھایا اور اس کا ننھا سا سر اپنی چھاتی میں چھپا لیا۔ بے فکری سے بولی۔ ”چل بھائی! تیرا کام تو ہو گیا۔ پر دیکھنا، تو زیادہ دیر صبر نہیں کر سکے گا۔ اسے لینے کے لیے دوڑا آئے گا۔“

چندو کو کبیر والا چھوڑ کر واپس آ گیا۔ شیدے نے اُسے ایک اور بات بھی رازدارانہ انداز میں سمجھائی تھی۔ اس پر عمل کرتے ہوئے تاجاں اور گامن نے ایک رات رونا چیخنا شروع کر دیا۔ چند قریبی مرد وزن واویلا سن کر دوڑے آئے۔ اس وقت گامن ہاتھوں میں ننھی سی سفید گٹھڑی اُٹھائے گھر سے نکلا۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کی چندو ماہی تیز بخار میں مر گئی ہے۔ لوگوں نے دیکھنا چاہا تو اُس نے دیوانگی آمیز انداز میں چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیا کہ اس کی چندو ماہی کو کوئی نہ دیکھے۔ اس نے دھمکی بھی دی کہ جس نے چندو کا پردہ اُتارا، وہ اُسے مار دے گا۔ دیکھنے والوں نے اس کی حد سے بڑھی ہوئی دیوانگی کو بڑی آزردگی اور ہمدردی سے قبول کر لیا اور دیکھنے پر اصرار کرنے کے بجائے قبرستان لے گئے۔ جنازہ پڑھنے کے بعد گامن نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے ہاتھوں چندو ماہی کو قبر میں دفن کر دیا۔ مٹی کی اس ڈھیری پر بیٹھ کر بین کرنے لگا۔ لوگوں نے دلاسا دیا، سمجھایا بجھایا مگر اس کی آشفتگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

وہ رات بھر قبر پر بیٹھا رہا۔ لوگ سمجھا سمجھا کر تھک گئے تو تاجاں اور اس کی کم سن بیٹی سرداراں کو گامن کے پاس چھوڑ کر اپنے گھروں کو سدھار گئے۔

تاجاں نے اردگرد دیکھ کر کان میں کہا۔ ”گامن! کیا تم ساری رات یہاں بیٹھے رہو گے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں تاجاں! تو سرداراں کو لے کر گھر چلی جا۔ سو جا۔ صبح اُٹھ کر مجھے دو چپاتیاں اور اچار دے جانا۔ آس پاس والوں کو کہہ دینا کہ گامن کا دماغ الٹ گیا ہے۔“

شیدے کی معاونت سے یہ ڈراما کوئی ڈیڑھ مہینے چلا۔ سردار رب نواز کا خاص کارندہ ماموں اور میر کریم بخش اُس سے ملنے کے لیے کئی بار آئے۔ گامن ان کی باتیں سن کر دیوانہ وار اُٹھتا، بلند آواز میں گالیاں دے کر ہنستا اور مٹی کے ڈھیلے اُٹھا کر مارتا۔ اس کی حالت دیکھ کر دونوں مایوس لوٹ جاتے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ان کا ادھورا کام گامن کی بیوی سرانجام دے دے مگر تاجاں نے پلو نہیں پکڑایا۔ پھر اس نے بغیر تقاضے کے ماموں اور میر صاحب کی رقم لوٹا دی اور ہاتھ باندھ کر جان کی امان مانگی۔ شیدو کا اندازہ درست ثابت ہوا اور گامن کے پاگل پن کا تذکرہ ہوتا رہا مگر چندو ماہی کے کردار پر مٹی ڈال دی گئی۔ چندو ماہی کون تھی؟ کہاں سے بہتی ہوئی آئی تھی؟ یہ قصہ پارینہ بن گیا۔

چار چھ ماہ کے بعد گامن کا دماغ ٹھیک ہو گیا مگر اس نے بے پناہ سنجیدگی اور کم گوئی کا چغہ پہن لیا اور پھر سے مچھلیاں پکڑنے لگا۔ کوئی سال بھر بعد چندو ماہی کا قصہ پارینہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اس دوران دریا پار دونوں جانی دشمنوں کی مظفر گڑھ کی کچہری میں حادثاتی طور پر مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں طرف آگ بھڑک رہی تھی۔ شعلوں کو پیاس نے یرغمال بنا لیا اور بندوقوں کے دہانے موت اگلنے لگے۔ سردار رب نواز اور ماموں موقع پر دم توڑ گئے جبکہ میر کریم بخش، اس کا منجھلا بیٹا اور ایک نوکر بھی کھیت رہے۔ دوطرفہ فائرنگ نے پانچ زندگیوں کے چراغ گل کر دیے جبکہ چھ متعلقہ اور تین غیر متعلقہ بندے اسپتال پہنچ گئے۔ یوں قسمت نے گامن کو ایک ہی دن میں بھی دشمنوں سے نجات دلا دی۔

اس نے پھر شیدو کا دامن جا پکڑا۔ ”اوئے شیدیا! بول، کیا میں کبیر والا سے اپنی چندو ماہی کو لے آؤں ناں؟ یار! اب تو وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتی ہو گی۔“

شیدو نے آنکھیں نکالیں۔ ”پاگل ہو گیا ہے تو! لوگ پوچھیں گے کہ اسے تو تم نے اپنے ہاتھوں قبر میں اتار دیا تھا پھر یہ کہاں سے نکل آئی؟ تو کیا جواب دے گا؟“

وہ بولا۔ ”میں کہہ دوں گا کہ یہ وہ نہیں ہے، کوئی اور ہے۔“

شیدا طنزاً ہنسا۔ ”واہ گامن واہ! تو ایسے کہہ دے گا جیسے تم نے دیکھی نہیں، کوئی بکری خرید کر کلّے پر باندھ لی ہو۔ ناں یار! یہ ظلم نہ کر۔ وہ جہاں ہے، اسے وہیں رہنے دے۔“

اس نے بہ ظاہر تو شیدے کی بات مان لی مگر دل ہی دل میں مضطرب رہنے لگا۔ سرداراں اس کی بیٹی تھی مگر وہ اس کے لیے کبھی اتنا بے چین نہیں ہوا تھا جتنا چندو ماہی کے لیے ہونے لگا۔ سال بھر بعد اُس پر پھر چندو ماہی کی محبت کا طوفانی دورہ پڑ گیا۔ تاجاں اور شیدے کے سمجھانے کے باوجود دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبیر والا پہنچ گیا۔ واپس آیا تو چندو اس کے کندھے سے چپکی ہوئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ ایک سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ لوگ سال پرانی باتیں بھول جاتے ہیں مگر جونہی لوگوں نے چندو کو دیکھا، ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جس کے لیے انہوں نے ننھی سی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی تھی، آنکھوں کے سامنے دفن ہوتا دیکھا تھا، وہ اچانک زندہ ہو گئی تھی۔ فوراً تاڑ گئے کہ گامن نے انہیں دھوکا دیا تھا۔ کیوں؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ کسی نے گامن اور تاجاں کو لعن طعن کیا، کسی نے دبے دبے لفظوں میں جھوٹ پر شرمسار کیا تو کسی نے پیٹھ پیچھے خوب باتیں بنائیں۔ اس ساری لے دے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وسیب نے یہ کہہ کر چندو ماہی کو پھر قبول کر لیا کہ گامن پاگل ہو گیا تھا اور اس نے پاگل پن میں کپڑوں کی خالی گٹھڑی کو دفن کر دیا۔ تاجاں نے لوگوں کو یہ جھوٹ بول کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ چندو ماہی کو بخار ہو گیا تھا۔ گامن اُسے لے کر شہر گیا تھا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں وہی گٹھڑی تھی جو اس نے سب کو دکھائی تھی اور کہا تھا کہ یہ چندو ماہی کی میت ہے۔ اسے میں اور شیدا غسل دے چکے ہیں۔ اب صرف دفن کرنا باقی ہے۔ تاجاں نے یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیا کہ گامن نے اُسے بھی چندو ماہی کا آخری دیدار نہیں کرایا تھا۔ تبھی اس نے پاگل گامن کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

گامن کے خاندان میں، آس پاس میں بچوں اور بالخصوص بچیوں کو اسکول میں پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ بچوں کو مدرسے میں قرآن پڑھنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی بڑی بیٹی سرداراں کو ناظرہ

قرآن پڑھ لینے کے بعد مدرسے سے اُٹھا لیا تھا اور اسے اسکول کا منہ تک نہیں دکھایا تھا۔ چندو ماہی کو بھی وہ پڑھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا مگر جب وہ پانچ برس کی ہوئی، ایک رات، بارہ ایک بجے کے درمیان، اس کی جھونپڑی میں بڑے گھر کا ایک چاند طلوع ہو گیا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں ایک زرق برق لباس اور طلائی زیورات میں جگمگاتی امیر زادی کو دیکھا تو رنگ فق ہو گیا۔ بوکھلاہٹ میں اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”مولا سائیں! خیر کریں......“

تاجاں گھر میں نہیں تھی۔ وہ سرداراں کو لے کر ایک میل دور واقع شیدے کے گھر گئی ہوئی تھی۔ شیدے کی بڑی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ شادی کا جھنجھٹ اکیلی عورت کے بس کی بات نہیں تھا اس لیے شیدے کی بیوی کو تاجاں کی مدد کی ضرورت تھی۔

گھر میں گامن اور چندو ماہی تھے جب سردار رب نواز کی بہن سکینہ خانم نے جھونپڑی میں اپنا قدم رکھا۔ گامن اُسے پہچانتا نہیں تھا مگر اس کی ظاہری آن بان دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ پھر جب اس نے نہ صرف یہ بتایا کہ وہ مرحوم سردار رب نواز کی بہن اور سردار احمد نواز کی پھوپی ہے بلکہ چندو ماہی کی ماں بھی ہے تو گامن کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ وہ اس کے پیروں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ”بی بی سائیں! غضب نہ کر اور پچھلے پیر لوٹ جا۔ کسی نے دیکھ لیا تو میری گردن کاٹ دے گا۔“

وہ بولی۔ ”نہیں گامن! میں سب سے نظر بچا کر آئی ہوں۔ مجھے یہاں لانے والا میرا ابھروسے والا ملازم ہے۔ تو فکر نہ کر، میں جس طرح رات کی چادر اوڑھ کر آئی ہوں، ایسے ہی رازداری سے لوٹ جاؤں گی۔ مجھے میری بیٹی دیکھنے دے۔“

وہ اُسے روکنے پر قادر نہیں تھا اور نہ ہی اس کے بس میں تھا کہ وہ امیر زادی سے پوچھتا کہ تو اس کی ماں ہے تو بول! اس کا باپ کون ہے؟...... بن بیاہی ماں سے ایسی باتیں پوچھنا دل گردے کا کام ہوتا ہے اور وہ اتنا منہ پھٹ نہیں تھا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سکینہ خانم نے گھٹنے چھاتی سے لگا کر سوئی ہوئی چندو ماہی کو میلے چیکٹ بستر سے کھینچ لیا اور چھاتی سے لگا کر پوری قوت سے بھینچ لیا۔ چندو جاگ گئی اور بلکنے لگی۔ سکینہ خانم کو اس کے رونے چیخنے کی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ دیوانہ وار اپنی بیٹی کا منہ ماتھا چوم کر اپنا سوختہ کلیجا ٹھنڈا کر رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ گامن نے کھانس کر اُسے ہیجانی کیفیت سے نکالا تو وہ سنبھل گئی اور چندو کو گود میں لے کر، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”گامن! تو مہینے میں کتنا کما لیتا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”بی بی سائیں! مجھے اللہ پاک دو وقت کی روٹی دے دیتا ہے۔ یہی بہت ہے۔“

وہ بولی۔ ”تو نے میری دھی رانی کو دریا سے نکال کر نئی زندگی دی ہے۔ میں نے اسی آس پر اس نصیبوں جلی کا گلا نہیں دبایا تھا اور اسے چوکی پر لٹا کر دریا کے حوالے کر دیا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اسے نکال کر بیٹی بنا لے گا۔ یہ بچ جائے گی۔ اللہ نے میری سن لی اور اس بدنصیب کو نئی زندگی مل گئی۔ تو نے مجھ گنہ گار پر بہت بڑا احسان کیا ہے گامن! میں تیرا قرض نہیں دے سکتی۔“

وہ شرمسار سا ہو گیا۔ اس نے کسی پر احسان نہیں کیا تھا۔ اس نے تو اپنے اندر کے جیتے جاگتے انسان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے تاسف سے بولا۔ ”تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کسی نے تجھے یہاں آتا جاتا دیکھ لیا تو یہ بات راز نہیں رہے گی۔ میری چندو ماری جائے گی۔ پہلے میں نے اسے بڑی مشکل سے بچایا ہے۔“

سکینہ نے اپنی بڑی سی چادر کے پلو سے آنسو پونچھے، ڈبڈبائی آنکھوں سے گامن کو دیکھا اور ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ”گامن! تو نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اجر دینے والی ذات سوہنے رب کی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور تجھے اجر دے گا۔ بہت بڑا اجر۔ پر تو مجھ پر ایک احسان اور کر۔ اس کرموں ماری کو اسکول میں داخل کرا دے۔ اس کی پڑھائی پر جتنا بھی خرچ آئے گا، میں چوری چھپے تجھے پہنچاتی رہوں گی۔“

گامن نے چند لمحے سوچا پھر انکار کر دیا کیونکہ یہ کام اس کی استطاعت سے بھاری تھا۔

وہ تڑپ کر بولی۔ ”دیکھ گامن! تو میرا بھائی ہے مگر میرے سگے بھائیوں جیسا نہیں ہے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔ انہیں اگر پتا چل گیا کہ میں اپنی جھولی پھیلا کر تمہارے پاس آئی ہوں تو وہ مجھے زمین میں زندہ گاڑ دیں گے۔ انہیں چندو ماہی اور میرے تعلق کا پتا چل گیا تو وہ نہ اسے زندہ چھوڑیں گے اور نہ تجھے۔“

وہ ڈر کر بولا۔ ”تو پھر تجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا بی بی سائیں! تو نے مجھ پر یہ ظلم کیوں کیا؟ کیا یہی احسان کا بدلہ دینے آئی ہے؟“

”نہیں۔ خدا کے لیے ایسے نہ کہہ۔ میں دل کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھوں مجبور ہو کر آئی ہوں۔ تو نہیں جانتا کہ مجھے اپنی رانی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنا پڑے ہیں۔'' اس کی آنکھوں کے جھرنے پھوٹ پڑے۔ ''پر ان باتوں کو چھوڑ...... میں جس کام کے لیے آئی ہوں، اس کے بارے میں سوچ۔ میری بیٹی میری نظروں کے سامنے رہے، نہ رہے، مگر زندہ رہے، میں یہی چاہتی ہوں۔ آئندہ شاید اسے ملنے اور دیکھنے کی مہلت مجھے نہ مل سکے مگر مجھے یہ یقین تو ہو کہ یہ سکھی ہے۔ سکھی بھی ہوگی، جب پڑھ لکھ کر کوئی نوکری کرنے لگے گی۔ کسی اسکول میں استانی یا اسپتال میں نرس لگ جائے گی۔ اپنا پیٹ پالتی رہے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمام عمر اس کے لیے تڑپتی رہوں گی اور دل ہی دل میں دکھتی رہوں گی کہ میں محلوں میں عیش کرتی ہوں جبکہ میری بیٹی غربت کی چکی پیستی ہے۔ خدا کے واسطے گامن! میری بات مان لے۔ میری چادر کا مان رکھ لے۔''

اس نے اپنی چادر پھیلا کر کشکول کر دی۔

گامن نے بھانپ لیا کہ سکینہ خانم کیوں اس کی دہلیز پر آئی تھی۔ نیم مائل ہو گیا۔ چندو کو اسکول میں ڈالنے سے ڈرتا تھا۔ تاجاں سب سے پہلے مزاحم ہوتی اور کہتی کہ چندو کو اسکول میں داخل کروانے چلے ہو تو سرداراں کی طرف بھی ایک نظر دیکھ لو۔ وہ بھی تمہاری بیٹی ہے۔ بہ یک وقت دونوں کی پڑھائی کا خرچ وہ اُٹھا نہیں سکتا تھا۔

اسی تذبذب کا شکار تھا مگر سکینہ خانم کی ماممتا اُس سے یہ بات منوانے کے لیے آئی تھی۔ اس نے اپنی پھیلی ہوئی چادر سمیٹی۔ باریک دوپٹا گردن سے نکال کر گامن کے پیروں میں رکھ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ یہ وار خطا جانے والا نہیں تھا۔ وہ سن رہ گیا۔ دوپٹا اُٹھایا، چوم کر آنکھوں سے لگایا اور چندو ماہی پر ڈال دیا۔ بولا۔ ''بی بی سائیں! یہ خرچ پٹھے والا معاملہ رہنے دے، میں اگر اسے پال سکتا ہوں تو دو کتابیں خرید کر بھی دے سکتا ہوں۔ اب تو چلی جا اور اپنے ہونٹوں کو سی لے۔ تیرے منہ سے سسکی بھی نکلی تو میری چندو کی گردن اُڑا دی جائے گی۔''

سکینہ خانم نے اپنی سی کوشش کی کہ وہ کچھ رقم رکھ لے مگر گامن کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ خواہش کے باوجود، ڈر کے مارے اسے باہر تک چھوڑنے نہ آیا کیونکہ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خانم کے نوکر کا سامنا کرتا۔

وہ چلی گئی تو اس نے بے اختیار چندو ماہی کو اُٹھا کر چوم لیا اور گلوگیر لہجے میں نیم خوابیدہ چندو سے دل کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اس کی چھاتی پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی چندو ننھے ننھے خراٹے لینے لگی۔ اس نے 'چل جھلی نہ ہووے تاں' کہہ کر اُسے اپنے پہلو میں لٹا دیا۔

لالٹین کی پیلی روشنی کی طرح غریب کی زندگی کا ہر رُخ پیلا ہوتا ہے، زرد...... سوچیں بھی۔ وہ چندو اور چندو کی ماں سکینہ خانم کے چہروں کو چشمِ تصور پر باری باری سجا کر پرکھ رہا تھا۔ دونوں کی صورتوں میں مماثلت تلاش کر رہا تھا۔ ناکام ہو کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کوئی بھی چندو اور اس کی ماں کو دیکھ کر دونوں کو ماں بیٹی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ دونوں خوب صورت تھیں مگر دونوں کی شکلیں مختلف تھیں۔ ماں کے نقوش تیکھے تھے۔ بیٹی کے نقوش پوپلے تھے۔ اس نے مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں۔ اگلے دن جب وہ چندو کو اسکول داخل کرانے کے لیے نہلا دھلا کر تیار کر رہا تھا، تاجاں شکوہ آمیز نظروں سے اُسے دیکھتی رہی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

گامن دس بجے کے قریب اسکول کی چار دیواری سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ بڑی ٹاہلی کے نیچے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے بیچ اس کی چندو ماہی ٹاٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور قاعدے پر آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ ''الف انار...... ب بکری...... ت تختی......''

اس کی باریک سی آواز ان گنت آوازوں میں چھپی ہوئی تھی۔ سنائی نہیں دیتی تھی مگر گامن کا دل سن رہا تھا۔ 'الف انار' کا قاعدہ پڑھتے ہوئے جھوم رہا تھا۔

'الف انار، ب بکری' کی سیڑھی چڑھنے والا ایک دن آسمان کو چھونے کی طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ بھی علم کے زینے پر پاؤں پاؤں چلتی ہوئی منزل بہ منزل بڑھتی جا رہی تھی۔ اسکول گھر سے کوئی ڈیڑھ میل دور واقع تھا۔ گامن مچھلیوں کا تھیلا، جس میں کبھی ایک مچھلی ہوتی، کبھی دو تین، اُٹھائے گھر سے نکلتا تو اس کی انگلی تھامے چندو بھی کپڑے کا جھولا (بستہ) اُٹھائے انگلی تھامے گھر سے نکل کھڑی ہوتی۔ کچھ دور تک اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی پھر رُک کر بیٹھ جاتی۔ گامن اُس کے شرارت آمیز مکر کو جی جان سے قبول کرتا اور جھوٹی موٹی ڈانٹ کر کاندھے پر بٹھا لیتا۔ اسے اسکول کے گیٹ پر اُتار کر شہر چلا جاتا۔ مچھلیاں بیچ کر واپس آتا اور اسکول کے باہر بیٹھ کر یا چل پھر کر وقت پاس کرتا۔ اگر جلدی لوٹ آتا تو گھر چلا جاتا۔ اسے اسکول سے اُٹھا کر گھر چھوڑتا اور نم مٹی سے کھود کر نکالے ہوئے ملپ (ٹیپ ورم) اور کنڈیاں اُٹھا کر دریا کا رُخ کرتا۔ دریا چڑھا ہوتا تو موج بن جاتی ورنہ ڈھنڈ کے بطن سے مچھلیاں ڈھونڈتا

رہتا۔ کبھی کوئی اچھی مچھلی ہاتھ لگ جاتی، کبھی ایک سے زیادہ اور کبھی ہاتھ جھاڑتا گھر لوٹتا۔

چندو کو پہلے پہل استانی کی تند باتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ مگر جب وہ چوتھی کلاس میں پہنچی، تب اُسے استانی کے منہ سے نکلنے والی گالی 'حرام زادی' گولی کی طرح لگنے لگی۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ حرام زادی کون ہوتی ہے مگر اُسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اچھا لقب نہیں تھا کیونکہ استانی کے ساتھ ساتھ کلاس کی لڑکیوں نے بھی دبی دبی ہنسی کے ساتھ اُسے حرام زادی کہنا شروع کر دیا تھا۔ پانچویں کلاس میں تھی جب اس نے اپنی ایک ہم جولی سے پوچھا۔ ''یہ حرام زادی کون ہوتی ہے؟''

اس نے اپنی بڑی بہن سے پوچھ کر اگلے دن بتایا۔ ''جس کے ماں باپ نہ ہوں، وہ حرام زادی ہوتی ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ بولی۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ بھلا دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جس کے ماں باپ نہ ہوں۔ ویسے بھی میری تو اماں بھی ہے، بابا بھی۔ پھر میں حرام زادی تو نہیں ہوں۔ پر استانی اور تم لوگ مجھے کیوں حرام زادی کہتے ہو؟''

اس کی سہیلی حساس دماغ تھی۔ دل رکھنے کو بات بنا گئی۔ ''تم کوئی حرام زادی تھوڑی ہو، وہ تو ہم یونہی غصے میں کہتے ہیں۔ استانی جی ہمیں 'کتی' اور 'گدھی' کہتی رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم کتیاں اور گدھیاں ہیں۔''

اس نے سمجھنے کے سے انداز میں سر ہلا دیا مگر دل مطمئن نہ ہوا۔ استانی ہر ایک کو 'کتی' اور 'گدھی' کا لقب دیتی تھی۔ حرام زادی کا لقب صرف اس کے لیے مخصوص کیوں تھا۔ ہم جماعت لڑکیاں غصے میں اُسے دیکھ کر منہ بنایا کرتی تھیں مگر عام حالات میں اس کا چہرہ چھوتیں، ہاتھ اور پیر دیکھتیں اور اس کی صحت اور خوبصورتی کی دل کھول کر تعریفیں کرتیں۔ یہ تعریفیں اچھی لگتی تھیں۔ وہ بیٹ کے اسکول کی سب سے خوب صورت بچی تھی۔ اس کے میلے کپڑے، پھٹی ایڑیاں اور گنجلک بال اس کے حسن کو چھپانے میں ناکام رہتے تھے۔

سکینہ خانم کی زندگی حویلی کی بلند و بالا چہار دیواری میں چکرا رہی تھی اور بالوں میں متواتر چاندی اُتر رہی تھی۔ اس کی خوب صورت جوانی تسلیم کیے جانے کے بغیر ہی بوڑھی ہو رہی تھی۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے دو ہی موضوع تھے۔ ایک چندو ماہی، جسے دیکھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ دوسرا چندو ماہی کا باپ جسے دو سال پہلے خاندانی دشمنی روایتی انداز میں چاٹ گئی تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ دونوں چوری چھپے مل لیا کرتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی، وہ من کی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ تن کی بھڑکتی ہوئی آگ پر لوگوں کی نظریں بچا کر پانی کے چند چھینٹے ڈال لیا کرتے تھے۔ اسے میر کریم بخش کے بیٹے نے روہیلا نوالی کے ایک چھپر ہوٹل پر گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا کیونکہ اس کی بھائی کی سیون ایم ایم گن کی نال سے نکلنے والی گولی نے اُس کے بابا کو کچہری کے احاطے میں چاٹ لیا تھا۔ اس کی موت کے بعد سکینہ خانم کی زندگی کی آخری روشنی بھی بجھ گئی کیونکہ وہ اس کے سوا کسی سے ملنے کا موقع نہیں پا سکتی تھی۔ وہ قریبی رشتہ دار تھا۔ بھابی کا بھائی تھا۔ بیوہ ہونے کے بعد بھابی اُسے کچھ زیادہ ہی مہلت دے دیا کرتی تھی۔ تبھی وہ دستک دیے بغیر اس کے کمرے تک پہنچ جاتا تھا۔

بھابی کے علاوہ اس کی ماں اور بھائیوں کو سکینہ خانم کی محبت کا علم تھا مگر انہوں نے ہمیشہ صرفِ نظر برتا۔ حویلی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا حویلی کا ہی فرد تھا۔ اس پر ہاتھ اُٹھاتے تو زمانے بھر کی انگلیاں ان پر اُٹھنے لگتیں اور بعید نہ ہوتا کہ سکینہ خانم کو کہیں بیاہنا پڑ جاتا جو ان کے لیے بہت بڑا نقصان ثابت ہوتا۔ کئی مربع اراضی ہاتھ سے نکل جاتی۔ یوں سکینہ خانم کا کام چلتا رہا مگر سوائے اس کی بوڑھی ماں اور بھابی کے، کسی کو چندو ماہی کی حیثیت کا علم نہیں ہوا۔

غیرت مند بھائی سکینہ خانم کی جذباتی لغزشوں کو پس پشت ڈال سکتے تھے مگر اس کی لغزشوں کے حیا پاش ثبوت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ تبھی سکینہ خانم نے سینے پر پتھر کی بھاری بھر کم سل رکھ دی اور سوتے میں بھی چندو کا نام لبوں پر نہیں آنے دیا۔ اس کی ایک معتمد نوکرانی بیٹ خیر پور سے بیاہ کر یہاں آئی تھی۔ وہ اپنے میکے جاتی، لوٹتی تو سکینہ خانم باتوں باتوں میں گامن اور چندو ماہی کی خیریت دریافت کر لیتی۔ یہ جان کر مطمئن ہو جاتی کہ گامن اس کے جگر کے ٹکڑے کو باقاعدگی سے اسکول بھیجتا تھا۔ اسے تب بھی پتا چل گیا جب گامن نے چندو کو شجاع آباد کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس نے اپنے اسی رازدار نوکر، جس کے ساتھ وہ ایک مرتبہ دریا پار کر کے گامن کی جھونپڑی میں گئی تھی، کے ہاتھ پانچ ہزار روپے بھجوائے۔ سمجھایا کہ کسی ایسی جگہ پر پھینک دے جہاں سے کچھ دیر بعد گامن کو گزرنا ہو۔ اس تاکید کے ساتھ کہ جب تک وہ اس رقم کو اُٹھا نہیں لے گا، تب تک نوکر کہیں چھپ کر نگرانی کرے تاکہ رقم گامن کے علاوہ کسی اور شخص کے ہاتھ نہ لگ جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

گامن کو پانچ ہزار روپے ڈھنڈ کی طرف جاتے ہوئے رستے سے ملے۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ اتنی بڑی رقم کا کوئی دعوے دار نظر نہیں آیا تو اس نے اپنے پھٹے پرانے لباس میں چھپالی۔ آج کل وہ متفکر رہتا تھا۔ چندو ماہی کو شجاع آباد داخل کروانے کی وجہ سے اس کے کام میں ہرج ہو رہا تھا۔ اسے دن کا بیشتر وقت چندو کے اسکول کے باہر چھاؤں میں بیٹھ کر ضائع کرنا پڑتا تھا۔ اس رقم نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس نے ایک گدھا اور ریڑھی خریدی۔ علی الصباح چندو کو اس پر بٹھایا اور شہر پہنچ گیا۔ چندو کو اسکول پہنچا کر سڑک پر مال برداری کا کام تلاش کرنے لگا۔ کاروبار چلتے چلتے چلتا ہے۔ مزدوری گھر سے نکلتے ہی مل جاتی ہے۔ اس کی مزدوری چل نکلی۔ اسکول کی چھٹی تک وہ مال برداری میں رُجھا رہتا۔ چھٹی کے وقت پر اسکول کے گیٹ پر پہنچ جاتا۔ چندو ماہی کو اپنی نویں نکور گاڑی پر بٹھاتا اور گھر روانہ ہو جاتا۔ اس نے ریڑھی کے نچلے حصے میں، بموں کے بیچ، دو تہ شدہ بوریاں رکھی ہوئی تھیں جن پر وہ اپنی پیاری کو بٹھایا کرتا تھا تاکہ سڑک پر لگنے والے جھٹکوں کی وجہ سے ریڑھی کے موٹے چوبی تختے اُسے نہ چبھیں۔

لگے بندھے معمول کے مطابق سہ پہر کو ڈھنڈ کی طرف نکل جاتا۔ جو مال ہاتھ لگتا، اگلی صبح اُسے شہر میں بیچنے کی غرض سے ریڑھی پر لاد لیتا۔ دُہری مزدوری کے سبب گھر میں کچھ خوش حالی آ گئی۔

تاجاں نے کبھی بھول کر بھی اُسے طعنہ نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے بیچ انصاف نہیں کرتا۔ وہ بھی کوشش کرتا تھا کہ سوائے پڑھائی کے، دونوں بیٹیوں میں اس کا رویہ مختلف نہ ہو۔ وہ جو چیز بھی خریدتا، دونوں کے لیے خریدتا۔ سرداراں کے بعد تاجاں کے بطن سے دو مردہ بیٹوں اور ایک زندہ بیٹی نے جنم لیا جو ڈیڑھ ماہ زندہ رہنے کے بعد داغِ مفارقت دے گئی۔ تاجاں بیٹے کے لیے جھولی پھیلائے رکھتی تھی مگر شاید قدرت کو ابھی یہ منظور نہیں تھا۔

شہر کے بڑے اسکول میں پہنچ کر چندو ماہی کا اعتماد بحال ہو گیا۔ اس کی ذات سے چپکا ہوا 'حرام زادی' کا لفظ یہاں تک نہیں پہنچا تھا کیونکہ بیٹ خیر پور سے اس اسکول تک پہنچنے والی وہ اکیلی لڑکی تھی۔ اپنی بے پناہ ذہانت اور پر اعتماد تقریر کی اضافی خوبی سے لیس تھی، ٹیچرز اسے بے پناہ پیار کرتی تھیں۔ جب وہ آٹھویں میں تھی، تب ایک صبح اُسے ہیڈ مسٹریس نے اپنے کمرے میں طلب کیا۔

چونکہ وہ بے پناہ قدرتی صلاحیتوں کی مالک تھی، بہت ذہین اور قابل اسٹوڈنٹ تھی، اس لیے ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں طلب کیا جانا معمول کی بات تھی۔ بے حد فربہ ہیڈ مسٹریس مسز ریحانہ کے کمرے میں اس کی ملاقات دبلی پتلی اور مشفق سکینہ خانم سے ہوئی۔ چونکہ پہلی ملاقات اس کے لاشعور تک سے محو ہو چکی تھی، اس لیے سکینہ خانم کو پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُسے خانم نے بے پناہ پیار کیا۔ پاس بٹھایا اور جی بھر کر باتیں کیں۔ اسے تب پتا چلا کہ وہ متمول گھرانے کی ہمدرد دل رکھنے والی خاتون تھی اور اسکول کی دو چار بچیوں کو اسکالرشپ دینے کا ارادہ لے کر آئی تھی۔ مسز ریحانہ نے اُسے جن تین بچیوں کے نام دیے تھے، ان میں چندو ماہی کا نام بھی شامل تھا۔

خانم نے شاہانہ انداز میں مسز ریحانہ سے کہا۔ ''میں اس بچی کو دیکھ کر بڑی خوش ہوئی ہوں۔ لگتا ہے کہ اس کا تعلق کسی نہایت غریب فیملی سے ہے۔ باقی دونوں بچیوں کے لیے میں ماہانہ اتنی ہی رقم بھیجا کروں گی، جتنی میں نے آپ کو بتائی تھی مگر اس بچی کے لیے میں زیادہ وظیفہ بھیجا کروں گی تاکہ یہ آسانی سے اپنی تعلیم کا حصول جاری رکھے۔''

چندو ماہی کو وہ خاتون بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی پرستائشی آنکھوں میں ثبت ہو رہی تھی۔ اس نے شکریہ ادا کیا۔ مسز ریحانہ نے خانم کو گلے لگاتے ہوئے تاکید کی کہ وہ گاہے بگاہے اسکول کا چکر لگاتی رہے اور تینوں بچیوں سے ملتی رہے۔ سکینہ خانم کی دلی آرزو یہی تھی اس لیے اس نے فوراً ہامی بھر لی۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ اس نے کتنی مشکل سے اپنے بڑے بھائی کو اس کارِ خیر کے لیے رضامند کیا تھا۔ اس کے دل میں انسان دوست دل نہیں دھڑکتا تھا مگر وہ اپنی بہن کو مصروف کرنے کے لیے مان گیا تھا۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی بہن نے صرف اپنی بیٹی کو دیکھنے کا سلسلہ چھیڑنے کے لیے یہ ناٹک کیا ہے۔

چندو بڑی بے تابی سے چھٹی کا انتظار کرنے لگی تاکہ وہ جلد از جلد اس اہم خبر کو گامن کے گوش گزار کر دے۔ وہ گامن سے بہت پیار کرتی تھی۔ اسے کبھی گامن کے وجود سے پھوٹتی ہوئی مچھلیوں کی بساند بری نہیں لگی تھی۔ وہ بے پناہ صفائی پسند تھی مگر اسے گامن کا میلا کچیلا وجود کبھی ناگوار نہیں لگا تھا بلکہ وہ اس کے پسینے سے شرابور بڑھی شیو والے گال چوما کرتی تھی۔ تاجاں اپنے سائیں کو خوش رکھنے کے لیے چندو ماہی سے گھر کے کام کاج میں معاونت نہیں لیا کرتی تھی۔ سبھی کام سرداراں اور وہ دونوں مل کر سرانجام دیتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ چندو سے شاکی نہیں تھیں اور

اسے جی بھر کے پیار کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ چندو کو کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے سگے ماں باپ نہیں ہیں۔

اس نے ریڑھی پر بیٹھ کر جب اپنے باپ گامن کو اس خوش رُو اور مشفق امیر زادی کے متعلق بتایا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ جلدی سے پوچھنے لگا۔ ''تمہیں اس کے نام کا پتا ہے؟''

وہ فخر سے بولی۔ ''ہاں تو! اس کا نام سکینہ خانم ہے۔ پار کے سردار رب نواز کی بہن ہے۔ بڑی امیر ہے بابا!''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ دل میں واہمہ سر اُٹھانے لگا کہ کہیں سکینہ خانم اس سے اس کی چندو ماہی چھین ہی نہ لے۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بھلے وہ اسے بیٹی بنا کر اپنے ہاں نہ لے جا سکے، نوکرانی یا لے پالک بنا کر تو حویلی میں لے جا سکتی تھی۔ اس نے چندو ماہی کو منع کرنا چاہا کہ وہ سکینہ خانم سے آئندہ نہ ملے اور نہ ہی وظیفے کے نام پر دی جانے والی رقم قبول کرے مگر کہہ نہ سکا کیونکہ اُس نے اپنی عادت کے مطابق پے در پے سوال کر کے اُسے زچ کر دینا تھا۔ وہ اکثر باتوں میں اس سے ہار جایا کرتا تھا اور سختی کر کے اپنی بات منوانا اس کے بس سے باہر تھا۔

وظیفے کی رقم اس کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق کچھ رقم اپنے پرانے سے ٹرنک میں رکھ لیتی جبکہ باقی رقم بابا کے حوالے کر دیتی۔ وہ رقم اتنی ہوا کرتی تھی کہ اس پر گامن کا پورا گھر بہ آسانی مہینا بھر چلتا تھا۔ ماہوار ملنے والی اس رقم نے چندو ماہی کی آن بان کو دوبالا کر دیا اور وہ چندو ماہی، جس کے حسن کا چرچا پہلے ہی بیٹ خیر پور میں زبان زدِ عام تھا، پیسوں کی نسبتاً فراوانی کے سبب آنے والی نزاکت اور نفاست سے چار چاند لگ گئے۔ وہ ہر گھر میں موضوعِ سخن بننے لگی۔ ایسی باتیں چھپائے چھپتیں نہیں بلکہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ گامن اور تاجاں نے تو زندگی بھر اُسے چھپانے کی کوئی کوشش تک ہی نہیں کی تھی۔

جوان حسن کی شمع پر دل فگار دیوانوں کی والہانہ یورشیں معمول کی بات ہے۔ اس کی الہڑ اُٹھان بھی اس معمول کا شکار ہو گئی۔ گھر سے شہر تک، تمام راستے میں، اس کی ایک جھلک دیکھنے کے مشتاق دل تھامے کھڑے ہونے لگے۔ وہ ان کی نظروں سے پھوٹنے والے پیغامات سے گھبرا کر اپنے بابا کی چھتری تلے گھس جاتی۔ گامن چوڑے چکلے سینے والا توانا مرد تھا۔ اس کے بازوؤں میں دم تھا۔ تبھی کوئی گدھا ریڑھی کی سامنے سینہ سپر ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ گامن کی تیز فہم نظریں بھانپنے لگیں کہ ہر آنے والا دن اس کے لیے مشکل ہوتا جاتا ہے۔ پھر جس دن میر ظفر حیات کے بڑے بیٹے عمر حیات نے اپنی موٹر سائیکل ریڑھی کے سامنے روکی، وہ بوکھلا گیا۔ اسے اپنی اور میر خاندان کی حیثیتوں میں حائل فرق کا بہ خوبی احساس تھا۔ عمر حیات نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے وفورِ شوق سے چندو کو دیکھا اور گامن کو مخاطب کیا۔ ''اوئے گامن! یہ وہی چندو ہے ناں جسے تم نے دریا میں بہتے ہوئے پکڑا تھا؟''

اس کا لہجہ نہ صرف استہزائیہ تھا بلکہ خاصا تضحیک آمیز بھی تھا۔ وہ کانوں تک سرخ ہو گئی۔ ''حرام زادی'' کا لفظ اپنی خوف ناک معنویت کے ساتھ اُس کی نظروں کے سامنے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

گامن کے تن بدن میں آگ دہک اُٹھی تھی مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میر زادے! تو بڑے گھر کا پتر ہے۔ ہمارا خیال کر، اپنے خاندان کی بڑائی کا بھی خیال بھی کر اور راستہ چھوڑ دے۔''

وہ منہ بنا کر بولا۔ ''راستہ تو خیر میں چھوڑ ہی دوں گا مگر چند گھڑیاں چندو ماہی کو تو دیکھ لینے دو۔''

گامن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ریڑھی سے اُترا اور عمر حیات اور چندو ماہی کے بیچ حائل ہو گیا۔ گدھے کی لگام پکڑ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''چن بس چا کر...... تو نے جو کہنا تھا، کہہ دیا۔ میں نے سن لیا کہ تجھ میں اپنے بڑے خاندان کا خون تو ہے مگر شرافت نہیں ورنہ تو ایک باپ کی موجودگی میں اس کی بیٹی کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھتا۔ تیرے باپ نے ہمیشہ ہم غریبوں کی دھی بھین (بیٹی بہن) کو اپنی دھی بھین سمجھا ہے۔ اس کی آنکھ میں حیا ہے پر تیری ابھی سے آنکھ جلنے لگی ہے۔ بہت برا ہو گا، چل ہٹ! میرا راستہ چھوڑ دے ورنہ بہت برا ہو گا۔''

عمر حیات ہنسا۔ ایسے، جیسے سمجھا رہا ہو کہ 'اپنی اوقات دیکھ کر دھمکیاں دے'...... بولا۔ ''ناں کرو گامن بابا! یہ کون سا تمہاری بیٹی ہے جس کے لیے اتنی غیرت دکھا رہے ہو۔''

یہ جملہ گالی بن کر گامن کا کلیجا فگار کر گیا۔ تڑپ کر آگے بڑھا۔ بے اختیارانہ ایک گالی اس کے لبوں سے نکل گئی۔ عمر حیات نے اُس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھا اور موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر گھما کر بھاگ جانے میں عافیت سمجھی۔ تھوڑے فاصلے پر رُکا اور گردن موڑ کر بولا۔ ''گامن! تم نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اس گالی کا حساب بے باق کرنے آؤں گا۔ انتظار کرنا...... اور اس حرام کی پھوئی کو بھی دیکھ لوں گا کہ تم کب تک اسے بچا کر رکھتے ہو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

گامن چند قدموں تک موٹر سائیکل کے پیچھے دوڑا پھر رُک گیا۔ چندو گدھے کو ہانک کر اس کے قریب پہنچی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بابا! بس کر۔ زیادہ غصہ نہ کر۔ کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں ناں!''

بابا گامن کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس نے چندو کو ایک نظر دیکھا اور گدھے کی لگام تھام کر پیدل چلنے لگا۔ چندو نے اُسے آواز دے کر ریڑھی پر بیٹھنے کا کہا۔ وہ گویا بھول گیا تھا۔ اچھل کر ریڑھی پر بیٹھ گیا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

چندو ماہی نے پہلے بھی کئی مرتبہ میرزادے عمر حیات کو دیکھا تھا۔ دبلا پتلا، نفیس اور تیکھے نقوش والا کھلنڈرا سا لڑکا اسے اچھا لگتا تھا۔ کئی بار اس سے کوئی بات کرنے کو بھی جی مچلا تھا مگر آج اس نے اپنی اصلیت دکھا کر ذہن میں آگ بھر دی تھی۔ چندو ماہی کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ یکبارگی جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اُسے گالیاں دے جس نے اُسے 'حرام کی پھوئی' کہہ کر بھرے راستے پر تذلیل کی تھی۔

وہ رات گامن نے کانٹوں اور انگاروں پر کروٹیں لیتے ہوئے گزاری۔ کئی مرتبہ چارپائی سے اُتر کر بکریوں کے باڑے میں گیا۔ کئی مرتبہ ایندھن والے ڈھیر کے گرد چکر لگا کر نکلے پر گیا۔ چندو کے برعکس وہ جانتا تھا کہ میر زادوں کا بیر بہت برا تھا۔ میر ظفر حیات کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بڑا وضع دار انسان تھا۔ اصول پسند ہونے کی وجہ سے سخت مزاج تھا مگر کسی کا بُرا نہیں مانگتا تھا۔ اس کے ڈیرے پر دو بجے چوتھے دن بیٹھنے والی پرہیاں (پنچائت) منصفانہ فیصلے پر منتج ہوا کرتی تھی۔

گامن کئی مرتبہ اس کی حویلی پر مچھلی دینے گیا تھا۔ وہ مچھلی کی قیمت سے دگنی رقم اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا کرتا تھا اور پیار سے تاجاں، سرداراں اور چندو کے نام لے کر خیریت دریافت کرتا تھا۔ وہ دل کا اچھا اور ہاتھ کا سخی تھا تبھی پورا علاقہ اس کی عزت کرتا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا؛ عمر حیات۔ اس نے شکل اور شاہانہ عادات اپنے باپ سے چرائی تھیں۔ گامن کا راستہ روکنے تک اس نے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کو مدنظر رکھ کر اُسے بُرا یا بگڑا ہوا میرزادہ قرار دیا جاتا۔ گامن کو طیش کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہو رہا تھا، حیرت بھی کیونکہ اس نے آج تک میر ظفر حیات اور اس کے خاندان کی دل سے قدر کی تھی۔

اگلے دن اس نے چندو کو اسکول سے چھٹی کرنے کا حکم دیا۔ نو بجے کے قریب اُسے ریڑھی پر بٹھا کر میر ظفر حیات کی حویلی پر پہنچ گیا۔ میر کا خاندان یونٹا سے کوئی دو کلومیٹر کے فاصلے پر مقیم تھا۔ جاہ و حشم والی حویلی کے زنان خانے کے دروازے پر ریڑھی روک کر اُس نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوکرانی نے جھانکا۔ اکھڑ لہجے میں بولی۔ ''تیکوں پتا کائے نی جو اِہ زنان خانہ اے؟''

(تجھے علم نہیں کہ یہ زنان خانہ ہے)

وہ بولا۔ ''میں جانتا ہوں تبھی دارے پر جانے کے بجائے ادھر آیا ہوں۔ میر صاحب کو بتاؤ کہ گامن آیا ہے۔ بڑا ضروری کام ہے۔''

وہ غصیلی نگاہ باپ بیٹی پر ڈال کر دروازے میں غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد میر ظفر حیات برآمد ہوا۔ وہ کیکر کی مسواک چباتے ہوئے باپ بیٹی کو مستفسرانہ نظروں سے گھورنے لگا۔ گامن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''میر صاب! آپ ہمارے مائی باپ ہیں اور آپ کی وجہ سے ہم غریب لوگ عزت سے اس علاقے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

میر ظفر حیات کی آنکھوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ گامن کے مودبانہ لہجے سے شکوے کی بو سونگھ کر بولا۔ ''خیر تو ہے گامن؟ کھل کر بات کر، کیا کہنا چاہتا ہے تُو؟''

گامن کی کئی نسلیں میرزادوں کے قدم چومتے زمین بُرد ہو گئی تھیں۔ شکوہ کرنا محال تھا مگر چندو کی سلامتی پیشِ نظر تھی۔ ہمت کر کے بولا۔ ''میر صاب! میں اپنی نصیبوں جلی دھی کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے آیا ہوں۔ جی چاہے تو اِسے نوکرانی بنا کر حویلی میں رکھ لیں۔ جی چاہے تو بہورانی بنا کر اس کے لیکھ سنوار دیں۔''

اس کی آواز آنسوؤں کی نمی میں ڈبڈبا گئی تھی۔ میر ظفر حیات کی آنکھیں فرطِ استعجاب سے پھیل گئیں۔ تیز تیز چلتا ہوا ہاتھ یک لخت رُک گیا، بولا۔ ''گامن! یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ یہ چندو ماہی ہے۔ ہے ناں؟ پر تو اِسے میرے پاس لے کر کیوں آیا ہے؟ پہیلیاں نہ بجھوا، انسانوں کی طرح بات کر۔''

وہ میر ظفر حیات کو جانتا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کی زبانی کافی کچھ سن رکھا تھا تبھی اس کے مزاج کو کسی حد تک سمجھتا تھا۔ اُس کے پیروں میں بیٹھ گیا اور سر جھکا کر بولا۔ ''میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ نمک حرام نہیں ہوں۔ میری کئی نسلوں نے آپ کے اونچے شملے والے خاندان کی خدمت کی ہے اور آپ نے کبھی بھی ہمارا حق نہیں مارا۔ آپ میری ہمیشہ مدد کرتے رہے ہیں۔ یہی سوچ کر آج پھر آپ کے دروازے پر آ گیا ہوں، خیرات لینے۔ عزت کی بھیک مانگنے آیا ہوں میر صاب!''

میر ظفر حیات سمجھ گیا کہ وہ ادب اور خوف کی وجہ سے مُدعا زبان پر نہیں لا رہا تھا اس لیے اس نے زمین پر بیٹھے ہوئے گامن کو نظر انداز کیا اور گدھا ریڑھی کے قریب آ گیا۔ چندو ماہی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''دھی رانی! تیرا کملا بابا ہمیشہ گھما پھرا کر بات کرتا ہے۔ سیدھی سی بات کو بھی اُلٹ پھیر کر پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ تو بتا! اسے کیا تکلیف ہے؟''

چندو نے سر اُٹھا کر وجیہہ اور بارعب میر ظفر حیات کو دیکھا پھر اَدب سے سر جھکا کر بولی۔ ''بابا میر سائیں! تکلیف میرے بابا کو نہیں، مجھے ہے۔ کل میرا راستہ میر زادے نے روکا تھا۔ اس نے مجھے سرِعام 'حرام کی پھوئی' کہا اور بابا کو دھمکی دی کہ میں دیکھ لوں گا تو کب تک چندو ماہی کو مجھ سے بچا کر رکھتا ہے۔''

وہ خود کو بہت دلیر سمجھتی تھی۔ تقریر کرتے ہوئے نجانے کہاں سے جملوں کے تانے بانے دماغ میں اُترتے چلے جاتے تھے۔ سوچ کر آئی تھی کہ بہت کچھ کہے گی مگر چند جملوں کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی اور گھٹنوں پر سر رکھ کر زارو قطار رونے لگی۔ اس نے سر اُٹھا کر میر ظفر حیات کی حیرت اور فرطِ اشتعال سے پھٹی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ میر ظفر کے بڑھاپے کو ایک دھکا لگا تھا اور وہ ڈگمگاتا ہوا زنان خان کی دیوار تک چلا گیا تھا۔ پھر دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور لرزتی ہوئی آواز میں پوچھنے لگا۔ ''دھی رانی! تیکوں پک ہے جو اُہ میرزادہ اِی ہا..... میڈا پتر عمر حیات؟''

(دھی رانی! تجھے یقین ہے کہ وہ میرزادہ ہی تھا، یعنی میرا بیٹا عمر حیات؟)

اس نے ہچکیوں کے درمیان، ایک ذرا سنبھل کر سر اُٹھایا اور کہا۔ ''جی بابا میر سائیں! میکوں کائی بھل کائے نی!''

(جی بابا سائیں! مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے)

گامن ہاتھوں پیروں پر چلتا ہوا میر صاحب کے پاس پہنچا اور دونوں پیر تھام کر بولا۔ ''میر صاحب! یہ اپنی اوقات سے بڑی باتیں کر رہی ہے۔ میں تو صرف اتنا کہنے کے لیے آیا تھا کہ میری جان، مال اور عزت آپ کے گھرانے پر قربان ہے۔ اگر میر زادے کا دل میری دھی رانی پر آ گیا ہے تو کیا ہوا؟ خدا کے بعد یہ آپ ہی کا تو مال ہے۔ پر آپ اِسے اپنے پاس رکھ لیں اور سڑکوں پر میری عزت کی نیلامی نہ کریں۔''

اس نے بھرپور نفسیاتی وار کرتے ہوئے اپنا مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جھکے ہوئے تھے مگر اس کا زوردار طمانچہ میر صاحب کے چہرے پر اپنی سرخی چھوڑ گیا تھا۔

میر ظفر حیات بہت شریف النفس انسان تھا۔ اس کا بڑا نام تھا۔ اپنی عمر بھر کی نیک نامی داؤ پر لگی دیکھی تو بوکھلا گیا۔ زور سے دہاڑا۔ ''اوئے عمر حیات! ذرا ادھر تو آ......''

چند لمحوں بعد سرخ رنگ کی ٹی شرٹ پہنے عمر حیات باپ کی شعلہ رُو عدالت میں سر جھکائے کھڑا کن انکھیوں سے کبھی گامن کو تو کبھی چندو ماہی کو دیکھ رہا تھا۔

باپ غرایا۔ ''میرزادے! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم نے گامن کی دھی رانی کا راستہ روکا ہے؟''

باپ کا غصے میں سرخ چہرہ دیکھ کر میرزادہ دہشت سے پیلا ہو گیا۔ ہکلا کر بولا۔ ''ب...... بابا! م...... میں نے کب ایسا......''

باپ کی نظروں نے بیٹے کے چہرے پر مرقوم فردِ جرم پڑھ لی۔ تاڑ گیا کہ وہ مجرم تھا۔ تبھی اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا بلکہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''تو پھر ٹھیک ہے میرزادے! اُدھر ریڑھی پر وہ لڑکی بیٹھی ہے جس کا تم نے راستہ روکا تھا۔ جاؤ، اس کی بانہہ پکڑ لو۔ چاہو تو اُسے بیوی بنا لو۔ چاہو تو بہن بنا کر سر پر ہاتھ رکھ دو۔ جاؤ! شاباش...... میر خاندان غریبوں کو آج تک عزت دیتا آیا ہے۔ عزت پر ہاتھ ڈالنے کا رواج کم سے کم میرے جیتے جی نہیں پڑے گا۔''

میرزادے کی رگوں میں خون جم گیا۔ چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ ندامت سے بولا۔ ''بابا! مجھے معاف کر دو۔''

ساتھ ہی اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ میر ظفر حیات نے لال بھبھوکا ہو کر بیٹے کی طرف بڑھنا چاہا مگر اچانک اُس کا ماتھا پسینے میں تر ہو گیا۔ ہاتھ دل پر ٹک گیا اور چہرے پر سخت تکلیف کے آثار ثبت ہو گئے۔ عمر حیات دہشت کے مارے کانپتا ہوا ملتجیانہ نظروں سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے کے ایک دم بدلتے ہوئے آثار دیکھ کر چونک گیا۔ اچھل کر باپ تک پہنچا مگر تب تک باپ دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہوا زمین پر ڈھے چکا تھا۔ اس کے ہونٹ تکلیف کی شدت سے بھنچ گئے تھے اور لرزتا ہوا ہاتھ سینے کو سختی سے مسل رہا تھا۔

عمر حیات حلق کے بل چیخا۔ ''اوئے رمضو! اوئے وَلیے! بھاگ کے آؤ؛ جلدی کرو۔ میرے بابا کو کچھ ہو گیا ہے۔''

بابا کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ عمر حیات کی خوفناک چیخ سن کر سبھی نوکر دوڑے آئے۔ گھر کی پردہ دار خواتین بھی ننگے سروں زنان خانے سے نکل آئیں۔ چند لمحوں میں ہڑبونگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بچ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں تڑپتے ہوئے میر ظفر حیات کو کار میں ڈال کر عمر حیات شہر روانہ ہو گیا۔ آس پاس کے کئی لوگ بھی پہنچ گئے۔ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا؟ ہر کوئی میر صاحب کو پڑنے والے دل کے خطرناک دورے کا ذکر کرتے ہوئے اللہ سے اس کی صحت یابی کی دعا کرتا مگر کسی کو علم نہیں تھا کہ اس حادثے کا سبب کیا تھا اور نہ ہی کسی نے گامن یا چندو کی طرف توجہ دی۔

دونوں باپ بیٹی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ گامن کو تب احساس ہوا کہ اُس نے ایک غیرت مند باپ کے منہ پر تازیانہ مار کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اس نے کیا سوچا تھا؟ کیا ہو گیا تھا؟...... اس نے گدھے کی لگام پکڑی اور پژمردہ انداز میں کندھے جھکائے حویلی سے نکل آیا۔ گھر پہنچنے تک دونوں کی زبانیں گنگ رہیں۔ کسی ناگہانی صورتِ حال کے پیش نظر دھڑکتے ہوئے دل غیرت مند میر ظفر حیات کی زندگی کی دعائیں مانگتے رہے مگر شام کو جب وسیب کی تمام مسجدوں کے اسپیکر چیخ چیخ کر میر ظفر حیات کے انتقال کا اعلان کرنے لگے، دونوں کے دل مٹھیوں میں آ گئے۔

''اب کیا ہو گا؟'' گامن نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔

اس نے قتل نہیں کیا تھا مگر میر ظفر حیات قتل ہو گیا تھا۔ ساری زندگی اپنی پگڑی کے شملے کو اپنے لہو کی قیمت پر بے داغ رکھنے والا، کم عمر بیٹے کے کردار کا ایک سیاہ چھینٹا برداشت نہیں کر پایا تھا۔ بیٹے پر اُسے بڑا مان تھا۔ اکثر سینہ ٹھونک کر کہا کرتا تھا کہ اس کے بیٹے کی رگوں میں اس کا شریف اور غیرت مند خون دوڑتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی خاندانی نجابت کا جھنڈا بلند رہے گا۔ ناگاہ سینے پر زوردار چوٹ پڑی تو دل نے ساتھ چھوڑ دیا۔

گامن خوفزدہ تھا۔ سمجھتا تھا کہ میر خاندان کی نظروں میں وہی میر صاحب کا قاتل قرار دیا جائے گا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ بعید نہ تھا کہ اُسے علاقہ بدری کے احکامات سنا دیے جاتے۔ وہ میر صاحب کی آخری رسومات میں شرکت کرنا چاہتا تھا مگر خوف کے مارے گھر میں دبکا رہا اور اس نے چندو ماہی کو اسکول پہنچانا بھی ترک کر دیا تھا۔

یہ دورانیہ چندو ماہی کے لیے بڑا اعصاب شکن تھا۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی اور دل ہی دل میں خود کو میر ظفر حیات کا قاتل سمجھنے لگی۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں۔ اس کی موت وسیب پر قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔ تمام بڑے زمینداروں میں ایک وہی تو تھا جس کے دل میں غریبوں کی محبت جاگتی تھی۔ وہی تو تھا جس کے در پر سبھی لوگ بلا جھجک پہنچ جایا کرتے تھے۔ وہ جتنا رزق خلقِ خدا میں بانٹتا تھا، خدا اور اتنا زیادہ اُسے نواز دیتا تھا۔ اس کی اصول پسندی وسیب کے لیے نعمت تھی جو اس کی وجہ سے آسمان پر اٹھ گئی تھی۔ زمین بانجھ ہو گئی تھی۔

تین چار دن گزر گئے۔ گامن کو کسی نے مورد الزام نہیں ٹھہرایا تو اس کے دل کو ایک ذرا ڈھارس ہوئی۔ واضح تھا کہ عمر حیات نے کسی کو میر صاحب پر پڑنے والے جانکاہ دورے کا اصل محرک نہیں بتایا تھا۔ مگر پانچویں دن، ڈھلتی ہوئی شام میں، جب سفید رنگ کی پوٹھوہار جیپ ناہموار راستے پر اچھلتی کودتی گامن کے گھر کے سامنے کھال پر آن رکی تو تاجاں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ چندو کی سانسیں رُک گئیں اور گامن کی آنکھیں خوف سے پتھرا گئیں۔ سرداراں اس وقت ٹوٹے ہوئے کنڈے والی بالٹی سے بکریوں کو پانی پلا رہی تھی۔ جیپ پر نگاہ پڑتے ہی صحن کی طرف دوڑ پڑی۔

سبھی نے میر عمر حیات کو جیپ سے اُتر کر تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف آتے دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے۔ چند لمحوں بعد وہ صحن کے عین وسط میں مرغیوں کے ٹوکرے کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا حال اچھا نہیں تھا۔ لباس سلوٹ زدہ، مٹی آلود سلیپر اور سوجن زدہ سرخ آنکھیں، وحشت بھری اور مجنونانہ۔

گامن کے سینے پر انگلی تان کر پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔ ''تم نے مجھے نہیں، اس پورے وسیب کو یتیم کیا ہے۔ جانتے ہو ناں؟''

اس نے تھوک نگلا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میر زادے! مجھے کیا پتا تھا کہ میر صاب......''

وہ دانت پیس کر بولا۔ ''نہیں نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں پتا نہ ہو کہ میر ظفر حیات کون تھا۔ پورا علاقہ جانتا ہے کہ میر صاحب گولی سے مرنے والے نہیں تھے اس لیے تم نے گولی کے بجائے گالی سے کام لیا۔ تم نے اور اس بے غیرت لڑکی نے مل کر میرے بابا کو مار ڈالا۔''

گامن نے جھک کر اس کے پیر چھونا چاہے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ تاجاں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں بی بی! میں جان کے بدلے جان لینے آیا ہوں۔ میرے بابا کی قاتل یہ حرام کی پھوئی ہے، میں اِسے لینے آیا ہوں۔''

اس کی شعلہ بار نگاہیں چندو ماہی پر آن ٹھہریں۔ گامن نے یکبارگی سر اُٹھایا، بولا۔ ''نہ میر زادے! نہ یہ، نہ

www.marhaba.com.pk

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں...... ہم میر صاحب کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو ہمارا سائیں تھا۔ بھاگ وند تھا۔ کاش! ہماری عمریں بھی اسے لگ جاتیں۔ مگر یہ ہونی تھی، ہوگئی۔ کون ٹال سکتا تھا اِسے۔ مرگ کا بہانہ بننا تھا، سو بن گیا۔ ہمیں معاف کردے۔ تو بڑا ہے۔ ہم چھوٹے ہیں۔ چھوٹوں پر رحم کرنا تیرے بابا کا وصف تھا۔ تو اپنے بابا کا وارث ہے۔ ہم پر رحم کر۔''

وہ رحم کرنے نہیں آیا تھا۔ سختی سے انکار کرتے ہوئے بولا۔ ''نہیں گامن! میں بدلہ لینے آیا ہوں۔ اگر تم شرافت سے بانہہ تھما دو تو ٹھیک ورنہ میں تمہارے پورے خاندان کو برباد کرکے بانہہ لے جاؤں گا۔ ایک ایک کو گولی ماردوں گا۔ اگر چاہوں تو تم سب کو تھانے لے جاسکتا ہوں۔ قتل کے کیس میں پھانسی چڑھوا سکتا ہوں مگر میں تم لوگوں کو کچھ نہیں کہتا۔ معاف کرتا ہوں۔ مگر اپنے دشمن کو معاف نہیں کرسکتا۔''

وہ بہ مشکل اٹھارویں بیسویں سن میں تھا مگر دل میں دہکتی ہوئی آگ کی حدت سے اس کا چہرہ پتھر ہوگیا تھا، آنکھیں بھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا، کرگزرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

گامن نے کہا۔ ''نہیں میر سائیں! ایسا نہ کر، ہم پر رحم کر۔''

چندو ماہی نے قدم بڑھایا اور میر زادے کے روبرو آگئی۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ''نہیں بابا! مجھے بچانے کے لیے زندگی کی بھیک مت مانگو۔ یہ میر زادہ ہے۔ میر نہیں ہے۔ اس کے سینے میں وہ دل نہیں ہے جو کسی غریب کے لیے دھڑکتا ہو۔ اسے جان کے بدلے جان چاہیے تو ٹھیک ہے، میں اس کے ساتھ جاتی ہوں۔ مجھے مار کر اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کرلے۔ میر زادے! لے چل مجھے، جہاں لے جانا چاہتا ہے۔ جہاں لے جاکر مارنا چاہتا ہے، وہاں لے چل اور میری گردن پر چھری چلادے......''

اس نے اپنی بانہہ بڑھادی۔ میر زادے کی آنکھوں میں کئی سانپ کلبلا اُٹھے۔ بانہہ تھامی اور فاتحانہ نگاہ گامن پر ڈال کر دو قدم چلا۔ وہ ساتھ گھسٹی۔ ایسے میں گامن اچھل کر میر زادے کی راہ میں حائل ہوگیا، بولا۔ ''نہیں میر سائیں! یہ ظلم نہ کر ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔ جیتے جی مرجاؤں گا۔''

وہ درشتی سے بولا۔ ''زیادہ ڈرامانہ کرو۔ میں نے تمہاری دھی پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ تم اپنی غیرت اس کے لیے سنبھال رکھو۔ سب جانتے ہیں کہ یہ حرام کی پھوئی ہے۔ حرام موت ہی مرے گی۔ اس کے لیے زیادہ غیرت اور غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اے! تو تو چل، تو کیوں رُک گئی ہے؟''

اتنی بڑی گالی سن کر گامن کی آنکھوں میں زہر بھر گئی۔ چہرہ پتھر ہوگیا۔ بے حد سرد لہجے میں بولا۔ ''اسے چھوڑ دے ورنہ بہت برا ہوگا۔ میری برداشت کا زیادہ امتحان نہ لے۔ میں نے میر صاحب کو تیرے انھی کرتوتوں کا گلہ کیا تھا۔ وہ غیرت مند تھا اس لیے دل پر لے گیا۔ تو غیرت والا نہیں تبھی سر پر چادر تاننے کے بجائے چادر پھاڑنے کے لیے یہاں تک چلا آیا ہے۔''

یوں محسوس ہوا جیسے وہ یک لخت ہر خوف سے بے نیاز ہوگیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور حیران کھڑے میر زادے کی کلائی تھام لی۔ خونخوار لہجے میں بولا۔ ''میرے بازوؤں میں اتنا دم ہے کہ تیرے جیسے لونڈے سے نمٹ سکوں۔ تیرے باپ کے احسانات میرا سر اور ہاتھ اُٹھنے نہیں دیتے تھے وگرنہ جب تو نے ریہڑی روکی تھی، تبھی تجھے سبق سکھا دیتا۔ چل چھوڑ اور بھاگ جا ورنہ مار مار کر باندر بنادوں گا۔''

چندو حلق کے بل چیخی۔ ''نہیں بابا! تم ہٹ جاؤ۔''

تاجاں اور سرداراں میر زادے کے پیروں سے لپٹ گئیں۔ اس نے چندو کی بانہہ چھوڑ دی، تاجاں اور سرداراں کو پاؤں کی ٹھوکر سے پرے دھکیل دیا، پہلو والی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ننھا سا پستول نکال لیا۔ بلٹ چڑھائی اور گامن کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر فائر کردیا۔ فائر کی خوفناک آواز کے ساتھ گامن کے حلق سے تیز چیخ نکلی۔ گولی اس کے گھٹنے میں سوراخ کرگئی تھی۔ آن کی آن میں تہبند کا ایک پلو سرخ ہوگیا اور وہ ایک پیر پر دیوانہ وار ناچتا ہوا عمر حیات کی طرف بڑھا جس نے دوسرا فائر کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھالیا تھا۔ چندو نے ہاتھ تھام لیا۔ بجلی کی سی تیزی سے پستول کی نال کا رُخ اپنے سینے کی جانب کردیا اور چیخ کر بولی۔ ''میں حرام کی پھوئی ہوں، زمانے کا بوجھ ہوں، تو مجھے گولی ماردے ناں، بابا کو کیوں مارتا ہے؟ اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟''

اس نے اپنی انگلی پر دباؤ بڑھایا۔ جان لینے سے پہلے دینا پڑتی تھی۔ سینے پر فائر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ فائر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایسے میں چڑے کی طرح پھدکتا ہوا گامن اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پوری قوت سے مکا اس کی گردن پر مارا۔ عمر حیات ڈگمگاتا ہوا کمرے کی دیوار تک گیا پھر رُک کر، ذرا سنبھل کر اُسے خشمگیں آنکھوں سے گھورنے لگا۔ گامن کی زخمی ٹانگ سے نکلنے والا خون صحن کو تر کررہا تھا۔ چونکہ عمر حیات عادی مجرم نہیں تھا، پیشہ ور لڑاکا نہیں تھا، اس لیے خون دیکھ کر ڈر گیا۔ چند لمحوں تک پستول

والا ہاتھ ہوا میں لہراتا رہا پھر دھمکیاں دیتا ہوا اپنی جیپ کی طرف بھاگ گیا۔ گامن کے خون سے تر ہونے والا میدان صاف ہوگیا تو وہ اپنی ٹانگ پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا اور تکلیف سے کراہنے لگا۔ بلند آواز میں میر زادے کو گالیاں دینے لگا۔

گولی گھٹنے میں پھنس گئی تھی۔ تاجاں نے سرداراں کی مدد سے اُسے اُٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ باپ کی حالت دیکھ کر چندو ماہی کا دل حلق میں اُٹکا ہوا تھا۔ اس نے زخم دیکھا۔ چادر سے خون صاف کیا۔ گامن کو تکلیف میں دیکھ نہیں سکتی تھی۔ رو رہی تھی۔ رب سے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی مگر بابا کو چین نہیں آرہا تھا۔

دیہاتوں میں شام مختصر ہوتی ہے۔ شام کا دھندلکا رات میں تحلیل ہوچکا تھا۔ سبھی ہراساں تھے، متفکر تھے کہ گامن کا کیا، کیا جائے؟ تاجاں دوڑ کر حکیم صاحب کو بلا لائی۔ اس نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ''بھین! ایں کوں وڈے اسپتال گھن ونج!''

(بہن! اسے بڑے اسپتال لے جاؤ)

چندو چاہتی تھی کہ اسی وقت اُسے ریہڑی پر بٹھا کر شہر لے جائے مگر تاجاں نہ مانی۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ علی الصباح چندو اور تاجاں گامن کو شہر کے تحصیل ہیڈ کوارٹر اسپتال میں لے گئیں۔ ڈاکٹر بھلے مانس آدمی تھا۔ اس نے پولیس کو انفارم کرنے کے ساتھ ساتھ علاج معالجہ شروع کردیا۔ ابھی آپریشن شروع نہیں ہوا تھا کہ پولیس پہنچ گئی۔ چندو چاہتی تھی کہ میر زادے عمر حیات کو نامزد کرکے ایف آئی آر درج کرائے مگر گامن نے سختی سے منع کردیا اور اپنے بیان میں لکھوایا کہ وہ شام کو مچھلیاں پکڑنے ڈھنڈ پر گیا تھا۔ ناکام واپس آرہا تھا کہ جنگل میں شکار کے پیچھے دوڑتے ہوئے نامعلوم شکاریوں کی فائرنگ کا شکار ہوگیا۔ سب انسپکٹر سمجھتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ کسی وڈیرے کو تحفظ دے رہا تھا۔ مگر اس علاقے میں یہ معمول کی بات تھی تبھی پولیس نے اُس کا بیان قلم بند کیا اور ضابطے کی کارروائی کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر چلی گئی۔

وہ بابا سے جھگڑ پڑی۔ بابا نے سمجھایا۔ ''دیکھ چندو! ہم غریب لوگ ہیں۔ میر زادے سے ٹکر نہیں لے سکتے۔''

وہ زمانہ شناس نہیں تھی، بابا شناس ضرور تھی مگر بابا کی نہ سمجھ میں آنے والی بات کو ماننے میں تامل کا مظاہرہ کررہی تھی۔ پھر جب تاجاں کو بھی بابا کا ہم خیال پایا تو ناچار خاموش ہوگئی۔

گامن کا آپریشن کامیاب رہا۔ گولی نکال لی گئی۔ ہفتہ بھر اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کی وجہ سے چندو کے پاس جتنی پس انداز کی ہوئی رقم موجود تھی، خرچ ہوگئی۔ گامن ٹانگ پر پلستر اور بغل میں بیساکھی دبائے گھر پہنچ گیا۔ وہ پڑھائی سے بددل ہوگئی تھی مگر گامن نے اُسے مجبور کرکے تاجاں کے ساتھ اسکول بھیج دیا۔ وہ کافی دنوں بعد اسکول آئی تھی اس لیے اپنی کلاس ٹیچر کے سامنے صفائی پیش کرنے کے بعد ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے اُسے دفتر میں بلالیا۔ ''چندو ماہی! تم نے بغیر درخواست دیے اتنی چھٹیاں کیوں کی ہیں؟ بیمار رہی ہو؟''

اس کا دل بھر آیا۔ ہیڈ مسٹریس کے ہمدردانہ رویے پر وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہچکیوں میں بتانے لگی کہ اس پر بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت آن پڑی تھی۔

مسز ریحانہ نے اُسے دلاسا دیا۔ عندیہ دیا۔ ''اگر تم چاہو تو میں سکینہ خانم سے بات کرتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس مشکل وقت میں تمہاری کچھ مدد کردے۔''

اس کی نظروں میں خانم کا مشفق چہرہ گھوم گیا۔ اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔ مسز ریحانہ نے فون پر سکینہ خانم سے رابطہ کرکے چندو سے سنی ہوئی تمام باتیں دہرادیں۔ سکینہ خانم کا جواب سننے کے بعد رابطہ منقطع کرکے چندو سے مخاطب ہوئی۔ ''خانم تمہیں ملتان شہر کے کسی بورڈنگ اسکول میں داخل کروانے کا مشورہ دیتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ گھبرا کر بولی۔ ''پر میرے بابا کا کیا ہوگا؟ وہ تو میرے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔''

مسز ریحانہ اس کی پریشانی سمجھتی تھیں۔ کچھ ہدایات دینے کے بعد اُسے ایک سفید لفافہ تھما کر بولیں۔ ''فی الحال تم اپنی توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھو۔ دو چار دنوں تک خانم یہاں آئیں گی۔ مل بیٹھ کر اس بارے میں مزید کچھ سوچیں گے۔''

خانم کی طرف سے بھیجے گئے وظیفے کی رقم پا کر اسے ایک ذرا تسلی ہوئی۔ امداد بروقت پہنچی تھی کیونکہ آج بابا کی دوائی بھی لے کر جانی تھی اور اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔

چھٹی کے وقت جب اس نے اسکول کے سامنے تارا تارا چھاؤں والی ٹاہلی تلے کھڑی ریہڑی پر اپنی ماں تاجاں کو پہلو کے بل لیٹے دیکھا تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ گامن اس کی پڑھائی کے دوران شہر میں مزدوری پر نکل جاتا تھا۔ تاجاں کہیں نہیں جاسکتی تھی۔ تبھی اس نے سارا دن وہیں بھوکے پیاسے گزار دیا تھا۔

تاسف بھرے دل کے ساتھ چندو نے گدھے کی لگام درخت کے تنے سے کھولی اور ماں کو جگائے بغیر ریہڑی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑھا دی۔ نالی کے جمپ پر ریڑھی کو زوردار جھٹکا لگا تو تاجاں بیدار ہو گئی۔ بولی۔ ''چندو! کوئی نلکا دیکھ کر ریڑھی روکنا۔ تریہہ (پیاس) سے میرا ساہ ڈوبنے لگا ہے۔ اسکول کے سامنے تو حکومت نے ایک نلکا تک نہیں لگایا کہ کوئی پیاسا دو چار گھونٹ پانی ہی پی لے۔''

اس نے ایک میڈیکل اسٹور پر گدھا گاڑی روکی۔ سڑک کے کنارے ایستادہ نلکے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اماں! وہ رہا نلکا؛ جی بھر کے پانی پی۔ میں اتنی دیر میں بابا کی دوائیں اور سبزی خرید لوں۔ چینی پتی تو نہیں لینی ناں؟''

''پیسے آ گئے؟''

''ہاں اماں!''

''تو پھر پتی کا ڈبا بھی پکڑ لینا۔ میں نے پرسوں سے چائے نہیں پی۔'' تاجاں بڑبڑاتی ہوئی نلکے کی طرف بڑھ گئی اور چندو میڈیکل اسٹور کے کاؤنٹر کی طرف۔

عمر حیات شاید اس کے اسکول جانے کی تاک میں تھا۔ واپسی پر اس نے ریڑھی روک لی۔ موٹر سائیکل سے اُتر کر چندو کے قریب آ گیا۔ درشتی سے بولا۔ ''میں آج شام کو تیرے گھر آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔''

تاجاں دہشت بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ چندو بولی۔ ''آخر تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

وہ بولا۔ ''یہ تو تو جانتی ہی ہے چندو! تیری وجہ سے میرے بابا نے تڑپ تڑپ کر جان دی ہے اور میں یتیم ہو گیا ہوں۔''

''یہ میرا جرم نہیں ہے مگر میں پھر بھی معافی مانگتی ہوں۔'' اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میری جان چھوڑ دو، معاف کر دو۔''

''نہیں۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

اس نے گدھے کی لگام ماں کی طرف اچھال دی اور چھلانگ لگا کر ریڑھی سے اُتر آئی۔ بڑی دلیری سے بولی۔ ''تو ٹھیک ہے، میں تمہاری مجرم سہی۔ جو سزا دینا چاہتے ہو، دو۔ میں تیار ہوں۔''

دھوپ اور دکھ کی شدت سے اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ میر زادے نے اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''چل...... میرے ساتھ چل۔''

تاجاں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی آئی اور عمر حیات سے لپٹ گئی۔ منت سماجت اور اللہ نبیؐ کے واسطے دینے لگی۔ وہ بے ساختہ رُک گیا۔ اور بھی کئی لوگ رُک کر سرِ عام دکھایا جانے والا تماشا دیکھنے لگے۔ عمر حیات نے اردگرد دیکھا۔ شرم آئی۔ چندو کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تاجاں کو جھٹک کر بولا۔ ''چندو! تو میرے ساتھ آنا چاہتی ہے مگر لوگ تیری حمایت کرنے لگتے ہیں۔ میرے دل کی آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑک اُٹھتی ہے۔''

اس کے لہجے میں انتقام کی خواہش کے ساتھ ساتھ عجیب سی بے بسی رچی ہوئی تھی۔

چندو روتے ہوئے بولی۔ ''جب تم نے اپنے دل کی آگ بجھانی ہی ہے، ہم بے گناہوں کا خون پینا ہی ہے تو لوگوں کی نگاہوں سے ڈرتے کیوں ہو؟ میرا خون پیو؛ مجھے مارو...... اتنا کہ بھلے جان سے مار دو۔ تم نے بابا کو گولی ماری۔ کسی نے تمہیں کچھ کہا؟ نہیں...... کیونکہ تمہارا گھر بہت بڑا ہے۔ تمہارے پاس دولت ہے۔ ہے ناں؟ پھر مجھے مار دو گے تو تمہیں کون پوچھے گا۔''

وہ اُسے مارنا چاہتا تھا...... نہیں مارنا چاہتا تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ چند لمحوں تک ہونٹ کاٹتا رہا، اُسے دیکھتا رہا پھر اپنی بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

تاجاں نے چندو کو بازو سے پکڑا اور ریڑھی پر لے آئی۔ عمر حیات کے جانے کے بعد کئی مرد ریڑھی کے آس پاس آن کھڑے ہوئے۔ ماجرا دریافت کرنے لگے۔ ہر آنکھ میں طنزیہ سوال مترشح تھا۔

تاجاں بولی۔ ''پرے ہٹ جاؤ! جب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت تھی، تب تم تماشا دیکھنے میں معروف تھے۔ اب وہ بے غیرت چلا گیا ہے تو ہمدردی جتانے کے لیے ہمارے سر پر آن دھمکے ہو۔ پتا نہیں خدا تم جیسے منافقوں کو غارت کیوں نہیں کر دیتا۔''

لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے تتر بتر ہو گئے۔ کچھ دور نکل کر تاجاں نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''چندو! کیا تجھے میر زادہ اچھا لگتا ہے؟''

وہ چونکی، گڑبڑائی، بولی۔ ''کیا مطلب اماں؟ جس نے میرے بابا کو گولی ماری، مجھے سرِ عام رسوا کیا، وہ مجھے کیوں اچھا لگے گا؟''

تاجاں اس کے چہرے پر نظریں گاڑے بولی۔ ''تو پھر کیوں تو بار بار اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو جاتی ہے؟''

اس نے لمبی سانس لی اور شکست خوردہ انداز میں بولی۔ ''اماں! میں بری ہوں ناں، اس لیے...... حرام کی پھوٹی ہوں ناں، اس لیے...... وہ مجرم سمجھتا ہے۔ میں اس کے ساتھ چل پڑتی ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم لوگوں پر کوئی اور مصیبت آئے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو کر دے۔ آپ لوگوں کو تو کچھ نہ کہے ناں!''

اماں نے اُسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تجھ سے بڑا احمق دنیا میں نہیں ہے بولی۔ ''تو نے یقین کر لیا ہے کہ وہ تجھے قتل کرنا چاہتا ہے؟''

''تو اور کیا کرے گا میرا؟ اچار ڈالے گا؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

تاجاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گئی۔ کہنا چاہتی تھی کہ مرد اپنے دل کے مرتبان میں سن چاہے آم کا اچار ڈالنا چاہتا ہے۔ اس مرتبان میں آم کا بدن گل جاتا ہے۔ تیز نمک رگوں تک سرایت کر جاتا ہے مگر ماں تھی، شرم کے مارے کہہ نہ سکی۔ گھر پہنچ کر گامن سے کہنے لگی۔ ''گامن! میری مان تو اِسے اسکول سے اُٹھا لے اور اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔''

گامن نے آنکھیں دکھائیں۔ ''کیا کہا، سرداراں گھر میں بیٹھی رہے اور میں اس کے ہاتھ پیلے کر دوں؟ واہ تاجاں! لوگ کیا کہیں گے؟...... پر ہوا کیا ہے؟ بول تو سہی ناں۔''

تاجاں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ بپھر گیا، بولا۔ ''میں چندو کو لے کر اسکول جاؤں گا اور اس جاگیردار کے بچے کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ بڑا آیا میر زادہ! غیرت کی رتی شامل نہیں ہے اُس کے خون میں۔ بے حیا نہ ہووے تاں...... اور چندو! سن تو...... اب اگر تو نے دوڑ کر اُسے اپنی بانہہ تھمائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ میں غریب ہوں، مزدور ہوں، پر بے غیرت تو نہیں ہوں کہ تو میری آنکھوں کے سامنے غیر محرم کو بانہہ پکڑا دیتی ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ پہلے ماں نے شک کیا تھا۔ اب باپ نے زمین میں اُتار دیا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے اپنا رویہ غیر فطری سا لگا۔ وہ کوئی بھیڑ بکری تو نہیں تھی کہ اپنی کلائی ڈاکو بن کر آنے والے کے ہاتھ میں تھما دیتی تھی۔

باپ کے زخم پر دوائی کا لیپ کرتے ہوئے رونے لگ گئی۔ پیر تھام کر معافی مانگنے لگی۔ گامن نے اُسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ''اوئے چندو! جب کوئی تجھے حرام کی پھوٹی کہتا ہے تو میرا اُسے آگ لگا دینے کو جی چاہتا ہے۔ تو حرام نہیں، حلال ہے۔ حلال سے بھی بڑھ کر حلال ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے تو بولوں کہ تجھ سے زیادہ پاک وجود تو شاید دنیا میں کوئی نہیں ہے پر خدا جانے کیوں لوگ میرا دل دکھاتے ہیں۔''

تاجاں نے طنزاً کہا۔ ''ہاں ہاں! اب دونوں بیٹھ کر ٹسوے بہاؤ۔ اپنی لاڈلی کو اسکول نہ بھیجتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ میں آج تک چپ رہی ہوں۔ آج بولتی ہوں۔ کہتی ہوں کہ تیری لاڈلی کا دل میر زادے کو مانگتا ہے۔ اس کی آنکھیں بولنے لگی ہیں۔ مجھے اس کی آنکھوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ یا تو اس کی آنکھیں پھوڑ دے یا اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔ آگ پر پانی پڑے گا تو سب اَٹ وَٹ (کس بل) نکل جائیں گے۔''

وہ کراہی۔ ''نہیں اماں! میرے دل میں کوئی اَٹ وَٹ نہیں ہے۔''

گامن نے تشویش بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''دیکھ چندو! میں تیرا بابا ہوں۔ بابا سے جھوٹ بولنا سخت گناہ ہوتا ہے۔ اگر تیرا دل وہی کچھ مانگتا ہے، جو تیری اماں بتاتی ہے تو مجھے بول دے۔ میں میر زادے کو بول دوں گا۔''

اس نے بابا کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھا، آنکھوں پر، پھر اپنے دل پر پھیلا ہوا ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''بابا! تیری قسم کھاتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں کہ میرا دل صرف تیرے نام پر دھڑکتا ہے۔ کہے تو ابھی روک دوں۔ ابھی اپنا گلا گھونٹ دوں۔ تو نے مجھے زندگی دی تھی۔ تو ہی میری زندگی کا مالک ہے۔ پر تو میری بات کیوں نہیں سمجھتا؟''

پھر وہ ایسے ٹوٹ کے روئی کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ بابا نے بڑی مشکل سے اُسے چپ کرایا۔

چندو نے گامن کے اصرار کے باوجود اسکول جانا ترک کر دیا۔ جس دن اس کی دہلیز پر مسز ریحانہ کے ساتھ سکینہ خانم نے دوسری مرتبہ قدم رکھا، وہ بری طرح نروس ہو گئی۔ گھر میں انہیں بٹھانے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی بیٹھتیں، لباس میلا ہوتا معلوم ہوتا۔ خانم نے اُسے پیار کیا۔ اس کا دکھ بانٹا اور بتایا کہ وہ ملتان کے ایک پرائیویٹ اسکول میں اس کی تعلیم اور رہائش کا بندوبست کر آئی تھی۔ اس نے امید بھری نظروں سے گامن کی طرف دیکھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنی چندو کو نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسز ریحانہ اور سکینہ خانم کا تمام تر اصرار بے معانی ثابت نہیں ہوا بلکہ چندو نے اگلے دن اسکول جانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ سکینہ خانم ہر حال میں اُسے پڑھانا چاہتی تھی۔ مسز ریحانہ نہیں جانتی تھی کہ امیر زادی خانم اس پر اتنی مہربان کیوں تھی، نہ گامن اور تاجاں نے اُسے بتانے کی غلطی کی تھی۔

وہ تیاری کے باوجود اسکول نہ جا سکی کیونکہ شام کو جب گامن ڈھنڈ سے لوٹا تھا تو اُس کی پھولی ہوئی سانسیں اور دہشت سے پیلا پڑتا ہوا چہرہ کوئی اور داستان سنا رہا تھا۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے بیساکھی چارپائی پر رکھی اور ہانپتے ہوئے پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد تاجاں کے استفسار پر بولا۔ ''تاجاں! آج حیاتی کی ڈور لمبی ہونے کی وجہ سے بچ گیا ہوں ورنہ اس وقت تو میرے حلق میں پانی ڈالنے کے بجائے میرے مردہ بدن پر پانی ڈال رہی ہوتی۔''

تاجاں کا کلیجا منہ کو آ گیا۔ ''منہ سے خیر کی بات نکال گامن! کیا ہوا ہے؟''

اس نے بتایا کہ وہ ڈھنڈ کے کنارے ڈور ڈال کر بیٹھا تھا کہ جھنگی میں سے دو آدمی نکلے۔ انہوں نے ہاتھوں میں بندوقیں اُٹھا رکھی تھیں۔ زیادہ فاصلے کی وجہ سے وہ انہیں پہچان نہیں پایا۔ انہوں نے اس پر یکے بعد دیگرے کئی فائر کیے تھے۔ خوش بختی سے گولیاں اس کے آس پاس ریت پر لگیں۔ وہ محفوظ رہا مگر ڈر کے مارے زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہوتا رہا۔ گولیاں مارنے والوں نے شاید سمجھا کہ اُسے گولی لگ گئی ہے، وہ پلٹ کر جھنگی میں گھس گئے اور غائب ہو گئے۔ گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے وہ نہ تو ان کا پیچھا کر سکتا تھا اور نہ ہی دوڑ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ بیساکھی پر پھدکتا ہوا گھر پہنچ گیا تھا، عافیت تھی۔

چندو ماہی کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ اس سمیت سبھی متفق تھے کہ فائرنگ کرنے والوں کو عمر حیات نے بھیجا ہوگا کیونکہ اس کے علاوہ ان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔

چندو اپنے آپ کو اس تمام تر قضیے کی بنیاد سمجھتی تھی۔ افسردہ اور نادم ہو گئی۔ تب اُسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔ جس شخص نے اُسے برسوں کاندھوں پر بٹھا کر اسکول پہنچایا تھا، اس کے لیے دنیا بھر کی ملامت سہی تھی اور نہ چین سے سوتا تھا، نہ کھاتا پیتا تھا۔ اس کی وجہ سے بے چارہ ایک ٹانگ پر پھدکتا پھرتا تھا۔ آج ڈھنڈ سے زندہ بچ آیا تھا، قسمت تھی۔ مگر قسمت ہر روز ساتھ نہیں دیتی۔ کسی دن وہ چارپائی پر اُٹھا کر لایا جاتا۔ یہ سوچ کر مزید ڈر گئی۔ اس نے کمرے میں بیٹھ کر اسکول کی کاپی سے ایک ورق پھاڑا۔ رقعہ بنایا جس میں میر عمر حیات کو مخاطب کر کے لکھا کہ وہ اس کے پاس آنا چاہتی ہے۔ اس کا انتقام پورا کرنے کے لیے اپنا آپ پیش کرنا چاہتی ہے کیونکہ وہ اپنے بابا کو تختۂ مشق بنتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ راستہ روکنے کے بجائے اسکول کے اوقات میں گیٹ پر آ جائے۔ جہاں لے جائے گا، وہ چلی جائے گی۔ اگلے دن اس نے اسکول کی ملحقہ کتابوں کی دکان سے لفافہ لیا، میر عمر حیات کا پتا لکھا اور سرخ رنگ کے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

وہ کتابوں سے پیار کرتی تھی۔ تبھی اس کا دل تعلیم میں خوش رہتا تھا مگر بدلے ہوئے حالات نے اُسے ہر چیز سے متنفر کر دیا تھا۔ مسز ریحانہ سمیت سبھی ٹیچرز کی ہمدردی بھی اُس پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈال رہی تھی۔ امید وبیم میں دو تین دن گزر گئے۔ اس کا انتظار رنگ لایا اور گیارہ بجے کے قریب چپڑاسی نے کلاس روم میں آ کر اعلان کیا۔ ''چندو بیٹی! تمہارا کوئی کزن تم سے ملنے آیا ہے۔ کہتا ہے کہ بڑا ضروری کام ہے۔ اُدھر گیٹ پر کھڑا ہے۔''

اس کا کوئی کزن نہیں تھا جو گیٹ پر آ کر پکارتا۔ وہی ہو سکتا تھا جسے اُس نے خود تک پہنچنے کا راستہ دکھایا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے ٹیچر کی اجازت سے مین گیٹ کا رُخ کیا۔ سفید رنگ کی پوٹھوہار جیپ وہیں کھڑی تھی جہاں گامن اپنی ریہڑی ٹھہرا کر چھٹی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ وہ چادر درست کرتی ہوئی جیپ کے قریب آ کر رُک گئی۔ عمر حیات بھی گاڑی سے اُتر کر قریب آ گیا۔ اس کا حلیہ پہلا سا نہیں تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ بری طرح اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ چندو کا چہرہ انگلی سے اوپر اُٹھا کر بولا۔ ''میں تمہارا خط پڑھ کر یہاں آیا ہوں۔''

چندو سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا یا اسکول کے گیٹ پر آن پہنچنے کے جرم کی صفائی پیش کی تھی۔

وہ بولی۔ ''ہاں میر زادے! تمہارے بندوں نے بابا پر فائرنگ کی۔ قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گیا۔ اگلی بار شاید نہ بچ سکے؛ ڈر گئی۔ تم امیر آدمی ہو۔ تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑے گا مگر ہم اُجڑ جائیں گے۔ یہی سوچ کر میں نے اسے بتائے بغیر تمہیں خط لکھ دیا۔ میں آ گئی ہوں۔ چلو! جہاں بھی لے جانا چاہو، جو بھی سلوک کرنا چاہو، میں حاضر ہوں۔''

''بس...... اتنا ہی دم خم تھا تو میرے بابا کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار شامل تھی۔

''جو بھی کہہ لو، کہہ سکتے ہو۔ بادشاہ ہو۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''او کے۔'' اس کا لہجہ بے عنوان تھا۔ چندو کوئی نتیجہ اخذ نہ کر پائی۔ اس نے جیپ کی طرف اشارہ کیا، ''بیٹھو......''

وہ کشتیاں جلا کر اسکول سے نکلی تھی۔ ایک اداس اور حسرت بھری نگاہ گیٹ پر ڈال کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ سیٹ پر بیٹھ کر، سر گھٹنوں میں دیتے ہوئے دنیا سے چھپ کر، آنسو بہانے لگی۔ وہ آج تک کار یا جیپ میں نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ وسیب کی غریب لڑکیاں رخصتی کے وقت

بھی ہوئی کار میں بیٹھتی تھیں یا جب دنیا سے رخصت ہونے سے قبل انہیں کار میں بٹھا کر اسپتال لے جایا جاتا تھا۔ کوئی خوشی سے نہیں بیٹھتی تھی۔ وہ بھی مقتل لے جائی جا رہی تھی۔ خوشی کیا؟ ہیجان کیا؟...... اس کا ذہن ایک دم خالی ہو گیا۔ جیسے دنیا کبھی کبھار بے معانی ہو جاتی ہے۔

شہر کے مضافاتی محلے کے ایک خالی مکان میں میر زادے نے اُسے اتارا۔ یہ اُس کے کسی دوست کا گھر تھا۔ دوست کے اہلِ خانہ سیر سپاٹے پر نکلے تھے یا کسی عزیز کی شادی پر گئے تھے۔ خالی صحن عبور کر کے عمر حیات نے اُسے کمرے میں لے جا کر بٹھایا اور پانی کا گلاس بھر کر تھما دیا۔ قدرے نرمی سے بولا۔ ''پانی پیو۔ تم بہت نروس ہو رہی ہو۔''

چندو نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام لیا۔ پانی لرزنے لگا۔ اس کی نگاہیں پانی پر ایک ذرا جم گئیں۔

بچپن میں اُس نے بابا سے پوچھا تھا۔ ''بابا! قربانی کے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے پانی کیوں پلایا جاتا ہے؟''

بابا نے ناصحانہ انداز میں سمجھایا تھا۔ ''قربانی والا جانور زمین سے سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ چونکہ سفر لمبا ہوتا ہے، اس لیے اُسے پانی پلایا جاتا ہے کہ لمبے سفر میں پیاس نہ لگے۔''

ایک مرتبہ اُس نے تاجاں سے پوچھا تھا۔ ''اماں! کنوارکوں ویندی وار لوک پانی کیوں پویندن؟''

(اماں! دلہن کو رخصتی کے وقت پانی کیوں پلایا جاتا ہے؟)

تب اُسے جواب ملا تھا۔ ''اُسے سمجھایا جاتا ہے کہ تمہارا دانہ پانی اس گھر سے اُٹھ گیا ہے اور تم نے اپنے مقسوم کا آخری گھونٹ بھی پی لیا ہے۔ لوٹ کر نہ آنا ورنہ پانی تک نہیں ملے گا۔''

اُسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر سر پر کھڑے میر زادے نے سخت لہجے میں کہا۔ ''جلدی پانی پیو، کیا دیکھنے لگ گئی ہو؟ میں نے اس میں زہر تو نہیں ملا رکھا۔''

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور گلاس لبوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

ابھی گلاس اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ عمر حیات نے پوری قوت سے زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ 'ہائے بابا' کی دردناک آواز نکال کر پہلو کے بل گر گئی۔ زندگی کا پہلا تھپڑ آنکھوں سے آنسوؤں کے بجائے خون نکال لایا۔

عمر حیات نے دوپٹے میں چھپے ہوئے بال مٹھی میں بھرے اور اُسے کھینچ کر بٹھا دیا۔ دوسرے گال پر پڑنے والا طمانچہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ اس کے بعد عمر حیات نے اُسے ٹھڈوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ ہر ضرب پر بلبلا اُٹھتی۔ ہر ٹھوکر پر اس کی آنکھوں میں تارے ناچ اُٹھتے مگر اس کے لبوں سے سوائے سسکیوں اور آہوں کے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ اس نے نہ تو اس سے پوچھا کہ وہ کیوں مار رہا تھا اور نہ ہی اُس کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تھک کر ہانپنے لگا پھر سر تھام کر چارپائی پر بیٹھ گیا جبکہ وہ فرش پر بے جان انداز میں پڑی بری طرح کراہ رہی تھی۔ عمر حیات نے درشت آواز میں دو تین مرتبہ اُسے اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھنے کا حکم دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

سانسیں بحال کر کے وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا۔ گلاس تھام کر کونے میں رکھے پانی کے جگ کی طرف گیا۔ گلاس حلق میں انڈیل کر پلٹا اور گلاس کو پوری قوت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا۔ ننھا سا دھماکا ہوا۔ چندو نے ڈر کر سر اُٹھایا۔ اتنی دیر میں وہ سر پر پہنچ گیا۔ بالوں سے پکڑ کر چارپائیوں کے بیچ گھسیٹتا ہوا صوفے تک لایا۔ بے دردی سے چیخ کر بولا۔ ''تم نے...... ہاں تم نے میرے بابا کا خون کیا ہے۔ تم نے مجھے جیتے جی مار ڈالا۔ تم نری حرام کی پھوٹی ہو...... سنا تم نے؟ میں کہہ رہا ہوں کہ تم حرام کی پھوٹی ہو۔ تمہارا وجود گناہ کی مٹی سے گوندھا گیا تھا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

اس کے حلق سے غلیظ گالیاں ابل پڑیں۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی، سسکتی رہی۔ وہ کافی کچھ کہہ گیا تو اُس نے سر اُٹھایا اور پھولی ہوئی سانسوں میں بولی۔ ''تو مجھے مار کیوں نہیں دیتے؟ مار کر اپنی آگ بجھا لو ناں۔ میں گناہ کی پوٹ ہوں۔ میرا کوئی ولی وارث نہیں ہے۔ کوئی تمہارا گریبان پکڑ کر نہیں پوچھے گا کہ تم نے چندو کو کیوں مارا۔''

اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دونوں گال سوج کر سرخ ہو گئے تھے۔ سلیقے سے باندھے گئے بال کھل کر مجنونانہ انداز میں بکھر چکے تھے جبکہ ہونٹوں کے دائیں گوشے سے خون کی ننھی سی لکیر نکل کر ٹھوڑی تک پہنچی تھی اور جم گئی تھی۔ اسے اس کا احساس تک نہیں تھا۔ آنکھوں میں دہشت کی جگہ وحشت نے لے لی۔

عمر حیات اُسے سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر پلٹ کر دروازے کے پاس گیا۔ دروازہ بند کر کے دوڑنے کے سے انداز میں اُس کے قریب آیا۔ کندھوں سے تھام کر جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ ''ہاں...... ایسا ہی ہوگا۔ میں تمہیں مارنے کے لیے ہی تو یہاں لایا ہوں۔ بولو! کیا میں دنیا کا پہلا لڑکا تھا جس نے کسی لڑکی کا راستہ روکا تھا؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے نفی میں سرہلایا۔

وہ غرایا۔ ''کیا قیامت آ گئی تھی کہ میں نے بے اختیار ہو کر تمہیں دیکھ لیا، بات کرلی؟ کھا جاتا تمہیں؟''

اس نے پھر نفی میں سرہلایا۔

''تو پھر تم نے میرے بابا سے میری شکایت کیوں کی؟''

اس نے عمر حیات کی وحشت بھری آنکھوں میں جھانکا۔ ''تم نے مجھے حرام کی پھوٹی کہا تھا۔''

''تو کیا تم حرام کی پھوٹی نہیں ہو؟''

اس نے نفی میں سرہلایا۔ ''نہیں! میں نہ کسی کے گناہ کا حصہ ہوں اور نہ کسی کے گناہوں کی پاداش۔''

''کیا مطلب؟''

''کیا تم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ تم اپنے باپ کی اولاد ہو؟'' اس کی ہمت دیدنی تھی۔

''تت...... تم...... میں تمہیں......'' وہ حلق کے بل چیخا۔ فرطِ اشتعال سے کچھ بھی نہ کہہ پایا۔ ذرا سانس لے کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ میں میر ظفر حیات کا بیٹا ہوں۔''

وہ بے دردی سے نفی میں سر کو جنبش دے کر بولی۔ ''نہیں میر زادے! کوئی بھی پورے یقین سے یہ بات نہیں کرسکتا۔ تم بھی۔''

وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے چندو کے شانے چھوڑ دیے اور اُسے دو تین زور دار تھپڑ رسید کیے۔ وہ بجائے رونے یا منت سماجت کرنے کے ہنسنے لگی۔ یوں جیسے کوئی فاتر العقل قہقہے لگاتا ہے۔ عمر حیات کے یکبارگی ہاتھ تھم گئے۔ گھبرا گیا۔ اُسے ہوش میں لانے کے لیے پھر جھنجوڑنے لگا۔

وہ وحشیانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''فکر نہ کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ مارو! اور زور زور سے مارو تا کہ تمہارے اندر کے پاگل آدمی کو قرار آ جائے اور میری تم جیسے جنونی سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے۔''

اس نے حلق سے ڈراؤنی آواز نکالی اور دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن دبوچ لی۔ بتدریج ہاتھوں پر دباؤ بڑھتا گیا۔ چندو کی آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں۔ چہرے کی رگیں کھنچ گئیں پھر منہ بھی کھل گیا اور خرخراہٹ برآمد ہونے لگی۔ بے اختیار چندو کے ہاتھ عمر حیات کی پھولی ہوئی رگوں والے ہاتھوں پر ٹک گئے۔ چند لمحے اور گزر جاتے تو وہ دنیا سے گزر جاتی۔ موت اُس کے سامنے لہرائی ضرور مگر اُسے شکست نہ دے پائی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی طلب رتی نہیں جاگی تھی۔

معمولی بات کو جذباتی اور ہیجانی انداز میں بڑی بات بنانے والے من چلے عمر حیات کے گلا گھونٹنے والے ہاتھوں کی بجلیاں بھی ماند پڑ گئیں اور بے جان انداز میں پیچھے ہٹ گئے۔ چندو نے یک بارگی پورا منہ کھولا، تیز تیز سانسیں پھیپھڑوں میں اُتاریں اور کھانسنے لگی۔

عمر حیات کا ہیجان تھما نہیں تھا۔ اس نے چندو کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے قمیص پھاڑ دی۔ وہ جلدی سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھی، پھر اپنی برہنگی کا خیال کرتے ہی صوفے پر گر کر سمٹتی ہوئی گٹھڑی سی بن گئی۔

اس نے ابھی تک عمر حیات کا ہاتھ نہیں روکا تھا۔ اب روکنا چاہ رہی تھی مگر اس کی دیوانگی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور چند ہی لمحوں میں آدھا بدن بے لباس ہو گیا۔ وہ شرم سے زمین میں گڑنے لگی۔ وہ اس کی حالتِ زار سے بے پروا تھا۔ باؤلے کتے کی طرح بھنبھوڑنے لگا اور چندو ماہی کی مزاحمتی سسکیوں اور سماجتوں پر دھیان دیے بغیر مارنے پیٹنے لگا۔ پانی کو دیکھ کر پیاس بڑھتی ہے۔ ماس کو دیکھ کر بھوک بڑھتی ہے مگر کچھ ایسا ہوا کہ میر عمر حیات کی بھوک اور پیاس یک لخت ختم ہو گئی۔ وہ فرعون بن کر ناکردہ جرم پر سزا دینے، اُسے مارنے یا گڑگڑا کر معافی مانگنے پر مجبور کرنے کے لیے لایا تھا۔ اس نے پھر دو چار ہاتھ جڑنے کی نیت سے ہاتھ اُٹھایا مگر ہاتھ نیچے لانے سے پیشتر ہار گیا۔ انسانی ذہن کمپیوٹر نہیں ہوتا۔ کمپیوٹر کو جو فیڈنگ دی جاتی ہے، وہ ہزار بار طلب کرنے پر وہی فیڈنگ اسکرین پر لا دکھاتا ہے مگر انسان ایک ہی سوال کا جواب ہر مرتبہ ایک سا نہیں دیتا۔ وہ دو جمع دو کا جواب 'چار' میں بھی دیتا ہے اور 'گالی' میں بھی۔ مانگنے پر دے بھی سکتا ہے اور چھین بھی۔

عمر حیات کی ذہنی رو بدل گئی۔ آنکھوں کی ندیدگی پر حیا کی چادر پھیل گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا، اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں کو، پھر آنکھیں بند کر کے رُخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''قمیص پہن لو۔''......

اس کی جان میں جان آئی۔ خود کو دیکھا تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ قمیص کو دیکھا جو پہننے کے قابل نہیں رہی تھی مگر وہ جلدی جلدی پہننے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ زیب تن کی، کچھ چیتھڑوں کی صورت میں بدن پر پھیلائی۔ چادر نے اُس کا بالائی تن ڈھانپ لیا تھا۔

عمر حیات نے اُس کی طرف پھر نہیں دیکھا بلکہ دور ہو گیا۔ پیٹھ کیے بولا۔ ''چندو! مجھے معاف کر دو۔ میں یقیناً پاگل

ہو گیا ہوں؛ شاید نفسیاتی مریض۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔''

خاموش ہو کر، تھوڑے توقف کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے، دیوار پر ٹکائے اور سر جھکا کر گویا ہوا۔ ''دیکھو چندو! میں اپنے بابا سے بہت پیار کرتا تھا۔ اتنا کہ دنیا میں کسی سے نہیں مگر تمہیں دیکھا تو مجھے کچھ کچھ ہونے لگا۔ تبھی خود پر اختیار نہ رکھتے ہوئے تمہارے سامنے آیا اور تم نے میری شکایت کر کے میرے پیارے سے بابا کو مار دیا۔ آہاہ...... تم نے میری نظروں کے سامنے میرے خاندان کو بے سائبان کر دیا۔ مگر...... میں اسی غلطی پر تھا کہ یہ سب کچھ تم نے کیا۔ نہیں...... یہ تو میں نے خود کیا تھا۔ پر نہیں...... یہ میں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ تو پھر یقیناً بابا کی غفلت ہی اُسے لے ڈوبی۔ ہے ناں؟''

چندو ماہی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بھانپ گئی کہ عمر حیات کا ذہن منتشر ہونے لگا تھا۔ جواب میں کچھ نہ بولی۔ سسکیاں روک کر سننے لگی، وہ کہہ رہا تھا۔ ''کاش! بابا کو ہارٹ اٹیک نہ ہوتا اور میں اُس سے معافی مانگ لیتا مگر اتنی مہلت ہی نہیں ملی...... اور تم...... تم...... جسے میں نے کئی بار حرام کی پھوٹی کہا، نہیں...... تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم کسی گناہ کا حصہ نہیں ہو۔ تم تو تم ہو...... چندو ماہی...... چاند کی طرح روشن، ماہی کی طرح خوب صورت۔ ہے ناں؟ میں تمہیں برباد کرنا چاہتا تھا۔ تمہیں بے آبرو کرنا چاہتا تھا۔ تبھی یہاں لایا تھا۔'' اس کی آواز شدتِ جذبات سے ٹوٹنے لگی۔ ''مگر اَب پتا چلا کہ تم نہیں، بے آبرو تو میں ہونے چلا ہوں۔ نہیں، بلکہ بے آبرو ہو گیا ہوں۔ اپنی ہی نظروں سے گر گیا ہوں۔ کیا میں اتنا ہی نیچ ہوں کہ ایک بن ماں کی، بن باپ کی بچی کی بددعا کی بھینٹ چڑھ جاؤں؟ نہیں...... میں تو بہت اونچے شملے والے میر ظفر حیات کا بیٹا ہوں۔ اس کا، جس کا نام لے کر دنیا قسمیں کھاتی ہے۔ اوہ! میں نے بہت بڑا گناہ کیا، بہت بڑا ظلم کیا۔ تم چاہو تو مجھے معاف کر دو۔ چاہو تو جوتا اُتار کر میری کھوپڑی پلپلی کر دو۔ آؤ...... دیر نہ کرو۔ اِدھر مارو، ایسے......''

اس نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا۔ ایک مرتبہ پھر بارہا......

چندو ماہی بے بسی اور نفرت کے ملے جلے احساس سے اُس کی اوٹ پٹانگ حرکات دیکھ رہی تھی۔ اس کا عضو عضو دکھ رہا تھا۔ دیوانے کی دیوانگی نے بدن کے جوڑ جوڑ میں درد بھر دیا تھا۔ ہونٹ زخمی کر دیے تھے اور دانتوں کے ننھے ننھے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ وہ ہاتھ کی پشت سے لہو پونچھنے لگی۔ کبھی اپنے لہو کو دیکھتی، کبھی دیوانے کی پشت کو۔

اُس نے بے آبرو نہیں کیا تھا مگر آبرو میں رہنے بھی نہیں دیا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کیا کہے؟ کیا نہ کہے؟

''چندو! مجھے گالیاں دو۔ جی بھر کے برا بھلا کہو۔ جو من میں آئے، کہو۔ پھر معاف بھی کر دو۔''

اسے جواب نہیں ملا تو کندھے کے اوپر سے گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے چلایا۔ ''تم بولتی کیوں نہیں ہو؟......''

پھر خود ہی بڑبڑایا۔ ''پر میں نے اچھا کیا بھی کیا ہے کہ تم میرے ساتھ بولو۔''

دیوار کا سہارا چھوڑ کر لہراتا ہوا تیزی سے اس کی طرف آیا۔ وہ ڈر کر سکڑ گئی۔ وہ قریب آ کر ایک ذرا ٹھٹکا پھر پیروں میں بیٹھ گیا۔ دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''بھلے مجھے مارو، گالیاں دو مگر ایسے خاموش نہ رہو۔ خدا کے لیے مجھے مارو۔ میں کتا ہوں۔ کتے کو بھی پتھر مارتے ہیں۔ جوتے مارتے ہیں۔ تم بھی مارو۔''

وہ سہمی سہمی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے منہ پھیر گئی۔ عمر حیات نے اس کے سرد ہاتھ تھامے۔ دونوں ہاتھوں پر خون لگا ہوا دیکھ کر دیوانہ وار چومنے لگا۔ پھر اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو زور زور سے اپنے گالوں پر مارنے لگا۔ ہوش میں نہیں تھا۔ وہ مزید ڈر گئی۔ پاگلوں سے ہر کوئی ڈرتا ہے۔ اپنا آپ بچاتا ہے۔ وہ اس پاگل سے اپنا آپ بچا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی گرفت سے نکل کر بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ اُس سے بڑی پاگل تھی جو احمقانہ انداز میں اُس کے ساتھ تنہائی میں چلی آئی۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر اَب سر پیٹنے سے کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

عمر حیات نے ایک ایک زخم اور نیل کو چوما۔ چاہا کہ اپنی بربریت کے سبھی داغ مٹا ڈالے مگر تھک گیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ ایسے میں چندو کی غیر معمولی سرد مہری دل پر گراں گزرنے لگی۔ گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ بچوں کی طرح ہچکیاں لینے لگا۔ بلند آواز میں خود کو برا بھلا کہہ کر اُسے بولنے پر اکسانے لگا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تبھی اُس نے سر اُٹھا کر چندو کو دیکھا اور کہا۔ ''چندو! بابا نے مجھے آخری حکم یہ دیا تھا کہ میں تمہیں بیوی بنا لوں یا بہن۔ کیا تمہیں بابا کا وہ فیصلہ یاد ہے؟''

اس نے اثبات میں سرہلایا۔ وہ بولا۔ ''میں تمہیں بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ اپنے جنونی سلوک کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے سر کو دائیں بائیں جنبش دی، بولی۔ ''نہیں میر زادے! میں اس قابل نہیں ہوں۔ تم مجھے زندہ رہنے دو یا

WWW.PAKSOCIETY.COM

مار دو مگر میرے بابا کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہیں اگر گولیاں چلانے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے برابر کے زمیندار پر گولی چلاؤ۔ مرے کو مارنے سے کوئی لطف نہیں ملتا۔"

وہ جانتا تھا کہ چندو محض اپنے خاندان کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے پاس آئی تھی۔ پھر بھی یہ سن کر اس کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ بولا۔ "تم نے خط میں لکھا تھا تم اپنے باپ کے لیے مجھے جان کے بدلے جان دینے پر تیار ہو۔ جان مانگ رہا ہوں تو اپنے قول سے پھرنے لگی ہو۔"

وہ الجھ گئی۔ پہلے وہ سمجھی تھی کہ عمر حیات اپنے باپ کی موت کا بدلہ اس کی موت کی صورت میں لینا چاہتا تھا۔ اب اسے بیوی بنانے کی بات کر رہا تھا، بولی۔ "جان لینے اور بیوی بنانے میں فرق ہے۔ میں اپنی جان اپنی مرضی سے دے سکتی ہوں مگر کسی کی بیوی بننے کا فیصلہ بابا کی مرضی کے مطابق کروں گی۔"

"اگر تمہارا بابا مرجائے تو؟"

وہ تڑپ کر بولی۔ "اگر تم اسے مارو گے تو میں تمہیں مار دوں گی۔"

"کیا تم میں اتنا دم خم ہے؟" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"ہاں! میں اگر اپنے بابا کی خاطر تم جیسے جانور نما انسان کی مار کھانے کے لیے یہاں تک آ سکتی ہوں تو بندوق بھی اٹھا سکتی ہوں۔ بدنامی اور رسوائی سمیت دنیا کا ہر عذاب جھیل سکتی ہوں مگر بابا کو تکلیف پہنچے، برداشت نہیں کر سکتی۔"

وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔ "اوکے! میں نے تمہاری بات مان لی۔ اب تم بھی میری بات مان لو۔ میں اپنے رویے پر نادم ہوں۔ مجھے دل سے معاف کر دو اور میری محبت کو قبول کر لو۔ میرا وعدہ ہے کہ میں زندگی بھر تمہیں خوش رکھوں گا۔"

اس نے بیزاری سے انکار کر دیا تو وہ اُٹھا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک زنانہ سوٹ اُٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ سوٹ اس کی طرف اُچھال کر بولا۔ "یہ پہن لو، پھر تمہیں اسکول پہنچا دیتا ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

اس نے سپاٹ نظروں سے بدلے ہوئے عمر حیات کو دیکھا اور اس کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ باہر گیا تو اس نے لباس بدل لیا۔ اسکول کی نیلی قمیص اور سفید شلوار کی جگہ بھڑکیلے سرخ سوٹ نے لے لی۔ یہ لباس اُس پر ڈھیلا ڈھالا تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں سنگار میز پڑی ہوئی تھی۔ بال سنوارنے کے لیے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے سراپے پر نگاہ پڑی تو ٹھٹک گئی۔ اس کا پورا سراپا عمر حیات کی دیوانگی کا اشتہار بنا ہوا تھا۔ وہ اس حال میں باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ اپنی چادر میں چھپنے کی کوشش کی مگر وہ اتنی بڑی نہیں تھی۔ بے بسی سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ دروازے میں آئی اور جھانک کر دیکھا۔ عمر حیات پشت پر ہاتھ باندھے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر قریب آیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ بولی۔ "کوئی بڑی چادر مل جائے تو میں اپنا چہرہ چھپا لوں گی ورنہ ہر کوئی اس کتے کا نام پوچھے گا جس نے مجھے اتنی بے رحمی سے کاٹا۔"

اس نے برہمی آمیز نادم نگاہوں سے اُسے گھورا اور ملحقہ کمرے میں گھس گیا۔ چند ہی لمحوں میں سیاہ رنگ کی بڑی سی چادر اُٹھا لایا۔ اس نے چادر اوڑھ کر منہ لپیٹ لیا۔ اُب اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں جن سے سوائے نمی کے کچھ عیاں نہیں ہوتا تھا۔

شاید عمر حیات کے اندر جلتی ہوئی آگ سرد پڑ گئی تھی، اس لیے اس کی آنکھوں سے جھلکتی وحشت ناپید ہو گئی تھی مگر وہ پوری طرح حواس میں نہیں تھی۔ تبھی اُسے دیر ہونے کا خیال تک نہیں رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ عمر حیات کی جیپ سے اُتری تو ایک دم ڈول گئی۔ قدم منوں وزنی ہو گئے۔ اسکول بند تھا۔ اسکول کے سامنے والی ٹاہلی کے نیچے بابا ٹانگیں پھیلائے ریڑی پر بیٹھا تھا۔ اُسے عمر حیات کی پوٹھوہار جیپ سے اُترتا ہوا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ نظر تانگا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عمر حیات پر پڑی تو اس کے ہاتھ سے بیساکھی چھوٹ گئی۔ جیپ آگے بڑھ گئی تو وہ سڑک عبور کر کے ریڑی کے پاس آ گئی۔ ریڑی پر بیٹھی تو چادر چہرے سے سرک گئی۔ کٹا پھٹا چہرہ ہویدا ہو گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ بابا...... وہ میرزادہ......"

یوں لگا جیسے گامن نے اُس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ جوانی کی دہلیز پر کھڑی ہوئی بیٹی اسکول گیٹ سے نکلنے کے بجائے میرزادے کی گاڑی سے اُتری تھی۔ یونیفارم کے بجائے سرخ سوٹ پہنے ہوئے تھی جو آج تک گامن نے اس کے بدن پر نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ چادر بھی نامانوس تھی۔ پہلی مرتبہ نقاب کیے ہوئے تھی۔ کندھے پر اسکول بیگ نہیں تھا۔ چہرے پر خراشیں اور ننھے ننھے زخموں کی کہانی عیاں تھی۔ یہ بھی عیاں تھا کہ جو بھی ہوا تھا، اس کی مرضی سے ہوا تھا، وہ جہاں بھی گئی تھی، اپنے پیروں پر چل کر گئی تھی، تبھی گامن پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کئی منٹوں تک گنگ بیٹھا اُسے

گھورتا رہا پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بڑبڑایا۔ "بس مولا سائیں! روگ لا چھوڑی ناں میڈی جندڑی کوں!"

(بس مولا سائیں! آخر میری زندگی کو روگ لگا دیا ناں تم نے!)

ٹانگیں گھسیٹ کر رُخ بدلا اور لگام کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ وہ بابا کو بتانا چاہتی تھی مگر بابا کا رویہ دیکھ کر اُس کی جرأت ماند پڑ گئی۔ بابا کی آنکھوں سے نکل کر ڈاڑھی کو تر کرتے ہوئے آنسو اس سے اوجھل ہی رہے کیونکہ وہ اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔

تاجاں اور سرداراں نے اُسے دیکھا تو چیخ اُٹھیں۔ گامن سے پوچھا تو وہ خاموش رہا۔ اُسے تو بس اتنا ہی پتا تھا کہ اس کی غیرت کا جنازہ اُٹھ گیا تھا۔ چندو بول پڑی۔ بابا پر فائرنگ کے واقعے سے لے کر عمر حیات کی پوٹھوہار سے اُترنے تک اُس نے سب کچھ بتا دیا، من و عن۔ کچھ بھی مخفی نہ رکھا۔ گامن سنتے ہوئے بھی نہیں سن رہا تھا۔ تاجاں سنتے ہی بپھر گئی۔ گالیاں اور کوسنے دیتی ہوئی اس پر پل پڑی اور دوہتھڑوں سے اَدھ موا کر دیا۔ چندو بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ جیسی تھی، ویسی ہی ہے۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ویسی نہیں رہی تھی، جیسی صبح اسکول جاتے ہوئے تھی۔ گامن نے اُسے تاجاں کی مار پیٹ سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ وہ مدد طلب نظروں سے سر تھامے بیٹھے گامن کی طرف دیکھتی رہی اور روتی رہی۔

اگر گامن اس پر ہاتھ اُٹھا لیتا، اپنا کرب ہلکا کر لیتا تو شاید چارپائی پر نہ گرتا۔ وہ اپنے اندرونی دکھ کی لپیٹ میں آ کر ایسا گرا کہ کئی دنوں تک اُٹھ نہ سکا۔ گھر کا اکلوتا مزدور بیمار پڑ گیا تو پھر غربت کے مہیب سایوں نے جھونپڑی کو اپنے خونیں حصار میں لے لیا۔ چندو کا اسکول جانا بند ہو گیا۔ اسے توقع تھی کہ مسز ریحانہ یا سکینہ خانم اس کا پتا لینے آئیں گی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا اسکول سے نکلنا اور چھٹی تک واپس نہ آنا اس کے ہمدردوں کو زندہ مار گیا تھا۔ مسز ریحانہ کے توسط سے عمر حیات کے ساتھ جانے کی خبر سکینہ خانم تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دل تھام کر بیٹھ گئی۔

مصیبت یہ پڑی کہ ناسپاس حالات میں بابا کی دوائی بھی ختم ہو گئی۔ زخم میں پس پڑ گئی۔ حکیم صاحب گولیاں دے دیتے۔ وہ کھاتا تو درد میں کچھ افاقہ تو ہو جاتا مگر زخم بتدریج خراب ہوتا گیا۔ پانچ سات دنوں بعد جھونپڑی کے اندھیرے میں پھر چاند طلوع ہو گیا۔ میر ظفر حیات کی بیوہ اپنی نوکرانی کے ساتھ چندو کا ہاتھ مانگنے چلی آئی۔

وہ اپنے اکلوتے بیٹے اور لاکھوں کی جائداد کے تنہا وارث کی ضد پر ہتھیار ڈال کر یہاں آئی تھی۔ اس کی نخوت اور بے بسی اس کے رشتہ مانگنے کے انداز سے آشکار تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اتمام حجت کے طور پر آئی تھی۔ گامن اور تاجاں اَدب اور دکھ سے لب بستہ رہے مگر چندو سے نہ رہا گیا۔ کمزور سی آواز میں بول ہی پڑی۔ "بی بی سائیں! مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا۔ اپنے بیٹے سے کہہ دیں کہ وہ اپنے خاندان کی کسی لڑکی کو پسند کر لے۔ میری جان چھوڑ دے۔"

بی بی کو اس کا انداز برا لگا، بولی۔ "میں تو اپنے گھر کو پاک صاف رکھنا چاہتی ہوں مگر اس پر تمہارے عشق کا بھوت سوار ہے۔ وہ تمہاری جان کیا چھوڑے، تم ہی اس کی راہ سے ہٹ جاؤ تو بہتر ہے۔"

اس نے چند ہی جملوں میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے سمجھا دیا کہ وہ چندو ماہی کو اپنے بیٹے کے بگاڑ کا ذمے دار ٹھہراتی تھی۔ ایک تیر میں دو شکار کرنا چاہتی تھی۔ ایک طرف بیٹے کو راضی کر رہی تھی کہ وہ اس کی ضد پوری کرنے کے لیے چندو کا رشتہ لینے گئی تھی۔ دوسری طرف وہ چندو کے گھر والوں کو سمجھا رہی تھی کہ ان کی دھی میر خاندان میں نقب لگانے کی کوشش کر رہی ہے، اسے سنبھال کر رکھو۔ ایک گھنٹے کے قریب گامن کی جھونپڑی میں جلوہ افروز رہی، پھر تنبیہی نگاہ ڈال کر رخصت ہو گئی۔ گامن اس دوران غیر فطری انداز میں تمام تر گفتگو سے لاتعلق بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا اور اپنی بیساکھی پر لحاف کی پھٹی ہوئی پٹی لپیٹتا رہا۔

رات نصف کے عمل میں تھی جب چندو چارپائی میں اُٹھ بیٹھی۔ بابا کی چارپائی خالی دیکھی تو متفکر ہو گئی۔ اسے تلاش کرتی ہوئی بکریوں کے بھانے میں پہنچ گئی۔ وہ ایک نوزائیدہ میمنے کو اپنی تندرست ٹانگ پر بٹھائے پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہا تھا۔ چندو دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے عقب میں جا کھڑی ہوئی۔ سننے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ڈیکھ میمے! میکوں ڈیکھ...... میں کل تک جوان تھا۔ میرے بازو فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ آج بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کل میرے دل میں اتنی طاقت تھی کہ میں نے سردار رب نواز اور میر کریم بخش جام کے نوٹ لوٹا دیے تھے۔ میں میر ظفر حیات کے زنانے خانے پر جا کھڑا ہوا تھا۔ اپنی چندو ماہی کا راستہ روکنے والے سے ٹکرا گیا تھا۔ مگر ڈیکھ میمے! آج میرا جسم بھی ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔ میری چندو ماہی نے میری غیرت کا جنازہ نکال کر مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔ اسی چندو نے، جس کے نام کی ہر سانس میرے پھیپھڑوں کو طاقت دیا کرتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ ڈیکھ گھن میسے! اُوں میکوں جیندے جی مار گھتا ہے!"

(دیکھ لو میسنے! اس نے مجھے جیتے جی مار ڈالا ہے)

چندو کے لبوں سے دلدوز سسکی نکلی۔ فضا سرسرا گئی مگر گامن لاعلم رہا، بولتا رہا۔ "ڈیکھ میسے! میری ٹانگ گل سڑ رہی ہے۔ میں چل پھر نہیں سکتا مگر کیا میری غیرت بھی لنگڑی ہو گئی تھی جو میری چندو اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر اُس میر زادے کی بے حیائی کو سینے سے لگا آئی؟ اُسے میری محبت کی پروا نہیں تھی ناں...... میری غیرت کا جنازہ کاندھوں پر اُٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ نہیں کانپے۔ آنکھ نہیں چھلکی۔ ہائے مولا! میں نے کیا برا کیا تھا؟ مار دیتا، یہ دن تو نہ دکھاتا۔ بھلا غیرت کے بغیر مرد، مرد رہتا ہے کوئی؟ نہیں مولا! میں نے تمہارے بنائے ہوئے وجود کو سینے سے لگایا، اس کی غلاظتوں کو ہونٹوں سے ہٹایا اور زبان سے چاٹ کر صاف کیا...... اس نے تو بھول ہی جانا تھا، تم کیوں بھول گئے۔ وہ گھڑی، جب میرے ہونٹوں پر پہلی بار مچلا تھا، 'چندو ماہی'...... وہ دن تم نے بھی بھلا دیا؟...... کیا چاند ایسا ہوتا ہے؟ کیا ماہی ایسی ہوتی ہے؟...... مولا! میکوں چا گھن...... میں نے اپنی جائی کو چھاتی پر نہیں سلایا تھا، تمہاری امانت کو آٹھ سال اپنی چھاتی پر سلاتا رہا۔ تمہیں بھی خیال نہیں رہا...... ہاں! نہیں رہا ناں...... تم بے پروا ہو۔ تمہاری بنائی ہوئی دنیا بھی بے پروا ہے۔"

گامن کی شکست خوردہ آواز چندو کا دل چیر رہی تھی اور وہ لکڑی کے تھم (ستون) کو بھینچے بے جان انداز میں کھڑی سن رہی تھی۔ "ہائے چندو! مجھے پتا ہی نہیں چلا اور تیرے بدن میں کوئی آلائش چھپی رہ گئی۔ دیکھ لیتا تو اُسے بھی چاٹ کر صاف کر دیتا۔ پر لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ اپنی جائی کی روح پر یقین کر لو، پر اس کے جوان بدن کا بھروسا نہ کرو۔ جوان بدن میں آگ لگتی ہے تو آس پاس کا دھیان نہیں رہتا۔ ہائے! میں نے کیا کیا؟ کیوں اُس لکڑی کی چوکی کو کسی اور منزل کی طرف جاتے ہوئے روک لیا...... نہ روکتا تو آج میرا دل نہ ٹوٹتا۔ میڈا سائیں! میکوں اپنے کول سڈ گھن نی تاں دنیا میکوں ننگا کر چھڑیسی...... میکوں چا گھن مولا!"

(میرے سائیں! مجھے دنیا سے اُٹھا لے ورنہ دنیا مجھے برہنہ کر دے گی۔ مجھے اٹھا لے مولا!)

اس کی سناٹے کا قلب چیرتی ہوئی آواز بھرا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تنہائی میں روتا ہوا مرد بڑا دل فگار ہوتا ہے۔ اس کا آس پاس بھی اُس کے ساتھ بلکنے لگتا ہے۔ چندو تڑپی مگر سنبھل گئی۔ سوچا۔ "غبار دل نکلنا چاہیے۔"

جت کافی دیر گزر جانے پر بھی اس فولادی [illegible] ہچکیاں نہ تھمیں تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس [illegible] گئی۔ اپنی عادت کے مطابق کے اس کا ماتھا اور منہ چوم رہی۔ ڈاڑھی سے کھیلتی رہی۔ وہ ایسے ہی ہر بات گامن سے منوا لیا کرتی تھی مگر گامن ہوتا تو مان ہی جاتا، وہ تو کوئی اور تھا...... پتھر کی طرح سرد اور بے جان...... اس نے میسنا [illegible] کر بکری کی طرف دھکیل دیا، گامن نے مزاحمت نہیں کی۔ اس نے جھنجوڑا، وہ کچھ نہیں بولا بلکہ اندھیرے خلا میں گھورتا رہا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بتانے لگی کہ وہ اپنے بابا کو زندہ اور محفوظ دیکھنا چاہتی تھی، تبھی بدنامی اور بے حیائی کے دریا میں کودی تھی۔ سمجھانے لگی کہ میر زادے نے اُسے مارا ہے [illegible] بے عزت نہیں کیا۔ بولتے بولتے اچانک تھم گئی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ "بے عزت کیسے کیا جاتا ہے؟"

'عزت کس احساس کا نام ہے؟'

اگر لباس عزت تھا تو اس کی عزت کو عمر حیات نے تار تار کر دیا تھا۔ اگر بدن عزت کا امین تھا تو وہ چھلنی چھلنی ہو کر آئی تھی۔ اپنے تئیں بجھ گئی۔ حساس تھی، ذہین تھی۔ دل گھونسا لگا۔ گامن کا رویہ بجا محسوس ہوا۔ ایک باپ کے لیے اس منظر سے بڑا کوئی سانحہ نہیں تھا۔

اس نے پاؤں چومے، ہاتھ جوڑے اور خدا اور رسول کے واسطے دیے مگر گامن کے نیم مردہ وجود میں کوئی ارتعاش پیدا نہ ہوا۔ وہ ہار گئی۔ اُسے اُٹھا کر چارپائی پر لائی۔ وہ ساتھ چلا آیا، یوں، جیسے اُس کی کوئی مرضی ہی نہ ہو، وہ جاندار ہی نہ ہو۔ چارپائی پر گر گیا۔ وہ اس کی چھاتی پر بڑی دیر چہرہ رگڑتی رہی پھر آہ بھر کر اپنی چارپائی پر چلی گئی۔

تاجاں اور سرداراں کی مزدوری نے چولھا سنبھال لیا۔ دونوں معمول کے کام کاج کے علاوہ سارا دن کھجور کے پتوں کی چنگیریں اور شہتوت کی باریک ٹہنیوں کے ٹوکرے بناتیں جنہیں بیچنے سے بہت کم اجرت ہاتھ لگتی مگر کار نان و نفقہ چل نکلا۔ چندو ماہی ان دونوں کے قریب جاتی تو وہ خاموش رہتے ہوئے اُسے پرے جھٹک دیتیں۔ چارپائی پر دیدے پھیلائے مردوں کی طرح لیٹے ہوئے گامن کے قریب جاتی تو اس کی سرد مہری دیکھ کر دل مٹھی میں آ جاتا۔ وہ گونگا بہرا ہو گیا تھا اور چندو کے کان اُس کی آواز کو ترس گئے۔

عمر حیات کی ماں نامراد گئی تھی۔ اس کا بیٹا چند دنوں کے وقفے سے پھر آن پہنچا۔ دیہاتی گھروں کے دروازے وسیب داروں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ وہ جیپ کھال پر روکنے کے بعد، شہتوت کی ٹہنیاں کھال کے رُکے ہوئے پانی میں بھگوتی ہوئی سرداراں اور تاجاں کو نظرانداز کر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ گامن چاروں شانے چت چارپائی پر دراز تھا۔ چارپائی کی بانہہ سے کمر لگا کر چندو ماہی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ وہ کھنکارا تو چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ اپنے بابا کے مرنے سے پہلے عمر حیات خوب رُو اور نفیس تھا۔ عمدہ لباس زیب تن کرتا تھا۔ کھلنڈرا تھا۔ اب دکھائی دینے والا عمر حیات مختلف تھا۔ حلیے سے نشئی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گامن کو سلام کیا۔ جواب نہ پا کر مستفسرانہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

چندو کو اس کا آنا گراں گزرا، بولی۔ "اب کیا لینے آئے ہو؟"

اس نے گامن کی طرف دیکھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ کھلی آنکھوں والا گامن ہوش و حواس سے عاری تھا۔ انگلی تان کر بولا۔ "تمہیں......"

وہ چیخی۔ "بابا! ڈیکھ تاں سہی، کون آیا ہے؟ تو کہتا تھا کہ تیری بانہوں میں دم ہے۔ اب وہ دم دکھا اور اس امیر زادے کو روک۔ ہائے بابا! اُٹھ ناں...... تو کہتا تھا کہ تیرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے جو بھی میرا نام لے گا، تو اس کی زبان کھینچ لے گا۔ اس کی زبان بھی گدی سے کھینچ دکھا۔ بابا اُٹھ ناں!"

عمر حیات کی آنکھوں میں تشویش دوڑ گئی مگر گامن ٹس سے مس نہ ہوا۔ چندو نے سینے پر دونوں ہاتھ مارے، چلائی۔ "دارو، اماں! میر زادہ میکوں چاون آیا ئے...... ایں کوں روک گھنو!"

(میر زادہ مجھے اُٹھانے آیا ہے، اسے روک لو)

وہ اتنے زور سے چیخی تھی کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ وہ سینہ کوبی کرتی جاتی تھی، سرداراں اور اماں کو پکارتی جاتی تھی، بابا کو جھنجوڑتی جاتی تھی مگر کوئی بیدار نہ ہوا۔ گامن کے گھٹنے کا زخم پس زدہ تھا۔ بہت دکھتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا گھٹنا پیٹ ڈالا۔ تب بھی گامن کی ٹھہری ہوئی آنکھوں میں جنبش پیدا نہ ہوئی تو ہانپنے لگی۔ دنیا سو گئی تھی۔

عمر حیات بوکھلا گیا۔ کبھی چندو کو، کبھی گامن کو تو کبھی دروازے کے باہر اچھلتی کودتی بکریوں کو دیکھتا۔ پھر گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ چندو کے دونوں ہاتھ تھام کر ملتجیانہ بولا۔ "چندو! میری بات سنو، میں تمہیں اُٹھانے کے لیے نہیں آیا۔ لینے کے لیے آیا ہوں۔ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔"

وہ یوں رُک گئی جیسے عمر حیات کو کچھ نہ ہونے دینا چاہتی ہو۔

وہ چندو کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر بولا۔ "چندو! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خدا کے لیے اپنے بابا کو سمجھاؤ۔ میں کسی کا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسی کو دکھ نہیں دینا چاہتا۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو پلیز!"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتی۔ تمہاری وجہ سے میرا گھر برباد ہو گیا ہے۔ میرا بابا جیتے جی مر گیا ہے۔ ہائے بابا! اُٹھ ناں! اِسے دھکے دے کر باہر نکال......" اس پر پھر ہسٹریائی کیفیت سوار ہو گئی اور اس نے 'ہائے! میرا بابا مر گیا' کی گردان الاپتے ہوئے عمر حیات کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ وہ اُسے تھامنے اور سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا پھر مایوس ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

خلاف توقع تینوں میں سے کسی نے بھی اُس سے عمر حیات کی آمد اور غرض و غایت کے بارے میں دریافت نہیں کیا۔ تبھی اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کا وجود اس گھر کے لیے بے معانی ہو گیا تھا۔ کہاں وہ چندو، جس کے پیروں تلے ہتھیلیاں رکھی جاتی تھیں اور کہاں یہ چندو، کہ بھوکی ہے، پیاسی ہے، بیمار ہے...... دیکھنے والوں کو خبر تک نہیں، پروا تک نہیں۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں بابا سے بات کرنا چاہی مگر ہر مرتبہ اُسے جواب میں خاموشی ملی۔

گامن دن بہ دن موت کی طرف گامزن تھا۔ اس کا زخم ناسور بن گیا۔ وہ برداشت نہ کر پائی تو ریبڑی جوتنے لگی۔ کبھی نے دیکھا مگر پوچھا نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ اُس کا دل اس اجنبیت اور غیریت کا عادی ہو گیا تھا تبھی اُسے بھی عجیب نہ لگا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ عمر حیات کی حویلی میں اس کے سامنے موجود تھی۔ عمر حیات نے اُسے دارے کے خاص کمرے میں بٹھایا اور پریشانی سے اس کی ہنگامی آمد کی وجہ دریافت کی۔ وہ پھٹ پڑی۔ اُسے موردِ الزام ٹھہرا کر اپنے گھر کی بربادی کا نوحہ سنانے لگی۔ وہ کمال صبر سے سنتا رہا۔ اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ "میرے پاس تمہارے ہر الزام کا جواب موجود ہے مگر میں کوئی جواب دے کر تمہارا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ بولو! میرے پاس کیوں آئی ہو؟"

وہ جی کڑا کر کے بولی۔ "میرا بابا مر رہا ہے۔ اسے بچا لو۔"

وہ چونکا۔ "کیا ہوا اُسے؟"

"اس کا زخم ناسور بن گیا ہے۔"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ گھبرا سا گیا۔ "تم اُسے اسپتال لے جاؤ۔ کہیں دیر نہ ہو جائے اور اس کی ٹانگ نہ کاٹنی پڑ جائے۔"

وہ تڑپ کر بولی۔ "نہیں نہیں! مجھے یقین ہے کہ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ پر میں اُسے اسپتال کیسے لے کر جاؤں؟"

"جیسے پہلے لے کر گئی تھیں۔" وہ شاید اس کا مسئلہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"کیسے جاؤں؟ اَب میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"اوہ...... تو یہ بات ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ جتنے پیسے لگیں گے، میں دوں گا۔ تم آج ہی اُسے لے کر شہر چلی جاؤ۔" عمر حیات نے کہا۔ "کتنے پیسے لگیں گے؟"

اسے اندازہ نہیں تھا۔ عمر حیات اُسے بٹھا کر گھر گیا۔ تھوڑی دیر بعد چند بڑے نوٹ لا کر تھماتے ہوئے بولا۔ "چندو! میں تمہارا مجرم ہوں۔ شاید عمر بھر سزا بھگتتا رہوں گا۔ یہ تھوڑی سی رقم ہے۔ لے جاؤ۔ میں کل یا پرسوں اسپتال میں اور رقم پہنچا دوں گا۔"

اس کے ہاتھوں میں نوٹ کانپنے لگے۔ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دیوانہ اُسے دارے کے باہر تک چھوڑنے آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر میں اماں اور سرداراں کو قائل کر رہی تھی کہ وہ اُسے بابا کو اسپتال لے جانے کی اجازت دے دیں۔ انہوں نے کمال بے پروائی سے اجازت دے دی اور گامن کو ریڑھی پر لٹانے میں مدد بھی کر دی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اسپتال میں تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے داخل کر لیا اور علاج شروع کر دیا۔ پہلے گامن کو سرداراں کھانا کھلاتی تھی۔ اب اُسے موقع میسر تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے کھاتا تو تھا مگر یوں جیسے سزا کے عمل سے گزر رہا ہو۔ اس کی تکلیف میں افاقہ تو ہو گیا مگر ڈاکٹروں نے نشتر اسپتال رجوع کرنے کا مشورہ دے کر اُسے نڈھال کر دیا۔

وہ جلد از جلد گامن کو ملتان لے جانا چاہتی تھی مگر زادِ سفر نہیں تھا۔ بڑے اسپتال کے اخراجات کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ ناچار دو دن عمر حیات کا انتظار کرنا پڑا۔ اسے دیکھ کر چندو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور بولی، "میرزادے! میرے بابا کو بچا لو ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

اس نے دلاسا دیا۔ ڈاکٹرز سے رابطہ کر کے گامن کی کیفیت دریافت کی تو اُسے پتا چلا کہ چندو کیوں اتنی گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ وارڈ میں جانے کے بجائے گھر چلا گیا۔ چیک بک لے آیا۔ ڈاکٹرز کے بتائے گئے تخمینے کے مطابق بڑی رقم نکلوائی اور گامن کو ایمبولینس میں ڈال کر ملتان کا رُخ کیا۔ اس کی کوششوں سے گامن کو بہ آسانی ایڈمٹ کر لیا گیا وگرنہ چندو شاید یہ مرحلہ عبور نہ کر پاتی۔

وہ تین دن تک چندو اور گامن کے ساتھ رہا مگر ان کی تمام تر محنت اکارت گئی اور ڈاکٹرز نے گامن کی ٹانگ گھٹنے سے کچھ اوپر سے کاٹ پھینکی تو وہ رُک نہ پایا اور ہوئی چندو کی جھولی میں کئی بڑے نوٹ پھینک کر اسپتال سے رخصت ہو گیا۔ چندو ماہی کو اس کے جانے کے بعد احساس ہوا کہ اُسے عمر حیات کا بڑا اسہارا تھا۔ مصیبت کے ان دنوں میں وہ اس کے کافی قریب بھی آ گیا تھا اور چندو یہ باور کرانے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ فطرتاً برا نہیں تھا مگر جذبات کی اشتعال پرور رو میں بہک کر برا بن گیا تھا۔ اَب بھی اس سے شادی کا خواہش مند تھا یا نہیں...... اس کی محبت کا دعویدار تھا، یا نہیں...... یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔ اس نے اسپتال کی مغموم فضا میں محبت اور خواہش کے گیت کھلانے معیوب سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔

جب ٹیکسی کھال پر آن رکی اور چندو بدلے ہوئے ڈیزائن کی چوبی بیساکھی تھامے اُتری، ڈرائیور کے سہارے پر ایک ٹانگ والا گامن نظر آیا، تب سرداراں اور تاجاں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں اور وہ دوپٹوں سے بے نیاز کھال کی طرف دوڑ پڑیں۔

بڑے دنوں بعد چندو نے گامن کی آواز سنی۔ "تاجاں! رج رج ویَن کر، ہیڈا سائیں مر گیا ئے......"

(تاجاں! خوب بین کرو، تمہارا سائیں مر گیا ہے)

عمر حیات کو اس کے گھر پہنچنے کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ گامن کی عیادت کو پہنچ گیا۔ گامن نے اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ چندو ماہی اس کی زیرِ بار تھی۔ اس سے منہ نہیں پھیر سکتی تھی مگر دل ہی دل دعا مانگ رہی تھی کہ وہ جلد چلا جائے۔ وہ کچھ دیر تک گامن پر جھکا عیادت کرتا رہا۔ گامن کی آنکھیں بند خاموش رہیں تو ایک آہ بھر کر پلٹا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "چندو! مجھے کھال تک تو چھوڑ آؤ۔"

وہ اس کی بات ٹال نہ سکی۔ کھال پر پہنچ کر عمر حیات رُک گیا۔ بولا۔ "دیکھو چندو! بابا کے انتقال کے بعد مجھ پر بھاری ذمے داریاں آن پڑی ہیں۔ تمہارا اور تمہارے گھر والوں کا رویہ بھی دل دکھاتا ہے۔ اس لیے میں بار بار نہیں آ سکتا۔ شاید دوبارہ یہاں نہ آؤں۔ تمہیں کوئی پرابلم ہو تو پیر بخش کے ہاتھ پیغام بھیج دینا۔"

وہ ایک ذرا تردد سے بولی۔ "پیر بخش...... علی بخش ماچھی کا بیٹا؟ پر وہ تو......"

"ہاں! وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ مگر اس میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ تمہیں میلی نظر سے دیکھے یا بدنام کرے۔"

وثوق سے بولا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاتھ بڑھائے۔ اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر چہرہ تھام کر وارفتگی سے چوم لیا۔ اس نے پہلی بار چندو کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا اس لیے اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نہ اُس کے سایہ فگن جسم سے علیحدہ ہوئی۔

جب اسے 'بائی' کہہ کر پلٹی تو نلکے کے کھاڑے میں کولھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تاجاں پر نظر پڑ گئی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ صحن میں پہنچی تو تاجاں نے اُسے دیکھ کر منہ بنایا، بولی۔ "بس چندو! ایہا گالھ تاں میں کریندی ہم۔"

(بس چندو! یہی تو میں کہتی تھی)

اس کے پاس تاجاں کے سوال نما فیصلے کا جواب نہیں تھا۔ سر جھکا کر کمرے میں چلی گئی۔ تاجاں اس کے پیچھے کمرے میں آ گئی اور طنزیہ لہجے میں گامن کو بتانے لگی۔ وہ خالی آنکھوں دیکھتا رہا جیسے کچھ بھی سن نہ رہا ہو۔ چندو چارپائی کی بانہہ سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی سنتی رہی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ یوں جیسے تاجاں اس کی نہیں، کسی غیر متعلق شخص کی بدخوئی کر رہی تھی۔

پہلا معمول لوٹ آیا۔ چندو ماہی صبح تا شام گامن کی چارپائی سے لگ کر بیٹھی رہتی اور کوشش کرتی رہتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بول پڑے، مگر اس کی ہر کوشش حسبِ سابق ناکام رہی۔ تب اس کی چشمِ تصور پر چوری چھپے عمر حیات براجمان ہونے لگا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی جسے سوچنا گناہ خیال کرتی تھی۔ دکھ اپنی جگہ بجا، کچی عمر کے سہانے سپنوں کو روکنا اس کے بس سے باہر تھا، کبھی کھلی آنکھوں دیکھتی رہی اور بند آنکھوں دیدارِ یار کرتی رہی۔

سرما کے ابتدائی دن تھے جب وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔ ایک سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلی۔ پیر بخش شریف والدین کا بگڑا ہوا بیٹا تھا۔ گریبان کھول کر چلنا، سگریٹ کے مرغولے اُڑاتا اور کئی کئی دن گھر سے بن بتائے غائب رہتا تھا۔ اس لیے وہ اس کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی مگر میرزادے سے رابطے کی طلب میں قدم اُٹھا رہی تھی۔

پیر بخش کا ڈیرا فرلانگ بھر کے فاصلے پر جنگل کے کنارے واقع تھا۔ قرب و جوار میں کوئی اور گھر نہیں تھا۔ وہ دوپہر میں وہاں پہنچی۔ اُسے گھر میں اکیلا پا کر گھبرا گئی۔ اس کی ماں، تین بہنیں اور باپ نہ جانے کہاں گئے ہوئے تھے۔ پیر بخش نے اُسے دیکھا تو اپنے بڑے سے اصیل مرغے کو صحن میں اچھال دیا اور بھاگا آیا۔ "آج میرے گھر میں یہ چاند کیسے طلوع ہو گیا؟"

وہ پھولی ہوئی سانسوں کے بیچ بولی۔ "میر عمر حیات کے لیے تمہیں ایک پیغام دینے آئی ہوں۔ اسے کہنا کہ میں اُس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

وہ جلدی جلدی کہہ کر پلٹنا چاہتی تھی مگر پیر بخش لپک کر سامنے آ گیا، بولا۔ "اوہ ہو...... اب آ ہی گئی ہو تو کچھ دیر بیٹھو تو سہی۔ جلدی بھی کیا ہے۔"

اس کا عامیانہ انداز اُسے ایک آنکھ نہیں بھایا مگر رکنے پر مجبور ہو گئی، بولی۔ "میرزادے کے کہنے پر تمہارے پاس آئی تھی، پیغام دے دیا، اَب جا رہی ہوں۔ اب پَرے ہٹو، جانے دو۔"

پیر بخش کی آنکھیں سلگنے لگیں۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے زندگی بھر نہیں سوچا تھا کہ چندو ماہی یوں اُس کی تنہائی کے محل میں آن کھڑی ہو گی۔ اسے عمر حیات کی دوستی بھول گئی۔ اس کا دبدبہ اور اختیار فراموش ہو گیا۔ اس نے اُسے بانہوں میں بھر لیا۔ چیختی چلاتی ہوئی چندو کو کمرے میں کھینچ لے گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں اظہارِ محبت کرنے لگا۔ وہ اُسے دھکیلتی رہی۔ مدد کے لیے بلند آواز میں چیختی رہی مگر اس کی آواز کمرے میں چکرا کر دم توڑتی رہی۔ تب بھی کوئی مدد کے لیے نہ آیا۔ عمر حیات بھی اُسے تنہائی میں لے گیا تھا مگر تب وہ اتنی خوفزدہ نہیں تھی۔ شاید تب اُسے علم نہیں تھا کہ مرد تنہائی میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔

پیر بخش توانا اور جوان مرد تھا۔ چندو کو فوراً احساس ہو گیا کہ وہ زیادہ دیر اُس کا مقابلہ نہیں کر پائے گی۔ اسے کسی اور طریقے سے اپنا دفاع کرنا ہو گا۔ یہ سوچتے ہی اچانک اُس نے مزاحمت ختم کر دی۔ رویہ بدل لیا اور پیر بخش کی باتوں کا حیرانی اور محبت کے ساتھ جواب دینے لگی۔ اس کی اوباشانہ چھیڑ چھاڑ سے ملنے والی مہلت میں اس ناگہانی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی ترکیب سوچنے لگی۔

وہ اسے باتوں میں لگا چکی تھی مگر قسمت کے وارے سے بے خبر تھی۔ وہ جب پیر بخش کے گھر میں داخل ہو رہی تھی، اس وقت کچھ فاصلے پر کھیتوں میں کام کرنے والے چند مردوں اور عورتوں کی نظر میں آ گئی تھی۔ دیکھنے والوں میں پیر بخش کا ایک چچا زاد بھائی بھی شامل تھا جو نہ صرف پیر بخش سے عناد رکھتا تھا بلکہ اُسے یہ بھی خبر تھی کہ گھر میں پیر بخش کے سوا کوئی فرد موجود نہیں ہے۔ فاصلے کی وجہ سے وہ چندو ماہی کو پہچان تو نہیں پایا تھا مگر یہ پہچاننا ضروری نہیں تھا۔ موقع

WWW.PAKSOCIETY.COM

غنیمت جانتے ہوئے اس نے آسمان سر پر اُٹھا دیا۔ شور سن کر دس بارہ لوگ اکٹھے ہو گئے جنہیں لے کر اس نے پیر بخش کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ جب دیہاتی چھاپہ ماروں کا وفد پیر بخش کے کمرے کے دروازے پر پہنچا، اس وقت چندو اور پیر بخش ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھے ہوئے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔

صفائی کا موقع دیے بغیر عورتوں نے چندو کو جبکہ مردوں نے پیر بخش کو دبوچ لیا اور چند ہی لمحوں میں دونوں کو مار مار کر اَدھ موا کر دیا۔ پیر بخش کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا جبکہ چندو کو گھسیٹ کر گامن کے سامنے لا پھینکا گیا۔ گامن کی سرد آنکھوں میں گھر تک پہنچنے والے عزت کے جنازے کو دیکھ کر زندگی کی ہلکی سی رمق پیدا ہوئی، پھر چندو کی بنی ہوئی درگت دیکھ کر معدوم ہو گئی۔ گامن اور تاجاں کو ویب داروں نے بہت برا بھلا کہا، بے غیرت بھی، جی کھول کر طعنے دیے اور ان کے سامنے چندو کو دو چار ہاتھ بھی جڑ دیے۔ گامن دیوانہ وار یہ ماجرا دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو جھرنوں کی صورت بہنے لگے۔

چونکہ اس بدنامی میں میرزادہ عمر حیات شامل نہیں تھا، اس لیے اس خبر کو پر لگ گئے۔ شام سے پہلے آس پاس کے تمام علاقوں تک چندو کی رسوائی کا قصہ پھیل گیا۔ عمر حیات کی پوٹھوہار جیپ شام ڈھلے کھال پر آن رُکی۔ وہ جیپ سے اُتر کر دوڑتا ہوا چندو کے پاس پہنچا جو حسبِ معمول سر نیہوڑائے گامن کی چارپائی کا پایہ تھامے ہچکیاں لے رہی تھی۔

عمر حیات نے رسمی علیک سلیک کے بغیر اُسے مخاطب کیا۔ ”چندو ماہی! یہ میں نے کیا سنا ہے؟“ فرطِ جوش سے اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور آواز کانپ رہی تھی۔

چندو نے سر نہیں اُٹھایا تو اس کا لہجہ مزید درشت ہو گیا۔ وہ پھٹ پڑی اور اس نے سانس لیے بغیر تمام رام کہانی کہہ سنائی۔ اسے شاید پروا نہیں رہی تھی کہ اس کی باتیں گامن بھی سن رہا تھا۔ عمر حیات اُسے چند لمحوں تک دیکھتا رہا پھر کوئی دلاسا دیے بغیر جس طرح دندناتا ہوا آیا تھا، ویسے ہی ہوا میں اُڑتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ سیدھا پیر بخش کے گھر پہنچا۔ پیر بخش کا باپ ملا جس نے اُسے بتایا کہ لوگوں نے اس واقعے کے بعد اس کا حقہ پانی بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاہم پیر بخش کو گھر سے نکالنے پر اُسے رعایت مل سکتی تھی۔ اس لیے اس نے پیر بخش کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا؟ اس بارے میں اُس سمیت گھر کے کسی فرد کو علم نہیں تھا۔

عمر حیات کے سینے میں پیار کے دل شکن روپے کی آگ دہک رہی تھی۔ وہ گھر گیا۔ گن اُٹھائی اور ہر اُس جگہ گیا جہاں پیر بخش کے ملنے کا امکان تھا مگر وہ نہیں ملا۔ نصف رات کو ناکام ہو کر عمر حیات حویلی لوٹ آیا۔ اس کی حالت خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ ایک مرتبہ پھر وہ چندو ماہی کے لیے باعثِ آزار ثابت ہوا تھا۔ یہی قلق اُسے مضطرب کر رہا تھا۔

وہ چندو ماہی کے عشق میں گرفتار تھا۔ اُسے بیاہنا چاہتا تھا مگر ماں آڑے آتی تھی۔ اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ کم عمری کی بدولت اس کے اصرار کو گھر میں سنجیدگی سے نہ لیا گیا۔ اس کی چاروں بہنوں اور ماں پر مشتمل گھرانا ہم خیال تھا جبکہ وہ ”مس فٹ“ تھا۔ بقیہ رات اُس نے جاگتے اور سوچتے گزاری۔ صبح تک وہ چندو ماہی کو بیاہ کر شہر والے مکان میں لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اس کا اپنا مکان خاصا بڑا تھا جسے اُس نے اپنے کزن کی معرفت کرایہ پر دے رکھا تھا۔ شہر پہنچ کر کزن سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ ہفتہ بھر پہلے کرایہ دار مکان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کا ایک مسئلہ آپوں آپ حل ہو گیا۔ اس نے چابی لی اور واپسی کا قصد کیا۔ ماں کے پیر چھوئے، روایتی ادب سے مخاطب ہوا۔ ”اماں! اولاد گناہ کرتی ہے۔ ماں کی دعا اس کے گناہ پر پردہ ڈالتی ہے۔ میں کچھ ایسا کر گزرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ آپ کا دل دکھے گا۔ میں آپ کو بہت برا لگوں گا۔ مجھے مار لینا، برا بھلا کہہ لینا مگر کوئی بددعا نہ دینا۔“

اس کی ماں کا ماتھا ٹھنکا۔ کریدتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے متفکرانہ بولی۔ ”تم ایسا کام کرتے ہی کیوں ہو جس پر تمہیں میری بددعا کا ڈر لاحق ہو؟“

وہ مزید جھک گیا۔ ”اماں! دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

”میرزادے! کیا بات ہے؟ تم بہت پریشان دکھائی دیتے ہو؟“

وہ ماں کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ماں نے بہتیرا پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے مگر وہ لب بستہ رہا۔ ماں کا دل مٹھی میں آ گیا۔ آج تک بیٹا اس طرح سر جھکائے اس کے دربار میں نہیں آیا تھا۔ بولی۔ ”تمہارے بابا کے بعد میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے عمر...... یہ دھیان میں رکھنا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور حویلی سے نکل آیا۔ دو بجے کے قریب وہ گھنے درخت کے نیچے کھال پر کھڑا اپنے فیصلے کا ازسرِ نو قلبی احاطہ کر رہا تھا۔ اپنے لانبے بال جھٹک کر پیچھے دھکیلے اور چندو ماہی کی طرف قدم اُٹھا دیا۔ تاجاں اور سرداراں گھر میں نہیں تھیں۔ گامن صحن میں چارپائی پر ایک

ٹانگ لٹکائے بیٹھا تھا جبکہ چندو کمرے میں دبکی پڑی تھی۔ وہ سیدھا گامن کے پاس آیا۔ چندو کا پوچھا۔ کوئی جواب نہ کر بولا۔ ”گامن! مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تمہاری ہنستی بستی جنت کو تہس نہس کر دیا۔ میں اگر تمہاری گدھا گاڑی نہ روکتا تو میرا بابا نہ مرتا، تمہاری ٹانگ نہ کٹتی، چندو اس طرح مفت میں بدنام نہ ہوتی اور تمہارا گھر پہلے کی طرح شاد باد رہتا۔ مگر یہ سب تقدیر کا لکھا ہوا تھا، پکی سیاہی ہے، جسے ہم سب سے ٹالا یا مٹایا نہیں جا سکتا۔“

گامن کا چہرہ بہ دستور سپاٹ رہا۔

وہ توقف کے بعد بولا۔ ”جب میں مجرم ہوں تو پھر سزا مجھے ہی ملنی چاہیے، ناں کہ تمہیں یا تمہاری بیٹی کو۔ مگر مجھے دی جا سکنے والی کوئی بھی سزا ایسی نہیں جو تمہاری خوشیاں لوٹا دے۔ اس لیے میں سوچ بچار کے بعد ایک نیا ارادہ لے کر آیا ہوں۔ تمہیں، بی بی تاجاں اور دارو، سب کو چندو ماہی کے وجود سے نفرت ہو گئی ہے۔ ہے ناں؟ اسے دیکھنا تم لوگوں کے بس سے باہر ہے جبکہ وہ تمہیں دکھ میں نہیں دیکھ سکتی اور نہ تمہارے بغیر زندگی کا تصور کر سکتی ہے۔ لوگوں کی نظریں اُسے زخمی کرتی ہیں، بدنام جو ہو گئی ہے۔ اور میں اُس سے محبت کرتا ہوں، اس کے لیے دن رات پریشان رہتا ہوں۔ ان سب مسئلوں کو ایک ہی عمل سے حل کرنے آیا ہوں۔ چندو ماہی کو دلہن بنانے آیا ہوں۔“

گامن کے سیاہ ہونٹ سکڑ گئے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ اُسے دیکھتا رہا جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ناقابلِ یقین دعویٰ کر رہا تھا۔

عمر حیات بولا۔ ”میری غلطی سے پیرو ماچھی جیسے کتے نے ماس کی بو سونگھ لی ہے۔ جب تک میرے ہاتھوں مارا نہیں جائے گا، وہ چندو کو سکھ سے نہیں رہنے دے گا۔ کوئی چندو کی طرف میلی نگاہ سے دیکھے، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔ اس لیے میں اُسے لینے آیا ہوں۔ اُسے بلاؤ اور میرے ساتھ روانہ کر دو...... مجھ پر احسان ہو گا تمہارا۔ بابا کی قسم! کسی دن اس احسان کا بدلا چکا دوں گا۔“

گامن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ جانے کس وقت کمرے کے دروازے میں آن کھڑی ہونے والی چندو کی آزردہ آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ”میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ دو چار دن اور رہی تو میں بھی مر جاؤں گی، بابا کا بھی دم گھٹ جائے گا۔ بابا! لگی ونجاں؟“

(بابا! چلی جاؤں؟)

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

عمر حیات کا چہرہ کھل اُٹھا۔ گاٹمن کی گردن میں بل پڑا۔ چندو کو دیکھ کر پھنکارا۔ ''ہا ہا وَنج...... جتھ وَنج کے اپنا مونھ کالا کر، میکوں کیا، میں حیڈا ہاں وی کون؟''

(ہاں ہاں جاؤ...... جہاں بھی جا کر اپنا منہ کالا کرو؛ مجھے کیا۔ میں تمہارا ہوں بھی کون؟)

وہ تیر کی طرح بابا کے پاس آئی۔ بڑے عرصے بعد وہ اُسے مخاطب کر کے بولا تھا۔ تبھی تو گاٹمن نے زوردار لات اس کے کندھے پر ماری۔ وہ پشت کے بل زمین پر گر گئی۔ سسک کر 'بابا' کہتی ہوئی اُٹھی۔ گاٹمن نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔ ''ناں چندو...... ہن ناں۔ بس چا کر؛ میکوں چار ڈینہہ جیون ڈے!''

(نہیں چندو! اب نہیں۔ بس کرو اور مجھے چار دن جینے دو)

وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ بابا کے لہجے میں اتنی نفرت گھلی ہوئی تھی کہ اس کی روح تک چھلنی ہو گئی۔ یک ٹک دیکھتی رہی پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''بابا! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں حرام کی پھوئی نہیں ہوں بابا...... تم میرے مالک ہو۔ چاہو تو روک لو۔ چاہو تو بھیج دو۔''

گاٹمن بولا۔ ''ناں چندو! میں تمہارا کوئی نہیں ہوں۔ تم جاؤ، جہاں بھی چاہو۔ خدا کے لیے لوٹ کر مت آنا۔ میرا جینا جینا نہیں، بے غیرتی کا جینا ہے اور ایسے جیون سے تو موت آ جائے، بہتر ہے۔ خدا کسی غیرت والے کوں ڈِھی نہ دے۔''

گاٹمن کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ آنکھوں سے لگاتار اشک اور ہونٹوں سے لعاب نکل کر ڈاڑھی کو بھگونے لگا تھا۔ عمر حیات نے چندو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنی جانب متوجہ کیا اور کہا۔ ''گاٹمن کو دکھی مت کرو۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ اسے چند دنوں میں قرار آ ہی جائے گا۔ چلو اب چلیں!''

یہ سب کچھ بڑا غیر فطری سا تھا کہ اس نے عمر حیات سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ اُسے کہاں لے جانا چاہتا ہے؟ جہاں لے کر جا رہا ہے وہاں اس کی حیثیت کیا ہو گی؟ اسے یوں اُدھل کر جانا چاہیے یا نہیں؟...... سب کچھ آپوں آپ، لحظہ بھر میں، طے ہو گیا اور وہ سر جھکائے گاٹمن کے گھر سے نکل آئی۔ پوٹھوہار جیپ میں بیٹھ کر ساکت نظروں سے اپنے گھر کو دیکھنے لگی جس میں اس کا نیم پاگل بابا رہتا تھا۔ بہت پیار کرنے والی ماں، تاجاں بی بی رہتی تھی۔ اسے شہزادی بنا کر رکھنے والی جواں سال بہن سرداراں رہتی تھی...... اس کی آنکھیں ایک دم پتھرا گئیں اور جیپ کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے سر گھٹنوں پر ڈال دیا۔

بے سامان گھر میں نیلوں بھرے چہرے والی لڑکی میت کی طرح اُتری۔ چونکہ مکان میں ایک چارپائی تک نہیں تھی اور نہ ہی اس کا خیال عمر حیات کو پہلے آیا تھا وگرنہ وہ بندوبست کرنے کے بعد چندو کو یہاں لاتا، اس لیے اُسے کچن کی شیلف پر بٹھا کر الٹے قدموں شہر گیا۔ فوری ضرورت کا سامان اور چارپائیاں خرید کر منی ٹرک پر لاد لایا۔ دونوں نے مل کر ایک کمرا اور کچن آباد کر دیا۔

عمر حیات امیر گھرانے کا اکلوتا وارث تھا۔ ماں اور بہنوں نے آج تک اُسے پانی بھی اُٹھ کر پینے نہ دیا تھا۔ تساہل پسند مزاج اور شدید ذہنی دباؤ کے باوجود آج خاصا کام کرنا پڑا تو بری طرح تھک گیا۔ چندو بھی کام کی عادی نہیں تھی۔ مستزاد کہ اُس کا جسم مضروب تھا۔ دل کے ساتھ سارا جسم کا عضو عضو دکھ رہا تھا۔ عمر حیات ہوٹل سے کھانا لانے نکلا تو وہ ہانپتی ہوئی چارپائی پر گر گئی۔

اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ گاٹمن کا نفرت بھرا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا جاتا اور وہ اپنے تئیں زمین میں گڑ جاتی۔ اسے کوئی مغالطہ نہیں تھا۔ کوئی شبہ نہیں تھا۔ اسے اپنے وجود کی گرانی اور گاٹمن کی محبتوں اور احسانات کا پوری طرح علم تھا۔ وہ باپ سے بڑھ کر باپ تھا اور دوست سے بڑھ کر دوست تھا۔ اس کے ذہن میں وہ تصویر ہمیشہ نقش رہی تھی جس میں گاٹمن ایک کاندھے پر مچھلیوں کا تھیلا لٹکائے، دوسرے کاندھے پر اُسے اسکول بیگ سمیت اُٹھائے کھال عبور کرتے ہوئے یوں اٹک گیا تھا کہ اس کا ایک پاؤں کھال کے پچھلے بنے پر تھا تو دوسرا اگلے پر۔ کھال کی چوڑائی زیادہ تھی۔ وہ نہ آگے جا سکتا تھا، نہ اگلا قدم پیچھے ہٹا سکتا تھا۔ بجائے غصہ کرنے کے، ایک دم دل کھول کر اپنی حماقت پر ہنسنے لگا۔ اس نے جونہی سرکس کے کرتب باز کی طرح چندو کو اگلے بنے پر اُتارا، اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لہراتا ہوا مچھلیوں بھرے تھیلے سمیت کھال میں گر گیا۔ نومبر کے آخری ہفتے کی کہر زدہ رات نے کھال کے پانی کو برف کر رکھا تھا۔

وہ پانی میں گرا تو کافی دیر تک باہر ہی نہ نکل سکا اور چندو بنے پر کھڑی تالیاں بجاتی رہی، ہنستی رہی۔ اس کی کم سنی کو احساس نہیں تھا کہ اس کا باپ برفیلے پانی میں کس عذاب سے گزر رہا تھا۔

جب گاٹمن نے باہر نکل کر اپنے کپڑے نچوڑے اور دونوں بوجھ کندھوں پر دوبارہ لادے، وہ تب بھی ہنس رہی تھی۔ اُسے گاٹمن کے بجتے ہوئے دانت اُس سے اچھے لگے تھے۔

اس نے بڑی مشکل سے سر جھٹک کر اس تصویر کو ذہن کے پردے سے ایک جانب سرکایا اور کھلے دروازے کے باہر صحن میں خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ مکان خاصا بڑا اور خوب صورت تھا۔ جھونپڑی میں بچپن اور لڑکپن گزارنے والی کے لیے کسی محل سے کم نہیں تھا مگر محل کو دیکھ کر دل میں کوئی خوشی نہیں پھوٹ رہی تھی۔ نئی منزل کا تجسس اور شوق کم تھا۔ پرانے رشتوں کے زیاں کا دُکھ کہیں زیادہ تھا۔ تبھی من ہی من میں سلگ رہی تھی۔

عمر حیات اُس کی زندگی میں اوباشانہ انداز میں داخل ہوا تھا مگر وہ بڑے باپ کا اعلیٰ ظرف بیٹا ثابت ہوا تھا۔ اس نے تمام رات اُس کی دل جوئی کی۔ اس کے جسم پر پڑے ہوئے سیاہی مائل نیلے دھبوں پر بام لگائی۔ سانجھے مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے اور دکھائے اور سب ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو چند ہی دنوں میں جوڑ دکھانے کے عزم کا اظہار کیا۔

وہ رفتہ رفتہ اس کی شخصیت کے سحر میں جکڑ گئی اور اس کا دل محبت کی لے پر دھڑکنے لگا، رقص کرنے لگا، جھومنے لگا۔ زندگی چیز ہی ایسی ہے۔ ایک کھلونا چھینتی ہے۔ دوسرا تھما دیتی ہے۔ بہلاووں کی سیڑھی پر چڑھا کر اوپر ہی اوپر کھینچتی جاتی ہے۔ عمر حیات نے اگلی صبح کورٹ میرج کرنے کا پروگرام بنایا۔ علی الصباح ناشتا لینے نکلا تو اپنے ایک وکیل دوست کے گھر پہنچ گیا۔ اُسے مختصراً اپنے حالات سے آگاہ کر کے مشورہ طلب کیا۔

دوست متفکر ہو گیا، بولا۔ ''میر صاحب! آپ نے اس کام کو جتنا آسان سمجھا ہے، یہ اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ آپ کا تو شناختی کارڈ بن چکا ہے مگر آپ جس لڑکی سے شادی کے خواہاں ہیں، بقول آپ کے، وہ ابھی نویں کلاس میں پڑھتی ہے۔ اگر زیادہ بھی ہوئی، تب بھی اُس کی عمر سولہ سے اوپر نہیں ہو گی۔ کورٹ اسے بالغ تسلیم نہ کرتے ہوئے آپ کا کیس خارج کر دے گی۔''

وہ بری طرح گھبرا گیا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا، بولا۔ ''پھر؟ پھر کیا، کیا جائے؟ میں تو واپسی کے راستے بند کر چکا ہوں۔''

وکیل دوست سوچ میں پڑ گیا۔ کندھا تھپتھپا کر بولا۔ ''میں چونکہ فوجداری وکیل ہوں، اس لیے خاندانی معاملات کو زیادہ بہتر طور پر نہیں جانتا۔ فیملی کورٹ کے ایک سینئر وکیل سے آج رابطہ کروں گا۔ اس سے رہنمائی لوں گا۔ اگر کوئی صورت نکلتی دکھائی دی تو تمہیں بلا لوں گا۔ تم گاؤں میں ہو گے یا یہیں شہر میں؟''

اس نے ملتجیانہ انداز میں بہ ہر صورت مدد کی درخواست کی اور یہ بتا کر کہ وہ شہر میں ہی ہے، اپنا فون نمبر نوٹ کرا دیا۔ گھر پہنچ کر چندو سے مخاطب ہوا۔ ''چندو ماہی! میں ایک وکیل کے پاس گیا تھا، تبھی ناشتا لانے میں دیر ہو گئی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے وکیل سے ہونے والی بات چیت گوش گزار کی۔ پھر کہا۔ ''مگر تم فکر نہ کرو۔ میں کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لوں گا۔''

چندو سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے ساتھ پڑھنے والی کئی لڑکیوں کو والدین نے پیا گھر روانہ کر دیا تھا۔ وہ اس کی ہم عمر ہی تھیں۔ ان کی شادیاں کیسے ہو گئیں؟ اگر ان کا نکاح ہو سکتا تھا تو پھر اُس کا کیوں نہیں؟ کہیں عمر حیات اُسے چکر تو نہیں دے رہا؟...... جب اس نے اپنے خدشات عمر حیات پر آشکار کیے تو اس نے سمجھایا۔ ''دیکھو چندو! ان لڑکیوں کا شرعی نکاح پڑھایا گیا تھا۔ ہم بھی شرعی نکاح کر سکتے ہیں مگر اس کے لیے تمہارے والدین کی اجازت ضروری ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ گاٹمن کبھی بھی اجازت نہیں دے گا۔ اور کورٹ میرج کے لیے لڑکے اور لڑکی کا بالغ ہونا ضروری ہوتا ہے جبکہ قانون کی نظر میں تم بالغ نہیں ہو، خود مختار نہیں ہو۔''

''تو پھر کیا ہو گا؟'' وہ سہم گئی۔ ڈر لگنے لگا کہ عمر حیات اُسے واپس نہ بھیج دے۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی، مدد طلب مگر ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میر زادے! میں مر جاؤں گی مگر واپس نہیں جاؤں گی۔ وہاں میرا دل پھٹنے کو آ جاتا ہے۔ بابا کی نظریں مجھے زندہ درگور کر دیتی ہیں۔ میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔''

اس نے اپنے وکیل دوست کی کال کا انتظار نہیں کیا اور نئے عزم سے کچہری روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے دوست کو چیمبر سے پکڑ کر فیملی افیئرز کو ڈیل کرنے والے وکیل کے پاس لے گیا۔ براہِ راست ملنے اور بالواسطہ ملنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ خاندانی معاملات میں شہرت رکھنے والا وکیل اصغر گیلانی خاصا بوڑھا اور مہنگا تھا۔ اس نے پہلے فیس طے کی، دو ہزار بیعانہ جیب میں ڈالا پھر اُسے قانونی طور پر محفوظ راستہ دکھانے لگا۔ سیدھا راستہ لمبا اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ شارٹ کٹ آسان ہوتا ہے۔ دل کو لگتا ہے۔ تبھی اس کے دل کو اطمینان ہوا جب اصغر گیلانی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نوجوان! بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ دو چار دن لگیں گے مگر کام ہو جائے گا۔ بالکل جینوئن......''

وہ کچہری سے نکل کر متصل بازار میں گھس گیا۔ اپنی چندو ماہی کے لیے جی بھر کے شاپنگ کی۔ چار بہنوں کے بیچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندگی گزری تھی۔ لڑکیوں کے استعمال کی ایک ایک چیز سے آگاہ تھا۔ اس نے نوع نوع کے پیکٹوں اور شاپروں سے لدی پھندی پوٹھوہار جیپ صحن میں پارکنگ کے لیے مخصوص فرش پر کھڑی کی، چندو کو آواز دی اور اُسے گدھے کی طرح لاد دیا۔ اس کی حیرت دیدنی تھی۔ کمرے میں لے جا کر سامان کھولتے ہوئے کبھی مسکرانے لگتی تو کبھی شرما کر آنکھیں چرانے لگتی۔ چارپائی کے پائے پر پاؤں رکھے، پورے قد کے ساتھ سر پر کھڑا عمر حیات اس کے گلنار چہرے کے لحظہ لحظہ بدلتے ہوئے تاثرات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے چند چیزیں ڈبوں کے نیچے چھپائیں تو وہ ہنس پڑا۔ ”چندو! اتنی جلدی تم بھول گئیں کہ یہ سامان میں خرید کر لایا ہوں؟“

وہ شرم سے لال ہو گئی۔ قوس قزح کے شوخ رنگوں نے عمر حیات کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس پر جھک گیا۔ قریب آ کر اجازت کا طلب گار ہوا۔ آنکھیں سوال کرنے لگیں تو آنکھوں کو ہی جواب دینا پڑتا تھا۔ چندو کی زبان نے انکار کیا مگر آنکھوں نے اپنے دیوانے کو مدعو کر لیا۔ محبت کا چلن ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبت کے والہانہ اظہار کا لمحہ چرانا پڑتا ہے، کبھی چھیننا تو کبھی بھکاری بن کر مانگنا پڑتا ہے۔ شب بھر پر محیط رومانوی پیرایوں نے اتنا اعتماد نہیں دیا تھا، جتنا ایک خاموش لمحے نے سونپ دیا تھا۔

”تم اپنے لیے کچھ نہیں لائے؟“

عمر حیات بولا۔ ”ساری عمر اپنے لیے خریدتا رہا مگر اتنی خوشی نہ ہوئی جتنی آج ہوئی۔ میں شام کو گھر جاؤں گا۔ واپسی پر اپنا سامان اُٹھا لاؤں گا۔“

”میں اکیلی رہوں گی؟“ اس کی آنکھوں میں واہمے سرسرا گئے۔

”گھنٹا بھر کے لیے جاؤں گا۔ جیسے کچہری میں گیا تھا۔“

”بی بی سائیں کو میرے بارے میں بتاؤ گے؟“

”نہیں...... مگر مناسب وقت آنے پر ضرور بتاؤں گا۔“

”وہ وقت کب آئے گا؟“

عمر حیات نے کھلنڈرے انداز میں دونوں ہاتھ کنگھی بنا کر ایک دوجے میں پھنسائے، جھولے کی طرح دو تین بار جھلائے اور شرارت سے ہنسنے لگا۔

وہ چندو کو اس گھڑی بہت بھایا۔ یک ٹک دیکھے گئی، پھر سر جھکا کر بولی۔ ”وقت ایک جیسا نہیں رہتا مگر پھر بھی دل بعض اوقات کیوں چاہنے لگتا ہے کہ زندگی کا سارا وقت اِس جیسا ہو جائے یا یہیں ٹھہر جائے۔“

اس نے چندو کا ہاتھ تھام لیا۔ چوما، کہا۔ ”میں [illegible] کرتا ہوں کہ میں دنیا بھر کی خوشیاں تمہاری جھولی [illegible] لا کر ڈالتا رہوں گا۔ تمہیں اتنا پیار دوں گا کہ تم میرے [illegible] ہر کسی کو بھلا دو گی۔“

اس کے دل نے ’آمین‘ کہا۔ دماغ نے فوراً اپنی [illegible] بدل لیا، پوچھا، ’اے چندو! کیا تم اپنے بابا کو بھی بھلا دو گی؟‘

اپنے اندر اُٹھنے والے سوال پر اس کا سر بے اختیار [illegible] نفی میں ہلا۔

عمر حیات نے سمجھا کہ انکار اُس کی بات پر ہوا، اس لیے جھٹ سے بولا۔ ”کیا مطلب؟ کیا تمہیں میری کہی [illegible] بات پر یقین نہیں ہے؟“

وہ جلدی سے بولی۔ ”نہیں، نہیں! یہ بات نہیں [illegible] دراصل میں کچھ اور سوچنے لگ گئی تھی۔“

اس کا تذبذب، مدافعانہ عجلت اور بے ساختگی عمر حیات کے دل میں اُتر گئی۔ اس کی آنکھ نے اٹکھیلی کی۔ ”دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ چندو سے پیاری لڑکی دنیا میں کوئی نہیں۔“

دل نے بھی باغیانہ توثیق کر دی، ’ہاں! میں بے سبب ’چندو چندو‘ کا ورد تو نہیں کرتا تھا ناں! یہ دنیا سے مختلف ہے، تبھی!‘

کوئی مختلف ہوتا ہے؟...... شاید دیکھنے والی نظر ’مختلف‘ کو مختلف زاویے سے دیکھتی ہے اور اسے دنیا کا مکمل حسن قرار دے کر جھومنے لگتی ہے۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر جھومنے لگے۔ دکھ کا دورانیہ طویل ہوتا ہے۔ خوشی کا مختصر۔ بڑی محنت اور باغیانہ جستجو کے بعد ان کی بچھائی ہوئی خوشی کی بساط اچانک سمٹ گئی۔ صحن میں کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نہ وہ جانتا تھا، کہ آنے والا کون تھا، نہ ہی وہ جانتی تھی۔ آنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ پھر چاپ دروازے پر آن تھمی۔ دونوں کی نظریں پہلے ہی کھلے دروازے پر ثبت تھیں۔

دروازے میں آنے والوں کے چہرے دیکھ کر چندو مائی کے بدن کا تمام تر خون نچڑ کر آنکھوں میں آ گیا اور وہ ایک جھٹکے سے چارپائی سے اُتر گئی۔ اس کی گود میں پڑے ہوئے دو اَدھ کھلے پیکٹ فرش پر گر گئے۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

پرانی تصویروں کو دیکھتے ہوئے انسان اکثر پرانی یادوں میں گم ہو کر ماضی کے رستوں پر بہت دور نکل جاتا ہے۔ لیکن نہ چاہنے کے باوجود حال میں پلٹنا بھی پڑتا ہے... وہ بھی جب واپس آئے تو حال کا تمام تر نقشہ پلٹا ہوا تھا... معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔

بے جان تصویروں سے جاندار ثبوت کی وصولیابی

فوٹو البم

بابر نعیم

فوٹو 1

یہ فیلیسا ہے۔
وہ خوب صورت ہے۔ ہے نا؟
یہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔
اس نے اپنے والدین کے یہاں تاخیر سے جنم لیا تھا۔
وہ پرفیکٹ ہے۔

فوٹو 2

یہ فیلیسا کا گھر ہے۔
یہ بہت بڑا ہے...... پورا تین منزلہ۔
یہ بہت خوب صورت ہے۔ پورا اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔
اس میں کاروں کے لیے چار گیراج ہیں۔
اس کا صحن خاصا بڑا اور صاف ستھرا ہے۔
یہ پرفیکٹ ہے۔

فوٹو 3

یہ میں ہوں۔
میری شکل بری نہیں ہے لیکن یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہیں سمائی۔
آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میں فیلیسا کے مقابلے میں قدرے بڑا ہوں۔
اس کی عمر سولہ برس ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں اکیس سال کا ہوں۔

فوٹو 4

یہ میرا گھر ہے۔
یہ اتنا پرفیکٹ نہیں ہے۔
یہ ریل کی پٹریوں کے ساتھ بنا ہوا ہے
اس کی چھت ٹپکتی ہے۔
اب میں یہاں تنہا رہتا ہوں لیکن زیادہ عرصے تک نہیں۔

فوٹو 5

یہ میری ممی ہیں...... نہیں تھیں۔
وہ خوب صورت تھیں، فیلیسا کے مانند۔
شاید اس سے بھی زیادہ حسین ہوں۔
اس تصویر میں وہ بائیس برس کی ہیں۔
میں اسی وقت پیدا ہوا تھا۔
ہاں، ان کے بازوؤں میں یہ میں ہی ہوں۔

فوٹو 6

یہ فیلیسا اپنے والدین کے ساتھ کھانا کھا رہی ہے۔
وہ شہر کے ایک وسطی علاقے کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔
وہ اور اس کے ڈیڈی کسی بات پر سر جوڑے ہوئے ہیں۔
وہ واقعی آپے سے باہر ہو رہی ہے۔
تب میں سمجھ گیا کہ میرا کام آسان ہو جائے گا۔

فوٹو 7

یہ وہی شب ہے جو گزشتہ فوٹو کی ہے۔
یہ فیلیسا کے ڈیڈی ہیں۔
وہ تصویر کھینچنے پر مجھے گھور رہے ہیں۔
انہوں نے مجھے کتیا کا بچہ کہا ہے۔
اس سے میرا کام اور آسان ہو گیا۔

فوٹو 8

یہ بھی فیلیسا کے ڈیڈی ہیں۔
یہ تصویر میں نے نہیں اتاری۔
یہ مجھے اپنی ماں کی اشیا میں ملی ہے۔
اس کی پشت پر موجود تحریر کو دیکھیں۔
یہ بات ثابت کرتی ہے کہ وہ میری ماں سے واقف تھے۔

فوٹو 9

یہ پھر میری ماں کی تصویر ہے۔
واقعی، یہ وہی ہیں۔
وہ اب بھی خوب صورت ہیں، باوجود اس کے کہ
انہیں ہلاک کر رہا ہے۔
وہ حقیقت میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکی ہیں۔
ان کا انتقال اسی مکان میں ہوا تھا۔

فوٹو 10

یہ پھر فیلیسا کے ڈیڈی ہیں۔ میں نے یہ تصویر فاصلے سے کھینچی ہے۔
وہ اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔
وہ اس سال ریٹائر ہو جائیں گے۔
وہ فیلیسا ان کے ہمراہ ہے۔
آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ فیلیسا سے کتنا پیار کرتے ہیں۔

فوٹو 11

یہ فیلیسا ہے جو اپنی کھڑکی سے چوری چھپے باہر آ رہی ہے۔
وہ سمجھی ہے کہ میں نے اسے ڈیٹ پر باہر چلنے کو کہا ہے۔
وہ پوری طرح آمادۂ عمل ہے۔
میرا خیال ہے کہ وہ کسی چیز کے لیے واپس اپنے ڈیڈی کے پاس جانا چاہتی ہے۔

فوٹو 12

یہ فیلیسا ہے۔
ہاں، یہ مر چکی ہے۔
ہوں ہوں، اپنے باپ کی اکلوتی اولاد۔
اب شاید ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ کیسا محسوس ہوتا ہے۔
میری صرف ماں تھی۔
انہوں نے میری ماں کو بھی اپنایا تھا، لیکن پھر اسے چھوڑ دیا تھا...... یہ انہوں نے اچھا نہیں کیا تھا۔

فوٹو 13

یہ فیلیسا کے ڈیڈی ہیں۔
یہ فیلیسا کی تدفین کے موقع کی تصویر ہے۔ میں نے ہی انہیں لاش کی خفیہ نشاندہی کی تھی۔ وہ رو پڑے تھے۔
انہوں نے اس وقت ممی کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا جب وہ بیمار پڑ گئی تھیں۔
میں الجھن میں ہوں کہ کیا وہ مجھے پہچان لیں گے جب میں انہیں یہ فوٹو البم بھیجوں گا......
ممی ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ میری آنکھیں بالکل اپنے باپ پر گئی ہیں۔

تکمیل

تنویر ریاض

شاہکار اگر ادھورا رہ جائے تو تخلیق کار کو کسی کل چین نہیں آتا... اور پھر یہی بے کلی دھیرے دھیرے اس شاہکار کی تکمیل کا سبب بنتی چلی جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی بے چینی اسے بھی گھیرے ہوئے تھی کیونکہ اسے اس نایاب پیکر میں کوئی نقص گوارا نہ تھا مگر... اس شاہکار کے مکمل ہوتے ہوتے وہ خود کتنا ادھورا رہ گیا تھا اس کا اسے احساس تک نہ تھا۔

فن کے تقاضے نبھانے والے ایک سنگدل مصور کا تصور

ایلس سے میری پہلی ملاقات آرٹ ہسٹری کی کلاس میں ہوئی تھی۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ مجھے اس سے بات کرنے کے لیے اپنے حواس قابو کرنے میں ایک مہینا لگ گیا۔ حالانکہ دوسری لڑکیوں سے بلا تکلف بات کر لیا کرتا تھا اور مجھے کبھی اس میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی اس کے سامنے جاتا تو رعبِ حسن سے میری زبان گنگ ہو جاتی اور میں کچھ نہ کہہ پاتا۔ میں اسے آڈیٹوریم میں آتے جاتے دیکھتا۔ اس کی سفید چکنی جلد ہال کی دودھیا روشنی میں اور زیادہ چمکنے لگتی اور میرے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ اس میں میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی قصور نہ تھا اور نہ ہی میں کوئی دکھاوا کر رہا تھا جیسا کہ کلاس کے بہت سے لڑکوں کا خیال تھا کہ میں ایک متکبر اور خود پسند شخص ہوں اور مجھے ہر کام میں کیڑے نکالنے کی عادت ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ دراصل فنکارانہ مزاج رکھنے والوں کے بارے میں لوگ ہمیشہ ہی غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں۔ اگر کوئی مجھے نک چڑھا یا دیوانہ سمجھتا تھا تو یہ اس کا مسئلہ تھا جبکہ میں درحقیقت بہت حساس واقع ہوا تھا اور میرے جیسے لوگ تخلیقی عمل میں معمولی سی کوتاہی یا خامی برداشت نہیں کر سکتے اور میری نظر میں ایک اچھے فنکار کی یہ خصوصیت ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت بڑا مصور تو نہیں سمجھتا لیکن فنی محاسن پر سمجھوتا کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کلاس کے باہر کھڑا اس کا انتظار کرتا اور کوشش کرتا کہ کسی طرح اس سے ٹکرا جاؤں یا اسے چھولوں اور اسے پتا بھی نہ چلے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ تیسری بار اس نے مجھے پکڑ ہی لیا۔

”ایکسکیوز می!“ وہ اپنی نیلی آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔ میں اسی دن کا انتظار کر رہا تھا۔ پہل اس نے کی تھی لہٰذا میری جھجک سیکنڈوں میں دور ہوگئی اور دھیرے دھیرے تکلف کی دیوار گر گئی۔ اس کی آنکھوں کا نیلا رنگ ایسا ہی تھا جیسا قدیم تصویروں میں استعمال ہوا کرتا تھا۔ نیلے رنگ کا یہ پتھر مصر میں پایا جاتا ہے اور قرون وسطیٰ کے مصور اسے پیس کر رنگ کے طور پر استعمال کرتے تھے جو انتہائی گہرا نیلا ہوا کرتا تھا۔ چند ہفتوں بعد جب ہماری بے تکلفی بڑھ گئی تو میں نے اس سے کہہ ہی دیا۔ ”تم جانتی ہو کہ تمہاری آنکھوں کا رنگ ایک قدیم معدنی پتھر جیسا ہے جو مصر میں پایا جاتا ہے۔“ وہ یہ سن کر حیران رہ گئی۔ غالباً سوچ رہی ہوگی کہ میں کتنی گہرائی میں جا کر چیزوں کو دیکھتا ہوں۔

کچھ لوگ مجھے خوابوں کا مسافر کہتے ہیں۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کو اپنے خوابوں کے ساتھ ہی چلنا چاہیے۔ میری ایک اسکول ٹیچر کہا کرتی تھیں کہ میں اداکاری کرتا ہوں اور میں حیران ہو کر انہیں دیکھا کرتا تھا۔ میری سمجھ میں کبھی یہ نہیں آیا کہ میں نے کب اور کہاں اداکاری کی تھی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میں ڈراما کوئن جیسا ہوں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ میں ہمیشہ سے ہی خاموش طبع اور شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اس کی گواہی میرے پڑوسی بھی دے سکتے تھے۔ بعد میں جب مجھ پر مقدمہ چلا تو انہوں نے میرے بارے میں یہی کہا کہ انہیں

یقین نہیں آ رہا کہ مجھ سے ایسا جرم بھی سرزد ہو سکتا ہے کیونکہ میں انتہائی شریف اور کم گو لڑکا تھا۔

ایلس کا اور میرا ساتھ صرف آرٹ ہسٹری کی کلاس تک ہی محدود تھا کیونکہ وہ آرٹ کی تعلیم حاصل کر رہی تھی جبکہ میں مصوری میں ماسٹرز کر رہا تھا اور میرے تعلیمی اخراجات یونیورسٹی سے ملنے والے وظیفے سے پورے ہوتے تھے کیونکہ میرے پاس پیسے نہیں تھے گو کہ بعد میں فرینک کے ذریعے کچھ آمدنی کا آسرا ہو گیا۔ وہ میرا آرٹ ڈیلر تھا جو مجھ جیسے باصلاحیت طالب علموں سے کام کروانے میں ماہر تھا اور ہماری بنائی ہوئی تصویریں اس کی آرٹ گیلری کی زینت بنا کرتی تھیں جنہیں وہ منہ مانگے داموں فروخت کر کے اپنی تجوری بھرتا اور اس میں سے مونگ پھلی کے دانے کے برابر ہمیں بھی حصہ دے دیا کرتا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ہمارا استحصال کر رہا ہے لیکن اسے برداشت کرنا ہماری مجبوری تھی کیونکہ ہماری تعلیم مکمل ہونے تک کوئی دوسرا ہماری تصویروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں اپنی ٹانگ کی وجہ سے حساس ہوں جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میری ٹانگ میں پیدائشی نقص ہے جس کی وجہ سے تھوڑا سا لنگڑا کر چلتا ہوں لیکن یہ اتنا برا نہیں لگتا حالانکہ بعض اوقات اس کی وجہ سے مجھے شدید تکلیف ہوتی ہے اور مجھے درد کم کرنے والی دوائیں لینا پڑتی ہیں جس سے تھوڑا سکون مل جاتا ہے۔ اس لنگڑاہٹ کی وجہ سے میری چال میں توازن قائم نہیں رہتا اور میری ٹانگ میں درد ہونے لگتا ہے لیکن میں نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ جانتا ہوں کہ کوئی بھی میری بات نہیں سنے گا۔ میں کوئی فن پارہ نہیں ہوں کہ لوگ میری خوبیوں اور خامیوں پر توجہ دیں۔ دنیا میں مجھ جیسے ہزاروں، لاکھوں لوگ ہیں جن میں کوئی نہ کوئی جسمانی عیب ہوگا۔ بہت سی لڑکیوں میں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی خامی پائی جاتی ہے۔ مجھے اس لڑکی کا نام یاد نہیں آ رہا لیکن وہ بہت خوب صورت تھی اور اس کے لانبے بھورے بال اس کی دلکشی میں اضافہ کرتے تھے لیکن جس طرح چاند پر داغ ہے اسی طرح اس کے بائیں گال پر ایک سیاہ تل تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ پُرکشش نظر آتی ہے چنانچہ وہ آئی برو پنسل سے اسے ... مزید گہرا کر لیا کرتی تھی لیکن میری نظر میں اس نقص کو نمایاں کرنا سراسر پاگل پن تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر کچھ لڑکیاں مجھے پسند کرتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں مجھ سے ہمدردی ہے اور وہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرتی ہیں جیسے

کوئی ماں اپنے بچے سے کر سکتی ہے۔ گویا وہ مجھے گود لینا چاہ رہی تھیں۔ یہ سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ جب میری اپنی ماں مجھے ممتا کا پیار نہ دے سکی تو کسی اور سے کیا اُمید رکھی جا سکتی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں جسمانی اعتبار سے مکمل انسان نہیں تھا لیکن ایلس میں کوئی جسمانی خامی نہیں تھی اور وہ بہ ظاہر بے عیب نظر آتی تھی، سوائے آنکھ کے مجھے یہ عیب اس وقت نظر نہیں آیا جب میں نے پہلی بار اسے آڈیٹوریم میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب میں اس سے ٹکرایا اور اس نے مجھے ایکسکیوز می کہا۔ جب میں متعدد بار کلاس روم سے اپارٹمنٹ تک اس کا پیچھا کیا کرتا تھا تب بھی یہ خامی مجھے نظر نہیں آئی اور نہ ہی ان سیکڑوں تصویروں میں اس نقص پر میری نظر گئی جو میں نے کھینچی تھیں کیونکہ ان میں کوئی کلوز اپ نہیں تھا اور وہ سب تصویریں فاصلے سے لی گئی تھیں۔ پہلی نظر میں اس کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ راہ چلتے لوگ گردن موڑ کر اسے دیکھا کرتے۔ جب وہ کبھی میرے ساتھ باہر جاتی تو لڑکے اسے دوسری بار دیکھنے کے لیے راستہ تبدیل کر لیا کرتے تھے۔ وہ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ اس لڑکی میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ ایک بار نظر پڑنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر اس کی آنکھ پر نہیں گئی ہوگی کیونکہ وہ ایک بہت چھوٹا سا عیب تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس کی بائیں آنکھ کے سفید پردے پر ایک بل کھاتی گہرے بھورے رنگ کی لکیر نظر آتی تھی جو واقعی نقص تھا مگر وہ اسے کوئی بڑی بات نہیں سمجھتی تھی۔

اس کا اظہار وہ کئی مرتبہ کر چکی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی ہماری دوستی کو چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ وہ اپنے ساتھ فلم دکھانے لے گئی جس میں جیک نکلسن نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ہیروئن کا نام میں بھول گیا لیکن وہ بہت خوب صورت تھی۔ یہ فلم سان فرانسسکو کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔ وہ دونوں بیڈروم میں ہیں اور نکلسن اس لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ ”تمہاری آنکھیں......“

اور وہ لڑکی جواب میں کہتی ہے۔ ”کیا ہوا؟“

”تمہاری سبز آنکھوں میں کچھ کالا کالا نظر آ رہا ہے۔“

”دھنک میں بھی تو ایک نقص ہے۔“ وہ لڑکی جواب دیتی ہے۔ ”یہ پیدائشی نشان ہے۔“

میں جانتا تھا کہ وہ مجھے یہ فلم دکھانے کیوں لے گئی تھی۔ اس کے بعد یہ منظر کئی بار اس کے بیڈروم میں دہرایا گیا اور جب میں نے ٹی وی اسکرین کی روشنی میں اس کے خوب صورت چہرے پر نظر ڈالی تو اس نے بھی فلم کی ہیروئن والے الفاظ دہرا دیے اور میں پورے وقت یہی سوچتا رہا کہ یہ زیادتی ہے۔ اس خامی کی وجہ سے ایلس کی ساری خوب صورتی تباہ ہوگئی اور پھر میری زبان سے وہ لفظ ادا ہو گئے جو مجھے نہیں کہنے چاہیے تھے۔

”تمہاری آنکھیں تمہاری خامی ہیں۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے۔“

ایلس کی ساری گرم جوشی رخصت ہوگئی اور وہ سرد لہجے میں بولی۔ ”میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں جیسے تم ٹانگ کے نقص کے باوجود اپنے آپ کو بے عیب سمجھتے ہو۔“

اس کی یہ بات سن کر مجھے بہت تکلیف ہوئی لیکن میں نے اسے قہقہے میں اڑا دیا کیونکہ اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ مجھے کتنا برا لگا ہے بلکہ میں نے اس سے معذرت کی اور کہا۔ ”ایلس، یقین جانو تم بہت خوب صورت ہو اور اس چھوٹے سے عیب سے تمہاری دلکشی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔“

وہ بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ کتنے لوگ میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور میری قربت کے خواہاں ہیں۔“ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر چاہتی تو میرے بجائے کسی بھی اسمارٹ لڑکے کا انتخاب کر سکتی تھی لیکن اس نے مجھے ترجیح دی شاید میری حساس فطرت کی وجہ سے یا پھر اس لیے کہ میں ایک فنکار تھا اور اپنی جسمانی خامی کے سبب اس سے مرعوب تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ اتنی خوب صورت ہے جس میں کوئی عیب تلاش کرنا ممکن نہیں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔

ہم آٹھ مہینے ایک ہفتے اور دو دن ساتھ رہے اور اس دوران میں نے اس کے دو تین سو تصویریں اور اسکیچز بنا ڈالے کیونکہ میں اس سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا تھا اور اس طرح مجھے اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ میری چاہت دیوانگی کی حدوں کو چھو رہی تھی اور مجھے اس سے ایک پل کے لیے بھی جدا ہونا گوارا نہیں تھا پھر اس کی ایک احمق سہیلی نے کہا کہ ایلس صرف اس لیے مجھے پسند کرتی ہے کہ میں اس کی تصویریں بناتا رہوں کیونکہ اس کے پاس کوئی اور کام نہیں تھا اور وہ مجھے بے وقوف بنا کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب ایلس نے یہ بات مجھے بتائی تو میرا خون کھول اٹھا۔ حالانکہ اس کی سہیلی نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ ایلس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ واقعی مجھے چاہتی تھی یا بقول سہیلی کے مجھے بے وقوف بنا رہی تھی لیکن میں اس کے پیار میں ضرور پاگل ہو چکا تھا۔ بہرحال

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے ایلس کو اس لڑکی سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور اس نے میری بات مان لی۔

مجھے کچھ وقت تو لگا لیکن رفتہ رفتہ میں ایلس کو اس کی تمام دوستوں سے الگ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ کیونکہ مجھے اپنے اور ایلس کے درمیان کسی تیسرے کی موجودگی گوارہ نہیں تھی۔ میں آرٹسٹ اور وہ میری ماڈل۔ بس وہ میرے سامنے بیٹھی رہے اور میں اس کی تصویریں بناتا رہوں، پھر میری یہ حالت ہوگئی کہ ایلس کو کسی کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگنے لگتیں۔ میں اس کا سایہ بن کر رہ گیا تھا۔ کلاس میں اس کے ساتھ رہتا اور اس کے بعد بھی ہم دونوں زیادہ وقت اکھٹے ہی گزارتے۔ وہ میری روح تھی، میری زندگی جس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں اس سے اکثر کہا کرتا۔ ”بے بی، میں تمہیں شہرت کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں لازوال بنادوں گا، مونالیزا کی طرح۔ اس کی تو مسکراہٹ نے لوگوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے جبکہ تم تو مجسم حسن ہو۔“ اسے یہ سب سننا اچھا لگتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اسے میری باتوں میں سچائی نظر آتی تھی۔

میں نے اس کی ہر طرح کی تصویریں بنائیں۔ بھرپور تاثرات والی، نفیس اور ایسی تصویریں جن میں وہ زمانہ قدیم کی کوئی شہزادی نظر آتی تھی۔ میں اسے جس روپ میں ڈھالتا وہ اسی میں ڈھل جاتی۔ یہ سب میرے تخیل کا کمال تھا لیکن وہ پوری طرح مجھ سے تعاون کررہی تھی۔ میں نے بڑے کینوس پر اس کی لائف سائز تصویر اور اس کے جسم کے مختلف حصوں کو الگ الگ کینوس پر منتقل کیا جن میں ان حصوں مثلاً آنکھ، ناک، کان، ہاتھ اور ٹانگوں کی تمام جزئیات کلوز اپ کے ذریعے نمایاں کی گئی تھیں لیکن جیسے جیسے میں اس کی تصویریں بناتا گیا میری یہ خواہش بھی پختہ ہوتی گئی کہ یہ ہر لحاظ سے مکمل ہوں اور ان میں کوئی عیب نظر نہ آئے لیکن اس کی آنکھ کے عیب نے مجھے پاگل کردیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس ناگوار عیب کو کس طرح چھپاؤں۔

کبھی کبھی ہم دونوں ساتھ بیٹھے ہوتے اور میں بڑی محویت سے اس کے خوب صورت چہرے پر نظریں جمائے ان حسین ساعتوں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا لیکن اس کی آنکھ کا یہ عیب مجھے کھٹکنے لگتا اور فوراً سارا مزہ کرکرا ہوجاتا۔ میرا جی چاہتا کہ اس کی یہ آنکھ ہی نکال دوں جس نے اس کے خوب صورت چہرے کو عیب دار بنا دیا تھا لہٰذا میں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا، اس پر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔

میں نے ایلس کی جو تصویریں بنائی تھیں ان کی نمائش کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اس کا تذکرہ میں نے اپنے آرٹ ڈیلر فرینک سے کیا تو اس نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا۔ میں پہلے ہی ایلس کی کئی تصویریں فیس بک پر ڈال چکا تھا اور ان پر ہزاروں کی تعداد میں تبصرے موصول ہورہے تھے۔ لوگوں نے ان تصویروں کو بے حد سراہا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایلس کے مسحور کن حسن سے بے حد متاثر تھے۔ مجھے ان تبصروں کو پڑھ کر اندازہ ہوگیا کہ ایلس کی تصویروں کی نمائش بے حد کامیاب رہے گی اور ان کے ذریعے میں اچھی خاصی رقم کما سکوں گا۔ یہ بات دوسری ہے کہ میں نے ان تصویروں میں ایلس کی آنکھ کے عیب کو نمایاں نہیں کیا۔ میں اس خامی کو دنیا کے سامنے نہیں لانا چاہ رہا تھا جسے صرف میری آنکھ نے محسوس کیا تھا۔

اس نمائش کے انعقاد سے پہلے ہم دونوں میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ گئے۔ وہ انتہائی سرد دن تھا، ہر چیز سرد اور بے جان نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ پورا شہر منجمد ہوگیا ہے لیکن میں نے صرف ایلس کی خاطر اس سفر کا اہتمام کیا تھا۔ میں اس جگہ کو خوب صورتی کا خزانہ کہا کرتا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے ایک مصری ملکہ تیتی کا سنگی مجسمہ دیکھا جو کسی جرمن عجائب گھر سے مستعار لیا گیا تھا۔ میں نے اس نام کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے معنی مجسم خوب صورتی کے ہیں اور اسے بتایا کہ وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل عورت تھی اور اس میں کوئی عیب نہیں تھا۔ ایلس نے بھی اپنی آرٹ ہسٹری کی کلاس میں اس بارے میں پڑھا تھا لیکن وہ اس کے نام کا مطلب نہیں جانتی تھی۔ پہلے مجھے بھی نہیں معلوم تھا لیکن میں نے ایلس کو متاثر کرنے کے لیے اس کے معنی گوگل پر تلاش کرلیے تھے۔

اس کے بعد میں نے اسے ایفروڈائٹ کا یونانی مجسمہ دکھایا اور وہ بھی اتنا مکمل تھا کہ آپ اسے دیکھتے ہی بے اختیار داد دینے پر مجبور ہوجائیں۔ کسی ماہر سنگ تراش نے اس کی خوب صورتی کو نمایاں کرنے میں اپنی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے کوربٹ اور پکاسو کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھیں۔ پکاسو نے میری تھریسا کی جو تصویر بنائی وہ بلاشبہ آرٹ کا شاہکار تھی اور اسے کسی بھی زاویے سے دیکھا جائے، اس کی خوب صورتی میں کوئی عیب نظر نہیں آتا پھر ہماری نظر مارلن منرو کی پینٹنگ پر گئی۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایلس کو بتایا۔ ”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مارلن منرو نے بے عیب اور ہر لحاظ سے مکمل نظر آنے کے لیے اپنی ناک اور ٹھوڑی کا چھوٹا سا آپریشن کروایا تھا۔“

اس طرح میں اس کے ذہن میں یہ خیال بٹھانا چاہ رہا تھا کہ اسے بھی اپنی آنکھ کا عیب دور کرنے کے بارے میں کچھ سوچنا چاہیے۔ ٹھیک ہے بہ ظاہر وہ کسی کو نظر نہیں آتا لیکن مجھ جیسے باذوق اور فن شناس کی نظر میں وہ ہمیشہ کھٹکتا رہتا ہے کیونکہ میں خوب صورتی میں کوئی داغ برداشت نہیں کرسکتا۔ میں سارا دن ایلس کی آنکھ کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا تاکہ میرا یہ دورہ خراب نہ ہوجائے۔ میں اس وقت مکمل اور بے عیب شاہکاروں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا اور کسی عیب کی جانب دیکھنا مجھے گوارہ نہیں تھا۔

لیکن میں نے ایلس کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کی اور گھر واپس آنے کے بعد اسے اپنی بانہوں میں لے کر کہا۔ ”ڈارلنگ! تم ان شاہکاروں سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو۔ میرا بس چلے تو تمہاری ایک شاہکار تصویر بنا کر وہیں رکھ دوں۔“

میں نے پوری احتیاط سے کام لیا کہ آرٹ کے ان شاہکاروں سے موازنہ کرتے وقت اس کی آنکھ کے بارے میں کوئی بات نہ کروں۔ میں ان پرمسرت لمحات سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا جو کچھ دیر بعد وہ میری جھولی میں ڈالنے والی تھی۔ وہ میری تعریف سن کر نہال ہوگئی اور اس نے خود سپردگی کے عالم میں میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ جب جذبات کا طوفان تھما تو میں نے اس پر ایک پیار بھری نظر ڈالی۔ وہ میرے پہلو میں لیٹی چھت کو تک رہی تھی اور میں اس کے چہرے اور جسم کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے اس کے بدن پر کچھ جھریاں اور مہاسے نظر آئے لیکن میں نے انہیں نظر انداز کردیا کیونکہ ان پر کسی کی نگاہ نہیں جاسکتی تھی اور نہ ہی ان سے اس کی خوب صورتی متاثر ہورہی تھی۔ اب اس نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور وہ پوری طرح میری محویت سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ میں اگر اسے ان جھریوں اور داغوں کے بارے میں بتاتا تو ان پُرکیف لمحات کا سارا لطف کرکرا ہوجاتا اور میں ان حسین ساعتوں کو برباد کرنا نہیں چاہ رہا تھا لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ میں کوشش کے باوجود آنے والی قیامت کو نہ روک سکا۔ جیسے ہی اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور میری نظر اس عیب پر گئی تو ان لمحات کا سارا حسن برباد ہوگیا اور مجھے احساس ہوا کہ اس خامی کے ہوتے ہوئے ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ اب میں اسے مزید برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ میں

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر رکھے تو وہ اسے بھی محبت کی کوئی ادا سمجھ کر مسکرا دی۔ کاش اس کی یہ مسکراہٹ مجھے اس حرکت سے باز رکھ سکتی پھر آہستہ آہستہ میرے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ اس نے اپنے آپ کو آزاد کروانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی لیکن جیسے ہی میری نظر دوبارہ اس کی آنکھ پر گئی تو میرے ہاتھوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ وہ مچلتی رہی، اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلتی رہیں لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، پھر سب کچھ ختم ہو گیا اور اس کے جسم میں جان نہ رہی۔

اس کی کھلی آنکھوں کی وجہ سے وہ عیب اب زیادہ بڑا اور بدصورت نظر آ رہا تھا۔ میں نے گوند کی شیشی لی اور اس کی دونوں پلکوں کو گوند سے چپکا دیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میت کے وارث آخری رسومات سے پہلے آنکھیں بند کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں تاکہ قبر میں کیڑے ان آنکھوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں پھر میں اسے اٹھا کر اپنے اسٹوڈیو میں لے گیا اور اسے فرش پر اس طرح لٹایا کہ اس کے دونوں ہاتھ سیدھے کر کے پھیلا دیے۔ میں نے کئی تصویروں میں برہنہ لڑکیوں کو اسی طرح ساحل سمندر پر لیٹے ہوئے دیکھا تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ ایلس اس حال میں بھی باوقار نظر آئے۔ اسی لیے اس کے جسم کو مختلف زاویوں سے حرکت دیتا رہا۔ اس کام میں کافی وقت لگا لیکن بالآخر مجھے کامیابی ہوئی اور میں نے ایلس کو اسی طرح لٹا دیا جیسا کہ میں چاہتا تھا۔

میں نے گلابی، سرخ، زرد اور سفید رنگوں کو السی کے تیل میں ایک خاص تناسب سے ملایا اور ایلس کی جلد کے زرد رنگ کی مناسبت سے شیڈ تیار کیا پھر میں نے ایک نرم برش کی مدد سے اس رنگ کی تہ اس کے جسم پر جمانا شروع کی۔ اس کے مساموں میں تیل جذب ہونے لگا اور میں اس وقت تک برش پھیرتا رہا جب تک اس میں چمک نہیں آ گئی۔ اب اس کا جسم حقیقی زندگی کے مقابلے میں زیادہ کامل نظر آ رہا تھا۔

اس کام میں میرے کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران حلق خشک کرنے کے لیے کولڈ ڈرنک اور جاگتے رہنے کے لیے مسلسل کافی پیتا رہا۔ تھکن کی وجہ سے میری کمر اور ٹانگوں میں درد شروع ہو گیا جسے دور کرنے کے لیے مجھے دواؤں کا سہارا لینا پڑا۔ اس کے جسم کے ایک ایک انچ حصے کو رنگ کرنے میں بہت وقت لگ گیا۔ مجھے کچھ حصوں پر گہرا اور کچھ جگہوں پر ہلکا رنگ کرنا تھا۔ ان میں گردن کی ہڈی، کہنیاں، گھٹنے اور ٹخنے شامل تھے پھر میں نے اس کے ہاتھ اور پیروں کے ناخنوں پر سفید رنگ کیا اور اس کے سر کے بالوں پر ایک عمدہ قسم کا چمک دار خضاب لگایا جس میں اس کا ایک ایک بال چھپ گیا پھر چھوٹے برش کی مدد سے اس کی آنکھیں بنانا شروع کیں۔ یہ انتہائی محنت طلب کام تھا۔ پہلے ایک محلول کی مدد سے اس کی پلکیں صاف کیں۔ پتلیوں پر سمندری نیلا رنگ لگایا اور کناروں کے لیے سفید رنگ استعمال کیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر جب میں نے اس کے جسم اور چہرے پر نظر ڈالی تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ ہر لحاظ سے مکمل تھی اور اس میں کوئی عیب نہیں تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنا ہوش نہ رہا اور بے سدھ ہو کر بستر پر گر گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنی دیر تک سوتا رہا لیکن جب آنکھ کھلی تو پورا جسم گرم اور پسینے میں بھیگا ہوا تھا کیونکہ میرا چھوٹا سا اپارٹمنٹ ضرورت سے زیادہ گرم ہو گیا تھا۔ اگر میں گھوڑے بیچ کر نہ سوتا تو ہیٹر بند کر سکتا تھا۔

میں نے ایلس پر نظر ڈالی۔ وہ اسی طرح خاموش اور مکمل حالت میں تھی لیکن میں نے کمرے میں ایک ناگوار مہک سی محسوس کی لہٰذا میں نے اس کے پورے جسم پر خوشبو چھڑک دی پھر میں نے کافی بنا کر دو پیالیاں چڑھائیں اور درد دور کرنے کی دوائیں بھی لیں لیکن میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں یہ شاہکار کسی کو دکھانا چاہ رہا تھا اور اپنے آرٹ ڈیلر فرینک کو فون کر کے کہا کہ وہ فوراً چلا آئے لیکن اس نے کہا کہ وہ اگلے روز کسی وقت آ سکتا ہے۔ مجھے اس کی بات کا یقین کرنا پڑا لیکن دل میں ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ وہ دوسرے روز بھی آئے گا یا نہیں۔ میں نے ایک اور گولی کھائی اور ایک کپ کافی پینے کے بعد کام کرنے بیٹھ گیا۔

ایلس کی تصویر میں مزید کچھ رنگ بھرنے کے ارادے سے میں نے اس کے گالوں کو ہلکے گلابی رنگ سے نمایاں کیا جو کہ اچانک ہی مجھے زرد نظر آنے لگے تھے پھر میں نے سب سے چھوٹا برش لے کر اس کی پلکیں بنائیں جو کہ پہلے ہی رنگ کر چکا تھا لیکن اس بار میں نے ایک ایک پلک کو احتیاط سے بنایا۔ ایک بار پھر اس کے پورے جسم پر خوشبو کا چھڑکاؤ کیا پھر میں نے دو ضرب چار کی ایک لکڑی کی تختی لی اور اس پر ایلس 2011 لکھ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ تختی اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں تاکہ وہ اس مجسمے کا حصہ معلوم ہو لیکن میں اس کی انگلیوں کو حرکت نہیں دے سکا۔ وہ کسی پتھر کی طرح سخت ہو چکی تھیں جیسے واقعی وہ کسی اصلی مجسمے کی ہوں۔ میں نے اس سامان کی فہرست بنانے کے بارے میں سوچا جو اس کام میں استعمال ہوا تھا۔ عام طور پر

عجائب گھروں میں یہ فہرست مجسمے کے ساتھ ہی آویزاں کی جاتی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تیاری میں کون کون سے رنگ، وارنش، تیل اور خوشبوئیں استعمال ہوئی ہیں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں اسے اپنا ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

فرینک کے آنے تک ایلس کے جسم پر لگایا ہوا رنگ خشک ہونا شروع ہو گیا تھا اور کسی کسی جگہ اس میں دراڑیں بھی پڑ گئی تھیں لہٰذا میں نے ان جگہوں پر السی کا تیل لگا دیا۔ میرا اپارٹمنٹ پانچویں منزل پر تھا۔ فرینک سیڑھیاں چڑھ کر آیا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے اسے سانس لینے کا موقع بھی نہ دیا کیونکہ میں اسے کام دکھانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

"تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

اس کا کہنا صحیح تھا۔ میں نے اس دوران منہ ہاتھ دھویا اور نہ ہی کپڑے بدلے۔ فرینک نے دیکھ لیا تھا کہ میرے ہاتھوں پر لرزہ طاری تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مسلسل جاگنے اور اس فن پارے پر کام کرنے کی وجہ سے میری یہ کیفیت ہوئی ہے۔ وہ سیاہ جینز اور سیاہ شرٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے سیاہ بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ وہ خاصا ہینڈسم اور مکمل انسان تھا۔ البتہ اس کے ہونٹ کے اوپری حصے پر ایک زخم کا نشان تھا جسے اس نے مونچھیں بڑھا کر چھپانے کی کوشش کی تھی اور میں سوچا کرتا کہ اگر یہ نشان نہ ہوتا تو فرینک ایک مکمل اور بے عیب مرد تھا۔

میں اسے اپنے بیڈروم میں لے کر آیا جسے اپنے اسٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ایلس پر نظر پڑتے ہی اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "اوہ میرے خدا!" پھر وہ تھوڑا سا آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "یہ تم نے کس طرح بنایا، یہ تو بالکل زندہ تصویر کے مانند ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ڈان ہانسن کے مجسمے کی یاد آ گئی۔"

وہ ساٹھ کی دہائی کے ایک فنکار کا حوالہ دے رہا تھا جس نے سیاحوں، محافظوں اور صفائی کرنے والی عورتوں کے جیتے جاگتے مجسمے بنائے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی میری ایلس جیسا خوب صورت نہ تھا۔ اس لمحے مجھے تھوڑی سی بے عزتی محسوس ہوئی لیکن میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میری اختراع ہے۔"

فرینک نے نتھنے سکیڑے اور بولا۔ "یہ بُو کیسی ہے، کیا یہ دور نہیں ہو سکتی ورنہ میں اسے فروخت نہیں کر سکتا۔"

میں نے اسے بتایا کہ اسے بنانے میں بہت زیادہ تیل اور بدبودار وارنش استعمال ہوا ہے اور یہ اسی کی بو ہے جو آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔"

وہ بولا۔ "مجھے تو یہ کسی سستے قسم کے پرفیوم کی بو لگ رہی ہے لیکن یہ شاہکار خوب ہے، خاص کر اس کی آنکھوں کا تو جواب ہی نہیں۔ یہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔"

اس کی تعریف سن کر میں خوش ہو گیا۔ میری محنت رنگ لائی تھی پھر میں نے دیکھا کہ ایلس کی ایک آنکھ چند لمحوں کے لیے کھلی اور بند ہو گئی۔ شاید اس میں ایک یا دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ میرے حلق سے ایک آواز نکلی جسے فرینک نے بھی سن لیا، وہ بولا۔ "کیا ہوا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایلس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھ اب بند ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ میرا وہم تھا۔ مسلسل جاگنے اور تھکان کی وجہ سے میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور جو کچھ میں نے دیکھا شاید وہ نظر کا دھوکا تھا۔ فرینک ایلس کے جسم کو چھونے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔ "ابھی نہیں، ممکن ہے کہ رنگ ابھی گیلا ہو۔"

فرینک اپنے ہاتھوں کو مسلنے لگا جیسے اسے یہ سن کر افسوس ہوا ہو پھر بولا۔ "میں اسے جلد از جلد اپنی گیلری میں لے جانا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا اور میں تصور ہی تصور میں دیکھنے لگا کہ لوگ جوق در جوق میرے شاہکار کو دیکھنے چلے آ رہے ہیں اور ہر کوئی اسے خریدنے کا متمنی ہے لیکن فرینک کی آواز سن کر مجھے واپس اپنی دنیا میں آنا پڑا۔

"یہ رنگ کب تک خشک ہو جائے گا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"تم بدبودار وارنش کو لگانا چھوڑ دو تاکہ یہ جلد خشک ہو جائے۔" اسی دوران میری نظر پرفیوم کی بوتل پر گئی جو میز پر رکھی ہوئی تھی۔ میں اسے چھپانے کے لیے میز کے سامنے کھڑا ہو گیا پھر جیسے ہی میری نظر ایلس پر گئی، میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھ کو کھلتے اور بند ہوتے دیکھا اور میں اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔

"آج تمہیں کیا ہو رہا ہے؟" فرینک نے پوچھا۔

"شاید بہت زیادہ کافی پینے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔" میں نے بات بناتے ہوئے کہا پھر مجھے خیال آیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ فرینک نے یہ سب کچھ نہ دیکھا۔ کیا وہ مجھ سے چھپا رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''بہتر ہے کہ تم کافی پینا چھوڑ دو۔'' فرینک نے مشورہ دیا۔
میں نے اس کی جانب دیکھا اور جیب میں رکھے ہوئے چاقو پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ ایک بار پھر ایلس کی آنکھ کھلی اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھ کا عیب پہلے سے زیادہ بڑا اور گہرا ہوگیا تھا، یہ دیکھ کر میری ٹانگوں پر لرزہ طاری ہوگیا۔
فرینک نے مجھے دیکھا پھر ایلس کے جسم پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بہت اچھی پلکیں بنائی ہیں لیکن انہیں مزید سنوارنا ہوگا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو ناں......؟''
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تبھی میں نے دیکھا کہ ایلس کی پلکوں میں ایک بار پھر حرکت ہوئی یقیناً فرینک نے یہ دیکھ لیا ہوگا۔
میں چلاتے ہوئے بولا۔ ''رک جاؤ۔''
فرینک اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔ میں نے کہا۔ ''جانتا ہوں تم سب کچھ دیکھ چکے ہو۔''
''یقیناً۔'' اس نے کہا۔ ''اور تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم نے ایک زبردست کام کیا ہے۔'' وہ مسکرایا اور اس کے ہونٹ کا زخم نمایاں ہوگیا۔ ادھر ایلس کی آنکھ بار بار پھڑک رہی تھی۔ اس کی آنکھ کی خامی پہلے سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا تھا لہٰذا چلاتے ہوئے بولا۔
''مجھ پر طنز مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم سب کچھ دیکھ چکے ہو۔''
''کیا...... میں نے کیا دیکھا ہے؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔
''اس کی آنکھیں۔'' میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔
''اس کی آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟'' فرینک مجھے دیکھتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''تمہیں میری بات کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔''
ایلس کی آنکھ اب پوری طرح کھل چکی تھی اور مجھے وہ نشان صاف نظر آرہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فرینک بھی اسے دیکھ چکا ہے۔
''میں اسے مکمل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔'' میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔''
''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ جانے لگا لیکن میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا اور ایلس کے جسم کے پاس لے گیا، اب وہ اس کے چہرے اور کھلی ہوئی آنکھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔
''دیکھو۔'' میں نے کہا۔ ''تم دیکھ سکتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے ضرور دیکھا ہوگا۔'' میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اور وہ اپنے آپ کو چھڑوانے کی جدوجہد کرنے لگا اور اسی کوشش میں اس کا ہاتھ ایلس کے جسم سے ٹکرا گیا، وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا جن پر پینٹ کے ساتھ ساتھ کھال کے ٹکڑے بھی چپک گئے تھے۔ اس نے خوف زدہ انداز میں ایلس کو دیکھا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''اوہ...... میرے خدا!''
میں بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ میری کمر اور ٹانگوں میں شدید درد ہورہا تھا اور مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا مشکل ہورہا تھا پھر میں بری طرح لڑکھڑایا اور ایلس کے برابر میں ہی لیٹ گیا۔ میں نہیں جانتا کہ کتنی دیر وہاں پڑا رہا پھر پولیس آئی اور مجھے اٹھا کرلے گئی۔
اخبارات نے اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور مجھے ایسا نفسیاتی مریض قرار دیا جو اپنی محبوبہ کی سڑی ہوئی لاش کے ساتھ کئی دن تک لیٹا رہا۔ یہ صریحاً جھوٹ تھا۔ میں کئی دن تک نہیں لیٹا رہا تھا اور میں نے پوری کوشش کی تھی کہ ایلس کی لاش سے بدبو نہ آئے۔
میں نے جیل میں ٹیٹو بنانے کا کام شروع کردیا۔ اس کے لیے مجھے صرف ایک بال پوائنٹ اور ایک پن چاہیے تھی۔ یہاں لوگ مجھ سے ٹیٹو بنوانے کے لیے لائن میں لگے رہتے تھے۔ وہ مجھ سے مختلف فرمائشیں کرتے۔ کسی کو اپنی محبوبہ کی تصویر بنوانی ہوتی۔ کوئی اپنے سینے پر دل کی شکل کھدوانا چاہتا اور کسی کو اپنی پسندیدہ ایکٹریس کی شبیہ بنوانی ہوتی تھی۔ میں ان کی ٹانگوں، بازوؤں اور سینے پر یہ ٹیٹو بناتا رہا۔ اس طرح میرا وقت بھی گزرتا رہا اور عزت بھی ملتی رہی۔ جیل کے سارے قیدی میرا بہت احترام کرتے تھے۔
مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایلس کی لاش واشنگٹن کی کسی سائنسی تجربہ گاہ میں نمائش کے لیے رکھ دی گئی ہے کیونکہ میں نے جو تیل، وارنش اور پرفیوم استعمال کیا تھا اس کی وجہ سے لاش اچھی طرح محفوظ ہوگئی تھی اگر اسے فرینک کی گیلری میں رکھا جاتا تو زیادہ خوشی ہوتی لیکن آپ کو زندگی میں سب کچھ نہیں مل جاتا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میرے کام کو دیکھ کر لوگ اس کی تعریف کررہے تھے۔ کاش کوئی یہ بھی جان لیتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ عیب دار چیزیں مجھے پسند نہیں اور میں نے ایلس کے اسی عیب کو دور کرنے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا کیونکہ مجھے ایلس سے بہت محبت تھی اور میں اس کے اندر کوئی خامی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اللہ کے برگزیدہ بندے ہر دور کی ضرورت رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جہالت کی تاریکی تہہ در تہہ بڑھتی جاتی مگر ان کے نور سے پھیلنے والے اجالے نے دنیا کے اندھیروں کو دور کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جو اگر رک جاتا تو آج اچھے برے کی تمیز اور نیک انسانوں کا سراغ تک نہ ملتا... یہ بھی ایک تاریک دور میں پیدا ہونے والے معصوم ولی کی داستان ہے جن کے ذمہ اپنے والد کے ادھورے مقصد کی تکمیل تھی۔ بالآخر انہوں نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔

ولادت سے قبل ہی ولایت کی سعادت پانے والی شخصیت کا ماجرا

معصوم ولی

ضیا تسنیم بلگرامی

حضرت مجدد الف ثانیؒ جو مقصد لے کر آئے تھے اور جن امور کا احیا اور قیام چاہتے تھے، ایک زمانہ ان کا مخالف تھا اور ان مخالفوں میں بادشاہ سرفہرست تھا۔ یہ اکبر اعظم کا عہد تھا۔ اکبر رخصت ہوا تو اس کے بیٹے جہانگیر کا دور شروع ہوا اور اس نے اپنے باپ سے ورثے میں جو کچھ پایا، اس پر سعادتمند بیٹے کی طرح عمل پیرا ہوا۔ مجدد الف ثانیؒ کو اپنے رب کی طرف سے القا ہوا کہ وہ سرکش اور گمراہ حکمران کے سر مغرور اور فرق کبر کی کجی کو دور فرمادیں۔ آپؒ مشیت ایزدی کی چٹان بن کر دبدبۂ شاہی اور کروفر مطلق العنانی پر گرے اور کجی دور فرمادی۔ آپؒ نے بادشاہ کی اصلاح کی اور پھر عامیوں کی اصلاح شروع

WWW.PAKSOCIETY.COM

کردی۔ اپنی پوری جدوجہد اور مساعی جلیلہ میں انہیں یہ احساس پریشان کرتا رہا کہ اپنی چند روزہ زندگی میں وہ پہاڑ جیسا کام کس طرح انجام دیں گے۔ انہیں اتنی ہی زندگی اور درکار تھی جتنی وہ اپنے رب سے لے کر آئے تھے۔ وہ اکثر ملول ہو جاتے اور اللہ سے کہتے۔

”الٰہ العالمین! کام زیادہ اور طویل المیعاد ہے اور زندگی تھوڑی، میں زندگی سے محبت نہیں کرتا لیکن پھر بھی زیادہ کا طلب گار ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی کو بڑے کاموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ مجھے اتنی زندگی مزید دے دے کہ میں بقیہ کام کو خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی سے انجام دے سکوں۔“

ان دنوں گھر میں ولادت کے لمحوں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ مجدد الف ثانیؒ کی بیوی اپنے ننھے مہمان کی منتظر تھیں۔ آپؒ شاہی لشکر سے نکل کر اپنے گھر تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں بھی تبلیغ و تلقین سے غافل نہیں تھے اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ تبلیغ و تلقین کا فریضہ ہر جگہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ آپؒ نے مغرب کی نماز پڑھی اور خشوع و خضوع سے اپنے مصلے پر بیٹھے رہے۔ ذکر زیرِ لب جاری تھا۔ اچانک آپؒ پر نیند نے غلبہ کیا اور آپؒ کی دونوں آنکھیں بند ہو گئیں۔ آپؒ نے دیکھا مشرق سے مغرب تک نور ہی نور پھیلا ہوا ہے۔ اس نور میں آپؒ نے رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ آپ کی زبان نے درود شریف کا ورد شروع کر دیا۔

اچانک رسول مقبول ﷺ نے آپ کو مخاطب کیا۔ ”شیخ احمد!“

آپ نے جوشِ عقیدت میں جواب دیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! میری جان و مال اور جو کچھ بھی میرا ہے، آپ پر قربان، ارشاد۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ عنقریب تیرے گھر میں بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام محمد معصوم رکھنا۔ کیونکہ یہ تمام عمر معصوم ہی رہے گا۔“

اس کے بعد مجدد الف ثانیؒ کی آنکھ کھل گئی۔ آپؒ درود شریف پڑھتے ہوئے بیوی کے پاس پہنچے، بیوی پر غنودگی طاری تھی۔ آپؒ کچھ دیر سامنے کھڑے رہے۔ ذرا دیر بعد بیوی کی آنکھ کھل گئی اور اپنے سامنے شوہر کو کھڑے دیکھ کر ہڑبڑا گئیں، جھجکتی ہوئی بولیں۔

”آپ کب تشریف لائے؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”ذرا دیر پہلے، کیوں خیریت تو ہے؟“

بیوی نے رک رک کر کہا۔ ”اس وقت میں نے ایک اچھا خواب دیکھا اور خواب کیوں کہوں، میں اسے رؤئے صادق کہوں گی۔“

آپؒ نے پوچھا۔ ”تم نے خواب میں کیا دیکھا؟“

بیوی نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ”کیا عرض کروں؟“

آپؒ نے اصرار کیا۔ ”بتاتی کیوں نہیں؟ کیا میں بتا دوں کہ تم نے خواب میں کیا دیکھا؟“

بیوی نے حیرت سے آپؒ کو دیکھا، پوچھا۔ ”کیا آپ میرے خواب سے واقف ہیں؟“

آپؒ نے فرمایا۔ ”ہاں، بحمد للہ تم نے خواب میں دیکھا کہ مشرق سے مغرب تک نور ہی نور پھیلا ہوا ہے پھر اس نور میں تم نے رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ آپؐ فرما رہے تھے کہ اس گھر میں جو لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام محمد معصوم رکھنا کیونکہ وہ عمر بھر معصوم رہے گا۔“

بیوی کے فرطِ خوشی سے آنسو آ گئے۔ بے اختیار کہا۔ ”واللہ آپ درست فرما رہے ہیں۔ میں نے خواب میں یہی کچھ دیکھا ہے جو آپ نے فرما رہے ہیں۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”بہرحال مبارک ہو، میں چند دن پہلے ذرا پریشان تھا اور یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ میں جو کام احیائے دین اور اصلاح ملت کے لیے انجام دے رہا ہوں، اس کو میرے بعد کون جاری رکھے گا لیکن اس خواب میں رسول اللہ ﷺ کی بشارت نے مجھ کو مطمئن کر دیا۔ میرا یہ بیٹا جو آنے والا ہے، میرے کام کو آگے بڑھائے گا اور اللہ نے چاہا تو قیوم ثانی ثابت ہوگا۔“

چنانچہ شوال 1007ھ کی 11 تاریخ کو اس گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا، والدین نے اس کا نام محمد معصوم رکھ دیا۔ چند دنوں کے بعد ہی سب کو یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ لڑکا غیر معمولی ہے۔ یہ بچہ رونا نہیں جانتا تھا، ہفتوں کے تجربے کے بعد یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بچے کے کپڑے بول و براز سے محفوظ رہتے ہیں۔ بچے کو برہنگی سے نفرت ہے اور حجاب کا یہ عالم ہے کہ اگر جسم سے کپڑا سرک جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی بچہ بھی سکڑ جاتا تھا اور جب تک اچھی طرح ستر پوشی نہ ہو جاتی بچہ پریشان اور سکڑا رہتا۔ بچہ دودھ پینے میں بے چینی یا بے صبرے پن کا ذرا بھی اظہار نہ کرتا اور اس وقت دودھ پیتا جب اسے دودھ پلایا جاتا۔

مجدد الف ثانیؒ اپنے بیٹے محمد معصوم پر بڑی توجہ دینے لگے، پیدائش کے بعد پہلی بار رمضان کا چاند دیکھا جا رہا تھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ چاند نظر آ جائے لیکن وہ نہیں نظر آیا۔ ناکامی نے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔ ان سب کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ ”کیا کل کا روزہ ہو جائے گا؟“

ان لوگوں کا ایک وفد مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں پہنچ گیا اور پوچھا۔ ”حضرت! کچھ ارشاد فرمائیے۔ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ فضا ابر آلود ہے اس لیے چاند نظر نہیں آئے گا پھر ہمیں یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ کل روزہ ہے یا نہیں؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”اگر میں اس بے چینی کا علاج کروں تو؟“

لوگوں نے کہا۔ ”پھر یہ کہ ہم سب آپ کے بندۂ بے دام ہو جائیں گے۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”آپ لوگ کل صبح روزہ رکھیں۔ میرے گھر میں جس ذات نے ظہور کیا ہے وہ معصوم ہے اور زندگی بھر معصوم رہے گا۔ کل صبح یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے دودھ پیا یا نہیں۔ چنانچہ اگر وہ دودھ پیے گا تو کل روزہ نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ دودھ نہیں پیے گا تو روزہ ہوگا۔“

لوگوں نے آپؒ کے فیصلے پر عمل کیا اور آپ کی ہدایت کے بموجب دوسرے دن روزہ رکھ لیا۔ مجدد الف ثانیؒ گھر میں اپنے بیٹے کی نگرانی فرماتے رہے چنانچہ نصف دن کی نگرانی نے یہ ثابت کر دیا کہ رمضان کا چاند ہو چکا ہے اور اس دن روزہ ہے۔ لوگوں نے روزے کی نیت پہلے ہی سے باندھ رکھی تھی جو برقرار رہی اور اللہ کے اس معصوم بندے نے لوگوں کو ایک روزے کے زیاں سے بچا لیا۔

☆☆☆

خواجہ معصوم نے تعلیم کی تحصیل کا آغاز کیا تو ان کے سامنے لائق فائق باپ تھا۔ مجدد الف ثانیؒ نے انہیں پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی آپ کی عمر صرف تین سال تھی کہ جوہر ذاتی و صفاتی کا ظہور ہونے لگا۔ چنانچہ اپنے بیٹے کے علو استعداد کو محسوس کر کے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے ایک خط میں یوں ذکر کیا۔

”اپنے فرزند محمد معصوم کے بارے میں کیا لکھوں، وہ خود اس دولت ولایت یعنی ولایت خاصۂ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی استعداد رکھتے ہیں۔ یہ اس کی علو استعداد کا تقاضا تھا کہ تین سال کی عمر ہی میں اس نے جامعیت استعداد و حقیقت تجلی ذاتی اور توحید میں لب کشائی کی اور کہنے لگا۔ میں آسمان ہوں، میں زمین ہوں، میں فلاں ہوں اور فلاں ہوں۔“

چوں زلیخا کز سپند آں تا بعود
نام جملہ چیز یوسف کردہ بود
(جیسا کہ زلیخا نے ہر چھوٹی بڑی چیز کا نام یوسف کر دیا تھا)

خواجہ معصوم نے سات سال تین ماہ میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ آپ کے آس پاس معتقدین میں معترضین بھی شامل تھے۔ وہ کبھی کبھی شک و شبے سے سوچتے رہتے کہ جب خواجہ معصوم پیدائشی ولی اور علو استعداد کے حامل ہیں تو یہ انہیں تحصیل علوم میں لگا دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ شک اور یہ اعتراض مجدد الف ثانیؒ کے باطن پر القا ہوا اور آپ نے انہیں جواب دیا۔ ”علم میدانِ حال ہے اس لیے اس کو حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔“ اس کے بعد خواجہ معصوم سے فرمایا۔ ”بیٹے! ان علوم کی تحصیل سے جلد از جلد فارغ ہو جاؤ ہم کو تم سے بڑے بڑے کام لینا ہیں۔“

خواجہ معصوم نے سات سال کی عمر اور تین ماہ کی مدت میں قرآن حفظ کیا اور گیارہ سال کی عمر میں دوسرے علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ 27 ذی الحجہ 1021ھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے خواجہ معصوم کی شادی اپنے ایک مرید اور خلیفہ میر صغیر احمد رومی کی صاحبزادی بی بی رقیہ سے کر دی۔

خواجہ معصوم تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد ہر وقت غور و فکر میں لگے رہتے۔ عبادت میں انہماک ایسا تھا کہ لوگ آپ کی بڑائی کے دل سے قائل ہونے لگے۔ اب خواجہ معصوم پر اسرار منکشف ہونے لگے تھے۔ وہ ذرے ذرے میں وہ کچھ دیکھنے لگے تھے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک دن فجر کی نماز پڑھ کر باہر جو نکلے تو انہیں آسمان سے زمین تک نور ہی نور دکھائی دیا۔ خواجہ معصوم نے اس نور کے منبع کا پتا چلانا چاہا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ یہ ہر چیز میں اس طرح پیوست تھا کہ یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ نور نے اشیا میں سرایت کیا ہے یا ان چیزوں سے خارج ہو رہا ہے؟ انہوں نے یہی نور انسانوں اور حیوانوں کے چہروں اور جسموں سے خارج ہوتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھا اور اسی کو درختوں اور ان کے پتوں میں سرایت کرتے دیکھا۔ انہیں یہ نور پتے پتے اور ذرے ذرے میں پیوست سرایت کیے ہوئے دکھائی دیا۔ اس منظر اور مشاہدے نے خواجہ معصوم کو حیران و پریشان کر دیا۔ آپ اپنے والد کے پاس پہنچے اور رک رک کر عرض کیا۔

''باوا جان! آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ خدا کے لیے بتایئے کہ آج کل میں کیا دیکھ رہا ہوں اور اس کا انجام کیا ہوگا۔''
باپ نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ''بیٹے! تو اپنے وقت کا قطب ہے، یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ تو میرا بیٹا ہے بلکہ اس لیے کہ مجھے ایسا بتایا گیا ہے اور واقعات اور مشاہدات اس کی گواہی دے رہے ہیں۔''

مجدد الف ثانیؒ کے مرید اور ارادت مند برابر یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ آپ اپنے بیٹے خواجہ معصوم کی بے حد عزت کرتے ہیں اور دونوں میں باپ بیٹے کا ادب و لحاظ نہیں پایا جاتا۔ اس دوران ایک دن یہ منظر بھی دیکھنے میں آ گیا کہ حجرے کے باہر خواجہ معصوم سو گئے۔ اس بستر پر مجدد الف ثانیؒ استراحت فرمایا کرتے تھے۔ وہ اندر ذکر و شغل میں مصروف تھے کچھ دیر بعد مجدد الف ثانیؒ کو آرام کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ حجرے سے باہر آ گئے۔ وہ اپنے بستر کے پاس جا کر ٹھٹکے اور وہاں اپنے بیٹے خواجہ معصوم کو محو استراحت پا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی اور یہ اندازہ لگا کر کہ وہ گہری نیند میں ہیں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ آپ کے چند مرید یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! کیا میں انہیں بیدار کر دوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ خود بیدار ہو جائیں گے۔''
مرید نے مایوسی سے عرض کیا۔ ''حضرت! آثار تو یہ نہیں کہتے۔ شاید یہ ابھی تو نہیں جاگیں گے۔''
آپ نے حجرے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم سچ کہہ رہے ہو۔ اگر یہ ابھی نہیں جاگیں گے تو میں بھی یہاں کیوں کھڑا رہوں۔ میں اپنے حجرے میں واپس جا رہا ہوں۔ پھر آ جاؤں گا۔''
مرید نے سکوت اختیار کیا اور آپ حجرے میں واپس چلے گئے۔ کافی دیر بعد آپ حجرے سے برآمد ہوئے اور اپنے بستر کی طرف بڑھے۔ لیکن یہاں خواجہ معصوم ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ اسی مرید نے آپ کے پاس جا کر عرض کیا۔
''حضرت! خواجہ معصوم تو ابھی تک بیدار نہیں ہوئے اور آپ ہمیں بے حد اداس اور فکر مند دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم آپ کی یہ اداسی دور کر سکتے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو ہم خواجہ معصوم کو جگا دیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ وہ خود بیدار ہو جائیں گے۔''
آپ کچھ دیر بیٹھ کر اپنے حجرے میں واپس چلے گئے۔
آخر کچھ دیر بعد تشریف لائے اور خواجہ معصوم کو بہ دستور سویا دیکھ کر مسکرا دیے، مرید نے ایک بار پھر جسارت کی اور عرض کیا۔ ''حضرت! اب تو میں جگائے بغیر نہیں رہوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''نہیں۔ اللہ کا ایک دوست سو رہا ہے، اس میں تمہیں مخل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''
اس بار مجدد الف ثانیؒ واپس نہیں گئے، وہیں دھوپ میں بیٹھ گئے۔ دھوپ کی تمازت نے فرش کو آگ کی طرح تپا دیا تھا۔ آپ کے مرید حیران تھے کہ ایک بزرگ باپ اپنے بیٹے کی اتنی عزت کیوں کر رہا ہے؟ آپ کشف سے ان کی کشمکش اور الجھن کو معلوم کر چکے تھے، فرمایا۔
''لوگو! جیسا کہ میں کچھ دیر پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ خدا کا دوست ہے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں خدا کے دوست... کو تکلیف پہنچاؤں...... خواجہ معصوم کا جو مرتبہ ہے اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ لیکن وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہیں جب لوگ میری ان باتوں کی تصدیق کریں گے۔''
انہی باتوں کے درمیان خواجہ معصوم کی آنکھ کھل گئی اور اپنے باپ کو دھوپ میں بیٹھا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ فوراً اُٹھے اور باپ کی طرف بڑھے مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا۔ ''معصوم! کیا بات ہے؟ تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟''
بیٹے نے خجالت سے جواب دیا۔ ''باوا جان! آپ نے مجھے بیدار کیوں نہیں کر دیا؟''
باپ نے کہا۔ ''میں اس لیے نہیں جگا سکا کہ کہیں اللہ تعالیٰ میرے اس فعل سے ناخوش نہ ہو جائے کیونکہ مجھے بار بار یہ بتایا گیا ہے کہ معصوم میرا دوست ہے، میں اللہ کے دوست کو جگانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔''
خواجہ معصوم نے پشیمانی سے کہا۔ ''باوا جان! آپ مجھ کو برابر شرمندہ کیے جا رہے ہیں۔ آپ ایسا نہ کیجیے۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''
بیٹے نے بستر خالی کر دیا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کچھ دیر کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔

☆☆☆

نصف رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ برابر کے حجرے میں خواجہ معصوم اپنے اللہ سے لو لگائے مصروف عبادت تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنے رب کے ذکر اور فکر میں گم تھے، آپ کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حجرے کے باہر کیا ہو رہا ہے۔
کچھ دیر بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ دنیا سے اتنے غافل ہو گئے کہ جو لوگ ان کے اس پاس تہجد پڑھ رہے تھے۔ آپ انہیں دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ آپ کو اپنے چاروں طرف ایک نور سا پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔ آپ کو اس نور نے اپنے احاطے میں لے لیا اور آپ خود کو ہلکا اور لطیف سا محسوس فرمانے لگے۔ پھر آپ کو یوں محسوس ہوا گویا آپ کے جسم سے لباس اتارا جا رہا ہے۔ آپ کو خوف محسوس ہوا اور دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اے کاش میرے جسم سے لباس نہ اتارا جائے لیکن یہ لباس اتار لیا گیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ایک دوسرا لباس پہنایا جانے لگا۔ یہ لباس پہلے لباس سے کسی طرح کم نہ تھا اور آپ کو اس نئے لباس میں اپنا قد کچھ زیادہ بڑا محسوس ہونے لگا۔ آپ نے نور کے ہالے میں اپنے اترے ہوئے۔ لباس کو دیکھنے کی کوشش کی وہ سامنے ہی رکھا ہوا تھا۔ آپ کو اپنے اترے ہوئے لباس سے انس و محبت باقی تھی اور یہی جی چاہتا تھا کہ یہ لباس بھی انہی کے پاس رہے۔
آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ آہستہ سے کہا۔ ''اے الہ العالمین یہ اترا ہوا لباس کیا مجھے نہیں مل سکتا؟''
یکا یک جواب ارشاد ہوا۔ ''کیوں نہیں؟ لیکن ایک جسم پر دو لباس زیب نہیں دیتے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''درست میرے رب! بجا ارشاد۔ اگر میرے جسم پر دو لباس مناسب نہیں رہیں گے تو کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ میرا یہ لباس میرے بیٹے معصوم کو مرحمت فرما دیا جائے۔''
جواب ملا۔ ''ایسا ممکن ہے اور نہ صرف ممکن بلکہ یہ لباس تیرے بیٹے معصوم ہی کے لیے اتارا گیا ہے۔ یہ لباس کیا ہے؟ یہ کس قسم کا لباس ہے؟ کچھ پتا ہے؟''
آپ نے فرمایا۔ ''ہر بات کا علم صرف تجھے حاصل ہے میں ضعیف انسان، میں کوئی دعویٰ کس طرح کر سکتا ہوں۔''
جواب ملا۔ ''شیخ احمد! تیرا یہ لباس تیرے جسم سے اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کو معصوم کے جسم پر ڈال دیا جائے، یہ لباس کیا ہے؟ کچھ معلوم ہے؟ یہ منصب قیومیت ہے اور اس کا تعلق تربیت و تکمیل سے ہے۔''
مجدد الف ثانیؒ کو اس خوش خبری نے بے حد خوش کر دیا اور آپ کے دل سے یہ تشویش دور ہو گئی کہ ان کے بعد ان کے کام کو جاری کون رکھے گا؟
1034ھ میں مجدد الف ثانیؒ کا وصال ہو گیا اور یکم ربیع الاول 1034ھ کو آپ نے ارشاد و قیومیت کی مسند سنبھالی۔ اس روز تقریباً پچاس ہزار افراد نے آپ سے بیعت کی اور ان میں دو ہزار وہ بزرگ بھی شامل تھے جنہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلفاء ہونے کا شرف حاصل تھا۔
حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وصال کی خبر شہنشاہ جہانگیر کو پہنچی تو وہ تعزیت کے لیے سرہند پہنچا اور خواجہ معصوم سے تعزیت کی۔
شاہجہاں ابھی بادشاہ نہیں بنا تھا کہ خواجہ معصوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت ہونے کی خواہش کی۔ آپ نے اسے بیعت کیا اور دنیا اور آخرت میں کامیابی اور سرخ روئی کی دعا دی۔ شاہجہاں کو خدشات تھے کہ محلاتی سازشیں اور امراء کی رقابتیں کہیں جہانگیر کو اس کی طرف سے بدظن نہ کر دیں اور باپ اس کی جگہ کسی اور کو نامزد کر دے۔ آپ نے شہزادہ خرم (شاہ جہاں) کو دعا دی اور خوش خبری سنائی کہ محلاتی سازشیں ضرور ہوں گی اور امراء کی مخالفتیں اور رقابتیں بھی جاری رہیں گی لیکن حکومت ہر حال میں اسی کو ملے گی۔
شاہجہاں خوش خوش اور مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔
1037ھ بروز اتوار، 27 صفر بوقت صبح (نومبر 1627ء) کو جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور نور جہاں نے اپنے داماد شہر یار کو برسر اقتدار لانے کی سرتوڑ کوشش کر ڈالی مگر شاہجہاں کے مقابلے میں ناکام رہی۔ آخر شاہ جہاں کامیاب ہوا اور شہاب الدین شاہجہاں کے نام سے مغل تاج و تخت کا مالک بنا۔ اس نے نظم و نسق پر قابو پاتے ہی خواجہ معصوم سے ملاقات کا اہتمام کیا اور نہایت ادب و احترام سے آپ کی خدمت میں حاضری دی۔ نئے بادشاہ نے آپ کے دونوں ہاتھوں کو مصافحے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد اپنے سینے پر رکھ لیا اور رقت زدہ لہجے میں درخواست کی۔
"مجھے آئندہ بھی آپ کی دست گیری درکار رہے گی، اس لیے کبھی چھوڑ نہ دیجیے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "شاہجہاں! میں تیرے حق میں دعا گو رہوں گا۔ لیکن تجھ کو بھی میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔"

بادشاہ نے عرض کیا۔ "بسر و چشم، میں ہر طرح حاضر ہوں۔ آپ ارشاد فرمائیے، بلکہ حکم دیجیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "خوب جانتا ہے کہ میرے والد بزرگوار سے تیرے مرحوم باپ کا ایک عرصہ تک اختلاف رہا ہے اور دونوں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ بعد میں تیرے باپ نے میرے والد مرحوم کی بہت ساری باتیں مان لیں۔ لیکن کچھ باتیں ایسی باقی رہ گئی تھیں جو نہیں مانی گئی تھیں۔ میرے والد اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے اور ان کی جگہ میں نے سنبھال لی ہے اس لیے میرا فرض ہے کہ میں اپنے والد مرحوم کے منصوبے کے بقیہ حصوں پر کام کروں اور انہیں ایک ایک کر کے پورا کروں۔"

شاہجہاں نے عاجزی سے عرض کیا۔ "حضور روشن ضمیر ہیں جو فرمائیں گے، اسے پورا کر دیا جائے گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "عرصے سے مسجدیں نہیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مساجد کی تعمیر شروع ہو جانا چاہیے۔"

شاہجہاں نے جواب دیا۔ "آپ کے حکم پر آج ہی عمل درآمد شروع ہو جائے گا اور فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "مساجد کے ساتھ مدرسوں کا قیام بہت ضروری ہے۔"

شاہجہاں نے جواب دیا۔ "اس پر بھی عمل ہو جائے گا اور کچھ؟"

آپ نے فرمایا "سکے پر کلمہ طیبہ کی مہر ہونی چاہیے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اس پر بھی کل ہی سے عمل شروع ہو جائے گا۔"

آپ نے مزید فرمایا۔ "علماء کے وظائف مقرر کیے جائیں کیونکہ یہ لوگ جتنے اہم ہوتے ہیں ان پر اتنی توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا کوئی مستقل علاج ہونا چاہیے۔"

بادشاہ نے خندہ پیشانی سے عرض کیا۔ "حضرت! میں نے آپ کو زبان دی ہے۔ ایک بادشاہ نے زبان دی ہے۔ آپ جو کچھ بھی چاہتے ہیں اس پر آپ کی مرضی اور خواہش کے مطابق عمل ہوگا۔ میں آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ میں اپنے والد مرحوم کے عہد کی بدعتوں کو دور کر دوں گا۔"

آپ نے شاہ جہاں کے حق میں دعا کی اور بادشاہ دعائیں لے کر اپنے محل میں واپس چلا گیا۔

آپ تبلیغ و تلقین کا کام اپنے بزرگ باپ کی طرح انجام دے رہے تھے۔ ہر طرف آپ ہی کا شہرہ تھا۔ اس دوران آپ کی والدہ بھی رحلت فرما گئیں۔ آپ پر اس سانحے کا گہرا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ آپ نے کئی دن تک کسی سے ملاقات تک نہیں کی، آپ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں مگر روتی آنکھوں سے دل کہیں زیادہ غمگین تھا۔ اس پر غم کا پہاڑ گر پڑا تھا اور یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ اس کو برداشت کر گئے تھے۔

جب دل کے زخم پر وقت نے مرہم رکھ دیا اور گھاؤ مندمل ہونے لگا تو آپ ایک بار پھر تندہی سے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی شہرت اور بزرگی کا نقش برصغیر کے ہر دل پر بیٹھ چکا تھا۔ ملک کے گوشوں سے آپ کی خدمت میں حاضری دینے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور آپ ان سب کے مضطرب دلوں کو سکون اور طمانیت سے بھر دیتے۔ ان آنے والوں میں ایک دن ایک مغل شہزادہ بھی شامل ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے سرہند کا سفر کیا اور راستے کی صعوبتیں جھیلتا ہوا آپ کے دروازے پر دستک دی، خادموں نے آپ کو مطلع کیا۔

"حضرت! شہزادہ محی الدین باریابی کا خواستگار ہے۔"

آپ کے چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ پوچھا۔ "شہزادہ محی الدین شاہ جہاں کا بیٹا اور جہانگیر کا پوتا محی الدین یعنی دین کو زندہ کرنے والا۔ بلاؤ۔ اس کو فوراً بلاؤ، ابھی اسی وقت، یہ تو بڑے کام کا نظر آتا ہے۔"

ایک خادم نے شہزادے کو خوش خبری سنائی۔ "شہزادے معلوم نہیں کیوں حضرت آپ سے بے خوش نظر آتے ہیں۔ آپ کو فوراً ہی یاد فرمایا ہے۔"

شہزادہ چپ چاپ اندر داخل ہوا اور السلام علیکم کہہ کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔

آپ نے شہزادے کو بہت غور سے دیکھا اور چہرے پر دیر تک نظریں جمائے رہے پھر فرمایا۔ "محی الدین! میں تیری

پیشانی میں ایک ایسی چمک دیکھ رہا ہوں جو کم ہی کسی کی پیشانی میں دیکھی گئی ہے۔"

شہزادے نے کہا۔ "قبلہ! میں تو آپ کی خدمت میں بیعت اور دعاؤں کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ واقعی ولی ہیں تو آپ کشف کی مدد سے یہ بتا دیں کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

آپ نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر یوں ہی چپ بیٹھے رہے پھر فرمایا۔ "غیب کا علم صرف خدا کو ہے، ہم لوگ تو صرف اندازے اور قیاس سے دوسروں کا حال بتاتے رہے ہیں یا پھر وہاں لب وا کیے ہیں جہاں ہونٹوں کو حرکت دینے کی اجازت دے دی گئی ہے۔"

شہزادے نے عاجزی سے کہا۔ "حضرت! میں کیا کر سکتا ہوں، میں تو محض آپ کی مدد اور تائید کے بل بوتے پر قدم اٹھا سکتا ہوں ورنہ میری کیا مجال کہ آپ کے روبرو یوں گستاخی سے بات کروں۔"

آپ نے شہزادے کو روک لیا اور فرمایا۔ "کیا بات ہے شہزادے، تم چپ کیوں ہو گئے۔ کہو کہو، آگے کہو۔"

شہزادے نے رک رک کر کہا۔ "حضرت! میں حکومت نہیں چاہتا لیکن میں ملک میں دین کا احیا ضرور چاہتا ہوں۔"

آپ نے آہستہ سے فرمایا۔ "سبحان اللہ! اللہ تیری عمر اور دولت و اقبال میں برکت دے۔"

شہزادہ اپنی کہتا رہا۔ "اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مغل تاج و تخت کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں نہ چلا جائے جو علم تو بہت زیادہ رکھتا ہو لیکن اسلام کی صحبت اور محبت سے محروم ہو۔ اگر کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں مغل حکومت چلی گئی تو اس ملک کا اور اس ملک میں اسلام کا کیا بنے گا؟"

آپ نے مسکرا کر بڑی محبت سے فرمایا۔ "جس ملک میں.... محی الدین موجود ہو وہاں اسلام اور تاج و تخت کو کوئی خطرہ نہیں۔ تو تیار رہ اس دن کے لیے جب مشیت ایزدی تیرے کاندھوں پر اہم ترین بوجھ ڈال دے۔"

شہزادہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ آہستہ سے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ کو تاج و تخت کی بشارت دے رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، تاج و تخت کی بشارت بھی اور دین کی سرداری کی نوید بھی۔ خدا کو تجھ سے کئی کام لینا ہیں۔ جا وقت کا انتظار کر اور چوکس اور مستعد رہ، معلوم نہیں کب اور کس وقت دین اور دنیا دونوں ہی تیرے دروازے پر دستک دیں اور تو ان کی دستک نہ سن سکے۔"

شہزادے نے پوچھا۔ "کیا سچ؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میں نہیں کہہ رہا مجھ سے یہ سب کچھ کہلوایا جا رہا ہے اور یہ کون کہلوا رہا ہے؟ خود ہی سمجھ لے اور دستک کا منتظر رہ۔"

شہزادے نے کہا۔ "کیا میں مرید ہوئے بغیر ہی واپس چلا جاؤں؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "جا، میں نے تجھے مرید کیا۔"

شہزادہ واپس مڑا ہی تھا کہ ایک زنانہ سواری بھی اندر داخل ہوئی۔ شہزادے نے اس معزز خاتون کو پہچان لیا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔

"روشن آرا بہن! کہو کیسے آنا ہوا؟"

بہن بھی اپنے بھائی کو آپ کے حجرے میں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ سٹپٹا گئی تھی، اس نے پوچھا۔ "بھائی، یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

بھائی نے جواب دیا۔ "بہن یہ وہ آستانہ ہے جس نے مغل تاج و تخت کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ اصل حکومت اس آستانے میں ہے، باہر جو کچھ ہے اس کے زیر اثر، اس آستانے کے فیض سے۔"

بہن نے شوخی سے بھائی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ "بھائی تمہیں یہاں سے کیا ملا؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "دین اور دنیا کی بشارتیں، نویدیں، خوشخبریاں۔ حضرت نے فرمایا ہے کہ عنقریب میرے در پر دین اور دنیا ایک ساتھ حاضر ہوں گی اور وہ دونوں ہی ایک ساتھ میرا دروازہ بھی کھٹکھٹائیں گی، دستک دیں گی۔ اس کے بعد جب میں لبیک کہہ چکا ہوں گا تو پھر یہاں میرے ہاتھوں دین کا احیا ہوگا اور اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا تو گویا دین اور دنیا کی سعادتیں میرے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔"

روشن آرا نے کہا۔ "اچھا آپ کو جو کچھ لینا تھا، لے چکے جو کچھ ملنا تھا مل گیا، اب مجھ کو جانے دیجیے کچھ میں بھی حاصل کر لوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھائی نے بہن کو اندر جانے دیا اور روشن آرا بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی۔

☆☆☆

آپؒ نے حج بیت اللہ کا قصد کیا اور بہت سے عزیزوں اور ارادت مندوں کو لے کر براستہ سورت بندر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ آپ سفر کی صعوبتوں کو شوق وافر سے زیر کرتے ہوئے مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے۔ آپؒ نے یہاں کچھ اور ہی سماں دیکھا۔ یہاں ہر طرف دور دور تک ہر شے ایک روح پرور اور جاں افزا نور میں گم نظر آئی۔ یہ نور آپ کے دل میں پیوست ہو گیا۔ آپ اس نور میں انوار الٰہی سے مشابہت محسوس کر رہے تھے۔ آپ نے عاجزی سے اپنے رب سے رجوع کیا۔ ”یا الٰہی! میں عاجز و ناتواں انسان جو بنیادی طور پر ضعیف البنیا کہلاتا ہے۔ بتا تو سہی کہ یہ نور جو یہاں کی ہر چیز میں جاری و ساری نظر آتا ہے کیا تیرا نور ہے؟ سوال اور شبہ یوں پیدا ہوتا ہے کہ اس نور میں تیرے انوار کی مشابہت تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن یہ اس کے علاوہ بھی محسوس ہوتا ہے۔“

اس سوال کے کچھ دیر بعد آپ کو جواب القا ہو گیا۔ ”اے میرے معصوم بندے، اس وقت تو کہاں آیا ہوا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ دیارِ نبی ﷺ میں، مولدِ نبوی ﷺ میں۔“

بشکل القا وضاحت ہوئی۔ ”یہ انوارِ نبویہ ﷺ ہے۔ یہاں کی ہر شے انوارِ نبویہ ﷺ میں گم ہے۔“

آپؒ نے درود کا ورد شروع کر دیا اور بتدریج یوں محسوس کیا گویا انوارِ نبویہ ﷺ نے آپ کو اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ آپ نے منیٰ میں قیام فرمایا تو حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔ آپؒ پر استغراق اور وجد نے غلبہ کیا اور وفورِ شوق میں آپؒ اپنے آپ میں نہیں رہے۔ اس وقت آپ کا ہر عضو حمد و درود میں مشغول تھا۔

منیٰ کے بعد آپ گیارہویں ذی الحجہ کو طواف کعبہ اور زیارت کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ آپؒ وفورِ شوق میں کعبے کے چاروں طرف پھرنے لگے۔ یہاں آپ نے ایک ایسا عجیب و غریب اور ماورائے عقل منظر دیکھا کہ ششدر رہ گئے۔ آپؒ کے آگے پیچھے نہایت حسین و جمیل عورتیں بھی طواف کعبہ میں مشغول تھیں۔ اور ان عورتوں میں مرد بھی شامل تھے۔ اور یہ بھی سب کے سب بہت ہی حسین تھے۔ آپؒ نے ان کے اشتیاق کا اپنے شوق سے موازنہ کیا تو مختلف نظر آیا۔ آپ کو حیرت تو یہ تھی کہ طواف کعبہ میں ان کی دنیا کے اور لوگ بھی شریک تھے۔ لیکن ان حسین و جمیل مردوں اور عورتوں کا وجود انسانوں سے الگ ہی نظر آتا تھا۔ پھر اس منظر نے آپؒ کو حیرت زدہ کر دیا کہ ان عورتوں اور مردوں کے قد بڑھ گئے اور ان کے ساتھ ہی کعبے کا قد بھی اونچا ہو گیا۔ پھر ان حسین و جمیل طویل القامت مردوں اور عورتوں نے کعبہ کو اپنی آغوش میں لے کر بوسے دیے اور کعبہ ان کی طرف یوں کھنچا گویا اسے مقناطیس کھینچ رہا ہو۔

آپؒ نے ایک بار پھر اپنے رب سے سوال کیا۔ ”خدایا! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟ میں تیرے اشارے کے بغیر اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

بصورت القا جواب ملا۔ ”اے میرے معصوم اور پاک بندے! یہ مرد میرے فرشتے اور عورتیں حوریں ہیں۔ یہ سب بھی کعبے کی زیارت و طواف کی خاطر یہاں کی حاضری دیا کرتے ہیں اور ان کے اور انسانی اشتیاق میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ کعبہ ان کے لیے اونچا اور لمبا ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے قد بھی اونچے اور لمبے ہیں۔ پھر یہ جس شوق اور وجد میں کعبے کو اپنی آغوش میں لے کر بوسے دیتے اور چومتے ہیں اس شوق اور وجد میں کعبہ بھی ان سے ہم آغوش ہو کر چومتا اور بوسے دیتا ہے۔“

آپ بے اختیار ہو گئے اور عجز و انکسار سے درخواست کی۔ ”یا الٰہی، میں تیرا عاجز و عاصی بندہ جس کو تو نے پاک اور معصوم کہا، کیا میں اپنے شوق اور وجد کا یوں اظہار نہیں کر سکتا جس طرح تیرے فرشتے اور حوریں کر رہے ہیں۔ میں کعبے کو اپنی آغوش میں لینے کا خواہش مند ہوں اور اے کاش یہ مجھے اپنے آغوش میں لے سکتا۔“

آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور گریہ وزاری نے آپ کے دل و دماغ کو ہلا دیا۔ طواف جاری تھا اور فرشتوں اور حوروں کے مرتبے اور اعزاز سے پیدا ہونے والے بشری رشک نے آپ کو غمزدہ اور متاسف کر رکھا تھا۔ اچانک آپ نے اپنے قد کو بڑھتا ہوا محسوس کیا اور یہ قد آہستہ آہستہ بڑھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے فرشتوں اور حوروں سے بھی اونچا ہو گیا۔ آپؒ حیرت سے اپنے قدموں میں پھیلے ہوئے انسانی ہجوم کو دیکھ رہے تھے۔ پھر آپؒ نے کعبہ کو بھی اونچا ہوتا ہوا محسوس کیا اور یہ بھی اتنا اونچا ہو گیا کہ بالکل آپؒ کے برابر آ گیا، آپؒ نے بے اختیار اللہ کے گھر کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اس طرح چومنے لگے گویا ان کا محبوب ہم آغوش ہو اور وہ اسے بوسے دے رہے ہوں۔

آپؒ نے اپنے اس اعزاز اور مرتبے کی خوشی اور شکرانے میں نمازیں پڑھیں اور سربسجود ہو کر الطاف کریمانہ اور نوازش ربی کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ آپ کو حیرت تھی کہ دوسرے انسانوں کے قد کتنے چھوٹے اور کوتاہ ہیں۔ کچھ دیر تک سربسجود رہے اور اپنے رب کی تسبیح و تہلیل کرتے رہے۔

اس کے بعد آپؒ نے عرفات جانے کے ارادے سے کوچ کیا اور وہاں پہنچ کر مسجد خیف میں نماز ادا کی۔ اس مسجد میں وہ قبہ بھی ہے جس کے نزدیک رسول مقبول ﷺ نے اپنا خیمہ نصب فرمایا۔ آپ نے اس مسجد میں تھوڑی دیر قیام کیا اور پھر اس مینار میں تشریف لے گئے جس کے نیچے حضرت آدم علیہ السلام کی قبر ہے۔ اسی میں آپ نے تمام چیزوں کو انوار میں مستغرق ہوتے دیکھا اور آپ کو بتایا گیا کہ ابھی ابھی رسول ﷺ کا بڑے کروفر سے گزر ہوا ہے۔

آپؒ نے ربیع الاول میں مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا۔ دورانِ سفر آپؒ کی بے چینی اور شوق کی فراوانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آپ راستے بھر چپے چپے میں رسول مقبول ﷺ کے آثار تلاش کرتے رہے۔ آپؒ ذرے ذرے میں رسول اللہ ﷺ کے قدموں سے مس ہونے کا اثر محسوس کر رہے تھے۔ یہ سوچ سوچ کر آپؒ کا دل بھر آتا اور آنکھیں نم ہو جاتیں کہ انہی راستوں پر صدیوں پہلے رسول اللہ ﷺ بھی سفر کر چکے ہیں۔ آپؒ نے راستے میں ٹوٹی پھوٹی قبروں کے آثار دیکھے اور قیاس سے یہ سمجھنے میں کامیاب ہو گئے کہ یہ قبریں ضرور رسول اللہ ﷺ کے صحابیوںؓ کی ہوں گی۔ آپؒ نے انہیں فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب پہنچایا۔

اس طرح جب آپؒ مدینہ کے قریب پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ آپ نے وہ رات مدینہ کے باہر ہی گزاری اور...... یہاں بھی انوارِ نبویہ ﷺ کی فراوانی محسوس کی۔ آپؒ کے شوق اور اضطراب میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ رات آپؒ نے باہر ہی گزاری اور دوسرے دن صبح شہر میں داخل ہو گئے۔ آپؒ دیوانہ وار رسول اللہ ﷺ کے مزار مبارک پر تشریف لے گئے اور وہاں اتنا روئے، اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ روتے روتے ایک دم سنبھلے اور سامنے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر آپؒ نے تبسم فرمایا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔

”لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ رسول اللہ ﷺ مجھ سے بغل گیر ہوئے ہیں تو تم کیا کہو گے؟“

آپؒ کے ساتھی نے جواب دیا۔ ”آپ منجانب اللہ معصوم ہیں اس لیے میں آپ کی بات پر یقین کر لوں گا۔“

آپؒ نے فرمایا۔ ”تب پھر اے میرے ساتھیو! تم یقین کر لو کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو بغل گیری کا شرف بخشا ہے۔“

پھر اسی دن شام کو آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”لوگو! آج میں جنت البقیع گیا تھا وہاں میں نے حضرت عثمانؓ اور حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی اور یہ دونوں مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔“

آپؒ نے وہاں کی حکومت سے روضۂ ﷺ کے اندر جانے کی اجازت مانگی جو دے دی گئی۔ جب آپ روضہ ﷺ کے اندر تشریف لے گئے تو وہاں ان پر بے خودی طاری ہو گئی اور آپؒ نے ایک طویل مراقبہ کیا اور اس مراقبے میں آپ نے محسوس کیا کہ ان کے جسم پر ایک نورانی خلعت ڈال دی گئی۔ آپ کے علم و فضل اور تقدس و پرہیزگاری کا بڑا چرچا تھا اور آپ ان باتوں کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ آپ کی کسی بات سے تقوے اور پرہیزگاری کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ آپؒ نے یہاں ایک شب اور دو دن اعتکاف فرمایا۔

آپ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس ہوئے۔ راستے میں آپ کو وجع المفاصل کا عارضہ لاحق ہو گیا، تکلیف کی شدت سے آپ بے حد پریشان ہوئے اور اللہ اللہ کا ورد فرماتے رہے۔ آخر اس میں حیرت انگیز طور پر افاقہ ہو گیا اور آپ نے کراہنا بند کر دیا۔ آپ کے ساتھیوں کو حیرت ہوئی اور پوچھا۔ ”حضرت! آپؒ نے وجع المفاصل کی کوئی دوا بھی نہیں کھائی پھر یہ افاقہ کیونکر ہوا؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا، میں نے عالم رؤیا میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو یہ فرماتے سنا کہ شیخ احمد سرہندی کے بیٹے خواجہ معصومؒ اللہ تیری تکلیف دور کرے گا چنانچہ اس کے بعد سے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

آپؒ نے 1067ھ میں سفرِ حج اختیار کیا تھا اور 1069ھ میں وطن مراجعت کی۔ اس عرصے میں ہندوستان میں خانہ جنگیاں شروع ہو چکی تھیں۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب آپس میں دست بہ گریباں تھے اور آخر میں اورنگ زیب کامیاب ہوا اور دارا شکوہ نے ہزیمت اٹھائی۔

اورنگ زیب کو آپؒ کی واپسی کی اطلاع ملی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے حکم دیا کہ ہندوستان کے تمام علماء اور مشائخ اور امراء آپؒ کے استقبال کو پہنچیں۔ جگہ جگہ استقبال اور ضیافت کے لوازمات مہیا کر دیے گئے اور عوام اور خواص اس طرح

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوشی کا اظہار کر رہے تھے گویا عید منائی جا رہی ہو۔

آپؒ نے وطن پہنچ کر رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔ آپؒ کے معتقدین اور مریدین میں بے پناہ اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور آپ سے کرامات کا ظہور ہونے لگا۔

آپؒ کے ایک خلیفہ خواجہ محمد صدیق پشاوری پر حال کا شدید غلبہ ہوا اور وہ جنگل کی طرف نکل گئے۔ وہ بڑی دیر تک ادھر ادھر پھرتے رہے، انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ آخر انہیں پیاس نے ستانا شروع کر دیا۔ اب جو خواجہ صدیق کو پانی کی خواہش ہوئی تو انہوں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور یہ جان کر خوفزدہ ہو گئے کہ آبادی کا کوسوں پتا نہ تھا۔ پیاس کی شدت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا۔ یہ پریشان حال پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ لیکن پانی کا کہیں پتا نہ تھا۔ واپسی کا ارادہ کیا تو پیاس نے پاؤں پکڑ لیے اور یہ تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ شام قریب تھی اور پانی کے بغیر سفر ناممکن تھا۔ آخر یہ سوچ کر دل بھر آیا کہ میں تو خواجہ معصومؒ کے وعظ سے متاثر ہو کر ادھر آ گیا تھا اس لیے یہ مشکل بھی انہی کو حل کرنا چاہیے۔

خواجہ صدیق پشاوری نے بے اختیار کہا۔ ”خواجہ معصومؒ! خدا سے سفارش فرمایے ورنہ میں یہاں سے نکل نہ سکوں گا۔“

وہ یہ التجا کر رہے تھے اور روتے جا رہے تھے۔ اس عالم میں ان کی نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں۔ انہوں نے اپنے سامنے خواجہ معصومؒ کو دیکھا تو محبت عود کر آئی اور یہ پیاس کو بھلا کر خواجہ معصومؒ کی طرف دوڑ پڑے۔ خواجہ صدیق کی نظریں اپنے پیر و مرشد پر گڑی ہوئی تھیں اور انہیں ایسا لگا گویا خواجہ معصومؒ انہیں ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلا رہے ہیں، خواجہ صدیق جب ان کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیر و مرشد وہم کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ انہوں نے خواجہ معصومؒ کو ایک درخت کی آڑ میں جا کر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہاں پانی کا چشمہ لہریں لے رہا ہے۔ خواجہ صدیق نے اپنی پیاس بجھائی اور نہایت ذوق و شوق سے مراجعت کی۔

☆☆☆

ایک دن آپ نے باتیں کرتے کرتے اچانک ایک شخص سے کہا۔ ”ذرا جانا تو میرے خادم کو بلا کر لاؤ۔“

مرید نے پوچھا۔ ”حضرت! آپؒ کا خادم کہاں رہتا ہے؟“

آپ نے خادم کا پتا بتایا، کہا۔ ”اسے فوراً بلاؤ، وہ بہت زیادہ پریشان ہے۔“

مرید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”حضرت! یہ اچانک آپ کو اپنے خادم کی پریشانی کا خیال کیونکر آ گیا؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”وہ پریشانی بھی ابھی ابھی اسی وقت اس کو لاحق ہوئی ہے۔“

مرید نے آپؒ کے حکم کی تعمیل کی اور خادم کو بلانے چلا گیا۔ خادم کا مکان زیادہ دور نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آپؒ کے سامنے حاضر کر دیا گیا۔ آپ نے خادم کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور پوچھا۔ ”کیوں میاں، خیریت تو ہے؟“

خادم نے جواب دیا۔ ”حضرت! بالکل خیریت سے ہوں۔ بس آپؒ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔“

آپؒ نے فرمایا۔ ”میں تجھ سے غافل نہیں رہتا۔ اس وقت بھی غافل نہیں ہوں۔“

خادم نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولنا چاہی مگر آپؒ نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کا حکم دیا اور فرمایا۔ ”بھائی خاموش رہ، کچھ دیر خاموش رہ۔“

خادم چپ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد آپؒ کی خدمت میں کہیں سے آموں کے ٹوکرے آ گئے۔ آپ نے ٹوکرے میں سے دس آم نکال کر خادم کی طرف بڑھا دیے، فرمایا۔ ”یہ تیرا حصہ ہے۔“

خادم نے انہیں اپنے سامنے رکھ لیا۔ آپ نے مزید دس آم نکال کر خادم کے آموں میں شامل کر دیے، فرمایا۔ ”یہ دس آم تیرے ایک مہمان کے لیے ہیں۔“

پھر دس آم اور بڑھا دیے اور فرمایا۔ ”یہ تیرے دوسرے مہمان کے لیے ہیں۔“

اسی طرح آپ نے اپنے خادم کو چالیس آم اور دیے اور جب چھ مہمانوں کے ساتھ آم دے چکے تو فرمایا۔ ”مجھ کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ تیرے گھر میں چھ مہمان آ گئے ہیں اور ان کی تواضع کے لیے تیرے گھر میں کچھ نہیں تو میں پریشان ہو گیا اور میں نے اپنے مرید کے ذریعے تجھ کو بلا لیا۔“

خادم پر رقت طاری ہو گئی اور سر جھکا کے رونے لگا۔

آپؒ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنی جیب سے چھ اشرفیاں نکال کر اس کے حوالے کیں، فرمایا۔ ”میں تجھے اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ جب بھی تجھ کو ضرورت ہو مجھ سے لے جا۔“

مرید یہ باتیں سن رہا تھا۔ چند دنوں تک تو وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد ایک دن تخلیے میں عرض کیا۔ ”حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو بندہ کچھ عرض کرے۔“

آپؒ نے ملائمت سے فرمایا۔ ”اجازت ہے، عرض کر۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپؒ نے ایک دن اپنے خادم سے فرمایا تھا کہ آپ اس کو اپنا فرزند سمجھتے ہیں۔ کیا آپ اپنے مریدوں کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

مرید نے عرض کیا۔ ”آپ نے اپنے خادم کی بڑی دل جوئی فرمائی تھی اور اس کی حاجتیں بھی پوری کر دی تھیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تجھے جو کہنا ہے کہہ دے۔“

مرید نے درخواست کی۔ ”حضرتؒ! میں ایک پریشان حال شخص ہوں۔ عسرت اور تنگی نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ میں تو کبھی کبھی موت کی خواہش کرنے لگتا ہوں۔ زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔“

آپؒ نے دریافت کیا۔ ”عسرت اور تنگی کے علاوہ بھی تجھ پر کوئی افتاد آ پڑی ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن عسرت اور تنگی ہی وہ سب سے بڑی افتاد ہیں جنہوں نے مجھ سے زندگی کا مزہ چھین لیا ہے، میں ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

آپؒ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے اور پھر چند ثانیوں کے بعد فرمایا۔ ”کون سی دولت درکار ہے، دینی یا دنیاوی؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”مجھ کو دونوں ہی درکار ہیں۔ دینی بھی اور دنیاوی بھی۔“

آپؒ نے مسکرا کر ارشاد فرمایا۔ ”عجیب بے تکا ارمان پیدا کیا ہے تو نے اپنے دل میں، دنیا بھی اور دین بھی۔ یعنی تو دو گھوڑوں کی سواری کرنا چاہتا ہے۔ تو بیک وقت دو کشتیوں میں بیٹھنا چاہتا ہے۔ لیکن سوچ تو سہی کہ کیا ایسا ممکن ہے یا ایسا محال ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں نہیں جانتا کہ کیا محال ہے اور کیا آسان لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ آپؒ کے لیے کوئی بات بھی محال نہیں۔ ہر بات آسان اور ممکن ہے میں دین اور دنیا کی دولتیں ایک ساتھ چاہتا ہوں۔“

آپؒ ایک بار پھر مراقبے میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد ہوش میں آ کر ارشاد فرمایا۔ ”جا تجھ کو دولت دنیا بھی عطا ہوئی اور دولت دین بھی لیکن ذرا احتیاط اور انصاف سے کام لینا۔“

مرید خوشی خوشی چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ہی لوگوں نے اس مرید کو تونگروں میں دیکھا اور دوسری طرف اس کا شمار اہل اللہ میں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

آپؒ کی کرامات کا چرچا ہر طرف ہو رہا تھا۔ ناکاموں اور مایوسوں نے آپؒ کو گھیرنا شروع کر دیا۔ آپ کا در ہر ایک پر کھلا تھا۔ جو چاہتا آتا اور امیدیں پوری کر کے واپس جاتا۔ اس دوران آپ کا ایک دوسرا مرید آشوب چشم میں مبتلا ہو گیا۔ وہ راتوں کو چیختا چلاتا رہتا۔ آپؒ نے اس سے فرمایا:

”بھائی! تو اپنا علاج کیوں نہیں کراتا؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”میں اپنا علاج کرانا تو چاہتا ہوں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے کراؤں اپنا علاج؟“

آپ نے ایک طبیب کا نام لے کر حکم دیا۔ ”تو اس سے اپنی آنکھوں کا علاج کرا۔ اللہ نے چاہا تو شفا ضرور ہو گی۔“

مرید سیدھا اس طبیب کے پاس پہنچا جس کا آپ نے نام لیا تھا۔ اس نے مرید کی آنکھیں نہایت توجہ سے دیکھیں اور کہا۔

”میں جو کچھ تجھے دوں گا۔ اس سے تجھے یقیناً فائدہ پہنچے گا اور تیری آنکھیں بالکل درست ہو جائیں گی۔“

مرید نے معالج کا سامان سمیٹا اور سیدھا آپ کی خدمت میں پہنچا۔ پہلے تو اس نے طبیب کی بڑی تعریف کی، اس کی دوا کی تعریفیں کرنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”پیر و مرشد یہ دوا جو میں لایا ہوں، حکیم صاحب کے بقول یہ ایسی دوا ہے کہ اس کی پہلی خوراک ہی اتنا کام کر جائے گی کہ تم اس کے فائدے کا تصور تک نہ کر سکو گے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ نے مرید سے دریافت فرمایا۔ ”اے خدا کے بندے! ذرا یہ تو بتا کہ طبیب نے تجھے دوا دی ہے یا خدا نے؟“ مرید کے لیے یہ عجیب و غریب سوال تھا، بولا۔ ”حضرت! یہ کیا سوال کر دیا آپ نے؟ مجھ کو دوا تو طبیب نے دی ہے۔ خدا کس طرح دوا دے گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو دوا کی جو تعریفیں کر رہا ہے اس سے مجھ کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ دوا شاید تو خدا سے لایا ہے کہ تجھے اس کے مفید اثرات پر اتنا زبردست یقین ہے۔“

مرید کو آپ کی بات ناگوار گزری، بولا۔ ”حضرت! آپ ہی نے تو مجھ کو اس طبیب کے پاس بھیجا تھا اور اب آپ ہی دوا کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ نہیں آ رہی۔“

آپؒ نے فرمایا۔ ”اچھا پہلے تو دوا استعمال کر، اس کے بعد میری ہر بات تیری سمجھ میں آ جائے گی۔“

مرید نے دوا کی سلائیاں دونوں آنکھوں میں پھر لیں۔ دوا اتنی تیز تھی جیسے آنکھوں میں نمک مرچ بھر دیا گیا ہو۔ رونے اور چیخنے چلانے لگا۔

آپؒ نے اسے تسلی دی۔ ”صبر کر صبر، پریشان نہ ہو۔“

مرید کا حال بہت برا تھا۔ کئی گھنٹے بعد اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کی دونوں آنکھیں بینائی سے محروم ہو چکی ہیں۔ ٹٹول کر ادھر ادھر آنے جانے لگا۔

آپؒ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، یہ تجھ کو کیا ہو گیا؟“

مرید نے رو کر عرض کیا۔ ”حضرت! مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں اندھا ہو چکا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیوں؟ کیا تیری دوا نے اپنا اثر نہیں دکھایا؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”حضرت! خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے اور میرا مذاق نہ اڑائیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں تیرا مذاق نہیں اڑا رہا۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جس مفید دوا کے اثرات پر تو استعمال سے پہلے ہی ایمان لے آیا تھا اس نے یہ الٹا اثر کیوں دکھایا؟“

مرید ٹٹولتا ہوا آپؒ کی طرف بڑھا اور آپ کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا، بولا۔ ”یہ پاؤں اس وقت تک میرے ہاتھوں میں رہیں گے جب تک آپ میری بینائی واپس نہیں کر دیں گے۔“

آپؒ کو اس پر رحم آ گیا۔ فرمایا۔ ”دوا کی تاثیر پر مجھے کوئی شبہ نہیں، اور نہ کر سکتا ہوں۔ مگر تجھ کو یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ دوا میں تاثیر کون پیدا کرتا ہے، اللہ اور صرف اللہ۔ چنانچہ تو نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ جس اللہ نے دوا کو تاثیر بخشی تھی۔ اس نے اس تاثیر کو چھین کر اس میں زہر کا اثر پیدا کر دیا۔ اب اس کا ایک ہی علاج ہے۔“

مرید نے تلملا کر پوچھا۔ ”کون سا علاج؟ میں اس علاج کے لیے تیار ہوں۔“

آپؒ نے مرید کے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کی۔ ”الٰہ العالمین! ہم سب تیرے عاجز و گناہگار بندے ہیں۔ تو جس بندے سے جو کام چاہے لے لے اور آئندہ لے سکتا ہے......“

مرید نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کا میری آنکھوں سے کیا تعلق ہے؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”او بے صبرے انسان صبر سے کام لے، درمیان میں دخل نہ دے۔“

مرید خاموش ہو گیا۔

آپ پھر گویا ہوئے۔ ”اے میرے مالک! مجھے تجھ پر بڑا ناز ہے میں خوب جانتا ہوں کہ تو جو چاہے کر دے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو جلا دیا کرتے تھے۔ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکالا، تو جو چاہے کرے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ اب اس تمہید کے بعد میں عاجزی اور انکسار سے مناجات کر رہا ہوں کہ تو میرے اس مرید کی دونوں آنکھیں بینا کر دے۔“

آپؒ یہ فرما رہے تھے کہ اچانک آپؒ کے دل پر القا ہوا۔ ”خواجہ معصومؒ! اس کی دونوں آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگا دیں۔ اس سے مرید کی دونوں آنکھیں دوبارہ بینا ہو جائیں گی۔“

آپؒ نے اپنے مرید کی دونوں آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگا دیا جس سے کچھ ہی دیر بعد اس کی بصارت واپس آ گئی۔ اور وہ ہکا بکا اپنے گرد و پیش کی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا اور آخر میں بے اختیار سجدے میں گر کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

☆☆☆

آپؒ کو بتایا گیا کہ ایک ہندو جوگی آگ کو باندھ دیتا ہے جس سے آگ غیر مضر ہو جاتی ہے اور لوگ آگ میں گھس بھی جائیں تو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتی۔ اس ہندو جوگی نے اپنے اس شعبدے سے بہتوں کو اپنا معتقد بنا لیا ہے۔

آپؒ نے اطلاع دینے والے شخص سے کہا۔ ”کیا تم مجھے اس جگہ پہنچا سکتے ہو جہاں ہندو جوگی یہ شعبدہ دکھاتا ہے؟“

جواب ملا۔ ”کیوں نہیں جب آپ فرمائیں۔“

دو دن بعد آپ اپنے مریدوں کو ساتھ لے کر اس جگہ پہنچ گئے آپؒ نے ہندو جوگی کو دیکھا اور پوچھا۔ ”تو لوگوں کو کیوں گمراہ کر رہا ہے؟“

جوگی نے جواب دیا۔ ”اگر میں لوگوں کو گمراہ کر رہا ہوں تو مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا ہے جو آگ کے جلانے کے اثرات کو زائل کر دے اور چھونے والا اس کے گزند سے محفوظ رہے۔“

آپؒ نے فرمایا۔ ”یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آگ سے اس کی حدت اور شدت کو زائل کر دینے سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ تو ایک معمولی سا کام ہے۔“

جوگی نے کہا۔ ”آپ اس کو معمولی سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو آپ کر کے دکھائیے۔“

آپؒ نے فرمایا۔ ”تو تو آگ کو باندھ دینے کے بعد محض چھو کر ہی دکھاتا ہے۔ میں تجھے اس سے زیادہ ہی کچھ دکھا دوں گا۔“

اس کے بعد آپؒ نے حکم دیا۔ ”یہاں بہت بڑا الاؤ روشن کیا جائے۔“

آپؒ کے مریدوں نے لکڑیاں جمع کرنا شروع کر دیں اور جب لکڑیوں کا انبار لگ گیا تو آپ نے اس میں آگ لگوا دی۔ ذرا سی دیر میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ آپؒ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ ”میں اس پر آیت کریمہ سے دم کرتا ہوں، تو اس میں قرآن پاک لے کر داخل ہو جائے گا اور وہاں بیٹھ کر تلاوت کرے گا۔ اس وقت تک جب تک کہ میں باہر نکلنے کا حکم نہ دوں۔“

جوگی، اس کے پرستار، ہندو اور مسلمان سبھی جمع ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

آپؒ نے آہستہ آہستہ آیت کریمہ کا ورد کیا اور آگ پر دم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد آپؒ نے اپنے مرید کو حکم دیا۔ ”جا، اس آتش کدے میں داخل ہو جا، اللہ تیرے لیے اسے بے ضرور کر چکا ہے۔“

مرید نے قرآن پاک کو اپنے سر پر رکھا اور اللہ اکبر کا ورد کرتا ہوا آگ کی طرف بڑھا، حاضرین کی سانسیں رک گئیں، لوگ پلکیں جھپکانا بھول گئے، کمزور دل ہول میں مبتلا ہو گئے۔ بعضوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

جوگی نے اپنے پرستاروں سے کہا۔ ”افسوس کہ یہ مسلمان جوگی اپنے اس چیلے کو خوامخواہ آگ میں جھونک رہا ہے۔ یہ داخل ہوتے ہی بھسم ہو جائے گا۔“

مرید نے اپنا پہلا قدم جیسے ہی آگ میں رکھا لوگوں کی چیخیں نکل گئیں، جوگی چلایا۔ ”مہاتما جی! اپنے چیلے کو واپس بلا لو، میں تو اپنے چیلے کے جسم پر ایسی دوائیں مل دیتا تھا جس پر آگ اثر نہیں کرتی تھی۔ لیکن آپؒ یہ کیا کر رہے ہیں، جو یوں ہی اس کو آگ میں چلے جانے کا حکم دے رہے ہیں۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”تو فکر نہ کر، میرے مرید کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

اتنی دیر میں مرید آگ میں داخل ہو چکا تھا۔ اور آگ اس کو نقصان پہنچانے میں ناکام رہی تھی۔

مرید نے آگ میں کچھ دور چل کر اس کے مرکز میں قیام کیا۔ دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ یہ منظر اتنا اثر انگیز اور ہوش ربا تھا کہ دیکھنے والوں پر رقت طاری ہو گئی۔ بعض کی چیخیں نکل گئیں۔ جوگی اپنی جگہ پریشان تھا اور جو کچھ دیکھ رہا تھا اس کے لیے ناقابل فہم تھا، وہ آہستہ آہستہ آپؒ کے پاس پہنچا اور کہا۔

”مہاتما! آپ مہاپرش ہیں۔ آپ نے آگ کو بے بس کس طرح کر دیا؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”آگ کو میں نے کہاں، خدا کے کلام نے خدا کے حکم سے بے اثر کر دیا ہے، اس میں میرا اپنا کوئی کمال نہیں۔“

جوگی نے فرط جذبات میں کہا۔ ”مہاتما جی! میں آپ کے چیلوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تو میرا نہیں اسلام کا چیلا بن جاؤ۔''
جوگی اپنے عقیدت مندوں سمیت مسلمان ہوگیا۔

☆☆☆

لاہور کا گورنر نواب مکرم خان آپ کا بے حد معتقد تھا۔ وہ آپؒ کے قریب رہنے کی خواہش میں ملازمت سے الگ ہو کر اور سرہند پہنچ کر آپؒ کے پاس رہنے لگا۔ چار سال بعد اس کی اورنگ زیب سے ملاقات ہوگئی۔ اورنگ زیب نے ان سے بہت سی باتیں کیں اور آخر میں دریافت کیا۔

''تم نے سرکاری ملازمت کیوں ترک کردی؟''

نواب مکرم خان نے جواب دیا۔ ''میں اپنے پیر و مرشد کے قریب رہنا چاہتا تھا اور ملازمت پر رہ کر میں اس سعادت سے محروم رہتا۔''

اورنگ زیب نے حیرت سے دہرایا۔ ''نواب مکرم! اس وقت تمہاری کیا عمر ہوگی؟''

نواب نے جواب دیا۔ ''چار سال''

اورنگ زیب نے حیرت سے جواب دہرایا۔ ''چار سال، کیا مطلب؟''

نواب نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، چار سال۔ کیونکہ چار سال سے پیر و مرشد کی صحبت میں رہ رہا ہوں۔ میری اصل عمر وہی ہے جو میں نے اپنے شیخ کی خدمت میں گزاری ہے۔ جو کچھ باقی ہے وہاں آخرت ہے۔''

اورنگ زیب اس جواب سے بہت متاثر ہوا۔

☆☆☆

آپ کے دسترخوان سے ہزاروں آدمی پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے۔ لنگر صبح سے شام تک جاری رہتا۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم پانچ ہزار آدمی ہر روز کھانا کھاتے تھے۔ کھانے میں گیہوں کی روٹی، چاول اور گوشت پکتا تھا۔

آپؒ کو ایک بار وجع المفاصل نے پریشان کیا تھا۔ آخر عمر میں اس مرض نے عود کیا اور اس نے بری طرح غلبہ پالیا۔ علاج جاری رہا لیکن اطباء عاجز آگئے۔ آپؒ کے مریدوں کو بڑی تشویش تھی۔ کسی مرید نے آپؒ سے پوچھا۔

''پیر و مرشد! اطبا مرض پر قابو کیوں نہیں پا رہے۔ آخر دوائیں فائدہ کیوں نہیں پہنچا رہیں؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''اب دوا کی کوئی ضرورت نہیں، میں اس لیے علاج کر رہا ہوں کہ سنت کا تقاضا پورا ہو جائے۔''

پھر آپ نے مریدوں سے فرمایا۔ ''میں تم سب کو کتاب و سنت پر چلنے اور قائم رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔''

مرید رونے لگے۔ آپؒ نے انہیں صبر کی تلقین فرمائی۔

9 ربیع الاول 1079ھ بروز پیر آپؒ نے سورۂ یٰسین پڑھنا شروع کی، یکایک آپ نے فرمایا۔ ''السلام علیک یا رسول اللہ علیہ ﷺ۔''

اور آپؒ کی روح پرواز کرگئی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ اس وقت آپؒ کے چہرے سے مسکراہٹ ہویدا تھی۔ اورنگ زیب آپؒ کی وفات سے بہت ملول ہوا اور تاریخ وفات کہی۔

عالم تاریک باشد 1079ھ

جس وقت آپؒ کا جنازہ اٹھایا گیا، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہزاروں آدمیوں کے کاندھوں سے گزر کر قصر معصومی سے شمال کی طرف نماز جنازہ ادا کی گئی۔ آپؒ کے صاحبزادے شیخ عبداللہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قصر معصومی سے جنوب کی طرف تدفین عمل میں آئی۔

روشن آرا نے اپنے صرف خاص سے روضۂ مقدسہ کی تعمیر کرائی جو آج تک مرجع خاص و عام ہے۔

ماخذات

خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔ سیکنتہ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبری، علامہ شعرانی۔ ریاض الریاحین، ابی جعفر۔ سیفنتہ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ

بھول

شرم جمیل

کبھی کبھی بھول جانے کی عادت بھی انسان کو بڑی تباہی سے بچالیتی ہے۔ ایسی ہی ایک غلطی اس سے بھی سرزد ہوئی مگر حادثاتی طور پر بہت ثمر آور ثابت ہوئی۔ بس ایک لمحے کی تاخیر اسے ایک لمبے سفر پر روانہ کردیتی اگر عشق اسے الہامی کیفیت میں مبتلا نہ کردیتا۔

بے وجہ خون کی ہولی کھیلنے والے سنگدلوں کا قصہ

گیری جلد ہی آفس سے اٹھ گئی تھی لیکن اس قدر جلدی بھی نہیں کہ اسے سڑکوں پر رش نہ ملتا۔ یہ رش پل تک پہنچتے پہنچتے اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اب کاریں رینگ رہی تھیں۔ وہ اس وقت اس قطار میں تھی جس میں چلنے والی گاڑیوں کے لیے رفتار کی حد چالیس میل تھی لیکن اس وقت تمام کاریں بیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے رینگ رہی تھیں۔ گیری کی کار اب پل کے وسط میں پہنچ گئی تھی۔ پل کے دونوں طرف بنے ہوئے پیدل چلنے والوں کے لیے جو راستے مخصوص تھے ان پر ان دنوں مرمت کا کام ہو رہا تھا اور مزدور اپنی مخصوص وردیاں پہنے کام میں مصروف تھے۔ گیری کو ان مزدوروں سے بڑی ہمدردی محسوس ہوئی جو سخت گرمی میں تپتے سورج کے نیچے کام کر رہے تھے۔

کار آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی کہ اچانک گیری کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ اس نے پل پر کام کرنے والے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مزدوروں جیسا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر آہنی ہیٹ تھا۔ وہ شخص پیدل چلنے والوں کے لیے مخصوص راستے پر مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ اس کے کاندھے پر ایک تھیلا پڑا ہوا تھا۔ جو بہت لمبا اور بڑا اور خاصا بھاری معلوم ہوتا تھا۔ گیری کو وہ تھیلا بڑا عجیب سا لگا۔

اب وہ شخص چلتا ہوا، اور گیری کی کار بڑھتی ہوئی ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آ گئے تھے پھر اس شخص نے ایک عجیب سی حرکت کی۔ وہ شخص ذرا سی دیر کے لیے رکا اور جو تھیلا اس نے اٹھا رکھا تھا وہ اس نے سیمنٹ کے جنگلے پر رکھ دیا۔ گیری کو لگا جیسے وہ شخص آرام کے لیے رکا تھا لیکن پھر یا تو وہ تھیلا نیچے دریا میں گر گیا تھا یا اس شخص نے خود اس تھیلے کو نیچے پھینکا تھا۔ ساتھ ہی گیری کے منہ سے زوردار چیخ نکلی تھی اور جو الفاظ اس کے منہ سے نکلے تھے وہ بھی بے اختیار ادا ہوئے تھے۔

"پکڑو، اس آدمی کو پکڑو۔"

چند سیکنڈ بعد ہی اسے احساس ہوا کہ ٹریفک کے شور اور مرمت کے کام کی ٹھک ٹھک میں اس کی آواز کسی کو سنائی نہیں دے سکتی۔ یہ سوچتے ہی اس نے زور سے بریک مارا۔ تھیلا دریا میں پھینکنے والا شخص اس کی کار کے سامنے سے نکل کر پیچھے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

اس نے کار کیا روکی ایک ہنگامہ ہو گیا۔ آگے پیچھے کئی کاروں کو بریک لگانے پڑے پھر بھی کئی کاریں آپس میں ٹکرا گئیں۔ خود گیری کی کار سے بھی پچھلی کار زور سے ٹکرائی تھی اور وہ اپنی نشست پر اچھل کر رہ گئی تھی مگر گیری کو اس وقت کچھ ہوش نہ تھا۔ اس نے جلدی سے کار کا دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ وہ شخص اس وقت بھی تیز رفتاری سے بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس کے انداز سے گھبراہٹ قطعی عیاں نہیں تھی۔

"اس شخص کو پکڑو، روکو۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے پھر شور مچایا۔

وہ اس شخص کو نہ تو روک سکی البتہ پل پر دو قطاروں میں گزرتی کاروں کو ضرور روک دیا۔ ٹریفک رک گیا، فضا کاروں کے ہارن سے گونج اٹھی۔ اسی شور میں وہ پھر حلق کے بل چیخی۔ "روکو، اس شخص کو روکو۔"

لیکن کوئی بھی شخص گیری کی چیخ و پکار پر دھیان نہیں دے رہا تھا اور وہ شخص اب اس سے تقریباً پچاس گز آگے نکل گیا تھا۔ اس کی چال بھی کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ گیری اس کے پیچھے بھاگ لی۔ لوگوں نے اس پر آوازیں کسیں۔ اس کے جوتے کی ایک ایڑی ٹوٹ گئی، ایک لمحے کو وہ رکی اور اس نے دونوں جوتے پیر سے نکال دیے۔

"ٹھہرو، رکو۔" گیری نے چیخ کر اس آدمی سے کہا۔

اس تمام ہنگامے اور افراتفری میں اس شخص نے بھی شاید گیری کی آواز سن لی تھی۔ وہ اچانک رک گیا اور پلٹ کر گیری کو دیکھا۔ ایک منٹ کے لیے ان کی نظریں ملیں اور ان دونوں نے ایک دوسرے کے خاموش پیغام کو سمجھ لیا۔

"میں جانتی ہوں کہ اس تھیلے میں جو تم نے پھینکا ہے کیا تھا؟" گیری کی آنکھوں میں دھمکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اس شخص نے بھی خاموش رہتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا تھا۔ "تم سے مطلب، تم آخر کیوں ٹانگ اڑا رہی ہو؟"

وہ پھر مڑ گیا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ گیری الجھ کر رہ گئی۔ وہ پریشان تھی، خوف زدہ تھی ساتھ ہی اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ پھر اس شخص کا پیچھا کرنے لگی لیکن اب اس کی رفتار کم تھی ایک مرتبہ وہ پھر پوری قوت سے چیخی۔ "روکو اسے، پکڑو اسے۔"

تھوڑی ہی دیر میں وہ چند پولیس والوں اور کچھ لوگوں کے درمیان گھری ہوئی تھی لیکن اس وقت تک وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے مادام؟ کیا پریشانی ہے آپ کو؟" ایک سپاہی نے دریافت کیا۔

"میں...... میں اس آدمی کا پیچھا کر رہی تھی۔ میں نے اسے ایک تھیلا دریا میں پھینکتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں جانتی ہوں اس تھیلے میں لاش تھی۔"

☆☆☆

پوسٹ کا رپورٹر کورسنگ پولیس ہیڈکوارٹر میں موجود تھا جب گیری چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچی۔ ذرا سی دیر میں گیری کے بیان کی خبر ایک پولیس والے نے اسے دی۔ گیری اس وقت لیفٹیننٹ جارج کے کمرے میں تھی اور کورسنگ باہر کھڑا بے چینی سے اس لڑکی کے باہر آنے کا منتظر تھا۔ اس دوران میں اس نے دفتر فون کر کے ایک فوٹوگرافر کو بلا لیا تھا۔

کورسنگ راہداری میں منتظر تھا کہ سارجنٹ روشو لیفٹیننٹ جارج کے کمرے سے نکلا۔ کورسنگ نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ "بڑی دلچسپ خبر ہے سارجنٹ۔ وہ شخص بہت مضبوط اعصاب کا آدمی معلوم ہوتا ہے جس نے دن دہاڑے ایک لاش دریا میں پھینکی ہے۔"

"کون کہتا ہے کہ اس نے لاش پھینکی ہے؟" سارجنٹ نے روشو سے پوچھا۔

"کیونکہ، وہ لڑکی بہت وثوق سے کہہ رہی ہے؟"

"وہ پاگل ہے۔"

"وہ گھبرائی ہوئی تو ہو سکتی ہے، پاگل ہرگز نہیں ہے۔" کورسنگ نے کہا۔

سارجنٹ روشو مسکرایا۔ "چلو مان لیا، لیکن ہو سکتا ہے اسے غلط فہمی ہوئی ہو۔"

"کس کا خیال ہے کہ اسے دھوکا ہوا ہے؟" کورسنگ نے اگلا سوال کیا۔

"میرا۔"

کورسنگ، خاموش ہو گیا اور لیفٹیننٹ جارج کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا فوٹوگرافر بھی پہنچ چکا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد لیفٹیننٹ جارج لڑکی کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلا۔ جارج کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا لیکن گیری اب پہلے کے مقابلے میں بہت پُرسکون تھی۔

کورسنگ جارج کی طرف بڑھا اور فوٹوگرافر نے گیری کی چند ایک تصویریں اتار لیں۔ "کیا اسے حراست میں لے رہے ہو، لیفٹیننٹ؟"

"حراست میں کیوں، کس لیے؟"

"غیر محتاط ڈرائیونگ کے الزام میں۔ اس کی وجہ سے گیارہ کاریں ٹکرائی ہیں۔"

"پھر وہی مبالغہ آمیزی، صرف پانچ کاریں۔"

"بہرحال غیر محتاط ڈرائیونگ تو ہوئی نا، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"نہیں، میرا خیال ایسا نہیں ہے۔"

"تو تم اسے حراست میں نہیں لے رہے؟"

"کس لیے؟"

"محض حفاظت کی خاطر، آخر اس نے ایک قاتل کو لاش ٹھکانے لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"بھاگ جاؤ کورسنگ، بلاوجہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔" لیفٹیننٹ جارج نے بیزاری سے کہا۔

"پھر اس لڑکی کا کیا ہوگا؟"

"یہ گھر جا رہی ہے۔ آرام کرے گی، میں کل صبح اس سے بات کروں گا۔"

"کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟"

"نہیں۔"

گیری کو پولیس کی نگرانی میں وہاں سے بھیج دیا گیا تو کورسنگ نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے لیفٹیننٹ! لڑکی نے کیا دیکھا تھا؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو تھیلا پھینکتے ہوئے دیکھا ہو مگر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی لاش ہی تھی۔"

"اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے لیفٹیننٹ۔"

"اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔" لیفٹیننٹ جارج نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے روز یہ خبر تمام اخبارات نے صفحۂ اوّل پر شائع کی۔ خبر میں ائرپورٹ برج پر ہونے والے حادثے کا تذکرہ کرتے ہوئے بس اتنا ہی لکھا تھا کہ 23 سالہ گیری نے جو ایک دفتر میں سیکریٹری ہے، پل سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو بھاری تھیلا دریا میں پھینکتے دیکھا تھا۔ گیری کا خیال تھا کہ اس تھیلے میں یقیناً کوئی لاش ہے۔ گھبرا کر اس نے بریک لگا کر کار روک دی۔

کورسنگ جلد بیدار ہو گیا تھا۔ وہ تمام رات بے چین رہا تھا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر وہ پولیس ہیڈکوارٹر پہنچا۔ اس وقت نو بج رہے تھے لیکن گیری اس سے قبل ہی ہیڈکوارٹر پہنچ چکی تھی اور لیفٹیننٹ کے کمرے میں موجود تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ لیفٹیننٹ جارج کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ یہ دیکھ کر کہ پولیس گیری کو گھر لے جا رہی ہے اس نے سیدھا سیدھا سوال کیا۔

"مس گیری! میرا اخبار کل کے واقعے کے بارے میں آپ کا انٹرویو شائع کرنا چاہتا ہے۔"

لیفٹیننٹ جارج نے کہا۔ "مس گیری! یہ کورسنگ ہے۔ پوسٹ کا رپورٹر۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ شخص رنگ آمیزی، مبالغہ آرائی اور خبر کو توڑنے مروڑنے کا ماہر ہے۔"

"ہاں مس گیری۔" کورسنگ نے کہا۔

"مس گیری نے ایک شخص کو پل کے جنگلے سے ایک تھیلا دریا میں پھینکتے دیکھا تھا۔" لیفٹیننٹ جارج نے گیری کی طرف سے جواب دیا۔ "بہرحال کافی پوچھ گچھ کے بعد مس گیری اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ وہ تھیلا اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس میں کوئی لاش رکھی جا سکتی لہٰذا اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ پولیس اس معاملے کو نمٹانے کی کوشش کر رہی ہے۔" کورسنگ نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "ویسے لیفٹیننٹ اس تھیلے میں آخر تھا کیا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"آپ جاننا بھی نہیں چاہتے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

”نہیں۔“

وہ اب باہر گیری کی کار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ کورسنگ نے ایک مرتبہ پھر گیری کو مخاطب کیا اور اس نے وہی بات دہرادی جو لیفٹیننٹ جارج نے کہی تھی۔ ”لیفٹیننٹ جارج نے مجھے قائل کردیا ہے کہ تھیلا اس قدر چھوٹا تھا کہ اس میں کوئی لاش نہیں سما سکتی تھی۔“

”اس صورت میں بھی نہیں کہ لاش کے ٹکڑے کردیے گئے ہوں۔“

”مسٹر کورسنگ، تمہیں تو رپورٹنگ چھوڑ کر کوئی ناول وغیرہ لکھنا چاہیے۔“

گیری کے چلے جانے کے بعد بھی کورسنگ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ڈولتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ گیری نے جو کچھ دیکھا تھا اور جو اندازہ قائم کیا تھا وہی اصل بات تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات چپک کر رہ گئی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے طور پر اس معاملے کا کھوج لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے سارجنٹ روشو سے حال ہی میں لاپتا ہونے والے افراد کی فہرست تیار کروائی۔ سارجنٹ روشو اس کا گہرا دوست تھا اور وہ دونوں اکثر بعض معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ سارجنٹ روشو نے کورسنگ کو گم شدہ افراد کی فہرست اور ان کے بارے میں ضروری تفصیلات دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ اس تھیلے میں کیا تھا؟“

”ہاں، سارجنٹ۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو شاید میں تلاش کر ہی سکوں۔“

فہرست لے کر وہ ایک ریسٹورنٹ میں آن بیٹھا۔ سب سے پہلے اس نے گمشدہ مردوں کے نام کاٹ دیے کیونکہ کسی مرد کی لاش کو اتنی آسانی سے کاندھے پر ڈال کر لے جانا آسان نہیں تھا۔ اس کے بعد اس نے عورتوں کے ناموں کو دیکھا۔ مسز زیلمان کا نام اس بنا پر کاٹ دیا کہ وہ بہت موٹی اور بھاری عورت تھی۔ اس کا وزن ہی دو سو پونڈز سے کچھ زیادہ تھا۔ مسز فیئرز کا نام اس لیے کاٹ دیا کہ وہ بہت زیادہ بدصورت تھی۔ اسی طرح فہرست کو مختصر کرتے ہوئے وہ ڈونا کے نام پر آ کر ٹھہر گیا۔

کورسنگ بڑی دیر تک اس کا نام گھورتا رہا۔ اس کی عمر انیس برس تھی۔ وزن ایک سو پانچ پونڈ۔ دور قریب کا کوئی عزیز نہیں تھا۔ ایک بہن تھی جو ڈوڈوباک میں رہتی تھی اور یہ ایک دور افتادہ مقام تھا۔ اگر وہ وہاں جاتی تو کسی نہ کسی شخص سے اس کا تذکرہ ضرور کرتی۔ ڈونا ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں ویٹرس کی حیثیت سے ملازم تھی اور اس نے اچانک کام پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک سستے سے فلیٹ میں رہا کرتی تھی۔ وہ باقاعدگی سے کرایہ دیتی تھی۔ وہ فلیٹ سے کچھ بھی سامان لے کر نہیں گئی تھی۔ بس تین دن قبل اچانک ہی غائب ہوگئی تھی۔

کافی پی کر کورسنگ اٹھ گیا۔ ایک مرتبہ اس نے پھر سارجنٹ روشو سے ملاقات کی۔ اس نے کورسنگ کے پوچھنے پر بتایا کہ ڈونا کی گمشدگی کے سلسلے میں پولیس نے ہوٹل کے مالک اور فلیٹ کی مالکہ سے پوچھ گچھ کی تھی۔ پولیس کے خیال کے مطابق کوئی ایسا شخص بھی سامنے نہیں آیا تھا جس پر ڈونا کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی شبہ کیا جاسکتا۔

کورسنگ وہاں سے اس اپارٹمنٹ ہاؤس پہنچا جس میں ڈونا رہا کرتی تھی۔ اس کی مالکہ مسز والس تھی۔ کورسنگ نے اپنا تعارف کروانے کے بعد ڈونا کے متعلق سوالات کا سلسلہ شروع کردیا۔

”تمہارا خیال درست ہے۔“ مسز والس نے کہا۔ ”ڈونا کی ذات سے کئی کہانیاں وابستہ ہوسکتی ہیں لیکن مجھے ان کا علم نہیں۔ وہ بہت کم وقت یہاں گزارتی تھی۔ اس کے کئی مرد دوست تھے۔“

”تو کیا وہ محض تفریح کی عادی تھی؟“ کورسنگ نے دریافت کیا۔

”نہیں جناب!“ مسز والس نے کہا۔ ”ڈونا شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس بارے میں سنجیدہ تھی۔ اسی مقصد کے تحت وہ چھوٹے سے قصبے کو چھوڑ کر یہاں آئی تھی تاکہ یہاں کے لوگوں سے اس کی ملاقات ہوسکے۔“

کورسنگ کے سوالات پر مسز والس نے بتایا کہ کبھی کبھار وہ ڈونا کے فون سن لیا کرتی تھی۔ اسی گفتگو سے اس نے تین افراد کے نام نوٹ کیے تھے۔ ڈونا کی گفتگو سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ تینوں میں سے کسی نہ کسی سے جلد از جلد شادی کرنے والی تھی۔ ان تین آدمیوں کے نام تھے فریزل، آرتھر اور ریمنڈ۔ مسز والس ان افراد کے پتے نہیں بتاسکی لیکن کورسنگ اپنی کارگزاری سے مطمئن تھا۔ وہ اب کسی سمت میں کام تو کر ہی سکتا تھا۔

”مسز والس آپ نے آخر ڈونا کی گمشدگی کے بارے میں پولیس کو کس بنا پر اطلاع دی تھی؟“

”بات یہ ہے مسٹر کورسنگ کہ مجھے وہ لڑکی اچھی لگتی تھی۔ جب سے یہاں آ کر رہی تھی کسی رات وہ غائب نہیں رہی تھی پھر مجھے اس کے مرد دوست قطعی پسند نہیں تھے۔ میں چاہتی تھی کہ اگر انہوں نے ڈونا کے ساتھ کوئی غلط حرکت کی ہے تو پولیس کو اس کی اطلاع ہوجانی چاہیے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے مسز والس، کیا ڈونا کسی تشدد کا شکار ہوگئی ہے؟“

”میں مردوں پر بھروسا نہیں کرتی۔ وہ شادی کے سلسلے میں بہت سنجیدہ تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے اس کے لیے کوئی مختصر راستہ تلاش کیا ہو۔ ایسی صورت میں مرد خود کو بے بس پاتا ہے پھر وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔“

”ان تین آدمیوں کے بارے میں آپ کو کچھ اور معلوم ہو تو بتادیں۔“ کورسنگ نے کہا۔

☆☆☆

مسز والس سے ملاقات کے بعد کورسنگ نے چند دن ان تینوں مشتبہ افراد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں صرف کیے۔ جب وہ بنیادی اور ابتدائی معلومات حاصل کرچکا تو اس نے مس گیری سے رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک پل سے تھیلا پھینکنے والے پُراسرار آدمی کے بارے میں خبریں اخبارات سے غائب ہوچکی تھیں۔

گیری مضافات کے ایک رہائشی علاقے میں تنہا رہتی تھی۔ ایک دن جب وہ اس کے گھر پہنچا تو گیری اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ تاہم اس نے کورسنگ کو اندر بلالیا اور مہذب خاتون کی طرح اسے کافی پیش کی۔

کافی پیتے ہوئے کورسنگ نے تھیلا دریا میں پھینکنے والے شخص کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس دوران میں وہ گیری کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ ایک خوش شکل، خوش لباس اور خوش اطوار عورت تھی۔ اس کے لیے کورسنگ نے اپنے دل میں نرم اور گرم جذبات محسوس کیے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”دو تین دن قبل لیفٹیننٹ جارج سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب تک دریا میں کوئی چیز، کوئی تھیلا تیرتا ہوا نہیں پایا گیا۔ اگر تھیلے میں لاش ہوتی تو اب تک وہ اوپر آجاتا۔ میرا خیال ہے کہ اس شخص نے تھیلے میں اتنا وزن ضرور رکھا ہوگا کہ تھیلا تہ میں بیٹھا رہے۔“

”مسٹر کورسنگ!“ اچانک گیری نے کہا۔ ”آخر آپ کو اس دردسری سے کیا ملے گا؟“

”ایک اچھی خبر، ایک سنسنی خیز کہانی۔“

”بس...... تم ایک سنسنی خیز خبر کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہو، تمہیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ انصاف ہو، مجرم کیفرِ کردار کو پہنچے۔“

”اگر وہ شخص جس نے تھیلا دریا میں پھینکا تھا قاتل ہے تو میں یہی چاہوں گا کہ وہ اپنے انجام کو پہنچے۔“

گیری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ”میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”اس دن پل پر میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ بہت عجیب تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس تھیلے میں کوئی لاش ہی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ قاتل ہے۔ ممکن ہے تمہیں میری بات احمقانہ معلوم ہو لیکن میرا احساس یہی ہے۔“

”لیفٹیننٹ جارج ایسا سمجھ سکتا ہے، میں نہیں۔“ کورسنگ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ تھیلے میں لاش ہی تھی؟“

”صرف چھٹی حس۔“

”یہی میرا بھی حال ہے اور میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ بات کس حد تک درست ہے؟“ کورسنگ نے کہا۔ ”اور اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”میں مدد کروں گی۔“ گیری نے عزم کے ساتھ کہا۔

اس کے بعد کورسنگ نے گیری کو اس سلسلے میں اپنی اب تک کی تمام کوششوں سے آگاہ کردیا اور کہا۔ ”اب ہمارے سامنے تین مشتبہ افراد ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ان تینوں کو دیکھ لو ہوسکتا ہے کہ ان تینوں میں سے ایک وہ شخص ہو جسے تم نے پل پر دیکھا تھا۔ ویسے تمہیں یقین ہے کہ تم اسے پہچان لوگی؟“

”ہاں، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھے شناخت کرسکتا ہے۔“ گیری نے یقینی لہجے میں کہا۔

اگلے دن کورسنگ، گیری کو ساتھ لے کر ایک ریسٹورنٹ میں پہنچا اور ایک ایسے کونے میں وہ دونوں بیٹھے جہاں سے وہ اندر آنے والے ہر شخص کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ یہاں گیری کو اس لیے لایا تھا کہ وہ فریزل کو دیکھ لے۔ اس نے پہلے ہی گیری کو بتادیا تھا کہ وہ خود کسی شخص کی نشان دہی نہیں کرے گا بلکہ خود گیری کو ہی متعلقہ شخص کی شناخت کرنا ہوگی۔ اسی لیے اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی ہر آنے والے شخص کو غور سے دیکھنا شروع کردیا تھا۔

پھر فریزل دروازے سے داخل ہوا۔ وہ بھاری بھرکم آدمی تھا لیکن موٹا نہیں تھا۔ اس کا چہرہ چوکور تھا اور ناک موٹی لیکن قدرے مڑی ہوئی تھی۔ فریزل ان کے قریب ہی ایک میز پر آ بیٹھا تھا اور گیری ایک نظر اسے دیکھ کر اندر آنے والے دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

”وہ فریزل ہے۔“ آخرکار کورسنگ نے اسے بتا ہی دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نہیں، یہ وہ نہیں ہے۔" گیری نے قطعیت سے کہا۔ "وہ نہ اتنا تنومند تھا اور نہ اتنا قد آور۔"

"پکا یقین ہے؟" کورسنگ نے پوچھا۔

"بالکل۔"

یہاں سے کورسنگ اسے لے کر ایک اور جگہ گیا۔ آرتھر ایک دفتر میں اکاؤنٹینٹ تھا۔ وہ دفتر کی عمارت کی راہداری میں کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ آرتھر اپنے دفتر سے نکل کر ان کے سامنے سے گزرتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت لنچ کا وقفہ تھا اور وہ کھانا ہی کھانے گیا تھا۔ وہ گیری کے ساتھ ساتھ آرتھر کے پیچھے پیچھے عمارت سے باہر نکل آئے۔

"اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ تو فریزل سے قد میں چھوٹا ہے۔"

"یہ......!" گیری نے حیرت سے کہا۔ "نہیں یہ تو ہرگز ہمارا مطلوبہ آدمی نہیں ہوسکتا۔" کورسنگ نے گہرا سانس لیا۔ گیری نے یہی فیصلہ ریمنڈ کے بارے میں بھی دیا۔

اس بھاگ دوڑ کے بعد دونوں تھک کر ایک بار میں آبیٹھے۔ وہ دونوں کافی دیر تک اپنی ناکامی اور ڈونا کے قتل کے اسباب پر گفتگو کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔

آخر گیری نے کہا۔ "کیوں کورسنگ، کیا اس قاتل کو شناخت کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں؟"

"اب ہمیں کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا ہوگا کہ قاتل خود ہی کھل کر سامنے آجائے۔" کورسنگ نے جواب دیا اور سوچ میں غرق ہوگیا۔

کورسنگ جانتا تھا کہ اس سلسلے میں جو کچھ کرنا تھا انہیں خود کرنا تھا۔ اس سلسلے میں اگر وہ اپنے ایڈیٹر سے گفتگو کرتا کہ اخبار میں چند ایک خبریں اس انداز کی شائع کی جائیں جو قاتل کے لیے جال بن جائیں تو ایڈیٹر راضی نہ ہوتا۔ وہ پولیس کی رضامندی کے بغیر ایسا ہرگز نہ کرتا۔ وہ ایک ایسی مقتولہ کے بارے میں پولیس سے تنازعہ مول لینے پر تیار نہ تھا جس کے بارے میں کوئی یہ ثابت نہیں کرسکتا تھا کہ وہ واقعتاً قتل کردی گئی ہے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس سلسلے میں اسے پولیس سے بھی کوئی مدد یا رضامندی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ نہ تو دریا کی تہ کھنگالنے کی اجازت دے سکتی تھی کہ اس پر اخراجات بہت آتے نہ ایسی کوئی خبر چھاپنے پر رضامندی ظاہر کرسکتی تھی کہ پولیس دریا کی تہ کھنگالنے کا ارادہ رکھتی ہے یا پھر یہ کہ گیری نے اس پُراسرار شخص کو قطعی طور پر شناخت کرلیا ہے اور اب پولیس اسے گرفتار کرنے والی ہے۔ گویا جو کچھ کرنا تھا انہیں خود کرنا تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" گیری نے اس کی خاموشی سے اکتا کر پوچھا۔

"ایک ترکیب تو سمجھ میں آتی ہے مگر اس میں خود تم خطرے میں پڑ جاؤ گی۔" کورسنگ نے کہا۔ "اگر ڈونا قتل کی گئی تو شاید اس نے خود قاتل کو ایسا کرنے کی دعوت دی تھی۔ آخر تم جیسی لڑکی کو بلاوجہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟"

گیری نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر آہستہ سے کہا۔ "کورسنگ! ڈونا قتل کی گئی ہے تو اس کے قتل سے اگر کوئی اور واقف نہیں تو ہم تو واقف ہیں لہٰذا یہ ہماری ذمے داری ہے کہ اس کے قاتل کو گرفتار کرائیں۔ یہ کام صرف ہم دونوں کرسکتے ہیں کوئی اور نہیں کرسکتا۔"

"مجھے سوچنے دو گیری۔" کورسنگ نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

راستے میں کورسنگ کو گیری کے اصرار پر وہ ترکیب بتانی ہی پڑی جو اس نے سوچی تھی۔ ساتھ ہی وہ دل میں پشیمان بھی تھا کہ وہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کو جس کے لیے اس کے دل میں نرم ولطیف جذبات پیدا ہوگئے تھے، بلاوجہ خطرات میں دھکیل رہا ہے۔

گھر پہنچتے ہی وہ اپنے ان خیالات سے نکل آیا اور وہ دونوں آگے پیچھے گیری کے مکان میں داخل ہوئے۔

"کہو تو میں فون کروں؟" گیری نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

کورسنگ نے گیری کو غور سے دیکھا۔ گیری بجا طور پر خوف زدہ تھی لیکن وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔ وہ خطرات سے گزرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اب یہ کورسنگ کی ذمے داری تھی کہ وہ ان خطرات کو کس حد تک کم کرسکتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔"

"پہلے کس کو فون کیا جائے؟" گیری نے پوچھا، اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"پہلے آرتھر اور ریمنڈ کو فون کیا جائے۔ وہ دفتر ہی میں ہوں گے۔ فریزل کو اس کے گھر فون کرنا پڑے گا کیونکہ وہ سیلز مین ہے، پتا نہیں اس وقت کہاں ہوگا۔"

گیری نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ ذرا ہی دیر بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ریمنڈ!"

"سنو مسٹر ریمنڈ۔" گیری نے پہلے سے طے شدہ باتیں فون پر دہرانی شروع کردیں۔ "میں گیری بول رہی ہوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کون؟"

"بات مت کاٹو، میری بات سنتے رہو۔ میں گیری بول رہی ہوں۔ تم نے اخبارات میں یقیناً میرا نام پڑھ لیا ہوگا۔ تم یقیناً مجھ سے واقف ہو گے۔ ابھی چند دن قبل ایک پل پر ہماری ملاقات ہوئی تھی۔"

دوسری طرف سے گہرا سانس لے کر کہا گیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا مس گیری کہ تم کیا بات کر رہی ہو؟"

"بنو مت۔" گیری نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "اب غور سے سنو مسٹر ریمنڈ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔ اگر تم نے وہی کیا جو میں کہہ رہی ہوں تو میں پولیس کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اگر تم معاملات طے کرنا چاہتے ہو تو آج رات گیارہ بجے اسی پل پر ملاقات کرو جہاں ہماری پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ اس وقت پل عموماً سنسان ہی ہوتا ہے۔ تم ٹھیک اسی جگہ ملنا۔ میرا خیال ہے تم جانتے ہو میں کس جگہ کی بات کر رہی ہوں۔ میں سیاہ لباس میں ہوں گی۔ اس لیے ہوسکتا ہے تم مجھے آسانی سے نہ دیکھ پاؤ لیکن میں بہرحال ٹھیک اسی جگہ موجود ہوں گی۔ سمجھ گئے مسٹر ریمنڈ۔"

"میں واقعی کچھ نہیں سمجھ پایا۔" دوسری طرف سے ریمنڈ نے کہا۔

گیری نے فون رکھ دیا اور کورسنگ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ریمنڈ ہمارا مطلوبہ آدمی نہیں ہے۔"

"میرا خیال اس سے مختلف ہے۔" کورسنگ نے کہا ویسے ایک مرتبہ پھر وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ "ویسے یہ کام بہرحال پولیس کا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ لیفٹیننٹ جارج اس سلسلے میں ہماری مدد نہیں کرے گا اور اگر اسے کسی طرح ہماری اس حرکت کا علم ہو گیا تو وہ مداخلت کرنے سے باز نہیں آئے گا۔"

اس دوران میں گیری آرتھر کا نمبر ملا چکی تھی۔ "ہیلو، میں آرتھر بول رہا ہوں۔"

گیری نے آرتھر سے بھی وہی تمام باتیں کہہ دیں وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔ "خاتون، کیا آپ کو یہی کچھ کہنا تھا؟"

"ہاں، بس یہی کہنا تھا۔" گیری نے فون بند کر دیا اور بڑی بڑی آنکھوں سے کورسنگ کو دیکھتے ہوئے جوشیلے انداز میں کہا۔ "آرتھر یقیناً وہی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آواز میں حیرت اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارا اندازہ غلط ہے۔ آرتھر ایسا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔" اس کے بعد وہ ایک گھنٹے تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایسی باتیں جو انہیں ایک دوسرے کے زیادہ قریب لے آئیں وہ ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب فریزل گھر آ گیا ہوگا تو گیری نے اس کا نمبر بھی ڈائل کیا۔ کورسنگ کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق فریزل اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہ اپنی ماں کی کفالت کرتا تھا۔ فریزل ایک سخت محنتی جوان تھا۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھا جہاں ہر نوجوان شادی کا خواہش مند ہوتا ہے پھر کیا وجہ تھی کہ اس نے ڈونا سے شادی کرنے کے بجائے اسے قتل کر دیا تھا۔ کورسنگ کا خیال تھا کہ فریزل بھی وہ شخص نہیں ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔

"میں مسٹر فریزل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" گیری نے کہا۔

پہلے ایک عورت نے فون اٹھایا تھا، شاید فریزل کی ماں نے تھوڑی دیر بعد فریزل کی آواز آئی۔ "کون بات کر رہا ہے؟"

"گیری۔"

"گیری کون؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"فریزل تمہیں یاد ہوگا چند دن قبل ایک پل پر ہماری ملاقات ہوئی تھی۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فریزل نے کہا۔ "کیا تم نے ایک مرتبہ پھر دہراؤ؟"

گیری کے بیان کے دوران فریزل اسی قسم کے سوالات کرتا رہا، آخر میں وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر گیری نے فون بند کر دیا۔

"یہ بھی نہیں ہوسکتا۔" گیری نے کہا۔

اب ان کے پاس کافی وقت تھا۔ انہوں نے مزے لے لے کر کافی پی۔ ہلکے پھلکے گانوں کے ریکارڈ بجائے لیکن دونوں میں سے کسی نے ان گانوں کے بول قطعی نہیں سنے۔ گیری کچھ پریشان اور سہمی ہوئی تھی لیکن کوشش اس کی بھی یہی تھی کہ وہ اپنی کمزوری ظاہر نہ ہونے دے۔ کورسنگ خاموشی سے اس بات پر سوچ رہا تھا کہ آیا جو کچھ وہ کر رہے ہیں مناسب بھی ہے یا نہیں۔ اسی غور و فکر میں وقت گزرتا رہا۔

انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھایا حالانکہ ان دونوں کو ذرا بھی اشتہا محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد وہ ائرپورٹ برج کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے کوئی دس بارہ مرتبہ اس پل کو کار میں بیٹھ کر پار کیا تھا۔

"کیا بات ہے کورسنگ، کیا سوچ رہے ہو؟" گیری نے پوچھا۔

"میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔ تم اکیلی اس سے ملو گی۔ وہ پتا نہیں کیا کر گزرے۔"

وہ کمزور سے انداز میں ہنسی۔ "ہم پہلے ہی اس پر غور کر چکے ہیں۔ وہاں آہنی ستونوں کے درمیان ایسی جگہ ہے جہاں میں آسانی سے چھپ سکتی ہوں پھر میں یہ لباس پہنے ہوئے ہوں۔ جب تک کوئی شخص خاص طور پر میری تلاش میں نہ ہو، کوئی مجھے وہاں نہیں دیکھ سکتا۔"

"اگر کسی پولیس والے نے دیکھ لیا تو ہمارا تمام کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر یہ خطرات تو بہرحال مول لینے ہی پڑیں گے۔" گیری نے پُرعزم انداز میں کہا۔

پھر مقررہ وقت سے بہت پہلے گیری اس خلا میں چھپ گئی جو اس جگہ سے تھوڑے فاصلے پر تھا جہاں سے اس پُراسرار شخص نے تھیلا دریا میں پھینکا تھا۔ ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر کورسنگ نے اپنی کار اس مقام سے تھوڑے فاصلے پر روک دی اور بونٹ کھول کر انجن پر جھک گیا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ قاتل ادھر نہیں آیا۔ ان دونوں کے دل اپنی اپنی جگہ دھڑکتے رہے۔ کئی کاریں اس دوران پل سے گزریں لیکن ان میں سے ایک کار بھی نہ تو رکی اور نہ اس کی رفتار میں کمی آئی۔ پیدل چلنے والوں کا راستہ بھی سنسان پڑا رہا۔

اب سوا بارہ بج چکے تھے۔ کورسنگ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب قاتل کا انتظار فضول ہے۔ وہ اپنی کار کا بونٹ بند کر کے اس طرف چل دیا جہاں دو آہنی ستونوں کے درمیان خلا میں گیری چھپی کھڑی تھی۔

"گیری آجاؤ وہ نہیں آئے گا۔ سوا بارہ ہو چکے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" گیری نے اپنی کمیں گاہ سے نکلتے ہوئے کہا۔

وہ گیری کے ہاتھ کو گرم جوشی سے تھامے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ کورسنگ گیری کو وہاں سے سیدھا اس کے کمرے میں لے آیا۔ کورسنگ بہت مایوس اور دل گرفتہ صوفے میں دھنس گیا اور گیری دو کپ کافی بنا لائی۔

"اب کیا ہوگا؟" گیری نے کورسنگ کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب ہماری کوششیں یہیں ختم ہو جائیں گی؟"

"نہیں۔" کورسنگ نے جواب دیا۔

"پھر تم کیا کرو گے؟"

"میں...... میں اب چند دن کی چھٹیاں لوں گا اور ان تینوں کی نگرانی کروں گا۔ جلد یا بدیر اصل قاتل کوئی ایسی حرکت ضرور کرے گا جس کی بنا پر وہ ہمارے سامنے کھل کر آجائے گا۔"

اس کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب کورسنگ وہاں سے اٹھا تو گیری کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ کورسنگ کی طرف سے پیش رفت کی منتظر تھی پھر کورسنگ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس نے الوداع ہوتے وقت گیری کو پُرجوش انداز میں اپنے جسم سے لپٹا لیا پھر ان کے ہونٹ آپس میں مل گئے۔ ایک طویل بوسے میں انہوں نے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

"اچھا گیری، خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ پھر اس کے چہرے پر جھک گیا۔

☆☆☆

کورسنگ کے جانے کے بعد وہ بے دم سی ہو کر بند دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اس کا ذہن ناکامیوں کے بارے میں نہیں صرف کورسنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کورسنگ کے ہونٹوں کے لمس سے اب تک پھول کھلے تھے۔

پھر وہ اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ کورسنگ اس کی تنہا زندگی میں ایک حسین خواب کی مانند آیا تھا۔ ابھی اس نے اپنے لباس کی زپ نیچے کھینچی ہی تھی کہ اس نے آئینے میں ایک حرکت سی دیکھی۔ کپڑوں کی الماری کے پٹ آہستہ سے کھلے تھے۔ ابھی وہ پوری طرح مڑی بھی نہ تھی کہ الماری سے برآمد ہونے والے شخص نے اسے چھاپ لیا۔

لیکن اس سے قبل وہ اس کا چہرہ دیکھ چکی تھی۔ وہ اسی شخص کا چہرہ تھا جسے اس نے پل پر دیکھا تھا۔ وہ ان آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ ایک جھلک دیکھتے ہی اسے پہچان گئی تھی۔ وہ آنکھیں ایک بار پھر خاموشی سے کہہ رہی تھیں۔ "تم نے بلاوجہ ٹانگ اڑائی۔ اب تم اس کی سزا بھگتو۔" ان آنکھوں نے گیری سے اسی انداز میں گفتگو کی جس طرح پہلی ملاقات کے موقع پر ان میں گفتگو ہوئی تھی۔ بس ایک لمحے کے لیے گیری نے عجیب سی خوشی اور فتح مندی کی سرشاری محسوس کی تھی کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس کی چھٹی حس کا پیغام درست تھا۔

اس شخص کے بڑے بڑے ہاتھ گیری کے حلق پر جم گئے۔ اس نے گیری سے کچھ کہا بھی تھا لیکن جذبات سے اس کی آواز اتنی بوجھل تھی کہ وہ یہ آواز نہ پہچان سکی۔

اس شخص نے پھر کہا۔ "اونہہ، آج رات پل پر پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہماری ملاقات ہوگی لیکن اس مرتبہ پل پر سے تم کو دریا میں پھینکا جائے گا۔"

گیری پوری قوت سے مدافعت اور مزاحمت کر رہی تھی۔ اس نے ٹانگیں چلائیں، قاتل کو دھکیلنے کی کوشش کی، اسے نوچا کھسوٹا لیکن قاتل اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس دوران میں گیری کے ذہن میں خیالات کی یورش تھی۔ غیر متعلق خیالات کی یورش، شاید وہ ذہنی طور پر اس خوف ناک حقیقت سے فرار چاہتی تھی کہ اس وقت وہ خود بھی اس طرح مرنے والی تھی جس طرح ڈونا مری تھی۔ جن ہاتھوں نے ڈونا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اس وقت خود اس کا گلا گھونٹ کر اسے موت کی گہری نیند سلانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ بے رحم، سخت اور سرد ہاتھ اس وقت اس کے گلے میں پیوست تھے پھر وہ بھی لاش میں تبدیل ہو کر تھیلے میں بند کر دی جائے گی اور اسے پل سے نیچے پھینک دیا جائے گا۔

گیری کمر کے بل پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا رہے تھے اور گلے پر قاتل کی انگلیوں اور ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بہ مشکل تمام وہ اپنے ہاتھوں سے اس کی کلائی کو پکڑ سکی پھر اس نے اپنے ناخن اس کی کلائی میں گاڑ دیے لیکن قاتل کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا گیا۔ اب اس کا سانس رک گیا تھا۔ اس کا سینہ پھٹنے والا تھا۔ اس کی تمام قوت سلب ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیل گئی۔

تاریکی کا یہ لمحہ بہت طویل تھا لیکن مختصر۔ سانس پھر اس کے سینے سے خارج ہوا، تازہ ہوا پھیپھڑوں میں آئی۔ ہاں وہ کورسنگ تھا جو قاتل کو اس سے علیحدہ کر رہا تھا پھر کورسنگ نے پوری قوت سے قاتل کی گردن پر کھڑے ہاتھ کی ضرب لگائی تھی اور قاتل اس ضرب سے بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا تھا۔ اگلے لمحے وہ گیری کو اپنی آغوش میں بھینچ رہا تھا اور گیری اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

"میں نے دروازے میں زنجیر ڈال دی تھی۔"

"تمہاری چیخ سن کر میں نے دروازے کو ٹکر ماری تھی اور چین ٹوٹ گئی تھی۔"

"میں چیخی تھی؟"

"ہاں۔"

"مگر تم واپس کیوں آ گئے تھے؟"

"میں تم سے ایک بات کہنا بھول گیا تھا۔"

"کیا بات؟"

"یہی کہ مجھے تم سے محبت ہے گیری۔"

وہ کورسنگ کے بازوؤں میں سما گئی۔ "تم کتنے اچھے ہو کورسنگ۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئی پھر اس نے پوچھا۔

"کیا یہ مر گیا؟"

"نہیں میرا خیال ہے یہ مرا نہیں ہے۔"

"یہ ہے کون، ان تینوں میں سے کون ہے؟"

"دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گیری کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

قاتل منہ کے بل فرش پر پڑا تھا۔ اس نے اس وقت بھی وہی لباس پہنا ہوا تھا جس میں پہلی مرتبہ گیری نے اسے دیکھا تھا۔

"یہ ان تینوں میں سے کوئی بھی معلوم نہیں ہوتا۔" کورسنگ نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"مگر میں نے اسی شخص کو پل پر دیکھا تھا۔" گیری نے کہا اور جھک کر اس کے سر سے مختلف رنگوں کی اون سے بنی ہوئی عجیب و غریب ٹوپی اتار لی۔ اس ٹوپی کے نیچے سے لمبے لمبے بال نکل کر دائروں کی شکل میں پھیل گئے۔ "ارے یہ تو عورت ہے۔"

یہ انکشاف ان دونوں کے لیے حیرت انگیز تھا پھر کورسنگ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"تم تینوں میں سے کسی کو شناخت نہیں کر سکی تھیں تو غلط بات نہیں تھی۔ تمہارا مطلوبہ قاتل ان تینوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ تم نے فون پر فریزل کی بھرائی ہوئی آواز سنی تھی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ اگرچہ فریزل کا اپنا گھر تھا۔ وہ ماں کے ساتھ رہتا تھا لیکن وہ کھانا ایک ہوٹل میں کھایا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے فریزل کسی بات پر اپنی ماں سے ناراض تھا۔"

"کیا مطلب، کیا وہ ڈونا سے شادی کرنا چاہتا تھا؟"

"ہاں۔" کورسنگ نے جواب دیا۔ "آج جب تم نے فریزل کو فون کیا تو پہلے فریزل کی ماں نے ہی فون اٹھایا تھا۔ جب اس نے فون پر تمہاری یعنی ایک نسوانی آواز سنی تو یقیناً اس نے آواز بدل کر تمہیں یہ تاثر دے دیا کہ اب فریزل تم سے گفتگو کر رہا ہے۔ وہ شاید یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا بیٹا کسی عورت سے گفتگو کرے۔"

"گویا محض اس لیے کہ کہیں شادی کر کے اس کا بیٹا اسے نہ چھوڑ دے اس نے ڈونا کو قتل کر دیا۔"

"ہاں، بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں۔"

وہ دونوں اس عورت کو دیکھتے رہے۔ فریزل کی ماں کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اب وہ ہوش میں آ رہی تھی۔

"لیفٹیننٹ جارج کو فون کرو گیری۔" کورسنگ نے کہا۔

ناسور

ڈاکٹر شیر شاہ سید

تضادِ کائنات میں یہ تکلیف دہ احساس بہت نمایاں ہے کہ... کچھ لوگ خوابوں سے تعبیر اور نظاروں سے مناظر تک چرا لیتے ہیں اور کچھ لوگوں کی آنکھیں... لمحہ لمحہ زندگی کو ضایع ہوتے دیکھ کر پتھرا جاتی ہیں مگر نہ حالات میں بدلاؤ آتا ہے، نہ ہی منظر بدلتے ہیں اور نہ کبھی تقدیر کو ان پر رحم آتا ہے... جب کبھی ذرا دو قدم اٹھانے کے قابل ہوتے ہیں کہ آگے پھر کوئی نہ کوئی کہانی ان کی منتظر ہوتی ہے۔

دلگداز احساسات کو جنم دیتی ایک پر فکر تحریر

لاڑکانہ تو شہر ہی وزیروں کا تھا اور اس کے ساتھ ہی موہنجوڈرو کا رومانس، ہزاروں سال پرانی تہذیب کے آثار جس کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ اسی لاڑکانہ آنے کی دعوت نے مجھے یکا یک مسحور سا کر کے رکھ دیا تھا۔

سالوں پہلے ڈاکٹر بننے کے بعد پاکستان چھوڑ کر جب میں لندن آ کر آباد ہوا تو پھر پاکستان جانا نہیں ہو سکا تھا۔ واقعات بھی کچھ اس طرح سے رونما ہوتے چلے گئے کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان سے تمام رابطے ختم ہو کر رہ گئے۔ میں ڈاؤ میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں ہی تھا کہ میرے والد نے اعلان کر دیا کہ میری شادی نجمہ سے ہوگی۔ نجمہ بڑے ابو کی بیٹی تھی، میری ہم عمر ہی تھی مگر مجھے کبھی کسی بھی قسم کی دلچسپی اس سے نہیں رہی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شادی وادی کے بارے میں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے والد صاحب کو اپنے بڑے بھائی سے بلا کی عقیدت تھی۔ شاید اس زمانے میں بھائیوں کا ایسا ہی تعلق ہوتا تھا کہ اولاد ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیتی تھی اور ان کا احترام خاندان کی دوسری روایات اور رشتوں سے برتر معلوم ہوتا تھا۔ ایک طویل سرد جنگ کے بعد میں نے جھوٹا وعدہ کر لیا کہ شادی نجمہ سے ہی کروں گا اور پھر ڈاکٹر بننے کے بعد مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ روانہ ہو گیا۔

لندن پہلے ہی دن سے میرے دل کو بھا گیا۔ چھوٹے گھر، سردی اور بہت سارے بے حس لوگوں کے باوجود میں لندن کے ہر رنگ کو پسند کرنے لگا تھا۔ میں آیا تو سرجن بننے کے لیے تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ ہیمر اسمتھ اسپتال میں کام کرتے کرتے مجھے عورتوں کے امراض سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عورتوں کے شعبے کا ایک ڈاکٹر نیل کوئن اتنا اچھا تھا کہ میں خود بھی اس سے متاثر ہو گیا اور باتوں باتوں میں ہی اس نے مجھے آمادہ کر لیا کہ سرجری کے بجائے گائنی کا امتحان دے ڈالوں۔ میں نے امتحان بھی دیا اور پاس بھی ہو گیا۔ اس کے بعد سے مجھے نوکریاں ملتی ہی چلی گئیں۔ کوئن شارلیٹ، کنگس کالج اور سینٹ جارجیز اسپتال میں ٹریننگ لیتا ہوا میں گائنا کالوجسٹ بن گیا۔

نجمہ کے خوف اور ابا جان کی ضد سے ڈر کر میں لندن میں ہی ٹکا ہوا تھا اور کنسلٹنٹ کی نوکری تلاش کر رہا تھا کہ تھوڑے دنوں میں ہی سرے کے علاقے میں مستقل نوکری مل گئی۔ نوکری کے شروع دنوں میں ہی شیوان سے ملاقات ہوئی تھی۔

زندگی میں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے آپ کسی سے ملتے ہیں، کسی کو دیکھتے ہیں اور یکایک بے وجہ وہ آپ کے وجود کو تسخیر کر لیتا ہے، آپ کے اوپر چھا جاتا ہے اور مکمل طور پر آپ کو مسحور کر لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ شیوان یکایک میری زندگی میں بغیر کسی پلاننگ کے آئی تھی اور پہلے ہی دن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میری زندگی کی باگ ڈور شیوان کے ہاتھ میں ہوگی۔

یہ فیصلہ بڑا مشکل تھا، میرے لیے بھی اور شیوان کے لیے بھی۔ مجھے پتا تھا کہ یہ فیصلہ اس لیے بھی کرنا ضروری ہے کہ جب تک میں کنوارا تھا نجمہ بھی کنواری رہے گی۔ میرے اس فیصلے کے بعد ہی بڑے ابو اور ابا جان نجمہ کے لیے کوئی رشتہ تلاش کریں گے۔

میرے خط اور فیصلے کا دھماکا خیز جواب آیا تھا۔ مجھے عاق کر دیا گیا تھا اور تاکید کی گئی تھی کہ اپنی منحوس شکل کے ساتھ کبھی اپنے والدین کے سامنے نہ آؤں۔ میں ان کے لیے زندہ درگور ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے والدین اپنی اکلوتی اولاد کے ساتھ ایسا بھی کر سکتے تھے۔ میرا قصور ہی کیا تھا...... صرف اپنی پسند کی شادی۔

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب مجھے خط ملا تو شیوان میرے ساتھ ہی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں کس قدر شدید جذباتی اتھل پتھل کا شکار ہو کر رہ گیا ہوں۔ نہ مجھ سے بولا جا رہا تھا نہ میں سوال سن رہا تھا اور نہ ہی جواب دینے کے قابل تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں اس کی بانہوں میں پڑا سسکتا رہا، بلکتا رہا۔

شیوان کے والدین ایک "پاکی" کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کو ناپسند کرنے کے باوجود راضی ہو گئے تھے اور وہ میری زندگی کی خزاں میں بہار کی طرح آ کر چھا گئی تھی۔ وہ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ بہت ہی دردمند دل کی مالک تھی۔ تمام زندگی اس نے ترقی پذیر تیسری دنیا کے لیے ہی کام کرتے ہوئے وقت گزارا تھا۔ کینیا کے کالوں کے اسکول میں رضا کارانہ طور پر وہ پڑھاتی رہی تھی۔ ساؤتھ افریقا کی آزادی کی جنگ کے لیے لندن میں ہونے والے مظاہروں میں وہ آگے آگے رہی تھی۔ تنزانیہ کے جوزف نریرے نے جب برطانیہ کی چائے کی کمپنیوں کے خلاف بغاوت کر کے خود ہی چائے برطانوی عوام تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تو شیوان دل و جان کے ساتھ لندن کی ایکشن کمیٹی میں سرگرم ہو گئی تھی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی وہ سرگرم رکن تھی۔ عدیس آبابا میں ڈاکٹر ہملٹن کے فسٹیولا اسپتال کے لیے وہ سارا سال چندہ جمع کرتی رہتی تھی۔ شیوان ایک خوب صورت عورت ہی نہیں تھی بلکہ ایک خوب صورت دل و دماغ کی بھی مالک تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یورپ میں ایک تیسری دنیا کی عورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔

پاکستان سے میرا تعلق ختم ہی ہو گیا تھا۔ مجھے نجمہ کی شادی کی خبر ملی تھی۔ ابا جان اور امی کا انتقال ہوا تو پھر کراچی سے، پاکستان سے تمام رشتے ہی ٹوٹ گئے۔ رشتوں کے ٹوٹنے کے باوجود پاکستان سے ایک رشتہ قائم تھا۔ ریڈیو پر

پاکستان کے بارے میں خبریں آتیں تو میں سنتا ضرور تھا، ٹیلی وژن پر پاکستان کے بارے میں پروگرام ضرور دیکھے جاتے تھے اور اخبارات کی خبریں اور تجزیے پابندی سے پڑھتا تھا۔ بھارت اور پاکستان کی جنگ ہوئی، مشرقی پاکستان بنگلا دیش بن گیا، ہندوستان ایٹم بم کا دھماکا کر بیٹھا، پاکستان بھی بم بنا رہا ہے، پاکستان میں فوج آ گئی وغیرہ وغیرہ ہر خبر کی اہمیت تھی۔ رشتوں کے ٹوٹنے کے بعد ایک اور ہی عجیب قسم کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ کبھی کوئی پرانا کلاس فیلو ملتا تو پاکستان کی باتیں ہوتی تھیں۔ کشمیریوں کے حقوق کی باتیں اور دنیا کی ناسمجھی کا رونا۔ پاکستان سے رشتہ دلچسپ بھی تھا اور عجیب بھی۔ ایٹمی جنگ کے خلاف ہونے کے باوجود اس وقت میرا خیال تھا کہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے پاس بھی ایٹم بم ہونا چاہیے۔

میں اور شیوان زندگی کا بھرپور لطف اٹھا رہے تھے۔ دو بچے تھے ہمارے، زندگی کامیاب تھی، خوشیاں جیسے ہمارا مقدر بنی ہوئی تھیں۔ زندگی سے مزید کچھ اور مانگا نہیں جا سکتا تھا۔

سال میں دو چھٹیاں ہم لوگ ضرور مناتے تھے، ایک دفعہ تیسری دنیا کے کسی غریب ملک میں اور ایک دفعہ یورپ امریکا کی کسی خوب صورت جگہ پر۔ شیوان کا خیال تھا کہ بچوں کو ہر طرح کی جگہ دکھانی چاہیے۔ اس دفعہ ہم لوگ عدیس آبابا گئے تھے، عدیس آبابا کا ہزاروں سال پرانا شہر جہاں ڈاکٹر ہملٹن کا فسٹیولا کا اسپتال بھی تھا۔ یہ اسپتال افریقا کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کی پناہ گاہ تھی۔ افریقا کے ان علاقوں میں جہاں نہ ڈاکٹر ہیں، نہ مڈوائف، نہ اسپتال ہیں اور نہ ہی زندہ رہنے کی سہولتیں۔ غربت کا ناگ ہے جس کے ڈسے ہوئے لوگ زندگی گزارتے نہیں بھگتاتے ہیں۔ ایسی جگہوں سے جہاں جوان لڑکیاں شادی کے بعد حمل کے دوران بچے جنم دینے میں ناکام ہو جاتی ہیں اور جب مرا ہوا سڑا ہوا بچہ کئی دنوں کے بعد پیدا ہوتا ہے تو پیشاب کی تھیلی میں سوراخ بھی کر ڈالتا ہے۔ پھر تھوڑے دنوں بعد ہر وقت پیشاب رستی ہوئی یہ لڑکیاں، گھروں سے نکال دی جانے والی بیویاں نہ جانے کن کن راستوں سے ہوتی ہوئی اور کیا کیا فاصلے طے کر کے اس اسپتال میں آتی ہیں اور یہاں ان کا فسٹیولا، یہ سوراخ صحیح کیا جاتا ہے۔ میں نے ایسی ہی لٹی ہوئی لڑکیوں کو آتے ہوئے دیکھا، ان لٹی ہوئی لڑکیوں کے چہروں کی چھنی ہوئی مسکراہٹوں کو بھی واپس آتے ہوئے دیکھا۔ وہ تجربہ بہت حسین تھا۔ مجھے ہر دفعہ شدید احساس ہوا کہ شیوان کتنا بڑا کام کر رہی ہے۔ اس اسپتال کے لیے پیسا

سوری

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شوہر نے غلطی کی تو بیوی اس پر چلّانے لگی۔ شوہر نے فوراً کہا۔ "سوری!"
ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ بیوی نے غلطی کی تو شوہر اس پر چلّانے لگا پھر......؟
پھر کیا عورت شوہر کے چلّانے پر چیخنے لگی اور گھر سر پر اٹھا لیا شوہر نے دوبارہ کہہ دیا "سوری!"

جمع کرنے سے بڑی کوئی عبادت کیا ہو سکتی تھی؟ مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

پھر شیوان کے اسکول کی چھٹیوں میں ہم ہر سال ایتھوپیا جاتے تھے۔ دو ہفتے رضا کارانہ طور پر میں بھی اس اسپتال میں کام کرتا تھا۔ روزانہ پانچ چھ آپریشن میں بھی کر لیتا تھا۔ سال کے دو ہفتے کا یہ کام جتنی خوشیاں دے کر جاتا تھا، انگلستان میں سارا سال کام کر کے نہیں ملتی تھی۔ پھر انگلستان میں فسٹیولا کا مسئلہ تو تھا ہی نہیں۔ تیس پینتیس سال انگلستان میں گزارنے کے باوجود میں نے ایک بھی ایسا مریض یہاں نہیں دیکھا تھا۔ انگلستان اور یورپ کی عورتیں ذلت کی اس بیماری سے سالوں پہلے نجات حاصل کر چکی تھیں۔ یہ بیماری تو افریقا اور ایشیا کے ان ملکوں کی عورتوں کا مقدر تھی جہاں دولت ہونے کے باوجود غربت ہے۔ جہاں کے میرے جیسے ڈاکٹر جو یہ آپریشن کر سکتے ہیں مگر وہ لندن میں کسی شیوان، کسی جوزفین کے ساتھ سکھ چین کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انگلستان نے مجھے بہت کچھ دیا تھا، شیوان میری زندگی تھی مگر نہ چاہنے کے باوجود یہ خیالات میرے دماغ میں آ جاتے تھے، اپنے ملک سے باہر رہ جانے والوں کا رشتہ کبھی ٹوٹتا نہیں ہے۔ یہ جیسے ناف کا رشتہ ہے جس کا نشان ساری زندگی کے بنیادی رشتے کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

ایک دن اسپتال میں نذیر سومرو ملنے آیا تھا۔ پاکستان کا یہ ڈاکٹر لندن یونیورسٹی میں ایک کورس کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ لندن میں ہی پاکستانیوں سے پیسے جمع کر کے لاڑکانہ کے اسپتال میں فسٹیولا کے آپریشن کے لیے ایک میڈیکل

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیمپ لگا رہا تھا۔ مجھے یہ پتا لگا تھا کہ پاکستان میں بھی لڑکیاں اس مرض کا شکار ہوتی ہیں۔ وہ اسی سلسلے میں مجھ سے ملا تھا۔

نذیر نے بتایا تھا کہ سندھ کے دیہاتوں میں کتنی ہی لڑکیاں ہیں جو فسٹیولا کے اس عذاب کے ہاتھوں زندہ درگور ہیں۔ نذیر کو پتا چلا تھا کہ میں ہر سال عدیس آبابا جا کر یہ آپریشن کرتا ہوں۔ اس نے مجھے دعوت دی تھی کہ میں تھوڑے دنوں کے لیے لاڑکانہ کے اس کیمپ میں مدد کروں۔ شیوان کا بھی یہی خیال تھا کہ ہمیں ضرور وہاں جانا چاہیے اور پھر ہم دونوں ہی نے اس کام کی ہامی بھرلی تھی۔ مجھے اس فیصلے کے بعد بڑی خوشی ہوئی تھی بالکل ایسی ہی خوشی جیسی کسی بہت اچھے دوست کا بہت پرانا قرض اتار کر ہوتی ہے۔

میرا اب پاکستان میں کوئی نہیں تھا۔ ابا جان، امی اور بڑے ابو کے انتقال کے بعد نجمہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اب کہاں ہے؟ دوست پاکستان میں کوئی رہا نہیں تھا۔ میڈیکل کالج میں میری کلاس کے دوست امریکا میں تھے یا انگلستان میں اور خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ پاکستان سے صرف خبروں کا تعلق تھا۔ ریڈیو کا ایک رشتہ اور ٹیلی وژن کا ایک واسطہ۔ پاکستان کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ تھا مگر میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں بھی لڑکیاں حمل کے دوران انہی تکالیف کا شکار ہوتی ہیں جو ایتھوپیا، تنزانیہ اور یوگنڈا کی عورتوں کا مقدر ہے۔ یہ تو قحط زدہ ملک ہیں، یہاں تو یہ ممکن ہوتا ہوگا، پاکستان میں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں افریقا کے صحراؤں اور جنگلوں سے آنے والی عورتوں کا علاج کرتا رہا اور سمجھتا رہا کہ پاکستان، ہندوستان غریب ممالک ضرور ہیں مگر وہاں یہ حال تو نہیں ہوگا۔ یہ خطۂ زمین تو بہت پرانا ہے۔ موئنجودڑو کے کھنڈروں سے لے کر اجنتا کے غاروں تک۔ افریقا کے وحشیوں سے بہت پرانی تہذیب ہے ہماری۔ ہندوستان کے پاس تو ایٹم بم بھی تھا اور پاکستان کی تیاریاں بھی مکمل تھیں۔ یورپ میں ہر ایک کو پتا تھا۔ اس کے باوجود افریقا جیسا حال...... میں نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا کہیں نذیر جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔

میں نے اور شیوان نے بھرپور تیاریاں شروع کردی تھیں۔ میں واپس کراچی جا رہا تھا جہاں میں اسکول اور کالج گیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں مجھے موئنجودڑو کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ ایک دن ضرور لاڑکانہ جا کر ہزاروں سال پرانے کھنڈر...... دیکھوں گا۔ اب یہ پرانا بہت پرانا خواب تعبیر پا رہا تھا۔ اب میں نہ صرف یہ کہ کراچی جا رہا تھا بلکہ موئنجودڑو اور لاڑکانہ بھی جا رہا تھا۔ اسی پاکستان میں جس کی جنگ کبھی پاکستانی پاکستان سے باہر لڑتے ہیں۔

کراچی کا کانٹی نینٹل ہوٹل ویسا ہی تھا۔ ویسا ہی صاف ستھرا، وہی دوستانہ ماحول ویسے ہی لذیذ کھانے۔ کالج کے زمانے میں کسی دوا کی کمپنی کی طرف سے ہونے والی دعوتوں میں، میں نے وہاں کھانا کھایا تھا یا کبھی چائے پی لی تھی مگر اس دفعہ ہم لوگ ٹھہرے ہی وہاں تھے۔ مہمان نوازی کا مزہ آ گیا تھا۔

دو دن کراچی میں رہنے کے بعد ہم لوگ لاڑکانہ چلے گئے تھے۔ موئنجودڑو ایئرپورٹ، موئنجودڑو کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔

موئنجودڑو میری اور شیوان کی توقعات سے کہیں زیادہ شاندار تھا۔ شیوان تو موئنجودڑو کے بارے میں بہت ساری کتابیں پڑھ کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ مجھے بھی کھنڈر...... دیکھنے کا بہت مزہ آیا تھا۔ ہزاروں سال پرانی تہذیب اپنی تمام تر شان و شوکت کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ وہ لوگ بہت عزت و شان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے گھر، ان کے اسکول، ان کی عبادت گاہیں، ان کا پانی کا نظام، ان کے گندگی کے نکاسی کے طریقے، ان کی عدالتیں، ان کے بازار، ان کا رہن سہن، ان کا طریق زندگی ہزاروں سال پہلے وہ اتنے ترقی یافتہ تھے، میں تو اش اش کر اٹھا تھا۔

لاڑکانہ اتنا ہی خراب تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس شہر سے تھوڑے سے فاصلے پر ہزاروں سال پہلے رہنے والوں نے جو شہر بسایا تھا یہ ان کے ہی بچوں کا دوسرا شہر ہے۔ گندگی کے ڈھیر، ابلتے ہوئے گندے پانی کے نالے، مکانوں کی بے سمت اور بے ترتیب قطاریں، ایک وہ شہر تھا جس کے کھنڈروں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہاں رہنے والوں کے نظام میں انصاف کو فوقیت رہی ہوگی۔ مجھے پاکستان آ کر یہ دھچکا لگا تھا۔ بھکاریوں سے اٹا ہوا ننگے پیر بھیک مانگتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے، دبلی پتلی فاقہ زدہ لڑکیوں، عورتوں کا ہجوم جو سرکاری اسپتال میں بے عزت ہونے کے لیے آتے ہیں۔ اتنی غربت...... میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس ملک کے اس شہر میں غربت و افلاس کا ننگا رقص دیکھ کر شیوان کے آنسو نکل آئے تھے۔ ایتھوپیا سے بدتر تھے لاڑکانہ کے غریب۔ کسی کو یہ بدحالی، یہ غریب، یہ مظلوم نظر نہیں آتے۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پچاس سے زائد جوان لڑکیوں کو جمع کیا ہوا تھا، نذیر نے آپریشن کے لیے۔ حمل کے دوران میں علاج نہ ہونے کی وجہ سے سب کی پیشاب کی تھیلیوں میں سوراخ ہو گئے تھے۔ ان سب کو گھروں سے نکال دیا گیا تھا۔ سب کی سب غریب تھیں۔ ذلتوں کی ماری ہوئی بے وقعت عورتیں، فاحشہ عورتوں سے بدتر...... پیشاب رستی ہوئی جادوگرنیاں۔ مجھے نذیر بہت اچھا لگا تھا جس نے پیسے جمع کیے تھے، لوگ جمع کیے تھے اور ان قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے آپریشن کا انتظام کیا تھا۔

صرف چار عورتوں کے علاوہ جن کے فسٹیولا اتنے بڑے تھے کہ ان کا آپریشن ممکن ہی نہیں تھا، باقی سب کے صبح سے شام تک روزانہ سات آٹھ آپریشن کر کے جتنے بھی سوراخ بن جانے کے قابل تھے، ان کو ہم لوگوں نے بنا دیا تھا۔ زلیخا آخری مریضہ تھی، مشکل سے پندرہ سال عمر ہوگی اس کی۔ لاڑکانہ شہر سے چالیس پچاس میل دور ایک اور شہر ہے شہدادکوٹ۔ شہدادکوٹ کے چاروں جانب چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں حاکم شاہ، بہرام، نوڈیرو، رتوڈیرو اور پناہ شیخ...... انہیں کے آس پاس سے آئی تھی وہ اپنی ماں کے ساتھ۔ دبلی پتلی کمزور چہرہ جو کبھی بہت خوب صورت رہا ہوگا، ہڈیوں کا ڈھانچا ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ کسی بچی کی اتنی ویران آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں۔ درد کی ایک ٹیس تھی جو میرے سینے میں اٹھی اور میری روح کو زخمی کرتے ہوئے، دور تک مجھے گھسیٹتی ہوئی لے گئی۔ وہ بارہ سال کی تھی تو اس کی شادی پینتیس سال کے ایسے زمیندار سے کردی گئی تھی جس کے پہلے ہی چھ بچے تھے۔ کچھ پیسوں کے عوض کچھ قرضے معاف کرانے کے لیے اس کے باپ نے اس زمیندار کے حوالے کردیا تھا۔ بارہ سال کی یہ گڑیا جس کے خود گڑیا سے کھیلنے کے دن تھے یکایک اپنے سے تین گنا عمر کے وحشی کی بیوی بن گئی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ تین دن تک گاؤں کی حویلی کے ایک کمرے میں حمل کے درد سے تڑپتی رہی، سسکتی رہی، بلکتی رہی۔ تین دن تک گاؤں کی دائیاں اس کے ساتھ وہ سب کچھ کرتی رہیں جو جانوروں کے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔ تین دن کے بعد ایک مرا ہوا متعفن بچہ پیدا ہوگیا تھا۔ پانچ دن کے بعد سے اس تیرہ سال کی بچی کا اپنے پیشاب پر اختیار ختم ہوگیا تھا۔ اس کا پیشاب مسلسل بہنا شروع ہوگیا۔ اسے فسٹیولا ہوگیا اور پھر زمیندار نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ اس کے قابل نہیں رہی تھی۔ گاؤں والوں کے خیال میں اس پر کسی جن کا سایہ تھا، وہ ناپاک تھی، اچھوت، نہ چھونے کے قابل۔

تیرہ سال سے پندرہ سال کی عمر تک اس کا پیشاب مسلسل بہتا رہا تھا۔ زندگی اس کے لیے نہ ختم ہونے والا ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گئی تھی۔ صرف اس کی ماں اس کے ساتھ تھی...... اس کے جنم کے گناہ کا بوجھ لیے ساتھ ساتھ ہر جگہ ذلتوں کا شکار ہونے کے لیے۔

دو گھنٹے کے معمولی آپریشن کے بعد وہ صحیح ہو گئی تھی۔ دوسرے دن وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے اور بستر بالکل خشک تھے، اس کی فاقہ زدہ خوب صورت چہرے کی ویران آنکھوں سے خوشی کے موتی چھلکنے کے لیے بے قرار سے تھے۔ شیوان نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کامیاب آپریشن کیا ہے۔

تین دن کے بعد ہم لوگ کراچی واپس آ گئے تھے۔ سارے ہی مریض ٹھیک تھے مگر مجھے سب سے زیادہ خوشی زلیخا کی تھی۔ چھ دن اور اس کو اسپتال میں رہنا تھا، پھر اس کے بعد وہ اپنی زندگی کی خود مالک ہوگی۔ ایک نارمل لڑکی کی طرح جس کا جسم مکمل ہوتا ہے۔ کانٹی نینٹل ہوٹل سے ہی میں نے چھ دن بعد لاڑکانہ فون کر کے زلیخا کا حال پوچھا تھا۔ وہ ٹھیک تھی، زخم بھر چکے تھے۔ وہ گھوم پھر رہی تھی، پیشاب رسنا بند ہو گیا تھا۔ اس کی خوشی کا اندازہ ہر کوئی نہیں کرسکتا۔

شام شیوان کے ساتھ مارکوپولو میں بیٹھے ہوئے تازہ پھلوں کے رس کی چسکی لیتے ہوئے ہم دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ خنجر کے زخم کی طرح وہ خبر آئی اور ہم دونوں کو چھلنی کرتے ہوئے چلی گئی...... پاکستان نے چاغی میں اپنے ایٹم بم کا دھماکا کردیا تھا...... پوکھران کے جواب میں۔ کراچی کے کسی اخبار کا سپلیمنٹ ریسٹورنٹ کے میز پر پڑا ہوا تھا۔ شیوان کا فق چہرہ سامنے تھا، میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

زلیخا جیسی ہزاروں لڑکیاں گرد و طوفان کے اس بادل کے پیچھے چاغی کے پہاڑوں پر سسکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ یہ بم تو اپنی قیمت وصول کرے گا، بہت ساری زلیخاؤں کو پامال کرے گا، بارہ سال کی بچیاں لٹتی رہیں گی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ بم کا دھماکا نہیں تھا، بارہ سالہ بچیوں کی عروسی رات کی دل خراش چیخیں تھیں۔ وہ چاغی کا پہاڑ نہیں تھا بلکہ پاکستان کی دھرتی پر بننے والا ایک بہت بڑا فسٹیولا تھا۔ بے بسی اور شدید دکھ کا ایک احساس مجھ پر امڈتا آ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

محی الدین نواب

گر قبول افتد

یوں تو کائنات میں ہر کوئی کسی نہ کسی سے برسرپیکار نظر آتا ہے مگر... جب ذہانت اور شرارت محاذ آرائی پر کمربستہ ہوجائیں یا ان کا آپس میں یارانہ ہوجائے تو کیسے ممکن ہے کہ چونکا دینے والی داستانیں رقم نہ ہوں۔ ایجادات سہولیات کے نظریے پر عمل میں آتی ہیں مگر... عیش پسندی کے ہاتھوں مجبور کب کسے یہ سوچنے کی فرصت کہ اس کا استعمال صحیح ہے یا غلط۔ دھماکا تو تب ہوتا ہے جب زندگی کسی بڑے سانحے کا شکار ہوکر کوئی نیا رخ نہ اختیار کرلے... ان کے رستوں کی سمت بھی اچانک بدل گئی تھی، دھند نے گویا تمام نشانیوں کو لپیٹ میں لے لیا تھا... ایسے میں منزل کا تعین نہیں کیا جاتا بلکہ پڑاؤ پر ہی سمجھوتے کرلیے جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک آزمائش سے انہیں بھی گزرنا پڑا جب دل مدھر تالوں پر دھڑکتے دھڑکتے اچانک طوفان کی زد میں آجائے تو سارے موسم اپنا اثر کھو دیتے ہیں۔ بھنور میں فقط کناروں کی تلاش کا احساس باقی رہتا ہے... موجوں کی مستی دل ودماغ سے اتر جاتی ہے۔ اس رات بھی طوفان آیا اور گزر گیا۔ طلوع سحر نے جو منظر واضح کیا اس میں کچھ بھی تو اپنی جگہ نہ تھا... اس کے باوجود جینا بہت ضروری تھا.. جو بھی تھا اور جیسا بھی نظر آتا تھا قبول تو کرنا تھا۔

قیمتی لمحات گنوا کر سرابوں کا تعاقب کرنے والے چند عقلمندوں کی روداد

WWW.PAKSOCIETY.COM

رات اندھیری تھی اور وہ اسی اندھیرے کا لباس پہن کر نکل پڑا تھا۔ یہ سیاہ لباس کی خاصیت ہے' اندھیرے میں آسانی سے چھپائے رکھتا ہے اور رات بھی بڑی گناہ پرور ہوتی ہے، گناہ گاروں کے بچ نکلنے کی راہیں ہر سمت سے ہموار کرتی رہتی ہے۔

اسے یقین تھا کہ راضی کے گھر تک راستہ ہموار ہے، وہ ابھی جائے گا اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر صبح تک واپس آجائے گا۔ نوجوانی میں خواہشات ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ایک ہی آرزو مچلتی ہے کہ شادی سے پہلے چپ چاپ شادی منالی جائے۔ نہ مایوں، نہ مہندی، نہ برات نہ ڈھول تاشے اور سہاگ رات کی ریہرسل ہوجائے۔

پرابلم یہ ہے کہ شرافت سے ازدواجی رشتہ قائم کرنے کے لیے لڑکوں کو ڈھنگ کی لڑکیاں نہیں ملتیں اور لڑکیوں کو نیک سیرت مجازی خدا نصیب نہیں ہوتے۔ کسی کو شریک حیات بنانے کے لیے اور کسی کو شوہر بنانے کے لیے بڑے شریف گھرانوں کی اور شجروں کی چھان پھٹک کرنی پڑتی ہے۔ ریہرسل کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا۔ ایک زمانہ تھا' جب کسی کی نگاہوں میں سمانا اور دل میں پہنچنا مشکل ہوتا تھا۔ اب موبائل فون نے بڑی آسانیاں پیدا کردی تھیں۔

راضی سے رانگ نمبر کے ذریعے ہی شناسائی ہوئی تھی۔ موبائل فون ایجاد کرنے والے سدا جئیں۔ گھر بیٹھے لڑکیوں کو اور لڑکوں کو ایک مس کال کے ذریعے رازداری سے ملادیتے ہیں۔

اسے راضی مل گئی تھی۔ نام اس کا رضیہ جمیل تھا۔ رضیہ پرانے دور کا نام ہے۔ وہ نئے حالات میں راضی ہوگئی تھی۔ وہ رات ایک بجے گھر سے نکلا تھا۔ آدھی رات کے بعد دنیا تقریباً سوجاتی ہے۔ اس نے بھی باپ کے سونے کا انتظار کیا تھا۔ اس سے بڑی ایک جوان بہن نبیلہ تھی، جب تک وہ نہ سوتی تب تک کسی دوسرے کی بہن سے جاکر رات کالی نہیں کرسکتا تھا۔

بڑی مجبوریوں سے اور مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ کراچی جیسے شہر میں فاصلے اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنی موٹر سائیکل پر فراٹے بھرتے ہوئے پچیس پچاس کلومیٹر تک گھنٹا بھر میں پہنچ سکتا تھا۔

لیکن اس رات چور بن کر نکلا تھا۔ شور مچانے والی گاڑی استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ ایک آٹو رکشا میں بیٹھ کر لیلیٰ کی گلی سے کچھ دور آکر اتر گیا تھا۔ آگے دو تاریک گلیاں تھیں، پھر تیسری گلی میں اس کا مکان تھا۔ کڑاکے کی سردی میں گلیاں سنسان تھیں۔ کتے بھی کہیں دبک کر سو رہے تھے۔ نائٹ چوکیدار "جاگتے رہو" کی صدائیں لگا کر وہاں سے گزر گیا تھا۔

اس نے تیسری گلی میں آکر دیکھا۔ مکانات ایک قطار میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور ایک جیسے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مکان نمبر ایک سو چار میں اس کی منتظر ہوگی۔

دیواروں پر لکھے ہوئے نمبر کہیں مٹے ہوئے تھے کہیں ذرا جھلک رہے تھے۔ کسی کے بھی دروازے پر نمبر اور نیم پلیٹ نہیں تھی۔ اس نے ایک دیوار کی آڑ میں ہوکر راضی کو ایس ایم ایس کیا۔ "میں آگیا ہوں۔ یہاں گھروں کے نمبر مٹے ہوئے ہیں۔"

اس نے جواباً لکھا۔ "ہمارے گھر کا دروازہ سبز رنگ کا ہے اور ایک ٹوٹا ہوا پان سگریٹ کا کیبن وہاں پڑا ہے۔"

اس نے فون کی اسکرین پر سے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سامنے ہی پتلی سی گلی کے دوسری طرف وہ دروازہ دکھائی دیا۔ اس نے اسکرین پر لکھا۔ "میں ابھی دیوار پھاند کر اندر آؤں گا۔ کیا اندر کا دروازہ کھلا رکھو گی؟"

"کوشش کرتی ہوں۔ ابھی کمرے سے نکل کر باہر والے دروازے تک جانے کی ہمت کروں گی۔ تم نے تو کہا تھا' تار کے ذریعے لاک کھول لیتے ہو۔"

"ہاں مگر وقت لگے گا۔ تم آکر کھولنے کی کوشش کرو۔ میرے لیے آسانی ہوگی۔ بس میں آرہا ہوں۔"

اس نے فون بند کرکے اسے جیب میں رکھ لیا۔ ان دونوں نے ابھی ایسے باتیں کیں جیسے آمنے سامنے ہوں۔ کوئی انہیں دیکھنے سننے نہیں آیا۔ گھر والے یہ معلوم نہیں کرسکیں گے کہ موبائل فون کے خاموش میسج کس طرح مقفل دروازے بھی کھلوادیتے ہیں۔

اس مکان کی دیوار کے پار ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ اس کے بعد ایک دروازہ تھا۔ اسے رات کو بند کرنے کے بعد کوئی بھی چور صحن میں تو آسکتا تھا لیکن مکان میں نہیں گھس سکتا تھا۔ صحن کے اس دروازے کے پاس ایک کمرے میں بڑے میاں رہتے تھے۔ ان کے لیے ٹوائلٹ صحن میں بنا ہوا تھا۔ اس وقت وہ جاگ رہے تھے۔ ایک ذرا ہولے ہولے کراہتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر صحن کے اس دروازے کو کھول کر باہر آئے پھر ٹوائلٹ میں چلے گئے۔

ایسے ہی وقت وہ دیوار پھاند کر صحن میں آگیا۔ وہاں چند لمحوں تک دم سادھے کھڑا رہا۔ آس پاس کا

جائزہ لینا ضروری نہیں تھا۔ سامنے ہی کھلے ہوئے دروازے نے زبان بے زبانی سے کہا۔ "خوش آمدید۔ راضی اسے کھول کر گئی ہے۔"

اس نے اندر آتے ہی صحن کے دروازے کو بند کردیا۔ ہائے نادانی میں کیا، کیا ہوتا ہے؟ اس نے گھر کے مالک کو باہر کردیا تھا۔ خود پنجرے میں قید ہوگیا تھا۔

وہ جہاں بھی پہنچا تھا۔ "صیاد اپنے دام میں خود آگیا تھا۔" بچارا بہت ہی خوبصورت شکار کھیلنے آیا تھا اور پھندا اپنے گلے میں ڈال چکا تھا۔ ابھی بڑے میاں باہر سے دستک دینے والے تھے۔ اب تو وہاں جو ہوتا ہے' وہ تو ضرور ہوگا لہٰذا تماشا دیکھنے کی جلدی کیوں کی جائے کیوں نہ اس داستان عبرت کو اپنے پہلے باب سے شروع کیا جائے...!

☆☆☆

کاشف اکبر تاریخ پیدائش کے مطابق اٹھارہ برس کا تھا لیکن موجودہ دور کے بچے اٹھارہ برس کے نوخیز جوان ہو نہیں پاتے اور انہیں ٹی وی کے بے باک پروگرام اور انٹرنیٹ کی بے لگام معلومات اٹھارہ برس سے اچھال کر اٹھائیس برس کا پختہ جوان بنادیتی ہیں۔

چھلانگ مارنا آجائے تو بچے اپنی عمر سے آگے سوچتے ہیں اور اپنی ذہانت سے زیادہ خود کو ذہین سمجھتے ہیں۔ باپ اسے غلطیوں پر ٹوکتا تھا اور بیٹا کہتا تھا' پرانے دور کے لوگ حالات کے مطابق نہ خود بدلتے ہیں نہ اولاد کو اپنے دور کے مطابق چلنے دیتے ہیں۔

بڑی بہن نبیلہ نے کہا۔ "ابو! کاشف سے موبائل فون چھین لیں۔ یہ آدھی رات کے بعد بھی ایس ایم ایس کے ذریعے گونگی گفتگو کرتا رہتا ہے۔"

ان دنوں تین لڑکیوں سے کاشف کی موبائل فرینڈشپ تھی۔ باپ نے دیکھا تھا، وہ دن رات اپنے فون سے لگا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے پوچھا۔ "تم پڑھتے وقت کسے میسج دیتے رہتے ہو؟"

اس نے بات بنائی۔ "جو سوالات سمجھ میں نہیں آتے' وہ میں دوستوں سے پوچھتا رہتا ہوں۔"

جو بھی نشہ حاوی ہوجاتا ہے۔ اسے جاری رکھنے کے لیے جھوٹ بولنا اور فریب دینا آجاتا ہے۔ فی زمانہ موبائل فون ایسا نشہ ہے جو کمسن جوانوں کو آپ ہی آپ لگ جاتا ہے اور والدین سمجھ نہیں پاتے کہ یہ بچوں کو دن رات مصروف رکھنے والا ننھا سا آلہ ان کی ذہانت کو اور تعلیمی صلاحیتوں کو کھا رہا ہے۔

ایک رات وہ ایس ایم ایس کے ذریعے خاموش گفتگو کرتے کرتے سوگیا۔ بڑی بہن نبیلہ نے چپکے سے فون اٹھا کر وہ ساری گفتگو پڑھی پھر اپنے باپ کو پڑھائی۔ باپ نے سر پکڑ لیا۔

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ بیٹے پر اندھا اعتماد کررہا ہے۔ اس نے دوسرے دن اسے خوب باتیں سنائیں۔ فون چھین کر رکھ لیا۔ ان دنوں کاشف نویں جماعت میں تھا۔

باپ نے کہا۔ "جب تک اے گریڈ میں نویں اور دسویں پاس نہیں کروگے، یہ فون تمہیں نہیں ملے گا۔ باہر گھومنے پھرنے کی بھی آزادی نہیں ہوگی۔ صرف اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلو گے۔"

وہ بہت تلملایا' جھنجلایا۔ ہاتھ پاؤں پٹختا رہا۔ لیکن باپ نے ایک نہیں سنی۔ وہ فون ایسا نشہ تھا جس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔ ایک نہیں تین موبائل زادیاں اسے پکارتی رہتی تھیں۔

ان میں سے دو ایسی تھیں جن سے دن کے وقت باتیں ہوا کرتی تھیں۔ تیسری راضی تھی، وہ آدھی رات کے بعد اس سے رابطہ کرتی تھی۔

راضی کی مجبوری یہ تھی کہ ان دنوں اس کے پاس اپنا فون نہیں تھا۔ جب اس کی ماں گہری نیند سوجاتی تو وہ میسج کے ذریعے خاموش گفتگو کرنے کے لیے چوری چوری اس کا فون استعمال کرتی تھی اور جو میسج اسے دیتی تھی۔ اسے مٹاتی رہتی تھی تاکہ کبھی چوری پکڑی نہ جائے۔

کاشف کو اپنے فون سے محروم ہوکر یوں لگ رہا تھا کہ باپ نے اس کے اندر سے کلیجا نکال لیا ہے۔ ایسا ظالم باپ تو کوئی نہ ہوگا۔ اس بوڑھے نے جوان بیٹے سے ایک نہیں تین ہونے والی بہوئیں چھین لی تھیں۔

کسی غلط مقصد کے لیے ذہانت کو استعمال کیا جائے تو ذہن بڑی تیزی سے کام کرتا ہے۔ اسی رات کاشف کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ بھی راضی کے طریقہ کار کے مطابق یہ عمل کرے، جب باپ سوجائے تو اس کے سرہانے سے فون کھینچ کر راضی سے خاموش گفتگو کرے پھر وہ تمام ایس ایم ایس مٹا کر فون واپس تکیہ کے نیچے رکھ دیا کرے۔

ادھر راضی نے آدھی رات کے بعد کاشف کے نمبر پر میسج دیا تو جواب موصول نہیں ہوا۔ باپ نے بیٹے کے اس فون کا سوئچ آف کردیا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی، ماں کے خاموش فون کو تکنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گی۔ یہ اندیشہ بھی رہتا تھا کہ کبھی ماں کی آنکھ نہ کھل جائے۔ چوری تو پھر چوری ہوتی ہے، کسی نہ کسی دن پکڑی جاتی ہے۔

ایسا ایک آدھ بار ہوا تھا۔ کبھی کروٹ بدلتے وقت یا واش روم جانے کی ضرورت سے ماں کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ فوراً ہی بٹن دبا کر فون کو آف کر کے اپنے بستر پر آ گئی تھی۔

چوری چھپے عشق کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ نیا مسئلہ درپیش تھا کہ کاشف کے فون سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔

وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ کاشف کی کوئی مجبوری ہوگی۔ شاید تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوگا اور واقعی ایک گھنٹے بعد اس نے ماں کے فون کی اسکرین کو روشن ہوتے دیکھا۔ فوراً ہی لپک کر اٹھایا تو اسکرین پر کسی کے میسج کی اطلاع تھی۔

اس نے ماں کو دیکھا۔ اتنی رات کو کبھی کسی رشتے دار کا میسج ماں کے پاس نہیں آتا ہے۔ اس نے بٹن کو دبایا تو اسکرین پر لکھا تھا، میں ہوں کاشف...

وہ خوش ہوگئی۔ کاشف اسے روداد غم سنا رہا تھا کہ باپ نے اس سے فون چھین لیا ہے لہٰذا کچھ روز باپ ہی کے فون سے رابطہ کرے گا۔ پھر نیا فون خرید کر اسے چھپا کر رکھا کرے گا۔ جلد ہی یہ رکاوٹ دور ہو جائے گی۔

اس نے لکھا۔ ''تم بہت اچھے ہو۔ مجھے دل و جان سے چاہتے ہو اسی لیے میں تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔''

''میں بھی تم سے سچ بولتا ہوں۔ تم سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا۔''

''تم نے ایک بار جھوٹ کہا تھا کہ تمہارے پاس ٹویوٹا کار ہے اور میں نے ایک نہیں کئی بار تمہیں موٹر سائیکل پر دیکھا تھا۔''

''مجھے غلط نہ سمجھو۔ میرے پاس ٹویوٹا تھی۔ ابو کو اچانک رقم کی ضرورت پیش آئی تو میں نے بیچ دی۔ ویسے یہ سراسر زیادتی ہے کہ تم نے برقعے میں چھپ کر مجھے کئی بار دیکھ لیا۔ میں آج تک تمہارے دیدار سے محروم ہوں۔''

''میں مجبور ہوں۔ امی ابو کے ساتھ گھر سے نکلتی ہوں۔ مجھے کسی سہیلی کے ساتھ بھی باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔''

''تم اپنی ایک تصویر Send کر سکتی ہو۔''

''سوری، میں تم سے کہہ چکی ہوں۔ جب تک تمہارے گھر والے رشتہ مانگنے نہیں آئیں گے۔ جب تک ہمارا رشتہ پکا نہیں ہوگا۔ میں تصویر Send نہیں کروں گی۔

تم خود سوچو اگر رشتہ نہ ہوا تو میری تصویر تمہارے جیسے ایک پرائے شخص کے پاس ہوگی اور میں رسوائیوں کے اندیشوں میں مبتلا رہوں گی۔''

''میں ابھی ابو سے تمہارا رشتہ مانگنے کی بات نہیں کر سکتا۔ ابھی نویں جماعت میں ہوں۔ عمر کا 17 واں سال شروع ہوا ہے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں دسویں پاس کروں گا پھر آگے بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہے گا۔ گریجویشن سے پہلے شادی کی بات کروں گا تو ابو گھر سے نکال دیں گے۔''

ایسی باتیں کرتے وقت جوانوں کو اس غلطی کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنی عمر سے بہت پہلے عشق و محبت کی حماقت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان کی عقل کہتی ہے ابھی تو جو مل رہی ہے اس کے ساتھ لائف انجوائے کرتے رہیں۔

کاشف یہی شکایتیں کرتا رہتا تھا کہ ہم کب تک فون سے بہلتے رہیں گے۔ کب تک تمہیں دیکھے بغیر ایک اندھے کی طرح تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ کوئی راستہ تو نکالو۔ ایک بار تو مجھ سے ملو۔ اپنا ہاتھ تو پکڑنے دو۔

ہاتھ پکڑنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ پوری کی پوری پکڑی جاتی۔ وہ نادان نہیں تھی۔ شادی سے پہلے ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی۔ اسے باتیں بنا کر ٹالتی رہتی تھی۔

باقی دو موبائل زادیاں بھی تھیں۔ کاشف ان سے بھی یہی مطالبہ کرتا رہتا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام اریبہ تھا، دوسری کا نام سعدیہ۔ انہوں نے اس سے پردہ نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھی اس سے پبلک پارک میں اور ریستوران میں ملتی رہتی تھیں۔

اور وہ تنہائی میں ملنے کو کہتا تھا۔ وہ بھی اس مطالبے کو رد کرتی تھیں۔ کہتی تھیں ہمارے پاس آبرو کا ایک ہی سرمایہ ہے اور وہ اپنے جیون ساتھی اپنے مجازی خدا کے لیے ہے۔ مجازی خدا بن جاؤ اور ہمیں لے جاؤ۔

اس کی عمر ہی کیا تھی کہ وہ مجازی خدا بن جاتا۔ الیکٹرانک میڈیا نے اور موبائل فون نے اسے خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ گبرو جوان ہے۔ خوش فہمی جڑ پکڑ لے تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اگر فون نہ ہوتا اگر لڑکیاں رانگ نمبر کے راستے نہ آتی رہتیں تو رفتہ رفتہ خوش فہمی ختم ہو جاتی۔

دسویں جماعت تک سعدیہ کی شادی ہوگئی۔ اس نے اپنے فون کی سم بدل دی۔ اس کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے گم ہوگئی۔ اریبہ نے بھی اچانک کسی وجہ سے اپنے فون کی سم بدل دی۔ کچھ کہے سنے بغیر موبائل فون کے سحر سے نکل گئی۔ صرف راضی رہ گئی۔

وہ مایوس ہونے والا نہیں تھا۔ کبھی کبھی رانگ نمبر پنچ کرتا رہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسی راستے سے اور دوسری تیسری آجائیں گی۔ راضی سے برابر ضد کرتا رہتا تھا کہ اسے روبرو آنا چاہیے۔ وہ اسے دیکھے بغیر اندھا بن کر محبت نہیں کرے گا۔

راضی نے اس حد تک تسلیم کیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ کوئی بھی اندھا بن کر کسی لڑکی کو دیکھے بغیر پسند نہیں کرتا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس کے روبرو آئے گی۔

اس نے پوچھا۔ ''کب آؤ گی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہمارے گھرانے میں لڑکیوں سے سخت پردہ کرایا جاتا ہے۔ میں کوئی تدبیر سوچ رہی ہوں۔ ایک آدھ روز میں جواب دوں گی۔''

بعض لڑکیاں اپنے معاملات میں بہت سمجھ دار ہوتی ہیں۔ کسی مرد سے ملنے کے معاملے میں بہت محتاط رہتی ہیں۔ راضی تو کچھ زیادہ ہی محتاط تھی۔

اس نے موبائل فون کے ذریعے کسی سے دوستی کرنے سے پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ کسی کو اپنا نام اور گھر کا پتا نہیں بتائے گی اور حتی الامکان اس کے سامنے بھی نہیں آئے گی۔ خود کو اور والدین کو ممکنہ ناگہانی بدنامیوں سے محفوظ رکھے گی۔

وہ یہی کر رہی تھی۔ اس کا نام کچھ اور تھا۔ اس نے کاشف کو رضیہ جمیل بتایا تھا۔ گھر کا پتا کبھی بتانے والی نہیں تھی اور پردے کی پابند تو تھی ہی نہیں۔ کئی بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ ریسٹورنٹ میں اور شاپنگ سینٹر وغیرہ میں کاشف کے سامنے آچکی تھی۔ یوں الو بنانے کے سلسلے میں یہ موبائل فون کا کمال تھا۔ وہ پردہ بھی کر رہی تھی اور جلوہ نما بھی تھی۔

کاشف نے بھی اس سے جھوٹ بولنے اور اسے دھوکے میں رکھنے کے سلسلے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ ٹویوٹا کار کا جھوٹ خود راضی نے کھول دیا تھا۔ اس کے باقی جھوٹ اور فریب کو جانتے ہوئے بھی انجان رہی تھی۔

اس نے کہا تھا کہ ڈیفنس میں کوٹھی ہے۔ جبکہ ناظم آباد میں رہتا تھا۔ ایسے جھوٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سنجیدگی سے محبت نہیں کر رہا تھا اور نہ آئندہ شادی کرے گا۔

صاف ظاہر تھا کہ فلرٹ کر رہا ہے۔ پہلی پہلی جوانی کے تقاضوں کے مطابق جوانی کے دن اور مرادوں کی راتوں کو انجوائے کرنا چاہتا ہے۔

راضی اس کی خود غرضی اور مطلب پرستی کو سمجھنے کے باوجود اس میں دلچسپی لے رہی تھی یعنی اس کی طرح فلرٹ کر رہی تھی۔ کاشف اسے وقت گزارنے کی حد تک بہت اچھا لگتا تھا۔ بہت ہی دلچسپ باتیں کرتا تھا۔ وہ خوب انجوائے کرتی رہتی تھی۔

راضی نے اچھا وقت گزارنے کے لیے اسے دل میں بٹھا رکھا تھا۔ اس نے دوسرے دن کہا۔ ''کل میں امی اور ابو کے ساتھ شاپنگ کے لیے حیدری مارکیٹ جاؤں گی۔ وہاں تم مجھے دیکھ سکو گے۔''

اس نے کہا۔ ''یوں دور سے دیکھ کر پیاس اور بڑھے گی، میں تم سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''فی الحال میری صورت دیکھنے کی یہی ایک صورت ہے۔ تمہاری یہ شکایت دور ہو جائے گی کہ تم نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔ تم اندھے عاشق نہیں کہلاؤ گے۔''

''تم سخت پردے میں رہتی ہو۔ اپنے والدین کے ساتھ برقعے میں رہو گی؟''

''وہ تو رہنا ہی ہوگا۔''

''پھر کیا تمہیں خاک دیکھوں گا۔ تم تو نقاب میں رہو گی۔''

''تم دیکھ سکو گے۔ میں عبا پہنوں گی مگر چہرے پر نقاب نہیں ہوگا۔''

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ ''چلو مٹھائی نہ سہی۔ گڑ ہی مل جائے۔ پہلی بار اپنی جان کو دیکھ سکوں گا۔''

وہ بولی۔ ''مجھے دیکھ کر مایوس ہو جاؤ گے۔ میں خوبصورت نہیں ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''کوئی بھی لڑکی چاہے کتنی ہی گئی گزری ہو، خود کو خوبصورت ضرور سمجھتی ہے اور جو تمہاری طرح خوبصورت ہوتی ہیں وہ کسر نفسی سے کام لے کے خود کو معمولی کہتی ہیں۔''

راضی نے ہنستے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔ ہنسی اس بات کی تھی کہ وہ کئی بار اسے دیکھ چکا تھا اور اس بات پر بھی تھی کہ وہ دوسرے دن حیدری مارکیٹ میں اسے دیکھ نہیں پائے گا۔

یہ تو ابتدائے عشق سے طے کر چکی تھی کہ اپنا نام، پتا ٹھکانا نہیں بتائے گی اور نہ کبھی صورت آشنا ہوگی۔ اس کی ایک ہم عمر لڑکی پڑوس میں رہتی تھی۔ اس کا نام حدیقہ تھا۔ راضی کے مکان کا نمبر ایک سو تین تھا اور پڑوسن کے مکان کا نمبر ایک سو چار تھا۔ پڑوسن نے اسے بتایا تھا کہ وہ دوسرے دن شاپنگ کے لیے حیدری مارکیٹ جائے گی۔

حدیقہ کو عبا پہننے کا شوق تھا۔ وہ باقاعدہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ مارکیٹ میں خریداری کے وقت چہرے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

نقاب ہٹا دیا کرتی تھی۔ یہ بات راضی اچھی طرح جانتی تھی۔

حدیقہ کی یہ عادت فلرٹ کرنے اور دیدار کرنے والوں کے لیے موافق تھی۔ کاشف اسے راضی سمجھ کر مطمئن ہو جاتا۔ اس نے پوچھا۔ ”مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ اتنی بڑی مارکیٹ میں تم کہاں ہو؟ اور یہ کیسے جان سکوں گا کہ وہ عبا والی تم ہی ہو؟“

راضی نے کہا۔ ”میری ایک سہیلی مجھ سے ذرا دور رہ کر مجھے دیکھتی رہے گی وہ تمہیں فون کے ذریعے بتائے گی کہ میں اپنے والدین کے ساتھ کہاں ہوں؟“

دوسرے دن یہی ہوا۔ کاشف نے شیو کیا۔ نیا لباس پہنا پھر اچھی طرح بال سنوار کر حیدری مارکیٹ پہنچ گیا۔ راضی اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجنوں کو مارکیٹ میں بھٹکتے دیکھا۔ ایک سہیلی ثمینہ نے راضی کی ہدایت کے مطابق فون پر پوچھا۔ ”کیا تم مارکیٹ میں ہو۔“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ کیا تم راضی کی سہیلی ہو؟“

”ہاں۔ راضی اِدھر کپڑوں کی دکان میں ہے، یہاں آؤ۔“

وہ متلاشی نظروں سے دیکھتا ہوا راضی کے ہی پاس آ کر رک گیا۔ جس کے دیدار کے لیے آیا تھا اسے نظر انداز کر کے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔

اس کی سہیلی نے فون پر کہا۔ ”کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی کوئی چیز اپنے ہی سامنے ہوتی ہے اور ہم اسے دور ڈھونڈتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”ہاں، دل ہمارا ہی ہوتا ہے، سینے میں رہتا ہے لیکن کوئی لے جائے تو اسے باہر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔“

”تم پکے عاشق ہو۔ اُدھر دیکھو۔ ایک دکان میں سفید ڈاڑھی والے بڑے میاں ایک صندوقچی کے پاس بیٹھے ہیں۔ دو جوان لڑکے عورتوں کے سامنے کپڑوں کے تھان کھول کھول کر دکھا رہے ہیں۔ ان عورتوں کے درمیان ایک ہی لڑکی نے عبا پہن رکھی ہے۔ وہی میری سہیلی راضی ہے۔“

وہ دکان کے قریب جا کر اسے دیکھنے لگا۔ حدیقہ کے چہرے پر نقاب نہیں تھا۔ کھلتا ہوا چہرہ پھول کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ اس حد تک قبول صورت تھی کہ پہلی نظر میں پسند آ جاتی۔ وہ خوش ہو گیا۔

وہ وہاں ٹھہر کر اسے دیکھتے رہنے کے لیے اس دکان کا خریدار بن گیا۔ اپنے لیے کپڑا پسند کرنے لگا۔ حدیقہ نے یونہی ایک بار اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے جذباتی انداز میں مسکرایا۔ وہ بیچاری گڑبڑا گئی، فوراً ہی دکاندار کی طرف دیکھ کر مول تول کرنے لگی۔

راضی نے ثمینہ سے کہا۔ ”اسے وہاں سے ہٹایا جائے ورنہ ہمارا فراڈ کھل جائے گا۔“

سہیلی نے اسے کال کی، وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”تھینک یو۔ تمہاری وجہ سے آج میں نے راضی کو دیکھا ہے۔ وہ بہت محتاط ہے۔ اس نے میری طرف ایک ہی بار دیکھا ہے۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی ہے۔“

”پلیز، اس کے پیچھے نہ پڑ جاؤ۔ اس کی امی ابو کو شبہ ہو گا تو وہ فوراً اسے نقاب میں چھپا کر گھر چلے جائیں گے۔ بیچاری کو کھلی فضا میں سانسیں لینے دو۔“

”میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تم ابھی مارکیٹ میں ہو۔ کیوں نہ کسی ریسٹورنٹ میں لائٹ ریفریشمنٹ ہو جائے۔“

سہیلی نے فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر راضی سے کہا۔ ”وہ مجھ سے لفٹ لے رہا ہے۔“

پھر فون پر بولی۔ ”ابھی میں سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک کے لیے سوچ ہی رہی تھی لیکن...“

وہ جلدی سے بولا۔ ”دیکھو کوئی بہانہ نہ کرنا۔“

وہ اپنی سہیلیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں بہانہ نہیں کروں گی، ابھی دونوں سہیلیوں سے دور آ کر بول رہی ہوں۔ یہ دونوں بھی ہمارے پیچھے پڑ جائیں گی اور میں خوامخواہ کی بھیڑ نہیں چاہتی۔“

”یہ تو میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔ پلیز ہو سکے تو کسی طرح ان دونوں کو ٹال دو۔ یہاں آگے کے ایف سی ہے وہاں انتظار کروں گا۔“

”اوکے، میں آدھے گھنٹے کے اندر آ جاؤں گی۔“

”ہم ایک دوسرے کو کیسے پہچانیں گے؟“

”یہ موبائل فون کس لیے ایجاد ہوا ہے۔ ہم بولتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب پہنچ جائیں گے۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے جانے لگا۔ راضی اپنی دونوں سہیلیوں کے ساتھ ایک دکان کے سامنے کھڑی اسے دور جاتا دیکھ رہی تھی۔ ثمینہ نے راضی سے کہا۔ ”تیرا مرغا میرے آنگن میں بانگ دینے آ رہا ہے۔“

اس بات پر تینوں ہنسنے لگیں۔ اُدھر وہ سوچتا ہوا کے ایف سی پہنچ گیا کہ ایک نئی مرغی ککڑوں کوں بولنے آ رہی ہے۔

وہ آدھے گھنٹے کے بعد ریسٹورنٹ کے دروازے پر آئی، فون کے ذریعے کہا۔ ”میں دروازے پر ہوں۔ تم کہاں ہو؟“

وہ فوراً ہی اپنی میز کے پیچھے سے اٹھ کر بولا۔ ”میں دوسری میز پر ہوں۔ تمہیں دیکھ رہا ہوں، اِدھر دیکھو۔“

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی آ گئی۔ ”ہائے، میرا نام ثمینہ ہے۔ تمہارا نام جانتی ہوں۔“

وہ دونوں میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کاشف نے کہا۔ ”یہ موبائل فون گاڈ بلیسنگ ہے۔ اجنبی بولتے بولتے شناسا بن جاتے ہیں۔ پھر دوست بن جاتے ہیں اور پھر...“

وہ ذرا رک کر ہنستے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ”پھر بہت کچھ بن جاتے ہیں۔“

وہ اس بات پر شرمائی جیسے اشارہ سمجھ رہی ہو۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا لو گی؟“

”برگر اور کولڈ ڈرنک۔“

وہ سیلف سروس کے لیے مطلوبہ چیزیں لانے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ ثمینہ نے فون نکال کر راضی سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

ثمینہ نے کہا۔ ”بندہ رومانٹک ہو رہا ہے۔ سیاسی لوٹے بھی اتنی جلدی نہیں لڑھکتے ہوں گے۔ اس نے تو ملتے ہی اشاروں میں بولنا شروع کر دیا ہے۔“

راضی نے کہا۔ ”سیاسی لوٹے لڑھکنے کے بعد کسی ایک پارٹی میں رہتے ہیں، تو دیکھ لینا یہ دونوں طرف رہے گا۔“

”یہ مرد شرافت سے محبت کیوں نہیں کرتے۔ اعتماد کو ٹھیس کیوں پہنچاتے ہیں؟“

اتنے میں کاشف ایک ٹرے میں کھانے کا سامان لے آیا۔ ثمینہ نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کس سے باتیں ہو رہی تھیں۔“

”میری ایک سہیلی تھی۔ میں نے کہا ابھی اس سے بات نہیں کر سکوں گی کیونکہ اپنے کزن کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں ہوں۔ یہ سنتے ہی اس نے کیا کہا، جانتے ہو؟“

کاشف نے پوچھا۔ ”کیا کہا؟“

”وہ ہنستے ہوئے بول رہی تھی کہ اپنے بوائے فرینڈ کو کزن کہہ کر پردے میں رکھا جاتا ہے۔“

کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو اس نے مجھے تمہارا بوائے فرینڈ بنا دیا ہے۔“

”بدنام ہوتے دیر نہیں لگتی۔ دیکھ لیں، ابھی ہماری ملاقات کو چند منٹ ہوئے ہیں۔“

”کیا بدنامی سے ڈر جاؤ گی؟“

”میں ڈرنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ تمہاری وہ راضی ڈرپوک ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، آج پہلی بار اسے دیکھا ہے۔ کیسی لگی؟“

”کیا بتاؤں کیسی لگی؟ میں سوچتا تھا میری توقع سے زیادہ حسین ہو گی لیکن کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ اس کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بولوں گا۔“

ثمینہ نے برگر کو دانتوں سے نوچتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا دوستی جاری رکھو گے؟“

”میں اچانک اسے شاک نہیں پہنچاؤں گا۔ رفتہ رفتہ فون پر بولنا چھوڑ دوں گا۔“ پھر وہ بڑے درد بھرے انداز میں بولا۔ ”میں بہت ہی بدنصیب ہوں۔ زندگی میں پہلی بار کسی کو پیار کرنا چاہا لیکن وہ کئی مہینوں سے اپنے پیچھے دوڑا رہی ہے۔“

ثمینہ نے کہا۔ ”میں نے اسے سمجھایا تھا کہ اپنے چاہنے والے سے کہیں ملنا چاہیے۔ اسے کم از کم اپنا ہاتھ تو پکڑنے دو۔ لیکن وہ بڑی پارسا بنتی ہے۔ میں ہوتی تو...“

وہ بولتے بولتے رک گئی، شرمانے لگی۔ کاشف نے میز کے نیچے اپنا پاؤں اس کے پاؤں سے لگا دیا۔ وہ اور شرمانے لگی۔ وہ اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں بولا۔ ”کیا مجھے اپنا سمجھو گی؟ اور مجھے اپنا سمجھنے دو گی؟“

”تم بہت جلد باز ہو۔ ابھی ملاقات ہوئی اور ابھی اتنی جلدی مجھ پر دل آ گیا۔“

وہ بولا۔ ”دل کسی کو دیا جائے تو یہ محبت نہیں ہے۔ دل خود ہی کسی پر آ جائے تو یہ قدرتی محبت ہے۔ یقین کرو، تم پر خود بخود دل آ گیا ہے۔“

”تم بہت ہی اچھی ’دل میں اتر جانے...‘ والی باتیں کرتے ہو۔ راضی بہت ہی بدنصیب ہے۔“

”ابھی پیار کے اس پاکیزہ ماحول میں اس کا نام نہ لو۔“

ثمینہ نے دل ہی دل میں کہا۔ ”واہ کیا پاکیزہ ماحول ہے۔ معلوم ہوتا ہے برگر چھوڑ کے نماز پڑھنے لگو گے۔“

پیار کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ دونوں کھاتے رہے اور پیار بھری باتیں کرتے رہے پھر ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا میرے ساتھ بائیک پر چلو گی؟ جہاں کہو گی پہنچا دوں گا۔“

وہ اس کے پیچھے بائیک پر آ کر بیٹھ گئی۔ اگرچہ ذرا فاصلہ رکھا تھا لیکن سہارے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

یہ اس کی سوچ سے زیادہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کے ہاتھ نے اسے چھو لیا تھا۔ وہ ہاتھ اور اس کی قربت کہہ رہی تھی کہ اب یہ لڑکی تمہاری ہے۔ جہاں چاہو گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمہارے ساتھ جائے گی۔

ثمینہ نے ایک بس اسٹاپ پر پہنچ کر کہا۔ ”مجھے یہاں اتار دو۔ میرا گھر ایک اسٹاپ آگے ہے۔ میں بس میں جاؤں گی۔“

اس نے بائیک روک کر کہا۔ ”تم نے پہلی ہی ملاقات میں دیوانہ بنا دیا ہے۔ پھر کب ملوگی؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”فون پر بتاؤں گی۔ او کے، بی یو۔“

بس آگئی تھی۔ وہ اس سے بچھڑ گئی۔ بس میں بیٹھ کر جاتے جاتے اسے دیکھتی رہی۔ اپنا دیوانہ بناتی رہی پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ تینوں سہیلیاں پھر یکجا ہوگئی تھیں۔ ثمینہ انہیں کاشف کی ایک ایک بات بتا رہی تھی کہ وہ اسے کس طرح پھانس رہا تھا اور وہ کیسے شرماتی ہوئی پھنس رہی تھی۔

ایک سہیلی نے کہا۔ ”راضی! تیرا مرغا یہ لے گئی ہے۔ وہ تیرے ہاتھ سے گیا۔“

راضی نے کہا۔ ”یہ دانہ چگنے والے خود کو بہت چالاک سمجھتے ہیں۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا اور ثمینہ کو بھی پھانستا رہے گا۔“

ثمینہ نے کہا۔ ”عالی! تو دانہ ڈالے گی تو تیرے پاس بھی چگنے آجائے گا۔“

راضی نے کہا۔ ”یہ رانگ کال کے ذریعے دوستی کرنے والے کبھی رائٹ نہیں ہوتے۔“

ایسے وقت ثمینہ کے فون نے میسج کی اطلاع دی۔ اس نے بٹن دبایا۔ کاشف پوچھ رہا تھا۔ ”ہائے ثمی! کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو؟“

وہ مسکراتے ہوئے سہیلیوں سے بولی۔ ”مجھے پیار سے ثمی کہہ رہا ہے۔“

”جب مجھ سے دوستی ہوئی تھی تو پہلے ہی دن رضیہ سے راضی بنا دیا تھا۔“

عالی نے کہا۔ ”کیا یہ لفنگے لڑکیوں کو امپریس کرنا ماں کے پیٹ سے سیکھ کر آتے ہیں۔“

ثمینہ نے جواباً لکھا۔ ”میں گھر میں ہوں۔ یہ میسج پکڑے جائیں گے۔ آئندہ جب تک میں میسج نہ دوں، تم بھی نہ دینا۔ انتظار کرو۔“

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”مجنوں کی اولاد! انتظار کرتے رہو۔“

رات ہوئی تو کاشف نے راضی کو سوچا۔ اس روز پہلی بار اس کی صورت دیکھی تھی۔ بہت ہی اچھی، گوری گوری، گلابی گلابی سی تھی۔ ہوس کی اسکرین پر وہ بھی بدن سے لگی ہوئی نظر آئی تو ویسی ہی میٹھی لگی۔

راضی نے روٹین کے مطابق رات ایک بجے کے بعد اسے میسج کے ذریعے مخاطب کیا۔ ”کیوں جناب عالی! آج اپنی ضد پوری کرلی۔ آج مجھے دیکھ ہی لیا۔“

اس نے جواب لکھا۔ ”ہاں...... تمہیں کیا دیکھا، ہوش گنوا بیٹھا۔ دل تو پہلے ہی ہار چکا تھا۔ اب دماغ سے بھی گیا۔ تمہارے لیے پاگل ہو رہا ہوں۔“

”شکریہ۔ یہ پڑھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ مجھے دیکھ کر پاگل ہو رہے ہو۔“

”تم نہ ملیں تو سچ مچ پاگل ہو جاؤں گا۔ کسی دوسری طرف نکل جاؤں گا۔“

”دوسری طرف نکل جانے کا مطلب کیا ہوا؟ کیا مجھے چھوڑ کر دوسری کے پاس جاؤ گے۔“

اس نے لکھا۔ ”جب تم پیاس نہیں بجھاؤ گی تو کیا پیاسا مرجانا چاہیے یا دوسرے کنویں سے پیاس بجھانا چاہیے۔“

”میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ کسی دوسری کا نام بھی لوگے تو رونے لگوں گی۔“

”رونے کی حماقت نہ کرو۔ صرف ایک بار ملو اور مجھے اپنا اسیر کرلو۔“

”پلیز...... ضد نہ کرو۔“

”پلیز، میری ضد کے پیچھے میری والہانہ محبت کو دیکھو کہ تمہیں کتنے پیار سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”پیار تو کرتے ہو مگر تمہاری یہ دھمکی میرا دل توڑ رہی ہے کہ کسی دوسری سے مل سکتے ہو۔“

”ایسا وقت ہی نہ آنے دو۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ آدھے گھنٹے بعد تمہارا ایس ایم ایس اٹینڈ کروں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے جیسے اسے سزا دینے کے طور پر رابطہ ختم کردیا۔ ادھر ثمینہ جانتی تھی کہ وہ راضی کے ساتھ میسج پر لگا ہوگا۔ اس نے میسج لکھا۔ ”ہائے کاشف! جاگ رہے ہو؟ تم نے تو میری نیند اڑا دی ہے۔“

کاشف نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”نیند تو تم نے میری اڑائی ہے۔ رات کے تین بجنے والے ہیں اور کروٹیں بدل رہا ہوں۔“

”ہائے، دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”تم واقعی مجھے سچے دل سے چاہتی ہو۔ راضی کی طرح نخرے نہیں کرتی ہو۔ میں تو اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔“

اس نے لکھا۔ ”ممی مجھے آواز دے رہی ہیں۔ پوچھ رہی ہیں میرے کمرے کی لائٹ آن کیوں ہے۔ میں بتی بجھا کر سو رہی ہوں۔ کل بات کروں گی۔“

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ کاشف نے اپنے فون کو سینے سے لگا کر کہا۔ ”یہ ہے کھلے دل کی لڑکی۔ کل اس سے کچھ اور کھل کر باتیں ہوں گی۔“

ادھر ثمینہ نے راضی کو میسج لکھا۔ ”میں نے تیرے مجنوں کو اشارتاً کہہ دیا ہے کہ وہ جہاں چاہے گا اس سے مل سکوں گی۔“

راضی نے کہا۔ ”میں بھی راضی ہو جاؤں گی تو اس کی چاند رات بھی ہوگی اور شب برات بھی ہو جائے گی۔“

”اسے تو سبق سکھانا ہی ہوگا۔“

راضی نے کہا۔ ”ہاں، سکھانا تو ہوگا۔“

اس نے ثمینہ سے رابطہ ختم کرکے کاشف کو میسج لکھا۔ ”تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ پلیز کہیں ملنے کی بات نہ کرو۔ مجھے شرم آرہی ہے۔“

اس نے لکھا۔ ”جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔ یہ شرمانے کی باتیں نہ کرو۔ ابھی تم راضی نہ ہوئیں تو کل سے تمہارے میسج کا جواب نہیں دوں گا۔“

”ایسا ظلم نہ کرنا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔“

”تو پھر مان جاؤ میری بات۔“

”کیسے مان جاؤں؟ کہاں ملوں گی؟ گھر سے کبھی تنہا باہر نہیں نکلتی۔ اپنے ہی گھر میں چاہوں تو......“

اس نے میسج ادھورا چھوڑ دیا، وہ بولا۔ ”میں تم سے ملنے کے لیے تمہارے گھر میں بھی چلا آؤں گا۔ بزدل نہیں ہوں، پیار کیا ہے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر ملنے آؤں گا۔“

”مجھے سوچنے سمجھنے دو۔“

”سوچنا سمجھنا کیا ہے۔ ہر رات اسی وقت فون کے ذریعے تمہارے پاس آتا ہوں۔ تمہارے گھر میں سب ہی گہری نیند سوتے رہتے ہیں۔ کل ہمت کروگی تو چھپ کر چلا آؤں گا۔“

ان تینوں سہیلیوں نے پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ اسے ایک بار رات کو ضرور بلایا جائے۔ اس کے عشق کا بخار ضرور اتارا جائے۔

راضی نے ہارنے کے انداز میں کہا۔ ”تم نے تو مجبور کر دیا ہے۔ اب تمہاری بات نہیں مانوں گی تو اور کس کی مانوں گی۔“

”تو پھر بتاؤ، کہاں رہتی ہو؟“

اس نے پہلی بار اپنے گھر کا پتا بتایا۔ راضی نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ دیوار پھاند کر صحن میں آئے گا تو ایک بند دروازے کو کھولنے کے بعد ہی مکان کے اندر آسکے گا۔

☆☆☆

دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد اطمینان ہوا کہ اسے اپنے گھر سے یہاں تک کسی نے چور کی حیثیت سے دیکھا نہیں ہے۔ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آیا ہے۔

اس نے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں بڑے میاں رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ہی کمرے سے نکل کر صحن والے ٹوائلٹ میں گئے ہیں اور ابھی تھوڑی دیر بعد واپس آنے والے ہیں لیکن واپس کیسے آئیں گے؟ اس نے تو اندر سے آکر دروازے کی چٹخنی لگا دی تھی۔ بڑے میاں... حیران ہوتے کہ دروازہ اندر سے کیسے بند ہوگیا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تو وہ دستک دیتے گویا خطرے کا گھنٹا بجاتے۔ گہری نیند سونے والوں کو آوازیں بھی دیتے۔

ایسا ہی کچھ ہونے والا تھا۔ پنجرے میں بند ہونے والا کسی معجزے سے بچ نکلنے والا نہیں تھا۔ اس نے کوریڈور سے گزر کر اندر جانے سے پہلے راضی کو میسج دیا۔ ”یہ تم نے اچھا کیا۔ دروازہ کھول دیا۔“

راضی نے جواب لکھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے تو دروازہ نہیں کھولا ہے۔“

”کیوں مذاق کرتی ہو۔ یہ آپ ہی آپ تو نہیں کھل جائے گا؟ چلو، یہ بتاؤ اس کوریڈور کے بعد پہلا کمرا کس کا ہے اور تمہارا کمرا کس طرف ہے؟“

اس نے جواب کا انتظار کیا۔ موبائل فون کی ٹارچ بجھا دی۔ پہلے کی طرح تاریکی چھا گئی۔ بڑے میاں کے کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ ایسے وقت سو طرح کے اندیشے ہوتے ہیں لیکن یہ تسلی تھی کہ راضی جاگ رہی ہے۔

اس نے میسج کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود آرہی ہے۔ سراسر خوش فہمی تھی۔ انتظار طول کھینچ رہا تھا۔ اس نے میسج دیا۔ ”تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟ کیا آرہی ہو؟“

اسے پھر جواب نہیں ملا۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ ”کیا بات ہے؟ میں اس کے گھر میں گھس آیا ہوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور یہ دو قدم چل کر میرے پاس نہیں آ رہی ہے اور اب میسج کا جواب بھی نہیں دے رہی ہے۔ کیا گھر میں کوئی اور جاگ گیا ہے اور وہ بستر میں دبک گئی ہے؟"

اس نے خود کو دلاسا دیا۔ "وہ کسی وجہ سے مجبور ہو گئی ہے۔"

پھر یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کسی کی آنکھ کھل گئی ہے تو وہ ادھر آ سکتا ہے۔ وہ فوراً ہی چھپنے کی جگہ ڈھونڈنے لگا۔

وہ ایسے مشکل وقت میں چھپنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایسے ہی وقت دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ پھر بڑے میاں کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ "ارے دروازہ اندر سے بند کیسے ہو گیا؟ میں تو کھلا چھوڑ کے گیا تھا۔"

باہر سے بیماری سی آواز نے سمجھا دیا کہ دروازہ معشوقہ نے نہیں گھر کے کسی بیمار بوڑھے نے کھولا تھا اور وہ بوڑھا اسی کمرے میں رہتا ہے جہاں وہ مشکل وقت میں چھپنا چاہتا تھا۔

اس کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نہ دروازہ کھول کر بھاگ سکتا تھا۔ نہ اس کمرے میں جا کر چھپ سکتا تھا۔

باہر سے دروازے کو جھٹکے دیے گئے۔ جھنجلاتی ہوئی سی آواز آئی۔ "ارے یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے؟"

پھر دروازے پر دو چار بار ہاتھ مارنے کی آواز دھماکوں کی طرح ابھری۔ اب تو گھر کے لوگ جاگنے ہی والے تھے۔ وہ بوکھلا کر کبھی ادھر کبھی ادھر جانے لگا۔ بڑے میاں کھانستے ہوئے دروازہ پیٹتے ہوئے آوازیں دیتے رہے۔ "بیٹے عبید...! یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے...؟ دروازہ کھولو... بہو...! کیا تم نے بند کیا ہے؟"

یہ تو یقین ہو چکا تھا کہ صرف جوتے ہی نہیں پڑیں گے۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں بھی توڑ دی جائیں گی۔ وہ دروازہ کھول کر بڑے میاں کو دھکے دیتا ہوا وہاں سے بھاگ سکتا تھا لیکن رات کے سناٹے میں دروازہ پیٹنے کی اور بڑے میاں کے چیخنے کی آواز دور تک جا رہی تھی۔ بھاگنے والا اس گلی محلے میں کہیں نہ کہیں پکڑا جاتا۔ عقل نے سمجھایا۔ گھر میں ہی کہیں چھپنا چاہیے، ہو سکتا ہے راضی کے پاس چھپنے کی جگہ مل جائے۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا ایک کمرے کے دروازے پر آیا۔ اس پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر دیکھا تو معلوم ہوا وہ اندر سے بند ہے۔ وہ تیزی سے پلٹ کر دوسرے کمرے کی طرف بھاگا۔ اس دروازے تک پہنچتے ہی اندر سے آواز آئی۔ "پتا نہیں ابا جان کیوں دروازہ پیٹ رہے ہیں؟"

ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔ "وہ دروازہ کھولنے کو کہہ رہے ہیں۔ آخر وہ ہیں کہاں...؟ اندر ہیں یا باہر ہیں...؟"

وہ وہاں سے پلٹ کر بھاگنا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک صحت مند، قد آور شخص کھڑا ہوا تھا۔ کاشف نے اسے راضی کے ساتھ کپڑے کی دکان میں دیکھا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا اور ماں پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ جبکہ وہ حقیقتاً راضی کے نہیں، اس کی پڑوسن حدیقہ کے ماں باپ تھے۔

ماں اسے دیکھتے ہی چیخ پڑی۔ "یہ کون ہے؟"

باپ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ اٹھارہ برس کا نوخیز جوان تھا۔ صحت مند بزرگ کی گرفت میں پھڑپھڑانے لگا۔ "کون ہے بے تو؟ گھر میں کیسے گھس آیا......؟ بول...... ابا جان کے ساتھ تو نے کیا، کیا ہے؟"

وہ بول نہیں پا رہا تھا، گردن مضبوط ہاتھوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ اس قد آور کے سامنے چھپکلی بن گیا تھا۔

بزرگ نے خاتون سے کہا۔ "جاؤ دیکھو۔ ابا جان کہاں ہیں؟ کیوں چیخ رہے ہیں؟"

خاتون کمرے سے نکل کر جانے لگی۔ وہ بزرگ گردن چھوڑ کر اس کی پٹائی کرنے لگا۔ وہ جواباً لڑتا تو میاں بیوی دونوں چیخنے لگتے۔ یوں محلے والے دوڑے چلے آتے۔ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے نہ مارو۔ میں چور نہیں ہوں۔ میں یہاں چوری کرنے نہیں آیا ہوں۔ اللہ رسول کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ چوری کرنے نہیں آیا ہوں۔"

بزرگ کا ہاتھ پہلوانی تو نہیں تھا لیکن چوٹ لگ رہی تھی۔ وہ مار کھاتا ہوا اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ اب لاتیں کھا رہا تھا اور وہ غصے سے پوچھ رہا تھا۔ "یہاں چوری کرنے نہیں آیا ہے تو کیا نماز پڑھنے آیا ہے۔ ابے تو ہے کون...؟"

بڑے میاں اپنی بہو کے ساتھ وہاں آ گئے۔ وہ ایک موٹی سی لکڑی لے کر آئے تھے۔ بیٹے نے باپ سے لکڑی لے کر اسے ایک جمائی۔ وہ فرش پر گر کر تڑپتے ہوئے بولا۔ "ارے باپ رے۔ میں مر جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔"

خاتون نے کہا۔ "اس کا منہ دباؤ۔ یہ چیخ رہا ہے، ابھی پورا محلہ آ جائے گا۔ ہماری بچی بدنام ہو گی کہ یہ اسی سے ملنے آیا ہے۔"

اسے پھر ایک لکڑی پڑی۔ وہ چیختے ہوئے، بدن سہلاتے ہوئے بولا۔ "میں سچ کہتا ہوں آپ کی بیٹی کو بدنام کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں اس سے سچی محبت کرتا ہوں۔"

وہ اسے ایک لات مارتے ہوئے بولا۔ "ابے چپ! میری بیٹی کا نام زبان پر لائے گا تو منہ توڑ دوں گا۔ تیری تو لاش ہی یہاں سے جائے گی۔"

"میں اپنے منہ سے کچھ نہیں بولوں گا۔ اپنی بیٹی کو بلا کر پوچھ لو۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"کتے! کمینے تو اتنی رات کو بچی محبت کرنے آیا ہے۔ یہاں سے نکل کر ہمیں بدنام کرے گا۔" وہ رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ خاتون نے اپنے میاں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں؟ یہ چلا تو نہیں رہا ہے۔ لیکن آپ جو غصے میں بول رہے ہیں تو یہ آواز دور تک جا رہی ہو گی کیوں بدنامی کو دروازے پر بلا رہے ہیں؟"

بڑے میاں نے کہا۔ "ہاں بیٹے! اپنا منہ بند رکھو اور اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونسو، پھر پٹائی کرو۔"

خاتون نے کہا۔ "پٹائی کرنے سے کیا حاصل ہو گا؟ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہاں سے باہر نکلے گا، محلے والوں کی نظروں میں آئے گا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

وہ لکڑی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "ہم اسے پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکیں گے۔ بدنامی ٹی وی اور اخباروں تک پہنچ جائے گی۔"

خاتون نے میاں کے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "ہم پہلے ہی کون سے نیک نام ہیں۔"

وہ غصے سے بولا۔ "بکواس مت کرو۔ ہم گھر کی بات باہر اچھالنے نہیں جا رہے ہیں۔ مگر یہ کتا ہمارا منہ کالا کرتے آیا ہے۔"

وہ بولی۔ "غصہ تھوک دیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسٹور روم میں بند کریں پھر ٹھنڈے دماغ سے میری باتیں سنیں۔"

ایسے وقت حدیقہ ایک کمرے سے نکل کر وہاں آئی۔ کاشف کی ہڈیاں پسلیاں دکھ رہی تھیں۔ وہ فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ حدیقہ کو دیکھتے ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ رونے کے انداز میں بولا۔ "دیکھو راضی! تمہاری محبت میں میرا کیا حال ہو رہا ہے۔ مجھے بچا لو...... نہیں تو میں مر جاؤں گا۔"

حدیقہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ پھر ماں باپ سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟ مجھے راضی کیوں کہہ رہا ہے؟"

باپ نے پوچھا۔ "کیا تم اسے نہیں جانتیں؟"

"میں پہلی بار اسے دیکھ رہی ہوں۔"

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "راضی جھوٹ نہ بولو۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "میرا نام راضی نہیں ہے۔"

"تم نے تو یہی نام بتایا ہے۔ کیا اس بات سے انکار کرو گی کہ روز رات کو ایک بجے کے بعد اپنی امی کے فون پر ایس ایم ایس کے ذریعے باتیں کرتی ہو؟"

خاتون نے کہا۔ "میرے پاس تو کوئی فون نہیں ہے۔"

حدیقہ کے باپ نے کہا۔ "اس گھر میں فون صرف میرے پاس ہے، تم میری بیٹی کا نام تک نہیں جانتے۔ کیا جھوٹی باتیں بنا کر یہاں سے نکل سکو گے؟"

"آپ کی بیٹی نے فون پر کہا تھا کہ اس کا نام راضی ہے۔ یہ حیدری مارکیٹ میں شاپنگ کے لیے آئے گی۔ میں وہاں اس کی صورت دیکھ سکوں گا۔"

وہ حدیقہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسی فون کے مطابق کل میں نے حیدری مارکیٹ میں اس کی صورت دیکھی۔ تم نے بھی مجھے وہاں دیکھا تھا نا...؟ سچ بولو...؟"

وہ کیا بولتی؟ ایک بار اس پر نظر پڑی تھی پھر اسے نظر انداز کر کے بھول گئی تھی، وہ بولی۔ "تم مسلسل جھوٹ بولتے جا رہے ہو۔ میں نے پہلے کبھی تمہیں نہیں دیکھا۔"

وہ اپنے دونوں کانوں کو پکڑتے ہوئے بولا۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم نے مجھے اس گھر کا پتا بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں آج رات یہاں ملنے آؤں۔ تم میرا انتظار کرو گی۔"

حدیقہ نے کہا۔ "بکواس مت کرو۔ نہ میں نے پہلے کبھی تمہیں دیکھا ہے نہ تمہارا فون نمبر جانتی ہوں۔"

اس کی ماں نے کہا۔ "بات یہ سمجھ میں آ رہی ہے کہ یہ لڑکا فون پر کسی لڑکی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس لڑکی نے اسے ہماری بیٹی کے پیچھے لگا دیا اور یہ الو بن کر یہاں چلا آیا ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ "ہاں میں الو ہوں۔ گدھا ہوں۔ پتا نہیں وہ کون ہے جو راضی کے نام سے مجھے دھوکا دیتی رہی اور آج مجھے جوتے کھانے کے لیے یہاں پہنچا دیا ہے۔" آتے ہوئے وہ باپ کے کمرے سے اپنا فون بھی چرا لایا تھا۔

بڑے میاں رسیاں لے کر آئے اور بیٹے کو دیتے ہوئے کہا۔ "بہو جو کہتی ہے وہ کرو۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونسو۔ اسے اسٹور روم میں بند کرو۔ پھر ہم ٹھنڈے دماغ سے بیٹھ کر سوچیں گے کہ اس کے ساتھ کرنا کیا ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہوں نے یہی کیا۔ اسے اسٹور روم میں لاکر، وہاں بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھتے ہوئے باپ کا نام اور پتا ٹھکانا پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام کاشف اکبر ہے۔ باپ کا نام جلال اکبر ہے۔ ناظم آباد میں ان کے چار مکانات اور نارتھ کراچی میں چھ مکانات ہیں۔ ان سے ایک لاکھ روپے سے زیادہ کرایہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ باپ بیٹا کوئی کام دھندا نہیں کرتے ہیں اور کسی غلط دھندے میں بھی نہیں ہیں۔

انہوں نے اس کا فون لے کر کہا۔ ”یہاں بیٹھے رہو۔ ہم ابھی آئیں گے۔“

وہ اس کے باپ کا فون نمبر معلوم کر کے اسے اسٹور روم میں بند کر کے ایک کمرے میں آگئے۔ باپ نے بیٹی سے کہا۔ ”تم اسے نہیں جانتیں اور یہ تمہیں راضی کے نام سے جانتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی لڑکی نے اسے اچھی طرح اُلّو بنایا ہے۔ راضی کے فرضی نام سے اسے تمہاری طرف بھٹکا دیا ہے۔“

حدیقہ نے کہا۔ ”ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔“

ماں نے بیٹی کو دیکھ کر کہا۔ ”لڑکا اچھا ہے۔“

بیٹی نے باپ کو دیکھا، وہ بولا۔ ”ہاں دبّو قسم کا ہے۔ دباؤ تو دب کے رہے گا۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”کہہ رہا تھا، مہینے میں لاکھ روپے سے اوپر کی آمدنی ہے۔“

ماں باپ، بیٹی اور بڑے میاں ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے والی نظروں سے دیکھنے لگے۔ باپ اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔ راہداری کے دوسری طرف اسٹور روم تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر کاشف کے پاس آکر منہ پر سے کپڑا ہٹایا پھر پوچھا۔ ”تیرے کتنے بھائی بہن ہیں؟“

وہ بولا۔ ”میری ایک ہی بڑی بہن ہے۔ ٹھیک دو مہینے بعد اس کی شادی ہونے والی ہے۔ امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ صرف میں اور ابو رہ جائیں گے۔“

”وہ جو تمہارے باپ کے دس مکانات ہیں اور ان سے لاکھ روپے کی آمدنی ہے، اس کے تم ہی اکیلے حق دار ہو یا اور بھی کوئی ہے؟“

”اور کوئی نہیں ہے۔ باپ کے بعد صرف میں ہی ہوں۔ مجھے جانے دو۔ میرے ابو کو کچھ نہ بتاؤ۔ انہیں معلوم ہوگا تو وہ شرم سے مرجائیں گے۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔ ”آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے اور جوتے مار لیں مگر ابو سے کوئی بات نہ...“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا پھر اوپر سے پٹی باندھ کر اسٹور روم کا دروازہ بند کر کے حدیقہ کا باپ کمرے میں واپس آگیا۔ بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اس کی ماں مر چکی ہے۔ کوئی بھائی نہیں ہے۔ ایک بڑی بہن دو مہینے کے بعد اپنے گھر کی ہوجائے گی۔ وہ جائداد کا اکیلا وارث ہے۔“

ماں نے بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ ”لڑکا تو ہمارے دباؤ میں آجائے گا۔ کیا ہم پولیس تھانے کی دھمکیاں دیں گے تو باپ جھکے گا؟“

بیٹی نے باپ کو دیکھا، باپ نے کہا۔ ”وہ اپنے علاقے میں بہت عزت دار ہے۔ میں دھمکی دوں گا کہ ہماری بات نہ مانی تو اس کے بیٹے کا آدھا سر مونڈ کر، آدھا چہرہ کالا کر کے اسے گدھے پر بٹھا کر پورے علاقے میں گھمایا جائے گا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر ہماری بات مانے گا۔“

ماں نے کہا۔ ”جلدی نہ کریں۔ پہلے لڑکے کو اچھی طرح جھکالیں۔ اس نے کل حدیقہ کو دیکھا تھا۔ اسے پسند کر کے ابھی یہاں آیا ہے۔ میں چاہتی ہوں ابھی حدیقہ اس کے پاس جائے، اس سے بات کرے۔ پہلے میاں بیوی راضی ہوجائیں پھر تو اس کا باپ بھی ضرور راضی ہوگا۔“

ماں نے دانشمندانہ مشورہ دیا۔ باپ اور دادا حدیقہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ سر جھکائے گہری سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ بزرگوں کا اچانک اتنا بڑا فیصلہ اس کے لیے حیرانی کی بات نہیں ہے۔ وہ زندگی کے کسی بھی چیلنج کو قبول کرسکتی ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ بزرگوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی کمرے کے باہر آئی۔ آگے کچھ فاصلے پر اسٹور روم تھا۔ وہ کمرے کے باہر دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس قیدی کے پاس جانے سے پہلے سوچنے لگی کہ اسے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

کمرے کے اندر اس کے باپ نے کاشف کے فون کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ پھر اس کے باپ کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ فوراً ہی کوئی اٹینڈ نہیں کرسکتا تھا کیونکہ رات کے ڈھائی بجے تھے، گہری نیند سونے کا وقت تھا۔

آخر نیند میں ڈوبی ہوئی غصہ ور آواز سنائی دی۔ ”نامعقول! اتنی رات کو باپ کی نیند حرام کر رہا ہے۔ اتنی رات کو کیا مار پڑی ہے فون کرنے کی؟“

وہ بولا۔ ”تمہارے بیٹے کا فون میرے پاس ہے۔ میرا نام اسرار احمد ہے۔ تم ذرا آنکھیں اچھی طرح کھولو۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارو۔ پھر باتیں کرو۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کاشف کا فون تمہارے پاس کیوں ہے؟ وہ نامعقول کہاں ہے؟“

”اس نامعقول کے ہاتھ پاؤں رسّیوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس طرح جانور کو باندھنے کا مطلب ہوتا ہے اسے ذبح کیا جائے گا اور انسان کو باندھنے کا مطلب ہوتا ہے اسے حوالات میں پہنچایا جائے گا۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”میرے بھائی!! اتنی رات کو ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ کیا میرے بیٹے نے تمہیں کسی طرح کا نقصان پہنچایا ہے؟“

”وہ اتنی رات کو میری بیٹی سے ملنے، ہماری عزت پر ڈاکا ڈالنے ہمارے گھر میں گھس آیا تھا۔“

”نہیں، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا کاشف گھر میں نہیں ہے؟ میں ابھی دیکھ رہا ہوں۔ ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔“

جلال اکبر بستر سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا بیٹے کے کمرے کی جانب آیا اور آوازیں دینے لگا۔ ”کاشف! کہاں ہو؟ کیا گھر میں نہیں ہو؟ یہ تمہارے فون سے کون بول رہا ہے؟“

وہ کاشف کے کمرے میں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بیٹی کو آواز دی۔ ”نبیلہ! یہ کہاں گیا ہے؟ میں فون پر کیسی باتیں سن رہا ہوں؟ کسی نے اسے رسّیوں سے باندھ کر رکھا ہے۔“

نبیلہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے ایک گھنٹے پہلے یہاں آکر دیکھا، کاشف نہیں تھا۔ میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ پریشان ہوجائیں گے۔ سوچا کہ ابھی آجائے گا۔“

باپ نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”کہاں سے آئے گا۔ وہ کہیں رسّیوں سے بندھا پڑا ہے۔“

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کو دیکھا پھر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ”اے بھائی صاحب! آپ کون ہیں؟ آپ نے کیا نام بتایا تھا؟“

”اسرار احمد... میں ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں۔ تمہارا بیٹا ہماری عزت سے کھیلنے آیا تھا۔ کیا تم تہذیب اور شرافت کو سمجھتے ہو؟ کیا جانتے ہو کہ عزت کیا ہوتی ہے؟“

”خدا کی قسم جانتا ہوں۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ میں تمہاری عزت پر حرف آنے نہیں دوں گا۔ مجھے اپنے گھر کا پتا بتاؤ۔ میں ابھی آؤں گا۔“

”آنا تو ہوگا۔ نہیں آؤ گے تو بیٹے کو زندہ نہیں پاؤ گے، نہ ہم بے عزتی سے جئیں گے نہ اسے جینے دیں گے۔“

”ایسی باتیں نہ کریں۔ اللہ سب کی عزت رکھنے والا ہے۔ ہماری آپ کی بھی عزت رکھے گا۔ میرے بیٹے سے بات کرائیں، مجھے وہاں کا پتا بتائیں۔“

”بتاؤں گا۔ تمہیں تو آنا ہی ہوگا۔ فون پر بیٹے کی بھی آواز سنو گے لیکن کچھ دیر بعد... جب تک میری کال نہ آئے۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ تمہارے بیٹے کو کہیں باندھ کر رکھا گیا ہے۔ ہمارے معاملے میں پولیس آئے گی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا ایک ہی بیٹا ہے نا؟“

”نن...... نہیں پولیس نہیں آئے گی۔ میں کسی سے نہیں بولوں گا ہم اور آپ مل کے اس معاملے کو نمٹا لیں گے۔“

”ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔ میری کال کا انتظار کرو۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ باپ مجبور تھا۔ اسے انتظار کی سولی پر لٹکتے رہنا تھا۔

ادھر اسرار احمد فون بند کر کے بیٹی کی طرف آیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسٹور روم میں کاشف سے کیا باتیں کر رہی ہے؟

وہ راہداری میں آکر اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اسٹور روم کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ وہ دروازے کے سامنے مصلے پر نماز ادا کر رہی تھی۔

وہ ناگواری سے پلٹ کر کمرے میں آیا پھر بیوی سے بولا۔ ”یہ نماز کا کون سا وقت ہے۔“

بیگم اسرار نے کہا۔ ”عبادت کسی وقت بھی کی جاسکتی ہے اور یہ تہجد کا وقت ہے۔ آپ ذرا صبر کریں۔ ہم جو چاہتے ہیں وہی ہوگا اور ضرور ہوگا۔“

وہ بیڈ کے سرے پر آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حدیقہ نے دروازے پر آکر کہا۔ ”امی! ابو ادھر نہ آئیں۔ میں کسی کے سامنے اس سے باتیں نہیں کروں گی۔“

ماں نے کہا۔ ”تم جاؤ۔ باتیں کرو، کوئی نہیں آئے گا۔“

اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ باپ نے اعتراض کیا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

بڑے میاں نے کہا۔ ”رہنے دو بیٹے! ابھی آجائے گی۔“

”ابا جان! وہ بدمعاش بھاگ جائے گا۔“

بیگم نے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیں، بیٹی ٹھکانے لگ گئی ہے۔ صبح ہوتے ہی ان کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ پورے تین برس بعد ہمارا مسئلہ حل ہو رہا ہے۔“

اسرار احمد بیڈ کے سرے پر بیٹھا تھا اور بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

حدیقہ دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی پھر اسے کھولا۔ وہ رسّیوں سے بندھا ہوا فرش پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیٹھا تھا۔ حدیقہ کو دیکھتے ہی اس کی نظریں جھک گئیں۔

وہ اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ ”موبائل فون پر دوستی کیسی لگ رہی ہے؟ ہم کسی کو دیکھتے نہیں۔ صرف آواز سنتے ہیں۔ کسی راضی نے تمہیں دھوکا دیا اور میرے گھر میں پہنچا دیا۔ وہ دھوکا نہ دیتی، تم اسے دھوکا دینے میں کامیاب ہوتے تو ابھی اس کے گھر میں گناہ گار نہ بنتے۔“

اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا، وہ بولی۔ ”جب من پسند لڑکی سے نکاح پڑھانے کی اسے قبول کرنے کی کھلی اجازت ہے تو پھر گناہ کرنا کیا ضروری ہے؟ جانتے ہو اب کیا ہوگا؟ اب کہا جائے گا کہ میرے ساتھ نکاح قبول کرو... اور مجھے یہاں سے اپنے گھر لے جاؤ۔ میں خوبصورت ہوں نا... کل مجھے دیکھا ہے تب ہی یہاں آئے ہو۔ سوچا تھا، پھول کی پتیاں نوچ کر چلے جاؤ گے۔ کیا یہ سوچ بھی سکتے تھے کہ یوں گلے کا پھندا بن جاؤں گی؟ میرے ابو نے فون کیا ہے۔ تمہارے ابو آنے والے ہیں۔ اگر وہ مجھے بہو بنانے سے انکار کریں گے تو تمہارا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر تمہارے علاقے میں گھمایا جائے گا۔“ وہ اس کے منہ پر سے پٹی ہٹا کر، ٹھنسا ہوا کپڑا منہ سے نکال کر بولی۔ ”کیا تمہارے ابو تمہیں گدھے پر بدنامی کا اشتہار بنتے دیکھ سکیں گے؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں، وہ شرم سے مر جائیں گے۔ کیا انہیں یہاں بلایا گیا ہے؟“

”ہاں تم سے باتیں کرنے کے بعد یہاں سے جاؤں گی۔ اپنی امی ابو کو یقین دلاؤں گی کہ تم مجھے دلہن بنا کر یہاں سے لے جاؤ گے تو وہ تمہارے ابو کو یہاں بلائیں گے۔“

اس نے بے اختیار انکار میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”اگر مجھے دلہن نہیں بناؤ گے تو ابھی ہمارے خاندان کے ہٹے کٹے جوانوں کو بلا کر تمہیں گدھے پر بٹھا دیا جائے گا۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”میں انکار نہیں کروں گا اور ابو بھی اپنی نیک نامی کی خاطر تمہیں بہو بنا لیں گے۔“

حدیقہ نے بہت دھیمی سی کھسانی ہنسی ہنس کر کہا۔ ”میری اوقات کیا ہوئی؟ میں کوئی گری پڑی چیز ہوں جسے بیٹا اور باپ بہت مجبور ہو کر اپنے گھر کی عزت بنائیں گے۔ کیا میرے بارے میں جانتے ہو کہ میرا چال چلن کیسا ہے؟“

”تمہیں دیکھتے ہی دل کہتا ہے کہ تم بہت سیدھی سادی، حیا والی ہو۔“

”ہاں، کبھی میں حیا والی بے داغ تھی۔ اب نہیں ہوں۔“

کاشف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کوئی لڑکی بھی خود کو داغدار نہیں کہتی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”تم حیران ہو نا؟ میں خود پر کیچڑ اچھال رہی ہوں۔“

کاشف اس کا منہ تک رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”حالات تمہیں مجبور کر رہے ہیں۔ تم مجھے دلہن بنا کر لے جاؤ گے۔ اس سے پہلے کہ گھر لے جاؤ، دلہن کا گھونگٹ اٹھاؤ، میں اپنے چہرے سے نقاب اٹھا رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں بھی موبائل فون کی ماری ہوں۔ میں نے بھی اندھا عشق کیا تھا۔ یہ مجبوری ہوتی ہے۔ کیا کیا جائے فون کے دوسری طرف جو ہوتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتا یا میسج کے ذریعے جھوٹی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ میں نے اسے دل سے چاہا تھا۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اسی طرح اسے بھی نیک نیت سچا عاشق سمجھتی رہی۔“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”پھر وہی ہوا جو ہر مرد چاہتا ہے۔ وہ مجھ سے تنہائی میں ملنے کو کہنے لگا۔ میں اسے ٹالتی رہی، پھر وہ ناراض ہونے لگا تو میں پگھل گئی۔ منہ زور جذبات شرم و حیا کو تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ میں رات کو تنہائی میں ملنے کے لیے راضی ہو گئی۔ تم آج آئے ہو۔ آج سے تین برس پہلے وہ اسی طرح رات کو چھپ کر یہاں، اسی مکان میں آیا تھا۔ پھر میری نادانیوں سے فائدہ اٹھا کر چلا گیا۔ دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ اس عاشق نے دوسرے دن فون کے ذریعے مجھ سے کہا۔ ”سوری حدیقہ! کل میرا فون دو بدمعاشوں نے چھین لیا تھا۔ تم سے رابطہ نہ کر سکا۔ پھر ڈیڈی کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ انہیں اسپتال لے جانا پڑا۔ اسی لیے وعدے کے مطابق کل رات نہ آ سکا۔“

یہ سنتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ تو آیا تھا۔ رات کالی کر کے گیا تھا۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کل رات تم آئے تھے۔ یہاں بڑی دیر تک رہے تھے۔“

وہ بولا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ میں تمام رات ڈیڈی کے پاس اسپتال میں تھا۔“

میں ایکدم سے رونے لگی۔ یوں اندھی بن کر لٹ جانے کا صدمہ کیا ہوتا ہے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ وہ سمجھانے لگا کہ رونے سے لٹی ہوئی عزت واپس نہیں آئے گی۔ وہ مجھ سے سچا پیار کرتا ہے مجھے کبھی آبرو باختہ ہونے کا طعنہ نہیں دے گا۔

میں نے روتے ہوئے پوچھا۔ ”کسی دوسرے کو کیسے معلوم ہوا کہ تم رات کو ملنے کے لیے آؤ گے؟“

اس نے کہا۔ ہم نے ایس ایم ایس کے ذریعے ملاقات کے لیے رات کا وقت طے کیا تھا۔ جو شخص مجھ سے فون چھین کر لے گیا تھا۔ اس نے میرے فون پر یہ سب پڑھا ہوگا۔ وہ دو تھے۔ انہوں نے مجھ پر نظر رکھی ہوگی۔ انہیں معلوم ہوا ہوگا کہ میں رات کو بیمار باپ کے ساتھ رہوں گا۔ ان میں سے ایک بدمعاش رات کو مجھے اسپتال میں دیکھتا رہا۔ دوسرا تمہارے پاس پہنچ گیا۔

میں رونے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تم میری محبت کی پونجی ہو، کوئی لوٹ کر چلا گیا۔ مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ جب تک میں تمہیں سینے سے لگا کر پیار نہیں کروں گا۔ تب تک مجھے سکون نہیں ملے گا۔“

میں بھی صدمے سے ٹوٹ رہی تھی۔ میں اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ میں چاہتی تھی، وہ مجھے روتے ہوئے دیکھے اور اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے۔ تب ہی میرا صدمہ کم ہو سکتا تھا۔

میں نے دوسری رات اس کے لیے راستہ ہموار کیا۔ دادا جان جس کمرے میں رہتے ہیں ادھر کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔

اس رات وہ آیا تو جیسے مجھے بہت بڑی پناہ مل گئی۔ میرا اپنا محبوب مجھے مل گیا۔ اس نے مجھے بڑی تسلیاں دیں۔ بڑا پیار دیا پھر چلا گیا۔

آہ! اس دنیا میں رہ کر کیسے کیسے فریب کھانے پڑتے ہیں۔ دوسرے دن میرے محبوب نے فون پر کہا۔ میری جان! کیا چیز ہو تم۔ واہ، مزہ آ گیا۔ ہم تین دوست ہیں۔ دو نے توفیض حاصل کر لیا۔ تیسرا رہ گیا ہے۔ اسے بھی سیراب کر دو۔

یہ سنتے ہی میں چکرا کر رہ گئی۔ مجھے پیار کا فریب دے کر یکے بعد دیگرے دو فریبیوں نے لوٹ لیا تھا۔ میں اسے فون پر گالیاں دینے لگی۔ وہ ہنستا رہا۔ میں تماشا بن گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تمام دنیا مجھ پر تھو تھو کر رہی ہے اور ہنس رہی ہے۔

اس نے کہا۔ ”ہمارے سامنے پارسائی نہ دکھاؤ۔ ہمارا فون نمبر تمہارے پاس ہے جب بھی ہماری سکندری یاد آئے تو کال کر لینا۔ ہم حاضر ہو جائیں گے۔“

حدیقہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ کاشف اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے صدمات جھلک رہے تھے۔ وہ بولی۔ ”پتا نہیں گناہ گار کیسے چھپ جاتے ہیں۔ میری نادانی چھپ نہ سکی۔

پہلا مہینا پھر دوسرا مہینا ایسے ہی گزر گیا پھر لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ یہ تو پاؤں تلے سے زمین سرکانے والی بات تھی۔ امی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ مجھے بتانا پڑا کہ کس طرح ایک نہیں دو مکاروں سے دھوکا کھا گئی ہوں۔ ابو کو معلوم ہوا تو انہوں نے میری پٹائی کی۔ بھائی جان اور بھابی جان نے دھمکی دی کہ اس بدنامی کو ظاہر ہونے سے پہلے ختم نہ کیا گیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ بدنامی ختم نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں میرے بدن میں خون نہیں ہے۔ چار ماہ کا حمل ضائع کیا جائے گا تو میں جان سے جا سکتی ہوں۔

ایک بچی کو دنیا میں آنا تھا۔ اسے آنے سے کوئی روک نہ سکا۔ سارا خاندان مجھ پر چھی چھی تھو تھو کرنے لگا۔ جہاں میرا رشتہ لگا تھا۔ وہ ٹوٹ گیا، اب اپنی برادری میں کوئی مجھے بیوی اور بہو بنانے والا نہیں رہا۔ امی اور ابو کے لیے صدمے کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بھائی جان بیوی اور بچوں کو لے کر دوسرے مکان میں چلے گئے۔ صاف کہہ دیا کہ جب حدیقہ اس گھر سے ٹلے گی۔ کہیں اس کی شادی ہو جائے گی یا یہ مر جائے گی تب ہی وہ بیوی بچوں کے ساتھ واپس آئیں گے۔“

وہ جھکے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میری بچی ڈھائی برس کی ہو گئی ہے۔ میری خالہ جان بیوہ ہیں۔ ان کے پاس رہتی ہے۔ پچھلے تین برسوں سے انتظار ہو رہا ہے کہ کوئی شادی شدہ بوڑھا ہی مجھ سے نکاح پڑھا کر بچی کے ساتھ مجھے لے جائے۔

امی ابو اپنے پوتے اور پوتی سے ملنے کو ترستے رہتے ہیں۔ جب تک میں اس گھر سے نہیں ٹلوں گی بھائی جان بچوں کو لے کر یہاں نہیں آئیں گے۔

خالہ جان بیمار رہتی ہیں۔ میری بیٹی موی کو آج نہیں تو کل میرے ہی پاس آنا ہے۔ مجھے ہی کنواری ماں بن کر اس کی پرورش کرنی ہوگی اور میری وہ معصوم بچی بدنامیاں سنتے سنتے میرے سائے میں پروان چڑھے گی۔ ان تمام مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ کوئی مجھے بیاہ کر بچی کے ساتھ یہاں سے لے جائے اور آج تم اپنی بدنصیبی اور میری خوش نصیبی سے یہاں آ کر پھنس گئے ہو۔“

کاشف اسے خاموشی سے تک رہا تھا۔ حدیقہ نے پوچھا۔ ”کچھ بولو گے نہیں؟“

”کیا بولوں؟ تم نے اپنی غلطیاں، اپنے گناہ اور اپنی کمزوریاں یوں بیان کر دی ہیں جیسے کسی کا ڈر نہ ہو۔ کسی کی پروا نہ ہو۔“

”تین برسوں سے ڈرتی آ رہی ہوں تو کیا اچھا ہوا؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا جواب ہے کہ میں تو ہوں بدنصیب، میری موی کے نصیب اس وقت اچھے ہوں گے جب کوئی مجھ سے شادی کرے گا اور میں بیٹی کو ایک باپ کا نام دے سکوں گی۔"

اسرار احمد کی آواز سنائی دی۔ "حدیقہ! کتنی لمبی باتیں کر رہی ہو؟ دروازہ کھولو۔"

اس نے سر گھما کر راہداری کے پار بند دروازے کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "ابھی کھولتی ہوں۔ بس دو چار باتیں رہ گئی ہیں۔"

کاشف نے کہا۔ "دروازہ کھول دو۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس گھر کی چار دیواری میں تم نے کسی چاہنے والے سے دھوکا کھایا۔ میں بھی ایک چاہنے والی راضی سے دھوکا کھا کر اسی چھت کے نیچے آ گیا۔ میں تمہیں دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔"

"مجبور ہو کر دلہن بناؤ گے۔ یہ بات تمہارے دماغ میں نقش رہے گی کہ میں کنواری پارسا نہیں تھی۔ تم سے پہلے دو مردوں کا منہ دیکھ چکی ہوں۔"

"میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔ تمہاری بیٹی کو اپنا نام دوں گا۔"

"اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں تمہارے گھر میں ایک آبرو باختہ بیوی اور اپنی بیٹی کی ایک گناہ گار ماں بن کر رہا کروں گی اور بعد میں تم مجھے دھکے دے کے نکال دو گے تو میں اور میرے ابو تمہارا کیا بگاڑ لیں گے۔"

"میں سچے دل سے وعدہ کر رہا ہوں۔ تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے تو بولو اور کیسے یقین دلا سکتا ہوں۔"

وہ اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں یہاں تم سے نکاح پڑھوا کر وہاں جانے کے بعد دھوکا نہیں کھانا چاہتی۔ دل میں فریب اور کینہ رکھ کر ان رستوں سے نجات حاصل کرنا چاہو گے تو کوئی تمہارے دو غلے ارادوں کو یہاں سمجھ نہیں سکے گا۔ اگر تم ایماندار ہو اور دل سے مجھے قبول کرنا چاہتے ہو تو یہاں سے جانے کے بعد برات کے ساتھ آ کر مجھے لے جاؤ گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "ایسا ہو جائے تو میں دھوم دھام سے برات لے کر آؤں گا لیکن تمہارے ابو مجھے یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔"

وہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کی رسیاں کھولتے ہوئے بولی۔ "جو میری بیٹی کو دل سے باپ کا پیار دے گا میں اسے قبول کروں گی۔ تم یہاں سے مجبور ہو کر مجھے نہ لے جاؤ۔ تمہارے دل میں ایمان ہے تو برات لے کر آؤ۔"

اس کے ہاتھ پاؤں کھل گئے، وہ بولی۔ "یہ میں بہت بڑی حماقت کر رہی ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے۔ امی ابو سے ان کے بیٹے کا اور پوتے پوتی کا پیار چھین رہی ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "تم بہت ہی ذہانت کا دل جیتنے والا کام کر رہی ہو۔"

"میں تو یہ جانتی ہوں کہ جب تک یہاں رہوں گی مجھ پر گھر والوں کا قہر نازل ہوتا رہے گا اور میں اپنے ایمان کے ساتھ تمہارے واپس آنے کا انتظار کرتی رہوں گی۔"

وہ اس کے ساتھ بند دروازے کے پاس آ کر بولی۔ "امی! ابو! دروازے کے پاس آئیں، میری بات سنیں۔"

ماں کی آواز سنائی دی۔ "باتیں تو اس لڑکے سے کرتی ہیں۔ تم دروازہ تو کھولو۔"

وہ بولی۔ "کاشف سے کوئی نہیں بولے گا۔ یہ جو سب ہیں۔ میں نے رسیاں کھول دی ہیں۔"

باپ نے چیخ کر کہا۔ "کیا بکواس کر رہی ہو۔ وہ بھاگ جائے گا۔"

"ابو! میں انہیں رخصت کر رہی ہوں۔ مجھے ان کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ میں باتیں کر چکی ہوں۔"

"تم نے اسے جانے دیا تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ دروازہ کھولو۔"

حدیقہ نے کاشف کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑے جذبے سے بولا۔ "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

وہ بولی۔ "احسان نہیں اعتماد... میرے اعتماد کو نہ بھولنا۔"

وہ الٹے قدموں جاتے ہوئے بولا۔ "ہاں، ٹھیک کہتی ہو۔ مجھ پر اعتماد کر رہی ہو۔ میں نہیں بھولوں گا۔" پھر وہ پلٹ کر دوڑتا ہوا صحن کے دروازے کو کھول کر جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اسرار احمد دروازہ پیٹ رہا تھا۔ وہ چپ کھڑی تھی، کاشف کے دور نکل جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے بعد تو اس کی شامت آنے ہی والی تھی۔ دروازے کو مسلسل پیٹا جا رہا تھا، وہ بولی۔ "ابو! چپ ہو جائیں، دروازہ کھلنے سے پہلے میری باتیں سن لیں۔"

ماں کی آواز سنائی دی۔ "وہ اسرار احمد سے کہہ رہی تھی۔ آپ ذرا خاموش رہیں یہ کیا کہتی ہے سن لیں۔"

وہ بولا۔ "ہم اس کی سنتے رہیں گے۔ وہ بھاگ جائے گا۔ اس نے رسیاں کھول دی ہیں۔"

حدیقہ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "وہ جا چکا ہے۔"

وہ پھٹ پڑا۔ دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "کیا بک رہی ہو۔ میں تمہیں زندہ گاڑ دوں گا۔ تم مرا گی تو میرے پوتے پوتی یہاں آئیں گے اور میں تمہاری لاش پر سے گزر کر انہیں یہاں لاؤں گا۔ اب اپنے بیٹے اور بچوں کے بغیر نہیں رہوں گا۔"

ماں کی آواز آئی۔ "تم نے اپنا ہی نہیں ہمارا بھی منہ کالا کیا ہے۔ برادری میں کسی سے آنکھ ملا کے بات نہیں کر سکتے۔ تین برسوں سے اس حرام کی جنی کے ساتھ تمہیں برداشت کرتے آ رہے ہیں۔"

باپ کی آواز آئی۔ "کوئی رشتہ مانگنے تو کیا تم پر تھوکنے بھی نہیں آ رہا ہے۔ ابھی آیا تھا۔ ہم نے اسے مجبور کیا تھا۔ وہ تمہیں منکوحہ بنا کر عزت سے لے جاتا لیکن تمہیں عزت راس نہیں آ رہی ہے۔ تم ہمارا پیچھا نہیں چھوڑو گی۔"

"چھوڑ دوں گی۔" وہ دروازے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "چھوڑ دوں گی۔ یہاں بیٹا اور آپ کی آئندہ نسل ضروری ہے۔ بیٹی سے نسل نہیں چلتی میں غیر ضروری ہوں۔ ابھی دن نکلتے ہی چلی جاؤں گی۔ لیکن مار پیٹ برداشت نہیں کروں گی۔ کوئی مجھے ہاتھ نہ لگائے۔"

بند دروازے کے پیچھے ماں باپ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ سوچ لیں۔ میں لات جوتے کھا کر نہیں جاؤں گی۔ مجھے مصیبت نہ بنائیں۔ چپ چاپ جانے دیں۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ ان کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ باپ غصے میں بھرا تھا۔ اس پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ ماں ان کے درمیان آ گئی۔

انہوں نے اسٹور روم کی طرف دیکھا۔ وہاں فرش پر رسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بیٹی کو گھونسا دکھاتے ہوئے بیوی سے کہا۔ "اسے ابھی دھکے دے کر نکالو۔"

ماں نے کہا۔ "ایسے ہی نکالنا ہوتا تو بیٹے بہو سے الگ نہ رہتے۔ یہ تو دماغ کا پھوڑا بن گئی ہے۔ باہر قدم رکھے گی تو پھر بدنامیاں لائے گی۔"

حدیقہ نے کہا۔ "بیٹیوں کو بدنام ہونے کا شوق نہیں ہوتا۔ مجھے بھی نہیں ہے۔ میں یہاں سے خالہ جان کے پاس چلی جاؤں گی۔"

باپ نے کہا۔ "وہاں کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ مشکل سے ان کا گزارہ ہوتا ہے۔ ہم تمہاری بیٹی کی پرورش کے لیے انہیں تین ہزار روپے مہینا دیتے ہیں۔ کیا تمہارے لیے دس ہزار دیا کریں گے؟"

"میں آپ سے پھوٹی کوڑی نہیں لوں گی۔ لڑکیاں گھر کی چار دیواری میں رہ کر محنت مزدوری کرتی ہیں۔ میں بھی کروں گی۔"

ماں نے کہا۔ "تیرا سر پھر گیا ہے۔ ابھی اچھی بھلی بیاہی بن کر چلی جاتی۔ وہ لڑکا دبو قسم کا تھا۔ ہمارے دباؤ میں رہتا۔ تیری بیٹی کو بھی قبول کر لیتا۔"

وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "بس امی! وہ مجھے یہاں سے لے جاتا اور بعد میں دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیتا۔ مجھ پر جھوٹے الزامات لگاتا تو آپ اور ابو اس کا کیا بگاڑ لیتے؟ آپ اپنے سروں سے مصیبت ٹالنا چاہتے ہیں۔ مجھے تماشا بنانا چاہتے ہیں۔ کسی طرح میرے ماتھے پر منکوحہ کا لیبل لگانا چاہتے ہیں۔ میں جھوٹے لیبل کے ساتھ نہیں جیوں گی۔ تماشا بننے سے پہلے چلی جاؤں گی۔"

وہ منہ پھیر کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ فرش پر کھلی ہوئی رسیاں کہہ رہی تھیں کہ دلہنیں پیار سے لائی جاتی ہیں۔ رسیوں سے باندھ کر نہیں لائی جاتیں۔

اے جانے والے اب تجھ پر ہی تکیہ ہے۔ گر قبول
افتد زہے عز و شرف...

☆☆☆

وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ وہاں سے نجات ممکن نہیں تھی لیکن اس لڑکی نے رہائی دلائی تھی، جسے وہ جانتا بھی نہیں تھا اور جس کی عزت سے کھیلنے آ گیا تھا۔

اس کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی سے برائی کرنے گیا تھا اور اس نے جواباً بھلائی کی تھی۔

وہ اس وقت مکان سے نکل کر بھاگ رہا تھا۔ حدیقہ کو بھول گیا تھا۔ یہ خوف سمایا ہوا تھا کہ اس کا باپ پیچھے آ رہا ہوگا یا پولیس والے اسے پکڑ لیں گے۔

پھر یہ کہ بدن کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ لیلیٰ کے ظالم باپ نے اچھی طرح پٹائی کی تھی۔ ناک سے اور باچھوں سے رسنے والا لہو جم گیا تھا۔ لباس پھٹ گیا تھا اور ڈنڈے کھانے کے باعث جسم کے کئی حصے سوج گئے تھے۔

وہ لنگڑاتا ہوا ایک گلی سے دوسری گلی میں چھپتا ہوا مین روڈ پر آیا۔ وہاں رکشے ٹیکسیاں کھڑی رہتی تھیں۔ اس وقت ایک ہی رکشا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر آ کر گرتے ہوئے بولا۔ "ناظم آباد چلو۔"

رکشا ڈرائیور نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ نیم تاریکی میں واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ اگر وہ زخمی نظر آتا تو ڈرائیور خوفزدہ ہو جاتا کہ اس کے ساتھ خون خرابے والا کوئی معاملہ ہے۔ اسے کبھی نہ لے جاتا۔

لیکن اس کے نصیب میں گھر پہنچنا تھا۔ وہ دل ہی دل

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں راضی کو گالیاں دیتا ہوا اپنے دروازے پر پہنچ گیا۔ باپ اور بہن کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔ وہ اسرار احمد کی کال کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ بہن بھائی کی خیریت اور سلامتی کے لیے مصلیٰ بچھا کر دعائیں مانگ رہی تھی۔

دستک کی آواز سنتے ہی جلال اکبر نے تیزی سے آکر دروازہ کھولا۔ پھر بیٹے کے چہرے اور لباس پر لہو کے دھبے دیکھ کر اسے غصہ دکھانا بھول گیا۔ بہن اسے دیکھ کر رونے لگی۔

وہ سہارے کے بغیر آیا تھا لیکن باپ اور بہن کی ہمدردیاں حاصل کرتے رہنے کے لیے ان کا سہارا لے کر لنگڑاتے ہوئے بستر پر آکر گر گیا۔

باپ نے پوچھا۔ ''یہ کیا حالت بنا کر آئے ہو؟''

وہ جواب دینے سے کترانے کے لیے آنکھیں بند کر کے ایسے کراہنے لگا جیسے بہت زیادہ تکلیف میں مبتلا ہو۔ بہن نے کہا۔ ''گھر میں پین کلر ہے۔ ایک گولی کھلاتی ہوں۔ تکلیف کم ہو جائے گی۔''

وہ دوا لانے چلی گئی۔ جلال اکبر بیٹے کو پریشان ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کسی اسرار احمد نے تمہارے فون سے کہا تھا کہ تم اس کے گھر کی عزت سے کھیلنے گئے تھے۔ اس نے تمہیں رسیوں سے باندھ کر رکھا ہے۔''

باپ بول رہا تھا اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''اسرار احمد نے کہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد مجھے کال کرے گا۔ لیکن دو گھنٹے تک انتظار کرنے کے بعد کال نہیں آئی تم آگئے ہو۔ بات کیا ہے؟ ایسی کیا بات ہوگئی کہ انہوں نے مجھے کال نہیں کی اور تمہیں رہا کر دیا؟''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''ابو! میرے زخموں کی مرہم پٹی کریں۔ میری تکلیف کا خیال کریں۔ جو ہو گیا اس پر مٹی ڈالیں۔ کیا آپ کے اطمینان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ نہ ان کی عزت پر آنچ آئی ہے نہ میں نے آپ کی عزت پر حرف آنے دیا ہے۔ ان باتوں کو جانے دیں۔''

اس نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ پھر قریب آکر اس پر جھک کر کہا۔ ''آنکھیں کھولو۔ مجھ سے نظریں ملاؤ۔''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''ابو! بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔''

''ابھی جوتے ماروں گا تو کھل جائیں گی۔ تم کوئی کارنامہ تو انجام دے کر نہیں آئے ہو برخوردار!''

نبیلہ ایک گلاس پانی اور دوا لے کر آئی۔ بھائی سے بولی۔ ''اٹھو، دوا کھاؤ۔''

باپ نے کہا۔ ''یہ نہیں اٹھے گا۔ آنکھ نہیں کھل رہی ہے۔ یہ اسی طرح لیٹے لیٹے مر جائے گا۔''

بیٹی نے باپ کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر حیرانی سے کہا۔ ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

وہ غصے سے بولا۔ ''اس کے لیے مرنے کی دعا کرو۔ تم اسے بھائی کہتی ہو نا؟ کیا بھائی ایسے ہوتے ہیں؟ دو مہینے بعد تمہاری شادی ہے اور یہ ہماری عزت کو مٹی میں ملانے گیا تھا۔ انہوں نے اسے رسیوں سے باندھ کر رکھا تھا۔ ابھی ہماری عزت کا جنازہ نکال دیتے تو کیا تمہیں اپنے گھر کی عزت بنانے کے لیے کوئی بیاہنے آتا؟ آنے والے رشتہ توڑ دیتے۔ لعنت ہے ایسے بے غیرت بھائی پر اور نالائق اولاد پر۔''

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جب بدنامی یہاں تک آئے گی اور آپ کا سر جھکے گا تب آپ مجھے باتیں سنائیں۔ میں نے آپا کی شادی روکنے والا کوئی کام نہیں کیا ہے۔''

باپ نے اس کے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ ''تو پھر اتنی رات کو کہاں مرنے گیا تھا؟ کہاں تجھے رسیوں سے باندھا گیا تھا اور کہاں سے اتنی مار کھا کر، زخمی ہو کر آرہا ہے؟''

''میں کہاں گیا تھا۔ کیا ہوا تھا یہ ایک الگ معاملہ ہے لیکن یہ تو مان لیں کہ میں نے ذلت اور بدنامی کو اپنے دروازے تک نہیں آنے دیا ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''ہاں یہ تم نے بہت بڑا کمال دکھایا ہے۔ مگر یہ تو بولو کمال دکھانے کہاں گئے تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو رات کو کسی جوان لڑکی کے گھر میں گھس جاؤ گے تو باپ تمہاری بدمعاشی کو نظر انداز کر دے گا اور اس بات سے خوش ہو جائے گا کہ تم نے ہمیں بدنام ہونے سے بچا لیا ہے؟ نہیں برخوردار...! تمہیں اپنے کالے کرتوت کی پوری ہسٹری سنانی ہوگی اور میری چھت کے نیچے رہ کر سزا بھی پانی ہوگی۔''

''ابو! ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ غلط فہمی ہوگئی تھی۔ وہ جس نے فون پر آپ سے بات کی تھی۔ وہ میرے دوست نعیم کے والد ہیں۔ میں ابھی نعیم سے ملنے گیا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ میں ان کے بیٹے سے نہیں بیٹی سے ملنے آیا ہوں۔''

''یعنی ان کا بیٹا نعیم گھر میں نہیں تھا۔ ہوتا تو تمہیں رسیوں سے باندھنے نہ دیتا۔ بعد میں آکر اس نے رسیاں کھلوائی ہیں۔''

''یہی بات ہے۔ آپ تو بولنے سے پہلے ہی سمجھ گئے۔''

''اسرار احمد کا فرض تھا کہ وہ تمہیں بے قصور باندھ کر رکھنے کی معافی مجھ سے مانگتا یا پھر مجھے فون ہی نہ کرتا...... یا پھر اپنی کال کا انتظار کرنے کو نہ کہتا۔''

اس نے بیٹے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''چلو ان تمام باتوں کو جانے دو۔ اپنا فون مجھے دو۔''

وہ بوکھلا گیا۔ اتنی دیر بعد یاد آیا کہ فون تو اس سے چھین لیا گیا ہے۔ وہ اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ''فون پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے؟''

''وہیں رہ گیا ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔''

جلال اکبر نے اپنا فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ وہ باپ کو کال کرنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ اس کا جھوٹ کھلنے والا تھا۔

جلال اکبر فون کو کان سے لگائے کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ باہر راہداری میں کھلے ہوئے دروازے سے نظر آرہا تھا۔ فون پر باتیں کر رہا تھا۔ بیٹا باتیں بنا کر باپ کو ٹالنا چاہتا تھا۔ ادھر باپ کو اس کا سارا کیا دھرا معلوم ہو رہا تھا۔

وہ خاصی دیر تک باتیں کرتا رہا بلکہ دوسری طرف کی باتیں زیادہ سنتا رہا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ پھر فون بند کر کے کمرے میں واپس آگیا۔ بیٹے کو گھور کر بولا۔ ''اچھا تو وہ تمہارا آدھا سر مونڈ کر آدھا چہرہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر گھمانے والے تھے۔''

وہ ذرا جھینپ گیا، پھر ڈھٹائی سے بولا۔ ''انہیں بکواس کرنے دیں۔ میں گدھے پر بیٹھ کر نہیں آیا ہوں۔''

''اگر وہ بٹھا دیتے تو؟ اور وہ کیوں ایسا نہ کر سکے؟ کس کی مہربانیوں سے تمہیں رہائی ملی ہے؟''

اتنی دیر بعد اسے حدیقہ یاد آئی۔ باپ نے کہا۔ ''اس کے ماں باپ زبردستی اسے تمہاری منکوحہ بنا رہے تھے اور تمہیں مجبوراً اسے دلہن بنا کر یہاں لانا پڑتا۔ میں بھی عزت اور نیک نامی کو بحال رکھنے کے لیے اسے بہو تسلیم کر لیتا لیکن وہ نیک سیرت بچی اپنی جیتی ہوئی بازی ہار گئی وہ جبر سے نہیں، پیار سے بہو بن کر آنا چاہتی ہے۔ خدا اسے اور ایمان دے۔ اگر وہ رسیاں نہ کھولتی تو کیا اس کے ماں باپ تمہیں یہاں آنے دیتے؟ وہ تو مجھے وہاں بلانے والے تھے۔''

نبیلہ نے کہا۔ ''ابو! وہ لڑکی تو بہت ہی نیک سیرت اور سمجھ دار ہے۔ اسے تو ضرور ہمارے گھر آنا چاہیے۔''

کاشف نے گھور کر بہن کو دیکھا پھر کہا۔ ''فضول باتیں نہ کریں۔ میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔ ابھی تو کم از کم پانچ برس تک تعلیم حاصل کرنی ہے۔''

جلال اکبر نے کہا۔ ''دو ماہ بعد نبیلہ کی رخصتی ہے پھر ہم باپ بیٹے کو کھانا کون پکا کر دے گی؟ گھر کون سنبھالے گی؟ حدیقہ نے تم پر اندھا اعتماد کیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ تم اپنے دل سے راضی ہو کر اسے دلہن بنانے آؤ۔ تمہاری تعلیم شادی کے بعد بھی جاری رہے گی۔ گھر میں جلد سے جلد بہو کی ضرورت ہے اور میں نبیلہ کو رخصت کرتے ہی دوسرے ماہ حدیقہ کو لے آؤں گا۔''

وہ جھنجلا کر بستر پر اچھل کر دو زانو ہو کر بولا۔ ''میں نہیں کروں گا شادی۔ آپ کیا جانتے ہیں کہ وہ لڑکی کیسی ہے۔ میں آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگلوں گا۔''

باپ نے گھور کر پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں کیا کہوں گا۔ اس کا پورا خاندان جانتا ہے وہ بے حیا اور بدچلن ہے۔ وہ دو لڑکوں کے ساتھ بدنام ہو چکی ہے۔ وہ لڑکی نہیں ہے۔ عورت ہے، ایک بچی کی ماں ہے۔''

باپ بیٹی نے حیرت سے یہ باتیں سنیں۔ پھر باپ نے بے یقینی سے کہا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

اس نے کہا۔ ''سانچ کو آنچ کیا ہے۔ جو میں بول رہا ہوں۔ وہ ان کا پورا خاندان بولے گا۔ حدیقہ کی وہ بیٹی اس کی خالہ جان کے ہاں پرورش پا رہی ہے۔''

''تم یہ باتیں کیسے جانتے ہو؟''

''حدیقہ نے خود مجھ سے کہا ہے۔''

نبیلہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا حدیقہ نے خود کہا ہے؟ کیا کوئی لڑکی خود کو بدچلن اور بے حیا کہے گی؟''

''اس نے خود کو بے حیا نہیں کہا۔ میرے سامنے بات بنائی کہ دو لڑکوں سے دھوکا کھا گئی ہے۔''

جلال اکبر نے کہا۔ ''جو لڑکی اپنی عزت رکھنے کے لیے بھی جھوٹ نہیں بولتی ہے، سچ بول دیتی ہے تو پھر یہ سچ ہے کہ وہ بے حیا نہیں ہے۔ دھوکا کھا گئی تھی۔''

''آپ کچھ بھی کہیں اس بات سے تو انکار نہیں کریں گے کہ وہ کنواری ماں ہے۔ اس نے شادی کے بغیر بچی پیدا کی ہے، آپ نے اسے بہو بنایا تو وہ اپنی بچی کے ساتھ یہاں آئے گی۔ میں تو کبھی شادی نہیں کروں گا۔''

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ جلال اکبر پریشانی سے سوچ رہا تھا۔ حدیقہ نے اپنے بہترین عمل سے جس قدر متاثر کیا تھا۔ بیٹا اتنا ہی الجھا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فی الحال کیا کہنا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔ وہ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

نیکی کر دریا میں ڈال یعنی نیکی کا صلہ کبھی نہ مانگ' خدا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر چھوڑ دے۔

یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ لوگ بے حس اور مطلب پرست ہوتے ہیں۔ کاشف نے لات جوتے کھائے تھے۔ اسے رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ حدیقہ کو دلہن بنا کر لے جانے سے انکار کرتا تو سرِ عام اسے گدھے پر بٹھایا جاتا پھر وہی نہیں باپ بھی ذلتیں برداشت کرتا اور وہ کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہتے۔

ان حالات میں حدیقہ نے خلافِ توقع نیکی کی۔ انہیں تمام ذلتوں سے رہائی دی۔ اس کے بعد یہ کہنا سراسر ظرفی تھی کہ نیکی کرنے والی بدچلن ہے اور کنواری ماں ہے۔

جیسے وہ دھوکا کھا کر راضی کے بجائے حدیقہ کے پاس پہنچا تھا۔ ویسے حدیقہ کو دھوکا دے کر پہلے ایک فراڈی اس کی تنہائی میں آیا پھر دوسرا اس سے کھیل کر چلا گیا۔

اس نے کسی سے محبت کی تھی، بے حیائی نہیں کی تھی لیکن اس پر بے حیائی کا داغ لگ گیا تھا اور یہ داغ کاشف لگا رہا تھا اور ایسے وقت بھول رہا تھا کہ حدیقہ نے بھی اسی طرح دھوکا کھایا تھا۔

لوگ دوسروں کی مظلومیت بھول جاتے ہیں صرف اپنی یاد رکھتے ہیں اور کسی کی نیکی اور شرافت کو بھولنے کے لیے اسے نظروں سے گرانے والی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے اندر برائیاں نکال کر ہی اس کا ہاتھ پکڑنے سے انکار کیا جاسکتا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ جب دلہن بنانے کے لیے کنواری لڑکیاں مل سکتی ہیں تو ایک بچی کی ماں کو گردن میں ڈھول بنا کے کیوں لٹکایا جائے۔

تازہ مچھلیاں پکڑنے کے لیے آگے سمندر ہی سمندر ہوتا ہے۔ بی بی نادان حدیقہ... اتم تو گئیں۔

فی الحال وہ اپنی مظلومیت پر اور ظلم کرنے والی راضی اور ثمینہ پر جھنجلا رہا تھا۔ ابھی وہ ہاتھ آجاتیں تو ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتا۔ ان کی صورتیں بگاڑ کر رکھ دیتا۔

اور وہ انہیں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ان سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ وہ اس بات پر بھی جھنجلا رہا تھا کہ اس نے راضی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟

ثمینہ کو جانتا تھا۔ اس کے ساتھ کے ایف سی میں اور کھلی سڑکوں پر اس نے کچھ وقت گزارا تھا۔ اگرچہ اس کا پتا ٹھکانا بھی نہیں جانتا تھا لیکن صورت آشنا تھا۔ اسے شاپنگ سینٹرز اور تفریح گاہوں میں ڈھونڈ سکتا تھا۔

وہ تو اسی رات گھر واپس آکر ان دونوں کو فون پر گالیاں دینا چاہتا تھا۔ لیکن فون اسرار احمد نے چھین لیا تھا۔ اس نے دوسرے دن ایک نیا فون خریدا۔ دن کے وقت راضی سے رابطہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ رات ایک بجے کے بعد اپنی ماں کے فون سے ایس ایم ایس کے ذریعے باتیں کرتی تھی۔

اس نے ثمینہ کے نمبر پنچ کرنے سے پہلے ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچا کہ فراڈ کرنے والیوں سے کیسے نمٹا جائے؟

عقل نے کہا۔ وہ دونوں یہ سوچ رہی ہوں گی کہ کاشف ان کی پلاننگ کے مطابق حدیقہ کے گھر میں گھس کر پھنس گیا ہوگا۔ وہاں اسے جوتے پڑیں گے پھر اسے پولیس کے حوالے کیا گیا ہوگا۔

انہیں یہی سوچنا چاہیے تھا۔ ان کی پلاننگ کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے تھا۔ راضی کا مکان حدیقہ کے مکان سے جڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی پڑوسن تھیں۔ اس رات راضی... جاگتی رہی تھی۔ انتظار میں تھی کہ کاشف چوروں کی طرح پڑوسن کے گھر میں گھسے گا تو پکڑا جائے گا۔ پھر چور کے پکڑے جانے کا شور مچے گا۔ پورا محلہ جاگ جائے گا پھر وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ باہر نکل کر تماشا دیکھے گی۔

وہ صبح اذان کے وقت تک جاگتی رہی لیکن پڑوس کے مکان میں کسی چور کے گھسنے سے ہلچل پیدا نہیں ہوئی۔

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ دور سے ہی دیکھ سکتی تھی۔ اتنی رات کو جوان لڑکی باہر نکل کر انکوائری نہیں کرسکتی تھی۔ وہ حیران تھی کہ حدیقہ کے مکان میں سکون تھا۔ جیسے سب گہری نیند سو رہے ہوں۔

اس کے اندر کھلبلی پیدا ہوگئی۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کاشف اسی مکان کے اندر گیا تھا تو کوئی ہنگامہ برپا کیوں نہیں ہوا؟

وہ تمام رات جاگتی رہی۔ فون کے ذریعے کاشف سے بات نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے والدین اسے پرسنل فون رکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

اسی لیے وہ رات کو چوری چھپے ماں کے فون کے ذریعے کاشف سے باتیں کرتی تھی۔ اب وہ دوسری رات ایک بجے اس سے رابطہ کرسکتی تھی لیکن رابطہ کر کے کیا کہتی کہ پچھلی رات تم میرے پاس آئے تھے جبکہ وہ حدیقہ کے پاس گیا تھا۔

اب تو کاشف اس کی ماں کے فون پر ایس ایم ایس کے لیے کال کرتا تو وہ فون اٹینڈ نہ کرتی۔ یہ طے تھا کہ پچھلی

رات اس کا جھوٹ کھل چکا ہے۔ وہ یہ سوچ کر جھنجلا رہی تھی کہ جھوٹ کھل بھی چکا ہے یا نہیں؟ پچھلی رات حدیقہ کے مکان میں کیا ہوا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

وہ دوسری صبح سات بجے پھر دس بجے گھر سے نکل کر حدیقہ کے مکان کو دیکھتی رہی۔ اس مکان کے اندر اور باہر گہری خاموشی تھی۔ وہ سب ہی دن کے گیارہ بجے تک ایسے سو رہے تھے جیسے تمام رات جاگتے رہے ہوں۔

پھر اس نے بڑے میاں کو دروازہ کھول کر صحن کے ٹوائلٹ میں جاتے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد اسرار احمد موٹر سائیکل دھکیلتا ہوا صحن سے باہر جانے لگا۔ اس نے اپنے صحن سے پوچھا۔ "انکل! حدیقہ کیا کر رہی ہے؟"

اس نے کہا۔ "وہ سو رہی ہے۔ کبھی اتنی دیر تک نہیں سوتی۔ شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ بولتا ہوا موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے چلا گیا۔ حدیقہ سے پڑوسن کی حیثیت سے شناسائی تھی۔ وہ بے تکلف سہیلی نہیں تھی۔ اس کے پاس جا کر پچھلی رات کی کوئی بات اس سے اگلوا نہیں سکتی تھی۔

ایسے وقت اس کی امی نے آواز دی۔ "کہاں ہو؟ ثمینہ کا فون ہے آؤ۔ بات کرو۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ماں کے کمرے میں آئی۔ وہاں ماں نہیں تھی، فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "شکر ہے تُو نے فون کر لیا۔ میں سوچ رہی تھی کیسے تجھ سے بات کروں۔"

اس نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟ پریشان لگ رہی ہے؟"

"پریشانی نہیں، الجھن ہو رہی ہے۔ وہ گدھا عاشق کل رات پڑوسن کے گھر میں گھسا تھا۔ میں حیران ہوں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ رات سے اب تک جاگ رہی ہوں۔ کچھ معلوم نہیں ہو رہا ہے کہ وہ الو یہاں آکر خیریت سے واپس کیسے چلا گیا؟"

ثمینہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ لات جوتے کھائے بغیر کیسے چلا گیا۔ تیرے منہ سے سن کر یقین نہیں آرہا۔"

"میں نے اسرار انکل سے پوچھا تھا' حدیقہ کیا کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا۔ پتا نہیں کیوں آج وہ دیر تک سو رہی ہے۔"

ثمینہ نے کہا۔ "اس کا مطلب تو وہی ہوا نا؟"

"ہاں، رات کی تھکن اتار رہی ہے۔"

"یار! یہ کاشف تو مقدر کا سکندر نکلا۔ ہم نے اسے کھائی میں گرانا چاہا' یہ کے ٹو کی چوٹی پر پہنچ گیا۔"

راضی نے کہا۔ "اس کی تو چاندی ہوگئی۔ اب وہ ہمارے پیچھے پڑے گا۔ اسے ہمارا فراڈ معلوم ہوا ہوگا۔"

"ہاں، پتا نہیں ہمارے بارے میں ان کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہوں گی۔"

"یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارا فراڈ کھل گیا ہے۔ یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ وہ میں نہیں ہوں اس کا نام حدیقہ ہے اور ہم نے اسے دھوکا دے کر اس کے پاس بھیجا ہے۔"

"وہ ہم سے فون پر ضرور بات کرے گا۔ تب ہی معلوم ہوگا کہ اب تک کیا ہوچکا ہے۔"

"میرے پاس فون نہیں ہے۔ میں تیرے پاس آرہی ہوں۔ کاشف بھی رات بھر کا جاگا ہوا ہے۔ سو رہا ہوگا۔ دوپہر تک ضرور ہمیں کال کرے گا۔"

کاشف نے صرف تین گھنٹے کی نیند لی تھی۔ اس کے اندر یہ غصہ بھرا ہوا تھا کہ دو لڑکیوں نے اسے الو بنا کر ذلت کی کھائی میں گرنے کو بھیجا تھا۔ اب ان سے انتقام لیے بغیر اسے سکون نہیں مل سکتا تھا۔

وہ ایک نیا فون خریدتے وقت سوچ رہا تھا کہ راضی اور ثمینہ کے ساتھ کیسا رویہ رکھے گا؟ ان سے کیا کہنا چاہیے؟

عقل نے سمجھایا، غصہ دکھانے سے، انہیں گالیاں دینے سے ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ فون بند کردیں گی۔ کہیں پبلک پلیس میں بھی ان کے خلاف کچھ نہیں کرسکے گا۔

وہ فون خریدنے کے بعد ایک جگہ بیٹھ کر بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر ذہن میں یہ بات آئی کہ ان سے دشمنی نہ کی جائے، دوست بن کر، میٹھی چھری بن کر انہیں ذبح کیا جائے۔ انہوں نے بھی دوستی اور محبت کے پردے میں یہی کیا تھا۔

اس نے فون پر نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف راضی، ثمینہ کے بیڈروم میں تھی۔ اس نے کہا۔ "کسی کی کال آرہی ہے۔ لیکن یہ کاشف کا نمبر نہیں ہے۔"

ثمینہ نے پاس آکر فون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی نیا مرغا ہے، رانگ نمبر کے ذریعے دوستی کرنے آیا ہوگا۔"

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر بڑی ادا سے کہا۔ "ہیلو...!"

"ہائے ثمینہ! میں بول رہا ہوں۔"

وہ اس کی آواز سن کر شوخی بھول گئی۔ پاس بیٹھی ہوئی راضی کو اس کا نام سنانے کے لیے کہا۔ "ہائے کاشف! یہ کیا......؟ یہ تو تمہارا فون نمبر نہیں ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے کہا۔ "میں نے سم بدل دی ہے۔"

"سم کیوں بدل دی؟"

"ہم چلتے چلتے ضرور تا راستے بدل دیتے ہیں۔ سم بدل دی ہے تو اس میں حیرانی کیا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "کیا بات ہے؟ کیا کسی نئی کے لیے تبدیلی آئی ہے؟"

"ہاں، وہ نئی تم ہو۔ پرانی تو راضی ہے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے سم بدل دی ہے۔"

"کیا سچ کہہ رہے ہو؟ میری خاطر اسے چھوڑ رہے ہو؟"

"چھوڑ چکا ہوں لیکن اس سے پہلے اس کے ساتھ ایک رت جگا منا چکا ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ تم سے اپنا کوئی راز نہیں چھپاؤں گا۔"

"کیا واقعی تم اس سے مل چکے ہو؟"

"ہاں، میں نے کل رات اس کے ساتھ گزاری ہے۔"

"کیا اس کے گھر والوں نے تمہیں نہیں دیکھا؟"

"وہ شور مچاتی تو پکڑا جاتا۔ میں نے اس کا منہ دبا دیا تھا۔ جب تک وہ راضی نہیں ہوئی اسے نہیں چھوڑا لیکن... لیکن تم سے شکایت ہے تم نے اس کا غلط نام بتایا تھا اور وہ بھی فون پر خود کو راضی کہتی رہی تھی۔ اس کا اصل نام تو حدیقہ ہے۔"

ثمینہ نے کہا۔ "حدیقہ اس کا پیدائشی نام ہے۔ ہم سب اسے راضی ہی کہتے ہیں۔"

کاشف نے کہا۔ "میں نے نام کے سلسلے میں اس سے بحث نہیں کی اور ہم زیادہ بول نہیں سکتے تھے۔ ہماری آواز گھر والوں تک پہنچ سکتی تھی۔"

"اس سے اور کوئی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں، ہم گونگے بنے رہے۔ میں نے اس سے ملنے کا خطرہ مول لیا تھا، پکڑا جاتا تو ابھی حوالات میں ہوتا۔ بہر حال خیریت سے واپس آگیا۔ اب توبہ کرتا ہوں۔"

"وہ جوان ہے، خوبصورت ہے پھر توبہ کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تم میرے حواس پر چھا گئی ہو۔ میں نے حدیقہ کے پاس جا کر دیکھ لیا۔ دنیا کی کوئی لڑکی مجھے تمہارے سحر سے نہیں نکال سکے گی۔"

"ہائے... کیا واقعی میں نے ایسا سحر طاری کیا ہے؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ آئندہ تم آزماتی رہو گی مجھ پر کسی حسینہ کا جادو نہیں چلے گا۔"

"آئی لو یو کاشف!"

وہ بولا۔ "آئی لو یو ٹو۔"

"میں ابھی تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"اور میں چاہتا ہوں اُڑتا ہوا تمہارے پاس آجاؤں لیکن نہیں آسکوں گا۔ ابھی ابو کے ساتھ سکھر جا رہا ہوں۔ دو یا تین دنوں کے بعد واپسی ہوگی۔"

"اوہ نو کاشف... ! تین دن تو بہت ہوتے ہیں۔ میں اتنے دنوں تک تمہارے بغیر کیسے رہوں گی؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ تمہارے بغیر کیسے رہوں گا لیکن مجبوری ہے، یہ دن گزارنے ہی ہوں گے۔"

وہ تھوڑی دیر تک پیار بھری باتیں ایک دوسرے کو سناتے رہے پھر فون پر رخصت ہو گئے۔

کاشف کی مجبوری یہ تھی کہ بری طرح پٹائی ہوئی تھی، چہرہ کہیں کہیں سے سوجا ہوا تھا۔ دو تین دنوں میں سوجن ختم ہوتی۔ تب ہی ثمینہ سے مل سکتا تھا۔

ثمینہ نے راضی سے کہا۔ "اسے یقین ہو گیا ہے کہ حدیقہ ہی راضی ہے۔ مجھ پر تو ذرا بھی شبہ نہیں کر رہا ہے۔ اندھا اعتماد کر رہا ہے۔ اچھا، یہ بتا کیا میں اتنی حسین اور پرکشش ہوں کہ وہ میری خاطر دوسری تمام حسین لڑکیوں سے توبہ کر لے گا اور فرشتہ بن کر میرے ساتھ زندگی گزارے گا؟"

راضی نے کہا۔ "بکواس کرتا ہے۔ میں نہیں مانتی کہ حدیقہ کو حاصل کر لینے کے بعد چھوڑ دے گا۔ ہم نے اسے دیکھا ہے کتنی حسین ہے۔ اگر عبایا پہن کر نہ رہے تو اس کا سراپا دیکھنے والے اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ویسے وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نہیں مانتی کہ حدیقہ اس کے ہاتھ لگی ہوگی۔ انگور ہاتھ نہ آئیں تو کہا جاتا ہے کھٹے ہیں۔ وہ ہاتھ نہیں لگی ہوگی تب ہی کہہ رہا ہے کہ وہ منہ لگانے کے قابل نہیں ہے۔ پتا نہیں کل رات وہاں کیا ہوا تھا۔ جو ہوا ہوگا وہ ہم سے چھپا رہا ہے۔"

ثمینہ نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھ سے باتیں بنا رہا ہے۔ حدیقہ اس کے ہاتھ نہیں لگی ہے اسی لیے انگور کھٹے کہہ رہا ہے۔ اس کے پاس دال نہیں گلی تو میرے پاس گلانے کے لیے سچا عاشق بن رہا ہے۔ اس سے بہت محتاط رہنا ہوگا۔"

"وہ تو ہم رہتے ہیں۔ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کل رات وہاں کیا ہوا تھا؟ جب تک معلوم نہیں ہوگا ہمارے اندر کھد بد سی ہوتی رہے گی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

اچانک ہی راضی نے چونک کر کہا۔ ”ثمینہ! اس نے تمہیں کسی دوسرے نمبر سے فون کیا تھا۔ تم نے اس سے پوچھا تھا کہ اس کا اپنا فون کہاں ہے؟“

”ہاں، میں نے پوچھا تھا لیکن اس نے بات بنائی تھی مجھے ٹال دیا تھا۔“

”کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے اپنے فون سے تجھے کال کیوں نہیں کی؟“

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگیں۔ پھر راضی نے کہا۔ ”سوچنا کیا۔ ابھی اس کا نمبر پنچ کر۔ معلوم ہوجائے گا کہ اس نے فون کیوں بدل دیا ہے۔“

ثمینہ نے اسی وقت اس کے نمبر پنچ کیے پھر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی۔ پھر حدیقہ کی آواز سنائی دی۔ راضی قریب آکر فون سے لگ گئی۔

اس نے حدیقہ کی آواز پہچان لی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہیلو...“

اتنا کہہ کر رک گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا۔ بات کرنے سے جھجک رہی ہے پھر اس نے کہا۔ ”میں...... میں حدیقہ بول رہی ہوں۔“

وہ پھر چپ ہوگئی۔ ادھر سے جواب کی توقع کر رہی تھی۔ ثمینہ نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر راضی سے کہا۔ ”میں کچھ بولوں گی تو وہ فون بند کردے گی۔“

راضی نے کہا۔ ”تو کچھ نہ بول۔ دیکھتے ہیں وہ آگے کیا بولتی ہے۔“

وہ بول رہی تھی۔ ”آپ کا یہ فون میں نے اپنے پاس رکھا ہے۔ خالہ جان کے پاس رہنے جارہی ہوں۔ آپ کچھ بولیں۔“

اس نے انتظار کیا پھر کہا۔ ”ہیلو... کاشف...! آپ خاموش کیوں ہیں؟“

ثمینہ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ کاشف کی آواز سننا چاہتی ہے۔ نہ سن کر فون بند کردے گی۔“

راضی نے کہا۔ ”چلو۔ کسی حد تک کچھ تو معلوم ہوا۔ کل رات کاشف بامراد رہا ہے۔ دونوں میں دوستی ہوگئی ہے۔ اس نے اپنا فون حدیقہ کو دیا ہے۔“

ثمینہ نے کہا۔ ”اور اب وہ خالہ کے گھر جارہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کاشف کو وہاں بلائے گی۔ یار! ہم نے سوچا تھا کیا اور کیا ہو رہا ہے؟ وہ تو فاتح نکلا۔ اس کا کمینہ پن دیکھو، انگور کھا کر کھٹے کہہ رہا ہے اور یہاں سچا عاشق بن کر مجھے الو بنا رہا تھا۔“

راضی نے کہا۔ ”بہت چالاک بن رہا ہے۔ وہ مکار سوچ بھی نہیں سکے گا کہ ہم نے کس طرح اس کی مکاری معلوم کی ہے۔ یہ لوگ کیسے ہوس پرست ہوتے ہیں۔ حدیقہ جیسی حسین لڑکی کو حاصل کرکے بھی تیری طرف لپک رہا ہے۔“

ثمینہ نے کہا۔ ”اب آئے میرے پاس! اس کے سر پر سینڈل نہ بجایا تو میرا نام نہیں۔“

اس کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حدیقہ ہے...“

راضی نے اس سے فون لے کر کہا۔ ”اس سے بات کرنی چاہیے۔“

”کیا کہو گی؟“

”تم چپ چاپ سنتی رہو۔“

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ حدیقہ کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔ لائن کٹ گئی تھی۔ سگنل بہت کم آرہے ہیں۔“

راضی نے کہا۔ ”تمہیں تو ایک بوائے فرینڈ کا سگنل مل گیا ہے۔“

اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”سہاگ رات مبارک ہو۔“

حدیقہ کو دھچکا سا لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ کسے مبارکباد دے رہی ہو؟“

”پارسا نہ بنو۔ ہم لڑکیوں سے شرمانا کیا؟ تمہیں تو مجھ سے دوستی کرنی چاہیے۔ میرا شکر ادا کرنا چاہیے۔ تمہاری جوانی کے پہلے کھلاڑی کو میں نے ہی بھیجا تھا۔“

حدیقہ سن رہی تھی، سمجھ رہی تھی کہ وہ فون پر بولنے والی راضی ہے۔ اسی نے کاشف کو الو بنا کر اس کے پاس بھیجا تھا۔

راضی بڑے فخر سے بول رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سنتی ہوئی تیزی سے سوچ رہی تھی کہ جواباً کیا کہنا چاہیے۔

پھر راضی نے پوچھا۔ ”چپ کیوں ہو؟ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں۔ کاشف نمبر ون فراڈ ہے۔ ہم سے دوستی کرو گی تو ہم تمہیں اس کے فریب سے بچائیں گے۔“

حدیقہ نے کہا۔ ”فریبی کون ہے؟ تم نے میرا نام راضی بتا کر اسے میرے گھر بھیجا تا کہ وہ پکڑا جائے اور میری بھی بدنامی ہو۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔ تمہاری جیسی ذلیل، کمینی اور فریبی دنیا میں اور کوئی نہیں ہوگی۔“

وہ غصے سے بولی۔ ”یو شٹ اپ۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔ تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟“

”فون بند کرنے سے پہلے یہ سن لو کہ وہ پکڑا کیوں نہ گیا۔ میں بدنام کیوں نہ ہوئی؟“

یہی ایک بات معلوم کرنے کے لیے وہ دونوں سہیلیاں بے چین تھیں اور اتنی دیر سے کاشف اور حدیقہ کے مشترکہ فون میں گھسی ہوئی تھیں۔

حدیقہ نے کہا۔ ”کاشف پکڑا گیا تھا لیکن ابو نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہمارے بچھڑے ہوئے چچا کا بیٹا تھا۔ بنگلا دیش بنتے وقت وہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ گھر آجاؤ سناؤں گی۔ فی الحال تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ تم نے برسوں کے بچھڑے ہوئے رشتوں کو ملا دیا ہے۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ بے حیائی کے الزام سے بچنے کے لیے باتیں بنا رہی ہو۔“

”سانچ کو آنچ کیا ہے۔ میرے گھر آؤ۔ میرے بزرگ تو جھوٹ نہیں بولیں گے لیکن تمہاری جیسی فراڈ کرنے والی ذلیل، کمینی یہاں جوتے کھانے نہیں آئے گی۔“

راضی نے فوراً ہی فون بند کردیا۔ ثمینہ فون سے لگی تمام باتیں سن رہی تھی۔ دونوں کے منہ لٹک گئے۔ وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔

راضی نے کہا۔ ”لعنت بھیجو اس پر، ابھی تو کتنے ہی مرغے ہمارے فون کے ڈربے میں ہیں۔“

”کیسے لعنت بھیج دوں؟ ابھی تک صرف کے ایف سی میں اس کے پیسے خرچ کرائے ہیں، اس الو کے پٹھے سے کوئی بڑی شاپنگ کرانی ہے۔ وہ حدیقہ کو حاصل کرنے کے بعد بھی مجھے پھانس رہا ہے، دیکھ لینا...... آج کل میں اس سے مہنگی شاپنگ ضرور کراؤں گی۔“

راضی نے کہا۔ ”اس کے پیچھے خوار ہوگی۔ وہ رقم اڑانے والوں میں سے نہیں ہے۔ حدیقہ کی طرح تجھے بھی مفت میں پانا چاہے گا۔“

”کیا میں اسے ایسے ہی مفت میں چھوڑ دوں؟“

”نہیں، ہم اپنے دوسرے مرغوں سے بولیں گے وہ اسے نقصان بھی پہنچائیں گے اور اچھی طرح پٹائی بھی کریں گے۔“

وہ فون کے ذریعے اپنے دوسرے بوائے فرینڈز سے رابطہ کرنے لگیں۔ راضی کے پاس اس کا اپنا فون نہیں تھا۔ اس کے والدین جوان لڑکی کو فون رکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس نے ایک سم خرید لی تھی۔ اسے ثمینہ کے فون میں لگا کر اپنے بوائے فرینڈز سے بات کرنے کے لیے استعمال کرتی رہتی تھی۔

بیشتر والدین اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ آج کی جوان نسل موبائل فون کا کتنا غلط استعمال کر رہی ہے۔ روک تھام کے باوجود اگر پورے ملک کا سروے کیا جائے تو کروڑوں لڑکوں اور لڑکیوں کے پرس اور اسکول بیگ میں ہر لمحہ فون کی کالنگ ٹون چیخ رہی ہوں گی اور ہر ایک منٹ میں کروڑوں خاموش میسجز کا تبادلہ ہو رہا ہوگا۔

کہیں ملاقات کا وقت مقرر کیا جا رہا ہوگا کہیں مرادیں پوری ہو رہی ہوں گی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر گزرتے ہوئے لمحہ میں کروڑوں والدین الو بنتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

وہ ثمینہ سے فون پر باتیں کرنے کے بعد سو گیا تھا۔ پچھلی رات کی نیند پوری کرنی تھی لیکن ایک گھنٹے کے اندر ہی ثمینہ کی کال نے اسے جگا دیا۔ وہ نیند بھری آواز میں بولا۔ ”ہاں بولو۔“

اس نے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ ابھی اپنے باپ کے ساتھ سکھر جا رہے ہو۔ تین دنوں کے بعد آؤ گے۔ لیکن کل جو رت جگا منایا تھا اس کی نیند پوری کر رہے ہو۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔“

وہ چیخ کر بولی۔ ”یو چیٹ! یو فراڈیے! ہمیں معلوم ہوچکا ہے۔ حدیقہ سے تمہاری رشتے داری ہے اور اتنی اپنایت ہوگئی ہے کہ تم اپنا فون اسے دے کر آئے ہو۔ ابھی میں نے تمہارے فون پر اس سے بات کی ہے۔ اب اگر میرے سامنے آؤ گے تو سینڈل اتار کے ماروں گی اور تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔ ایسا انتقام لوں گی کہ آئندہ کسی لڑکی کو دھوکا دینے سے پہلے کان پکڑ لو گے۔ یو گو ٹو ہیل!“

اس نے ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم کردیا۔ کاشف نے اپنے فون کو دیکھا۔ ثمینہ ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اسے ایک ذرا دکھ نہیں ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے خود کو تسلی دی۔ موبائل فون سلامت رہے، اس پنجرے میں کتنی ہی آتی رہیں گی۔

ثمینہ کی یہ بات دماغ میں لگ رہی تھی کہ اس کا چھینا ہوا فون حدیقہ کے پاس ہے۔ اس نے سوچا۔ ”فون باپ نے چھینا تھا، بیٹی کے پاس کیوں ہے؟“

اس سوال کا جواب سمجھ میں آگیا۔ حدیقہ نے اس امید پر اسے رہائی دی تھی کہ وہ ایک دن برات لے کر اس کے گھر آئے گا اور اس کے باپ اسرار احمد نے بھی اس امید

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر بیٹی کو فون دیا ہوگا کہ کاشف گھر جا کر شاید اپنے فون پر رابطہ کرے گا، حدیقہ کا شکریہ ادا کرے گا اور اسے منکوحہ بنا کر لے جانے کی بات کرے گا۔

رہائی تو اسے اسی امید پر ملی تھی۔ وہ پورا گھر اس سے امیدیں لگائے ہوئے تھا اور وہ اپنی محسنہ کو ایسے نظر انداز کر رہا تھا جیسے کسی غیر ضروری چیز کو پھینک آیا ہو۔

نیکی اور شرافت کا کوئی مول نہیں!

وہ نیند پوری کرنے کے لیے پھر سو گیا۔ اپنے ہی ہاتھوں شکست کھانے والی لڑکی کے لیے وہ فون امید پرور تھا۔ اسے ڈھارس دے رہا تھا کہ وہ آج نہیں تو کل ضرور اس سے بولے گا۔

وہ توبہ کر کے سو گیا تھا کہ اپنے فون کا نمبر بھی بھول جائے گا۔ اس لڑکی سے بات کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کا احسان ماننا پڑتا۔ اس کی تعریفیں کرنی ہوتیں اور یہ بتانا پڑتا کہ اسے منکوحہ بنانے کے لیے کب آرہا ہے؟ یہ اس کی نظروں میں سراسر حماقت تھی۔ وہ کبھی ادھر کا رخ کرنے والا نہیں تھا۔

دوسرے دن جلال اکبر نے کہا۔ ”تمہارا فون وہاں پڑا ہے۔ جا کر لے آؤ۔“

اس نے کہا۔ ”وہ فون ضروری نہیں ہے۔ میں نے دوسرا خرید لیا ہے۔“

اس نے بیٹے کو ناگواری سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”کوئی تم پر احسان کرے تو تمہیں کیا کرنا چاہیے؟“

اس نے پوچھا۔ ”کس نے مجھ پر احسان کیا ہے؟“

”تعجب ہے۔ اس نے تمہیں اپنے بزرگوں کی دشمنی سے بچایا۔ تم کبھی رسیاں توڑ کر نہیں آسکتے تھے۔ ہمیں ذلت اٹھانے سے بچا نہیں سکتے تھے۔ اس نے تمہیں گدھے پر بیٹھنے سے بچایا ہے تاکہ تم گھوڑے پر اسے دلہن بنانے آؤ۔“

”سوری ابو! اس نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ وہ بہت چالاک اور مطلب پرست ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کی بے حیائی کسی سے چھپی نہیں رہے گی۔ ایک کنواری ماں بننے والی کو کوئی اپنے گھر کی عزت بنا کر نہیں لے جائے گا۔

اگر میری طرح کوئی پھنس جائے گا اور مجبوراً نکاح پڑھوائے گا تو اپنے گھر لے جا کر اسے لات جوتوں میں رکھے گا۔“

”بیٹے! انسان خطا کا پتلا ہے۔ سب ہی سے چھوٹی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی سے ایک بڑی غلطی ہوجائے اور وہ توبہ کرے اور اپنے ایمان سے اور اپنے بہترین اعمال سے یہ ثابت کرے کہ واقعی وہ دین دار اور دیانت دار ہوگیا ہے تو اسے معاف کردیا جاتا ہے۔“

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بے حیائی سے توبہ کر چکی ہے۔ پھر وہی کھیل چوری چھپے نہیں کھیل رہی ہوگی۔“

”اگر وہ اب بھی بے حیا ہوتی تو تمہیں پھانسنے میں دیر نہ کرتی۔ اس نے جبراً یہاں نہ آکر ثابت کیا ہے کہ وہ مسائل پیدا کرنے والی لڑکی نہیں ہے۔ بہت ہی سمجھ دار ہے۔ معاملات کو اپنی شرم و حیا اور ایمان کے مطابق سلجھانا جانتی ہے۔“

”میں آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ ایک بات جانتا ہوں کہ میں جیسا ہوں ویسی ہی آپ کی بہو ہو۔ میں کنوارا ہوں جسے لاؤں گا وہ بھی کنواری ہوگی۔“

”تم اور کنوارے؟ میں باپ ہو کر نہیں کہہ سکتا کہ میرا بدمعاش بیٹا پارسا ہے۔ اگر ہو تو کل تمہاری بدمعاشیاں میرا سر جھکا دیں گی۔ یاد رکھو ایک بار تو بچ گئے دوسری بار گدھے کی سواری سے نہیں بچو گے۔“

وہ اٹھ کر جانا چاہتا تھا۔ باپ نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر بٹھا دیا۔ ”بیٹھو۔ کب تک اچھائی سے اور سچائی سے بھاگتے رہو گے؟“

”ابو...! اگلے مہینے سے پیپرز ہیں۔ مجھے پڑھنے دیں۔ یہ شادی وادی کے جھنجٹ میں نہ پھنسائیں۔“

”تم جو پڑھ رہے ہو۔ وہ میرے سامنے ہے۔ کبھی اے گریڈ تو کیا بی گریڈ سے بھی کامیاب نہ ہوئے۔ ہر سال نمبروں کی بھیک مانگ کر آگے بڑھتے ہو۔“

”پاس تو ہوتا ہوں، فیل کبھی نہیں ہوا۔“

”صرف پاس ہونے سے اور سند حاصل کرنے سے علم حاصل نہیں ہوتا۔ علم حاصل نہ ہو تو اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ ابھی میں حدیقہ کی اچھائی کے اور تمہاری بے حسی اور احسان فراموشی کے بارے میں کچھ نہیں بولوں گا۔ تمہاری تعلیم کی بات کرتا ہوں۔ ہر مہینے باپ کے ہزاروں روپے ضائع نہ کرو۔ کتابیں کھولتے ہو تو فون بھی کھلا رہتا ہے۔ علم حاصل کرتے وقت تمہارے کانوں سے ایر فون لگا رہتا ہے۔ یہ ہوتا کیا ہے میں نادان ہوں۔ میں نے معلوم کیا ہے دوسری طرف سے لڑکے لڑکیاں گانے اور لطیفے سناتے رہتے ہیں۔ جو علم تمہیں اچھے برے کی تمیز سکھاتا ہے وہ تمہارے سامنے کھلی کتاب میں ماتم کرتا رہتا ہے۔“

”میں ایسا نہیں ہوں۔ جب بھی پڑھنے بیٹھتا ہوں تو فون کا سوئچ آف کردیتا ہوں۔“

نبیلہ نے کچن سے آکر کہا۔ ”میں سب سن رہی ہوں۔ دن رات تمہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ تعلیم کے وقت فون بند رکھا کرو۔ تم میری بات کیا سنو گے تم تو رات کے دو تین بجے بھی فون سے لگے رہتے ہو۔“

”بیٹی! تم جاؤ۔ یہ ہمیں نادان اور خود کو دانا سمجھ رہا ہے۔ اب میں اسے وارننگ دے رہا ہوں۔ یہ اس بار اے گریڈ سے پاس نہیں ہوگا تو میں اس کی پڑھائی چھڑا دوں گا۔ ایک چھوٹی سی دکان کھول کر بٹھا دوں گا اور اپنی پسند کی بہو لاؤں گا۔ سن رہے ہو؟ تمہیں منظور ہوگا تو یہاں رہو گے ورنہ اپنا بوریا بستر لپیٹ کر یہاں سے جاؤ گے۔ میں اکیلا جی لوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا پھر وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ تم جاہل ان پڑھ رہنا چاہو گے اور میرا سر پھرے گا تو تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دوں گا۔“

وہ کمرے سے چلا گیا۔ بہن دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”کاشف! تم کب سنبھلو گے۔ میں یہاں سے جانے والی ہوں۔ ابو نے تمہیں بھی گھر سے نکال دیا تو وہ اکیلے کیسے جئیں گے۔ ان کی محبت کو سمجھو۔ انہوں نے ہماری خاطر دوسری شادی نہیں کی، ہم پر سوتیلی ماں کا عذاب نازل نہیں ہونے دیا۔ جب تمہیں بھی یہاں سے نکال دیں گے تو پھر سے یہ گھر نہیں بسائیں گے؟ تم جانتے ہو وہ ہوٹل کا کھانا نہیں کھاتے ہیں، گھر کی صفائی ستھرائی اور دوسری ذمے داریاں کوئی دوسری آکر سنبھالے گی۔ پھر جانتے ہو کیا ہوگا۔ اولاد ہوگی۔ مکانوں سے جو کرایہ آتا ہے، وہ جو ایک لاکھ سے اوپر رقم آتی ہے۔ وہ سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی بہنوں میں تقسیم ہوجائے گی۔ تمہیں عقل کب آئے گی کاشف؟“

یہ بات اس کے دماغ کو لگی۔ اس نے سنجیدگی سے بہن کو دیکھا پھر کہا۔ ”میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ابو بھی دوسری شادی بھی کریں گے۔“

”جب وہ تمہاری طرف سے مایوس ہوجائیں گے، ہر طرف سے مجبور ہوجائیں گے تو اور کیا کریں گے۔“

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”میں تو چاہوں گی، وہ اپنا گھر بسائیں۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”یہ ہماری خود غرضی ہوگی کہ میں اپنے گھر چلی جاؤں۔ تم کسی دن اپنا گھر بسا لو اور ان کے بڑھاپے میں کوئی خدمت گار شریک حیات نہ آئے۔ یہ جو تمہارے جیسے بیٹے ہوتے ہیں نا انہیں باپ کی اتنی پروا نہیں ہوتی جتنی دولت اور جائداد کی ہوتی ہے۔ چلو جائداد کے لیے ہی سوچو اور گمراہیوں سے سنبھل جاؤ تو بڑی بات ہوگی۔“

”میں سنبھل جاؤں گا۔ بھلا سنبھلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“

”لوگ سنبھلتے سنبھلتے زندگی گزار دیتے ہیں۔“

”آپ میری بات کو سمجھیں۔ کیا میرے سنبھلنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ان کی ناجائز بات بھی مان لوں۔“

”کیوں بکواس کر رہے ہو کاشف! ابو نے کبھی کوئی ناجائز بات نہیں منوائی ہے۔“

”وہ ایک ناجائز بچی پیدا کرنے والی سے شادی کرنے کو کہتے ہیں، یہ ناجائز بات نہیں ہے؟“

”وہ ایک سنبھل جانے والی سمجھ دار لڑکی کی غلطی پر پردہ ڈالنے کو کہہ رہے ہیں۔ دل میں ایمان رکھو۔ یہ نیکی کرو گے تو خدا بھی تم سے راضی رہے گا۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر بولا۔ ”مجھے نیکیاں کرنی آتی ہیں۔ ابھی جا رہا ہوں۔ باہر کسی اندھے کو سڑک پار کراؤں گا۔ کسی کے گھر میں فاقے ہو رہے ہوں گے وہاں ایک ہفتے کا راشن پہنچا دوں گا۔ مسجد کے دروازے پر کسی کے جوتے چرائے گئے ہوں گے تو اسے نئے جوتے خرید کر دوں گا۔ پھر کیا خدا راضی نہیں ہوگا؟ مجھے سو طرح کی نیکیاں کرنی آتی ہیں، کرتا رہوں گا اس سے زیادہ مجھ سے توقع نہ کی جائے۔“

وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

وہ کوشش کرنے لگا کہ تعلیم کی طرف زیادہ سے زیادہ دھیان دے گا اور موبائل فون صرف ضرورت کے وقت استعمال کرے گا۔ یوں بھی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو فون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ صبح اسکول یا کالج جاتے ہیں دوپہر کو گھر آجاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بچے کسی حادثے سے کسی سانحے سے دوچار ہوسکتے ہیں ایسے وقت فوراً ہی اپنے فون سے گھر والوں کو اطلاع دے سکتے ہیں جبکہ ہزاروں میں سے کسی ایک بچے کے ساتھ بھی حادثہ پیش آجاتا ہے۔

آج کی اہم ضروریات میں موبائل فون بہت ضروری ہے۔ اس دنیا کو ترقی کی راہ پر چلانے والے ڈاکٹرز، انجینئرز، سائنسداں اور بزنس مین اپنا قیمتی وقت بچا رہے ہیں اور موبائل فون کے ذریعے کم سے کم وقت میں جدید ٹیکنالوجی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ لیکن طلبا اور طالبات کے لیے یہ ایسا ہتھیار ہے جس سے وہ خود زخمی ہوتے جا رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔ کاشف بھی خود کو اندر سے زخمی کر رہا تھا اور یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کس طرح خود کو نقصان پہنچا رہا ہے۔

ان دنوں اس کا فون رانگ نمبر والیوں سے خالی ہو گیا تھا۔ راضی اور ثمینہ فون سے نکل گئی تھیں۔ اسے سنبھلنے کا اچھا موقع تھا۔ وہ تعلیم کی طرف زیادہ سے زیادہ دھیان دے کر باپ کو خوش کر سکتا تھا۔ لیکن یہ ایک انسانی کمزوری ہے کہ آدمی پہلے خود کو خوش کرتا ہے پھر دوسروں کی خوشی کرنے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ جال ہاتھ میں ہو تو شکار بھی ہاتھ آجائے۔ کبھی شکاری کے ہاتھ سے بھی جال چھوٹ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہی ہوا۔ لٹیروں نے اسے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اس سے فون چھین کر گاڑی کے پہیے کو پنکچر کر کے اپنی موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے رفو چکر ہو گئے۔

حالات نامہرباں تھے۔ پہلے راضی اور ثمینہ فون سے نکلیں پھر وہ فون ہی حدیقہ کے باپ نے چھین لیا۔ اب اسٹریٹ اسنیچرز دوسرا فون چھین کر لے گئے تھے۔

جو ہوا تھا اس کی بہتری کے لیے ہوا تھا اور وہ نالائق اپنی بہتری پر کُڑھ رہا تھا۔

دوسری طرف ثمینہ کے فون سے کالنگ ٹون ابھری۔ اس نے اسکرین پر نمبر پڑھے، اس کا ایک موبائل فرینڈ کال کر رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا پھر کہا۔ ”ہائے بشارت! کہاں ہو؟ ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“

وہ بولا۔ ”دیکھ لو، دلدار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یاد کرتے ہی حاضر ہو جاتا ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”مانتی ہوں، پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوتا ہے کہ یاد کر رہی ہوں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہچکی آتی ہے۔ فوراً اُڑ کر چلا آتا ہوں۔“

اس بات پر دونوں قہقہے لگانے لگے۔ پھر وہ بولا۔ ”تمہاری ہنسی بہت اچھی لگتی ہے۔ اس لیے تمہیں خوش کرنے کے لیے بتا دوں کہ کاشف کے سر پر چپت پڑ گئی ہے۔“

”کیا تم نے اس کی پٹائی کی ہے؟“

”نہیں، تم نے پٹائی کرنے کو نہیں کہا تھا۔ اسے تھوڑا نقصان پہنچانے کو کہا تھا۔“

”ہاں تو تم نے کیا، کیا ہے؟“

”اس کا موبائل فون چھین کر لے آیا ہوں۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”واقعی؟“

”اس کا نمبر تمہارے پاس ہوگا۔“

”ہاں ہے۔“

”تو اسے کال کرو۔“

”ابھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

”میرے ہی پاس آؤ گی۔ کال تو کرو۔“

اس نے بشارت سے رابطہ توڑ کر کاشف کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر بشارت کی آواز سن کر بولی۔ ”ارے واہ! میں نے کل کہا اور تم نے آج ہی یہ کام کر دکھایا۔“

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تم کہو تو اس کی بائیک چھین لوں۔“

”کیا واقعی؟ اسے اتنا بڑا نقصان پہنچا سکتے ہو؟“

”ہاں، تھوڑا وقت لگے گا لیکن وعدہ کرو جب میں اس کی بائیک چھین کر اس کی پٹائی کروں گا تو تم تماشا دیکھنے آؤ گی۔“

”میرے سامنے اس کی پٹائی کرو گے تو بے شک کمال کرو گے۔ لیکن مجھے کہاں آنا ہوگا؟“

”یہ تو ابھی سوچنا ہوگا۔ پلاننگ کرنی ہوگی۔ کچھ وقت لگے گا۔“

”ہاں۔ ایسے کام میں تو دیر ہوگی۔ میں انتظار کروں گی۔ پھر جب بھی بلاؤ گے تو اپنی سہیلی کے ساتھ آؤں گی۔“

”کون سہیلی؟“

”میں نے بتایا تو تھا، اس کا نام راضی ہے۔“

”تم نے بتایا ہے پھر بھول جاؤں گا۔ مجھے تمہارے سوا کوئی یاد نہیں رہتا۔“

”مجھے خوش کرنے کے لیے بول رہے ہو۔“

”سچ کہتا ہوں، بے اختیار تمہارا نام زبان پر آتا رہتا ہے۔ کل امی نے کہا لیڈی ڈاکٹر کو کال کروں۔ میں نے اس سے رابطہ ہوتے ہی بے اختیار کہا۔ ”ہیلو ثمینہ!... ادھر سے لیڈی ڈاکٹر نے رانگ نمبر کہہ کر کال کاٹ دی۔“

ثمینہ خوشی سے کھلکھلانے لگی۔ وہ بولا۔ ”بس اسی طرح ہنستی رہو۔ میں سات سروں کی سرگم سنتا رہتا ہوں۔“

موبائل فون کی یہی خوبی ہے ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے ایک دوسرے کو اُلّو بنا کر پیار کرتے رہنے کا مزہ آتا ہے، یوں لگتا ہے یہ آلہ جوانوں کو سدا جوان رکھنے کے لیے ہی ایجاد کیا گیا ہے۔

کاشف بھی نوجوان تھا۔ فون کے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ باپ اسے حساب سے جیب خرچ دیتا تھا۔ اس نے جمع کی ہوئی رقم سے دوسرا فون خریدا تھا۔ اب تیسرے کے لیے رقم نہیں تھی۔

ایسے وقت وہ ہیرا پھیری کے ذریعے باپ سے رقم حاصل کرتا تھا۔ کبھی کتابیں اور کاپیاں خریدنے کے بہانے اور کبھی بائیک میں خرابی پیدا کر کے اس کی مرمت کرانے

کے لیے رقم وصول کر لیتا تھا۔

فی الحال یہ ہتھکنڈے کام نہیں آسکتے تھے۔ اس کا ایک دوست فہد ایک بہت نامور ٹیوٹر کے پاس پڑھنے جاتا تھا۔ ٹیوٹر کا نام کوثر نظامی تھا۔ سب انہیں سر نظامی کہتے تھے۔

وہ ایک سبجیکٹ کے ایک ہزار روپے لیتے تھے۔ حقیقتاً ان کے پاس ایم اے آنرز کی جو ڈگری تھی وہ جعلی تھی۔

انہوں نے صرف انٹر تک کالج کا منہ دیکھا تھا باقی رشوت کے ذریعے تعلیمی اسناد حاصل کی تھیں۔ ان کے پاس ایسے طلباء آتے تھے جو والدین سے جھوٹ اور فریب کے ذریعے رقمیں حاصل کرتے تھے۔ والدین فی مضمون ایک ہزار روپے دیتے تھے۔ سر نظامی پانچ سو اپنی جیب میں رکھ کر پانچ سو پیارے طلبا کو دے دیتے تھے۔ یوں سر نظامی کے گھر کا چولہا جلتا تھا اور ہر ماہ طلبا کا جیب خرچ پورا ہوتا رہتا تھا۔

کاشف نے فہد کے پاس آکر کہا کہ اس کا فون گن پوائنٹ پر چھین لیا گیا ہے مگر جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔

”تو پھر کیا سوچ کر آئے ہو؟“

”یہی کہ جو تم کرتے ہو وہی مجھے کرنا ہوگا۔“

”سوچ لو۔ چار سبجیکٹ پڑھنے کے گھر سے چار ہزار لاؤ گے تو تمہیں دو ہزار ملیں گے۔“

”نو پرابلم، ابو راضی ہو جائیں گے۔“

وہ باپ کی محبت کو اور کمزوریوں کو سمجھتا تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ باپ اس کی تعلیم کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرتا رہتا تھا۔ جب بیٹے نے کہا کہ اسے گریڈ سے پاس ہونے کے لیے ٹیوشن پڑھنا ضروری ہے تو وہ خوش ہو گیا۔ بیٹے کا مستقبل روشن کرنے کے لیے چار سبجیکٹس کے چار ہزار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے فوراً جیب سے رقم نکال کر دے دی۔

اسی روز شام تک سر نظامی کی مٹھی میں دو ہزار آئے اور ایک نیا فون کاشف کے ہاتھ میں آگیا۔

انسانی زندگی کا ایسا کون سا شعبہ ہے جہاں جرائم پرورش نہیں پا رہے ہیں۔ وہ سر نظامی کیا پڑھاتے ہوں گے اور طلبا کیا پڑھتے ہوں گے۔ وہ بھی آگے جا کر جعلی سندیں حاصل کریں گے۔

جلال اکبر ان دنوں بیٹی کی شادی کے سلسلے میں مصروف تھا۔ بیٹے کی چالبازیوں کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ رشتے داروں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ نواب شاہ اور سکھر سے بھی قریبی رشتے دار رہنے کے لیے آگئے تھے۔

ان مہمانوں میں کئی جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کے ساتھ خوب ہنسنا بولنا ہو رہا تھا۔ مایوں سے مہندی کی راتوں تک ناچنا گانا بھی ہو رہا تھا۔ انہوں نے بے تکلفی سے ایک دوسرے کے فون نمبر Save کر لیے تھے اور وعدے کیے تھے کہ فون پر ضرور ایک دوسرے کو یاد کرتے رہیں گے۔

ایک رات نبیلہ نے کاشف سے کہا۔ ”کل رات میں پرائی ہو جاؤں گی۔ آج مجھ سے ضروری باتیں کر لو۔ میں ابو کے لیے پریشان ہوں۔ تم سے کہتی ہوں۔ انہیں شادی کرنے دو۔“

کاشف نے کہا۔ ”ابھی آپ یہاں سے گئی نہیں ہیں اور سوتیلی ماں کو لانے کی بات کر رہی ہیں۔“

”جو بھی آئے گی اسے اپنا سمجھو گے تو سوتیلی کبھی نہیں لگے گی اور ابو خوب سوچ سمجھ کر کسی کو لائیں گے۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے ابو نے سچ مچ شادی کا ارادہ کر لیا ہو۔“

”ہاں، ایسا ہی کچھ ہے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا ہے لیکن میں جان گئی ہوں، وہ کسی کو پسند کرتے ہیں۔“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”پسند کرتے ہیں؟ لوگ اس عمر میں لڑکیاں پسند کرتے ہیں یا اللہ اللہ کرتے ہیں؟“

”ایسا نہ کہو۔ ابو اتنے بھی بوڑھے نہیں ہیں کہ خانہ آبادی کے فرائض ادا نہ کر سکیں۔“

وہ جھنجلا کر بولا۔ ”آپ کیسے جانتی ہیں کہ وہ کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں؟“

”میں نے کب کہا کہ کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی ہی عمر کی کوئی خاتون ہیں۔“

وہ منہ کھول کر اسے تکنے لگا۔ نبیلہ سے پوچھا۔ ”یقین نہیں آرہا ہے؟ اور کیسے یقین کروں؟ انہوں نے اس سلسلے میں آپ سے کچھ نہیں کہا ہے پھر یہ کیسے جانتی ہیں کہ وہ اپنی کسی ہم عمر خاتون کو پسند کر رہے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”جوان ہو یا بوڑھے ہوں، کسی کا کوئی راز چھپا نہیں رہتا۔ موبائل فون سب اگل دیتا ہے۔“

”موبائل فون؟“ اس نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا بوڑھے بھی فون کے ذریعے عشق کرتے ہیں؟“

وہ اس کے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”باپ کے بارے میں ایسی بات نہ کرو۔ میں نے چوری سے ان کے میسج پڑھے ہیں۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے ان سے باتیں کرتے ہیں۔“

”پھر تو میں بھی وہ میسج پڑھوں گا۔ وہ اس وقت سو رہے ہیں۔ فون سرہانے رکھا ہوگا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

نبیلہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ”یہ مناسب تو نہیں ہے لیکن ہمیں ابو کے ایسے فیصلے کا علم ہونا چاہیے جسے وہ اولاد سے بولتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔“

”میں ابھی جاتا ہوں۔“

وہ باپ کے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ”رک جاؤ۔ دو بج رہے ہیں۔ وہ تہجد پڑھ رہے ہوں گے۔ ایک گھنٹے بعد گہری نیند میں ہوں گے تب وہاں جاؤ۔“

”ٹھیک ہے میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔“

اس کے کمرے میں چچا اور پھوپی کے بچے سو رہے تھے۔ ہر کمرے میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ نبیلہ نے اپنے کمرے میں سونے والیوں سے کہا تھا کہ وہ بھائی سے کچھ باتیں کرے گی تب انہیں تھوڑی دیر کی تنہائی ملی تھی۔

صرف جلال اکبر کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دروازے پر آکر دیکھا۔ وہ مصلّے پر قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے۔ نماز سے فارغ ہوکر ہاتھ میں فون لے کر میسج کی گونگی زبان سے بول رہے تھے اور کسی کی باتیں سن رہے تھے۔

بیٹے نے باپ کو دیکھ کر سوچا۔ ”یہ موبائل فون کہیں پیچھا نہیں چھوڑتا۔ نیند کے وقت سرہانے رہتا ہے اور عبادت کے وقت مصلّے کے پاس پڑا رہتا ہے۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتے ہیں پھر وہ ہاتھ میں آجاتا ہے۔ آج پتا چلا کہ یہ بوڑھوں کے بھی پیچھے پڑا رہتا ہے۔“

جلال اکبر نے سر گھما کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”آؤ۔ میں تمہیں بلانے ہی والا تھا۔“

وہ ان کے پاس آکر دوزانو ہوکر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ”آپ اتنی رات کو کسی سے بول رہے ہیں۔“

”ہاں، کل بیٹی رخصت ہوجائے گی۔ اس کے لیے میسج کے ذریعے دعائیں موصول ہورہی ہیں۔ کل اس وقت ہمارا گھر ویران ہوجائے گا۔ ہم باپ بیٹے رہ جائیں گے۔“

اس نے بیٹے کو دیکھا پھر کہا۔ ”کوئی بھی گھر ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے بغیر آباد نہیں ہوتا اور ان میں سے کوئی ہمارے گھر میں نہیں ہوگی۔ کل سے یہ عورت کے بغیر گھر نہیں ہوگا۔ چار دیواری کا ایک مکان ہوگا۔ کسی کو تو یہاں ہونا چاہیے۔

تم نے حدیقہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ تم تعلیم مکمل کرنے تک شادی نہیں کروگے۔ تم اب بھی یہی کہتے ہونا؟“

”جی ہاں۔ میں آپ کے مزاج کو خوب سمجھتا ہوں۔ ابھی شادی کے لیے ہاں کہوں گا تو آپ حدیقہ کو میرے سر پر لاکر بٹھادیں گے۔“

”بیٹے! اب میں حدیقہ کے معاملے میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ یہ فیصلہ کرچکا ہوں کہ جس نے ہمارے ساتھ نیکی کی ہے۔ اس کی شادی جب تک نہیں ہوگی تب تک میں تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گا۔ وہ جو تمہاری وجہ سے اس رات بدنام ہونے والی تھی پہلے اسے کسی کی دلہن بن کر نیک نام ہوتے دیکھوں گا۔ اس کے بعد میرے گھر میں کوئی بہو آئے گی۔“

اس نے سر جھکالیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ باپ نے کہا۔ ”اب چونکہ بہو نہیں آئے گی اور کسی کو آنا چاہیے تو وہ تمہاری نئی ماں آئے گی۔“

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”آپ شادی کریں گے؟“

”کیا مجھے نہیں کرنا چاہیے؟ یہ میرا گھر ہے مجھے اسے آباد نہیں کرنا چاہیے؟ چلو۔ میں آباد نہیں کرتا۔ تم کرو۔ حدیقہ کو لے آؤ۔“

”آپ مجھ پر جبر کرنا چاہتے ہیں اور زندگی میں ساتھ چلنے والے رشتے جبراً نہیں ہوتے۔“

”میں نے تمہاری گردن پر چھری نہیں رکھی ہے۔ کسی طرح کا جبر نہیں کررہا ہوں۔ میں تمہارے معاملے میں نہیں بولتا۔ تم میرے معاملے میں نہ بولو۔“

”نہیں بولوں گا۔ لیکن کچھ معلوم تو ہو۔ اتنی جلدی آپ نے کسے دیکھ لیا؟ کیسے اتنی جلدی پرکھ لیا کہ اس کے ساتھ باقی زندگی گزار سکیں گے؟“

”میں نے جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میں سلیقہ کو اٹھائیس برسوں سے جانتا ہوں۔“

اس نے حیرانی سے کہا۔ ”اٹھائیس برسوں سے؟“

”ہاں، ان دنوں ہم ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ ہم نے سوچا تھا، شادی کریں گے اپنا گھر بسائیں گے لیکن میری غریبی اور بیروزگاری آڑے آگئی۔ میں نے اس کے بزرگوں سے کہا۔ مجھے دو برس کی مہلت دی جائے۔ مجھے یقین ہے، میں اتنا تو ضرور کمالوں گا کہ آپ کی بیٹی کا بوجھ اٹھا سکوں۔ لیکن وہ میری خاطر اپنی بیٹی کو بٹھا کر نہیں رکھ سکتے تھے۔ رشتہ آتے ہی ایک برس میں اسے دلہن بنا کر رخصت کردیا۔ اس دن کے بعد پھر ہم نے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی۔ اس کی محبت اور جدائی نے میرے اندر یہ ضد پیدا کردی کہ مجھے اس معاشرے میں صاحب حیثیت بن کر رہنا چاہیے۔ نکھے رہنے والوں کو حقارت ملتی ہے محبت نہیں ملتی۔ پھر میں نے دن رات محنت کی، اپنی ذہانت کو آزمایا، آج تم دیکھ رہے ہو کہ تمہارا باپ

سوائے خدا کے اور کسی کا محتاج نہیں ہے۔“

بیٹے نے پوچھا۔ ”آپ محترمہ کے بارے میں بتائیں۔ کیا اب وہ سہاگن نہیں ہیں؟“

”چار برس پہلے بیوہ ہوگئی تھیں۔“

”ان کے بیٹے بیٹیاں بھی ہوں گے؟“

”بیٹے نہیں ہیں۔ دو بیٹیاں ہیں۔“

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا۔ ”میرا خیال ہے آپ جلد ہی نکاح پڑھا کرلے آئیں گے۔“

”میں تو یہی چاہتا ہوں لیکن کچھ وقت لگے گا۔ پہلے اپنی نبیلہ بیٹی کے سسرال والوں تک یہ خبر پہنچاؤں گا۔ سب ہی حیران ہوں گے کہ اس عمر میں شادی کررہا ہوں۔ جبکہ اڑتالیس برس کا ہوں۔ جوان نہیں ہوں تو بوڑھا بھی نہیں ہوں۔ لوگوں کو باتیں بنانے کی عادت ہے۔ کھل کر اعتراض نہیں کریں گے۔ پیٹھ پیچھے باتیں بنائیں گے۔ ایسا کچھ عرصہ ہوگا پھر سب ٹھنڈے پڑجائیں گے۔ انشاءاللہ دو چار مہینے میں بیاہ کرلے آؤں گا۔“

”ایک کو نہیں، تین کو لائیں گے۔ دو بیٹیاں بھی ہوں گی۔“

”ہاں۔ تم نے حدیقہ کے ساتھ ایک بیٹی کو برداشت نہیں کیا۔ میں دو بیٹیوں کو یہاں پیار بھری سرپرستی میں رکھوں گا۔ کبھی اپنے اندر باپ کا ایمان اور حوصلہ پیدا کرکے ثابت کرو کہ میرے بیٹے ہو۔“

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ آرام کریں۔ آپ کو سونا چاہیے۔ صبح نماز کے لیے اٹھنا پڑتا ہے۔“

”میں تو اٹھ جاتا ہوں۔ تمہیں کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ ماں کی وفات کے بعد شیطان تمہیں لوریاں سناتا آرہا ہے۔“

وہ باپ کی باتیں سنتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔

☆☆☆

دوسرے دن نبیلہ اپنے گھر کی ہوگئی۔ وہ باپ بیٹا اپنے بڑے سے مکان میں تنہا رہ گئے۔ ان کے لیے اب وہ ایک مکان تھا کیونکہ گھر عورت سے بنتا ہے۔ اب وہاں کوئی ماں، بیٹی، بہن اور بیوی نہیں تھی۔

کاشف کو نئی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ دو لڑکیاں سوتیلی بہن بن کر آنے والی تھیں۔ اس کے ابو بہت ہی بندہ پرور اور پیار کرنے والی طبیعت رکھتے تھے۔ ان سوتیلیوں کو اپنی جائداد میں سے حصہ دے سکتے تھے۔

وہ باپ سے جھگڑا کرسکتا تھا لیکن انہیں من مانی کرنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اس بڑھاپے میں باپ بننے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے اور دو چار بیٹے بیٹیاں پیدا کرنے کا اعزاز حاصل کرلیتے۔

وہ دس مکانات جو پچیس برس پہلے صرف دس لاکھ میں بنوائے گئے تھے اب ان کی مالیت پانچ یا چھ کروڑ روپے ہوگئی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات تھی کہ ابو کو آئندہ بچوں کا باپ نہیں بننا چاہیے۔ میں سراسر گھاٹے میں رہوں گا۔

جلال اکبر کی دوسری شادی بیٹے کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ وہ اور چار شادیاں کرلیتے لیکن اولاد پیدا نہ کرتے۔ حصہ دار بننے والی اولاد مسئلہ بننے والی تھی۔

پہلے وہ ایک آزاد پنچھی کی طرح خوابوں اور خیالوں میں پرواز کرتا ہوا اور لڑکیوں سے فلرٹ کرتا ہوا اچھے دن گزار رہا تھا۔ اب باپ نے فکر اور اندیشوں میں مبتلا کردیا تھا۔

ایک روز وہ باپ کے کمرے میں آیا تو وہ غسل خانے میں تھے۔ موبائل فون بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی روشن اسکرین اسے اپنی طرف متوجہ کررہی تھی۔ اس نے قریب آکر دیکھا۔ کسی کا میسج آیا ہوا تھا۔

اس نے غسل خانے کے بند دروازے کو دیکھا۔ سوچا پھر اسے اٹھا کر بٹن دبا کر میسج پڑھنے لگا۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ ”معاملات آپ کو الجھا رہے ہیں۔ کچن کا مسئلہ اہم ہے۔ میں سوچتی ہوں آپ کے لیے کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا مجبوری ہے کسی طرح ماسی کے ہاتھ کا کھانا کھا کر گزارا کریں۔ اللہ نے چاہا تو میں جلد ہی آکر آپ کی تمام مشکلیں آسان کردوں گی۔“

وہ میسج پڑھتے ہی فون کو اس کی جگہ واپس رکھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ دو چاہنے والے اپنی جوانیاں گزار کر بڑھاپے میں ملنے والے تھے۔ بیٹے کا خیال تھا کہ میسج کو رومانٹک ہونا چاہیے تھا یا خاتون کے لکھنے کے انداز میں رومانس ہونا چاہیے تھا۔ لیکن موجودہ عمر میں چولہا ہانڈی کے موضوعات پر چولہے کی آگ بھڑکتی ہے۔ جذبات نہیں بھڑکتے۔

اس نے دو گھنٹے بعد سم بدل کر باپ کو ایک میسج دیا۔ ”ہم ایک ماہر نجوم ہیں۔ آپ کی قسمت کا حال بتاسکتے ہیں۔ آپ ایک بار آزما کر دیکھ لیں۔ ہم بہت ہی معمولی اور معقول معاوضہ لیتے ہیں۔ پہلے دو سوالات کے جواب مفت دیں گے۔ تیسرے سوال کا جواب درست ہو تو معاوضے کے طور پر سو روپے کا بیلنس بھیج دیں۔ صرف ایک بار آزمائیں۔ ہوسکتا ہے آپ کا کوئی رکا ہوا کام ہمارے وسیلے سے جاری ہوجائے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے ابو کو علم نجوم سے بہت دلچسپی تھی انہوں نے فوراً ہی جواباً پوچھا۔ ”کیا آپ میرے ماضی کے متعلق کچھ بتا سکیں گے؟“

اس نے لکھا۔ ”آپ اپنا نام، تاریخ پیدائش، دن...... سال اور وقت پیدائش لکھیں اور اپنی والدہ کا پورا نام بتائیں۔ میں ایک گھنٹے بعد جواب ارسال کروں گا۔“

جلال اکبر نے وہ سب کچھ لکھ بھیجا۔ بیٹا اپنے باپ کے متعلق کیا نہیں جانتا تھا۔ باپ کے بچپن اور جوانی کے حالات اپنی دادی سے سنتا رہا تھا اور بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا آرہا تھا۔

اس نے ایک گھنٹے بعد لکھا۔ ”جناب! آپ اپنی پیدائش کے ایک سال بعد سخت بیمار ہوئے تھے۔ کیا یہ درست ہے؟“

جلال اکبر نے کہا۔ ”یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اکثر بچے ایک آدھ بار ضرور بیمار ہوتے ہیں۔“

”جناب! کوئی یہ نہیں بتائے گا کہ آپ چیچک کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔“

جلال اکبر نے کہا۔ ”ہاں، یہ درست ہے۔ آپ میری جوانی کا کوئی اہم واقعہ بتائیں۔“

”جوانی کو دیوانی کہتے ہیں۔ اس عمر کی خاص بات یہ ہے کہ آپ ناکام رہے تھے۔ ان دنوں ایک نجومی نے آپ سے کہا تھا کہ تقدیر نے اس لڑکی کو آپ کے نام نہیں لکھا ہے لیکن آپ نے یقین نہیں کیا تھا۔ آخر وہ پرائی دلہن بن کر چلی گئی۔“

”آپ درست فرماتے ہیں۔“

”اب آپ تیسرا سوال کریں۔ اس کا جواب درست ہوگا تو آپ میرے موبائل میں سو کا بیلنس ڈالیں گے۔“

جلال اکبر نے ذرا سوچنے کے بعد لکھا۔ ”ایک دور گزر چکا ہے۔ وہ جو پرائی ہوگئی تھی۔ اب بیوہ ہوگئی ہے۔ کیا محبت کا وہ گزرا ہوا زمانہ واپس آسکتا ہے۔ وہ مجھ سے شادی کے لیے راضی ہے۔ کیا ہماری شادی اس بار کسی رکاوٹ کے بغیر ہوسکے گی؟“

نجومی بیٹے نے لکھا۔ ”ماضی کا اشارہ پہلے ہی مستقبل کی طرف ہے کہ جو پہلے حاصل نہ ہوئی وہ اب بھی نہیں ہوگی کیونکہ وہ تمہارے نصیب میں نہیں ہے۔ اگر تقدیر سے لڑکر تدبیر کے ذریعے حاصل کریں گے تو گھریلو ازدواجی زندگی میں مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ آپ کے مقدر میں جوڑ توڑ لکھا ہوا ہے۔ آپ ایک طرف خاتون سے اہم رشتہ جوڑیں گے تو دوسری طرف سے آپ کا ایک اہم رشتہ ٹوٹ جائے گا۔“

جلال اکبر نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ”کون سا اہم رشتہ ٹوٹے گا؟“

”سوری۔ یہ آپ کا چوتھا سوال ہے۔ پہلے آپ تیسرے سوال کی پیمنٹ کریں۔“

”میں ابھی بیلنس بھیج رہا ہوں۔“

”پیمنٹ ہوتے ہی جواب ارسال کروں گا۔ فی الحال آپ مجھے یہ بتادیں کہ ابھی آپ کے کتنے بیٹے اور بیٹیاں ہیں؟“

”میری ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹی بیاہ کر اپنے گھر جاچکی ہے۔“

”کیا آپ بیٹے کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟ مثلاً یہ کہ وہ جوان ہے تو آپ بہو کیوں نہیں لا رہے ہیں؟ اگر اپنی شادی پہلے ضروری سمجھتے ہیں تو کیا بیٹا اعتراض نہیں کررہا ہے؟ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اولاد بہ ظاہر معترض نہیں ہوتی لیکن اندر سے باغی ہوجاتی ہے۔“

”میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔“

”جو جیسا نہیں ہوتا ویسا ہوجاتا ہے۔ ہم تقدیر کے کھیل دیکھتے آرہے ہیں۔ ہم نے آپ کے چوتھے سوال کا جواب بھی دے دیا ہے۔ اس جواب کے مزید سو روپے ادا کردیں۔ جواب یہ ہے کہ بیٹے کو اندر سے ٹٹولیں۔ کیا واقعی وہ فرمانبردار ہے؟ کیا وہ آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتا ہے؟ اگر آپ صاحب جائداد ہیں تو کیا وہ جائداد میں حصہ دار بنانے کے لیے سوتیلے بھائی بہنوں کی پیدائش چاہے گا؟“

”ہوں...... آپ کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ آپ کی پیمنٹ بھیج رہا ہوں۔“

اس نے رابطہ ختم کیا۔ اپنے فون سے دو سو روپے نجومی بیٹے کے فون میں ٹرانسفر کیے اور یہ سوچتا رہا کہ بیٹا فرمانبردار ہوتا تو باپ کی بات مان کر حدیقہ کو گھر لے آتا۔

اسے باپ کی عزت کا پاس ہوتا تو رسوائیاں مول لینے کے لیے کسی لڑکی کے گھر آدھی رات کو نہ جاتا۔ اسے جو کرنا ہوتا ہے وہ چپ چاپ کر گزرتا ہے۔ نتیجہ بعد میں سامنے آتا ہے۔ میں سلیقہ کو شریک حیات بنا کر لا رہا ہوں۔ وہ ابھی چپ ہے لیکن اچانک ہی ایسی کوئی حرکت کرے گا۔ جو نا قابل برداشت ہوگی۔

مجھے محتاط رہنا چاہیے اور اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔

وہ شام تک سوچتا رہا۔ ایک ہی بیٹا تھا اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ یہ کبھی نہ چاہتا کہ وہ باغی ہوجائے۔

اس نے رات کے کھانے پر بیٹے سے کہا۔ ”ہمیں اس گھر کو شاد آباد رکھنا ہے۔ میں تمہارے لیے ایک ماں لا رہا ہوں اگر وہ تمہیں گراں گزرے گی تو یہ گھر کبھی شاد و آباد نہیں رہے گا۔“

”میں نے کبھی نہیں کہا کہ وہ گراں گزرے گی۔“

”تو تم اس کی آمد سے خوش ہو؟“

”خوش ہونا چاہیے۔ آپ کو اس عمر میں ایک خدمت گزار ساتھی کی ضرورت ہے۔“

اس نے لقمہ چباتے ہوئے اسے چور نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر اس سے اولاد ہوگی تو......؟“

”تو وہ میرے سوتیلے ہوں گے۔“

”یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، جب باپ ایک ہے...... ایک ہی لہو ہے تو سوتیلے کیوں کہلاتے ہیں۔ اولاد دو ماؤں کے نام سے الگ الگ ہوتی ہیں لیکن باپ ایک ہی ہوتا ہے۔ ولدیت بھی ایک ہوا کرتی ہے۔ پھر ایک باپ کی اولاد سوتیلی کیوں کہلاتی ہے؟“

”جو دنیا میں ہوتا آیا ہے وہی ہوگا۔ ہمارے اور آپ کے کہنے سے سوتیلے سگے نہیں ہوجائیں گے۔“

”اپنے اندر کی سیدھی سی بات نہیں کہہ رہے ہو کہ جائداد کا بٹوارہ نہیں چاہتے۔“

”جی ہاں۔ یہی بات ہے۔“

”سگے بھائیوں میں جائداد کا بٹوارہ ہوتا ہے۔“

”میں دولت جائداد وراثت اور بٹوارے کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔“

”جبکہ یہی بات تمہیں مجھ سے بدظن کررہی ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جلال اکبر اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں چاہوں گا کہ کوئی اولاد نہ ہو۔ تم میرے لاڈلے ہو۔ صرف تم ہی رہو۔“

”آپ خود اندازہ لگائیں کہ ایک لاڈلے سے اس کا لاڈ پیار چھین کر دوسری اولاد کو دیا جائے تو وہ کیسی تکلیف میں اور غم و غصہ میں رہے گا اور شاید میں یہ تکلیف برداشت نہیں کرپاؤں گا۔ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

باپ ایکدم سے تڑپ گیا۔ کھانے کی پلیٹ کو ہاتھ مار کر دور کرتے ہوئے بولا۔ ”بکواس مت کرو۔ گھر چھوڑ کر جاؤ گے؟ اپنے باپ کو چھوڑ کر جاؤ گے؟ تمہاری ٹانگیں توڑ کر گھر میں بٹھا دوں گا۔ دروازے سے باہر بھی نہیں جاسکو گے۔“

باپ کا غصہ اور محبت ایسی تھی کہ وہ دل کی گہرائیوں تک متاثر ہوا۔ پیار کی سچائی اسی طرح پھوٹ پڑتی ہے۔

وہ صدق دل سے بولا۔ ”ابو! آپ اپنی محبت میرے لیے سمجھتے ہیں۔ میری محبت آپ کے لیے کتنی ہے یہ نہیں سمجھتے۔ میں اس وقت رزق کے سامنے بیٹھا ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں کہ جائداد کا بٹوارہ برداشت کرلوں گا۔ لیکن میرے ابو کی محبت تقسیم ہوجائے، جو مجھے ملتی ہے وہ دوسروں کو ملے، یہ کبھی گوارا نہیں کروں گا۔“

وہ اتنا کہہ کر دو گھونٹ پانی پی کر وہاں سے اٹھ گیا۔ واش بیسن پر منہ دھونے اور کلیاں کرتے وقت محسوس کررہا تھا کہ باپ اس کے اندر سما گیا ہے۔ باپ کی ہستی ہی اس کی جاگیر ہے وہ اس جاگیر کا ایک تنکا کسی کو نہیں دے گا۔

اگرچہ وہ بچپن سے باپ کی بے لوث محبت سے متاثر ہوتا آرہا تھا لیکن ایسی گھڑی کبھی اچانک ہی آتی ہے جب کسی کی محبت دفعتاً دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اس وقت باپ کی شخصیت نے سمجھایا کہ اسے کھلنڈرا پن چھوڑ کر کسی قدر سنجیدہ ہوجانا چاہیے۔ عمر کے ساتھ حالات بھی انسان کے اندر تبدیلیاں لاتے ہیں۔ بعض لوگ اچانک تبدیل ہوجاتے ہیں اور بعض رفتہ رفتہ ہوتے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ ہونے والا تھا۔ جوانی کی شوخیوں میں فوراً ہی بزرگی نہیں آتی۔ ایک روز اچانک ہی اس کے فون پر رانگ کال چیخنے لگی۔

وہ جوان بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کے فون پر رانگ کالیں آتی ہیں۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے رس بھری آواز سنائی دی۔ ”ہیلو اشفاق بھائی! امی کو دوسرا اٹیک ہوا ہے۔ آپی انہیں اسپتال لے گئی ہیں۔ کوئی مرد ان کے ساتھ نہیں ہے۔ آپ کہاں ہیں؟“

کاشف نے پوچھا۔ ”کیا جناح کارڈیو میں لے گئی ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں...... مگر آپ کون ہیں؟ چلیں کوئی بھی ہوں۔ فار گاڈ سیک فرشتہ بن جائیں۔ میری امی کو بچالیں۔“

”میں ابھی وہاں پہنچتا ہوں۔ اپنی امی اور آپی کا نام بتائیں۔“

”امی کا نام جمیلہ خاتون اور آپی کا نام شکیلہ بانو ہے۔“

”میں انہیں بتاؤں گا کہ میں تمہاری فون کال پر آیا ہوں۔ تمہارا نام بھی معلوم ہونا چاہیے۔“

”میرا نام شائلہ ہے۔ آپ نام ہی پوچھتے رہیں گے تو اسپتال کب پہنچیں گے؟“

وہ موٹر سائیکل پر سوار ہوکر کک مارتے ہوئے بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"گاڑی کی آواز سنو۔ میں چل پڑا ہوں۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر کہا۔ "واقعی آپ گاڑی ہیں۔ سوری...... میرا مطلب فرشتہ ہیں۔ فوراً ہی گاڑی میں جا رہے ہیں۔"

پھر وہ پریشان ہو کر بولی۔ "ہائے اللہ! یہ کیا......؟"

اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ بولی۔ "آپی جلدی میں پانچ ہزار یہاں بھول کر گئی ہیں۔ وہاں پریشان ہو رہی ہوں گی۔ یہ رقم انہیں کیسے پہنچاؤں؟"

"گھر کا پتا بتاؤ میں ابھی آ کر رقم لے جاؤں گا۔"

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟"

"میں ناظم آباد سے گرومندر کی طرف جا رہا ہوں۔"

"پھر تو آپ بہت دور ہیں۔ ہم کورنگی میں رہتے ہیں۔ یہاں تک آنے اور اسپتال جانے میں تین گھنٹے لگ جائیں گے۔ پتا نہیں امی کس حال میں ہوں گی۔"

وہ پریشان ہو رہی تھی۔ بول رہی تھی۔ "آپ مائنڈ نہ کریں۔ پلیز یہ رقم آپ ابھی امی کو دیں پھر یہاں آ کر مجھ سے یہ پانچ ہزار لے لیں۔ آپ یہاں آئیں گے تو آپ جیسے مہربان سے مل کر مجھے خوشی ہوگی۔"

وہ تو ملنے کی بات کر رہی تھی۔ ایسے سنہری مواقع کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔ اس نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں تمہاری امی کو ابھی یہ رقم دوں گا۔"

اس نے موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے یوٹرن لیا۔ پلٹ کر گھر آیا۔ کیونکہ جیب میں پانچ ہزار نہیں تھے۔ پھر وہاں سے رقم لے کر اسپتال پہنچ گیا۔ وہاں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مریضہ جمیلہ خاتون کہاں ہیں؟

وہ ڈاکٹر کے انتظار میں مریضوں کے درمیان بیٹھی تھیں۔ کاشف نے سوچا تھا کہ مریضہ کی حالت تشویش ناک ہوگی اسے آئی سی یو میں رکھا گیا ہوگا لیکن وہ نارمل تھیں چہرے سے بیمار لگ رہی تھیں۔

اس نے قریب آ کر سلام کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ جمیلہ خاتون ہیں؟ مجھے شمائلہ نے بتایا ہے کہ آپ پر دوسری بار دورہ پڑا ہے۔"

"ہاں بیٹے! خدا کا شکر ہے ابھی طبیعت سنبھلی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر کا انتظار کر رہی ہوں مگر ایک پریشانی ہے۔ میری شکیلہ پیسے گھر بھول آئی ہے۔"

کاشف نے جیب سے رقم نکالتے ہوئے کہا۔ "ہاں مجھے شمائلہ نے بتایا تھا۔ آپ یہ پانچ ہزار رکھیں اور ضرورت ہوگی تو اور آ جائیں گے۔"

خاتون نے رقم لے کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں۔ کاشف نے پوچھا۔ "آپ کی صاحبزادی کہاں ہیں؟"

"ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔ بیٹے اتم شمائلہ کے پاس جاؤ اور اپنی رقم لے لو۔"

"ایسی کوئی جلدی نہیں ہے ماں جی!"

"بیٹے! وہ اکیلی ہوگی۔ گھبرا رہی ہوگی۔ اسے میری حالت بتا کر تسلی دو۔"

ماں کی طرف سے بیٹی کے پاس جانے کی اجازت مل رہی تھی۔ وہ ایک بوڑھی کے پاس بیٹھ کر کیا کرتا؟ فوراً ہی جانے کے لیے اٹھ گیا۔ ایسے وقت شکیلہ ایک جوان کے ساتھ آئی۔ اتفاق سے وہ کاشف کا دوست تھا۔ اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہائے امجد! تم یہاں؟"

شکیلہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

جمیلہ خاتون نے کاشف سے کہا۔ "بیٹے! تمہیں دیر ہو جائے گی، تم وہاں جاؤ۔"

ادھر شکیلہ امجد کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ذرا دور لے گئی پھر آہستگی سے بولی۔ "اپنے دوست سے نہ کہنا کہ ہم نے آپ سے ادھار سات ہزار لیے ہیں۔ قرض لینے سے سبکی ہوتی ہے۔"

و: لا۔ "میں ایسا نہیں ہوں کہ تمہاری انسلٹ کروں گا۔ یہ لین دین صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔"

وہ شکیلہ کے ساتھ پلٹ کر آیا تو کاشف وہاں سے جا چکا تھا۔ ڈاکٹر بھی آ چکا تھا۔ چھ مریضوں کے بعد جمیلہ خاتون کا نمبر آنے والا تھا، اس نے کہا۔ "بیٹی! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ بسکٹ اور چائے مل جاتی تو اچھا ہوتا۔"

امجد نے کہا۔ "میں ابھی لے آتا ہوں۔"

وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ماں بیٹی تیزی سے اٹھ کر واش روم میں گئیں پھر باہر آئیں تو عبا اور نقاب میں تھیں۔ امجد انہیں دیکھ کر کبھی پہچان نہیں سکتا تھا۔

وہ چائے، دو کپ اور بسکٹ کے دو پیکٹس لے کر آیا تو چڑیاں اُڑ چکی تھیں۔ اس نے کھانے کا سامان ایک طرف رکھ کر وہاں انہیں ہر طرف ڈھونڈا۔ فوراً ہی سمجھ میں نہیں آیا کہ دھوکا کھا چکا ہے۔ اسپتال کے باہر بھی انہیں تلاش کیا۔ اب وہ نظر آنے والی نہیں تھیں۔

ادھر کاشف لیلیٰ کے کوچے میں جا رہا تھا۔ اس نے کورنگی کے ایک مکان کا پتا بتایا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا

راستہ تھا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا پتا غلط ہے۔

اس نے فون پر شمائلہ سے رابطہ کیا۔ کسی شمائلہ نامی لڑکی کا وجود ہوتا تو رابطہ ہوتا۔ فون کے ٹیپ سے آواز سنائی دی، مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔ پھر کسی وقت رابطہ کریں۔ وہ خاموش فون کو دیکھنے لگا۔ اب بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ توقع کے خلاف کچھ ہو رہا ہے۔ اس نے ایک آدھ بار اس نمبر پر رابطے کی کوشش کی۔ پھر اسپتال کی طرف دوڑ لگائی۔

وہاں بھی وہی ہوا۔ "وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔"

جمیلہ خاتون، شکیلہ بانو اور امجد نظر نہیں آئے۔ وہ اس کا کلاس فیلو تھا لیکن اس کا فون نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ تینوں کہاں چلے گئے ہیں؟

دوسرے دن کالج میں اس سے ملاقات ہوئی۔ امجد نے پوچھا۔ "کل تم اسپتال سے اچانک کہاں چلے گئے تھے؟"

کاشف نے کہا۔ "شکیلہ پانچ ہزار روپے گھر بھول آئی تھی۔ میں نے وہ رقم اس کی ماں کو دی۔ پھر اپنی رقم وصول کرنے ان کی دوسری بیٹی کے پاس گیا تھا۔"

امجد نے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں یقین سے کہتا ہوں وہ تمہیں نظر نہیں آئی ہوگی۔"

"ہاں، تم کیسے جانتے ہو؟"

"میری آنکھوں کے سامنے سے وہ ماں بیٹی غائب ہو گئیں اور تم اس سے ملنے پتا نہیں کتنی دور گئے تھے۔"

"کل ایک دن میں پورے ایک ہزار روپے کا پیٹرول جلایا ہے اور پانچ ہزار کیش الگ سے گنوائے ہیں۔"

"اور میں نے سات ہزار کی چوٹ کھائی ہے۔ اس کتیا نے کہا تھا سات ہزار گھر بھول آئی ہے۔"

موبائل فون کے جال میں پھانسنے والے شکاری خود اپنے دام میں آ گئے تھے۔

☆☆☆

کاشف بری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ قسمیں کھا رہا تھا کہ آئندہ کسی کے جال میں نہیں پھنسے گا۔ بلکہ کسی پھنسنے والی کا انتظار کرے گا اس بار جو اس کے فون کی ڈبیا میں آئے گی، وہ زندگی بھر پچھتائے گی۔

فون کے ذریعے جو کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں اور جو مجرمانہ حرکتیں سرزد ہوتی رہتی ہیں وہ اکثر جوان لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان ہی ہوا کرتی ہیں۔ کوئی مات کھانے والی یا مات کھانے والا معصوم اور ہمدردی کے قابل نہیں ہوتا۔ جو معصوم اور شریف ہوتے ہیں وہ رانگ کالیں اٹینڈ ہی نہیں کرتے۔

جلال اکبر اپنے بیٹے کے لیے پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹا خود کو بہت عقلمند سمجھتا ہے تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں واقعی ذہین تھا لیکن دوسرے معاملات میں غلطیاں کرتا رہتا تھا۔

باپ یہ نہیں جانتا تھا کہ بیٹا آدھی رات کو حدیقہ کے گھر میں گھسنے کی شرمناک غلطی کرنے سے پہلے راضی اور ثمینہ سے بھی دھوکا کھا چکا ہے اور اس کے بعد بھی نامعلوم ماں بیٹیوں کے پاس پانچ ہزار روپے ڈبو چکا ہے۔

جلال اکبر یہ سب کچھ نہ دیکھنے کے باوجود اچھی طرح جانتا تھا کہ بیٹا اپنی نادانی کے باعث اخلاقی پستیوں میں گرتا جا رہا ہے۔ اس کا بوڑھا تجربہ کہہ رہا تھا کہ شادی ہوگی اور حدیقہ جیسی شریک حیات اس کی زندگی میں آئے گی تو وہ سنبھل جائے گا۔

وہ اکلوتا بیٹا اس کی جان تھا، وہ کسی بھی طرح اسے سنبھالنا چاہتا تھا۔ جس رات حدیقہ کے باپ نے فون پر اسے کہا تھا کہ اس کے بیٹے کو رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا ہے تو وہی جانتا ہے کہ یہ سن کر اس کی کیا حالت ہوئی تھی۔

پھر یہ کہا گیا تھا کہ بیٹے کو گدھے پر بٹھا کر باپ کی عزت اور نیکنامی کا جنازہ نکالا جائے گا تو یہ دھمکی سنتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

کسی غلطی کرنے والے جوان بچے کو ایسی ذلت آمیز سزا دی جائے تو وہ سدھرتا نہیں ہے اور ڈھیٹ بن جاتا ہے۔ اس رات وہ بیٹے کو ذلت سے نکال لانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ سجدے میں گر کر گڑگڑا رہا تھا۔ جیسے حالات تھے ان کے پیش نظر ذلت اور رسوائی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ان حالات میں شرم سے مر جانے کا ہی ایک راستہ رہ جاتا ہے۔

ایسے وقت حدیقہ ان کی عبادت اور دعاؤں کی قبولیت بن گئی، ایسی نیکی اور شرافت بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ چاہتی تو جبراً کاشف کی منکوحہ بن کر آ جاتی۔ وہ اپنے گھر والوں پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ ایسے وقت اسے نکاح کے نام پر ایک شوہر اور ایک گھر مل رہا تھا۔ وہ گھر جیسا بھی ہوتا وہاں عزت دار منکوحہ بن کر رہ سکتی تھی۔ وہ بیچاری نیکی کرنے والی اب تک اس مرد کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جو بہو بن کر نہ آ سکی اس سے جلال اکبر بہت متاثر ہوا تھا۔ کسی کی نیکی اور شرافت اس کو متاثر کرتی ہے جو دین دار ہوتے ہیں اور حساس دل رکھتے ہیں۔ وہ دوسرے ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

دن حدیقہ کے والدین سے ملنے گئے تھے۔ یہ بات کاشف نہیں جانتا تھا۔ جلال اکبر نے حدیقہ کے بزرگوں کا شکریہ ادا کیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ انہوں نے باپ بیٹے کی عزت رکھی ہے۔ وہ بھی جلد ہی حدیقہ کو اپنے گھر کی عزت بنا کر لے جائیں گے۔

پھر انہوں نے کہا کہ وہ حدیقہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے ابو نے کہا۔ ”اب وہ ہم پر بوجھ بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی خالہ جان کے ہاں رہنے گئی ہے۔ وہیں اس کی تین برس کی بیٹی بھی رہتی ہے۔“

وہ حدیقہ سے بھی مل کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ اسے نیکی کا صلہ ضرور ملے گا۔

حدیقہ کے ابو نے کہا۔ ”آپ میری بیٹی سے ملنا چاہتے ہیں تو اس کی خالہ جان کے گھر جانا ہوگا۔“

”میں ابھی جاؤں گا آپ ان کا نام اور پتا بتائیں۔“

اس نے مکمل پتا سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ان کا نام سلیقہ بیگم ہے محلے میں سب ہی انہیں جانتے ہیں۔ آپ آسانی سے پہنچ جائیں گے۔“

سلیقہ ایسا نام تھا جسے سنتے ہی دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئیں۔ وہ اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں پہنچ گئے تھے۔

ناکام محبت کبھی کبھی بڑھاپے میں بھی یاد آجاتی ہے۔ جلال اکبر نے اس نام کو ذہن سے جھٹک دیا۔ خواہ مخواہ یاد کرنے سے کوئی مل نہیں جاتا۔ دل بھاری اور ذہن بوجھل ہوجاتا ہے۔

وہ اپنی موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا اس دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے حدیقہ سے ملنے کے لیے دستک دی۔ دروازہ کھلا تو سامنے سلیقہ دکھائی دی۔ ایکدم سے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔

خزاں کی عمر میں بہار کا جھونکا سا آیا۔

وہ بھی حیران سی، ہکا بکا سی رہ گئی۔

وہ گمشدہ محبت کی دہلیز پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”جلال... !تم...؟“

وہ جیسے خواب دیکھ رہی تھی۔ ”یہ تم... تم ہو؟“

دونوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ پوری جوانی گزارنے کے بعد بڑھاپے کے موسم میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا تم ہی حدیقہ کی خالہ جان ہو؟“

”ہاں، تم حدیقہ کو کیسے جانتے ہو؟“

”میں اس سے مل کر ہی تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔“

”آؤ، اندر آکر بیٹھو۔“

وہ ایک کمرے میں آکر ایک پرانی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ مکان کی اندرونی حالت بتارہی تھی کہ وہ بہت ہی غربت اور محتاجی کی زندگی گزار رہی ہے۔

سلیقہ نے آواز دی۔ ”حدیقہ یہاں آؤ۔ یہ تم سے ملنے آئے ہیں۔“

چند لمحوں کے بعد ہی ایک بہت ہی پیاری سی لڑکی نے آکر اسے سلام کیا پھر پوچھا۔ ”آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟“

”ہاں بیٹی! میں اس نالائق کاشف اکبر کا باپ ہوں۔“

یہ سنتے ہی اس نے سر کے آنچل کو ایک ذرا گھونگٹ کے طور پر آگے کرلیا، وہ بولا۔ ”یہاں بیٹھو اور میری باتیں سنو۔“

وہ ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔ ”میں باپ ہو کر اپنے بیٹے کو نالائق کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ وہ ایسا ہی ہے، تم نے اسے نہ جانتے ہوئے اس پر بھروسا کیا۔ تمہارا خیال تھا کہ اسے نیکی اور شرافت متاثر کرے گی اور وہ تمہاری قدر کرے گا۔“

وہ بولی۔ ”میں نے جو کیا ہے اس کا صلہ صرف اللہ سے چاہتی ہوں۔“

”یہی ہمارا ایمان ہے ہمیں صرف خدا پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں بیٹے کی بے حسی پر شرمندہ ہوں لیکن مایوس نہیں ہوں۔ یہ عہد کر چکا ہوں کہ تمہیں ضرور اپنی بہو بناؤں گا۔ کچھ وقت لگے گا لیکن اس سر پھرے کو راہ راست پر ضرور لاؤں گا۔“

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ ”وہ آپ کے صاحبزادے ہیں آپ کا جو فرض ہے وہ ادا کریں۔ میں نیکی کرکے بھول جانا چاہتی ہوں۔“

سلیقہ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے کہا۔ ”حدیقہ! ان کا نام جلال اکبر ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی اتنا کہہ دوں کہ یہ ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔ اگر تمہاری قدر کررہے ہیں تو پھر دل سے کررہے ہیں۔“

”میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ تمہاری بہن کی بیٹی ہوگی۔ اس حوالے سے یہ میرے اور قریب ہوگئی ہے۔“

سلیقہ نے کہا۔ ”اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔“

”ہاں، مجھے بتایا گیا ہے۔ کہاں ہے وہ؟“

اچانک دروازہ کھلا۔ ایک تین برس کی بچی دوڑتی ہوئی آکر حدیقہ سے لپٹ گئی۔ سلیقہ نے کہا۔ ”یہ لیں۔ نام

لیتے ہی کوئی فرمائش کرنے آگئی ہے۔“

وہ حدیقہ سے کہہ رہی تھی۔ ”امی! آئسکریم والا آیا ہے۔ جلدی پیسے دیں چلا جائے گا۔“

حدیقہ نے اپنی خالہ جان کو دیکھا۔ سلیقہ نے کہا۔ ”کتنی بار سمجھایا ہے۔ یہ آئسکریم اچھی نہیں ہوتی۔ کھانے سے گلا بیٹھ جاتا ہے۔ دیکھو، یہ کون ہیں؟“

بچی نے جلال اکبر کو بڑی معصومیت سے دیکھا۔ سلیقہ نے کہا۔ ”یہ تمہارے نانا جان ہیں۔ انہیں سلام کرو۔ ان کے پاس جاؤ، ان سے ہاتھ ملاؤ۔“

بچی کو ٹالنے کا انداز ایسا تھا جیسے گھر میں نقد پیسے نہ ہوں۔ جلال اکبر نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”ہم اپنی بیٹی کو گاڑی میں بٹھا کر لے جائیں گے اور بہت مزیدار آئسکریم کھلائیں گے۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

وہ بولی۔ ”میرا نام موی ہے۔“

اس نے سلیقہ سے کہا۔ ”کیا میں اسے تھوڑی دیر کے لیے قریبی مارکیٹ تک لے جاسکتا ہوں۔“

”ضرور لے جائیں لیکن اسے فضول چیزیں نہ دلائیں۔ یہ سر پر چڑھ جائے گی۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ارے بھئی! میں اسے سر پر نہیں موٹر سائیکل پر لے جارہا ہوں۔“

وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر باہر آیا۔ سلیقہ اور حدیقہ نے دروازے پر آکر دیکھا۔ موی بہت خوش تھی، آئسکریم کھانے کے لیے ایک اجنبی کی دوست بن گئی تھی۔

سلیقہ انہیں جاتے دیکھ رہی تھی اور حدیقہ اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی، کچھ سمجھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔ ”خالہ جان! وہ جاچکے ہیں۔ آپ ابھی تک ادھر ہی دیکھے جارہی ہیں؟“

سلیقہ ایکدم سے جھینپ گئی۔ حدیقہ نے کہا۔ ”آپ انہیں برسوں سے جانتی ہیں۔ کیا صرف جانتی ہیں یا کچھ اور...“

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”کچھ اور سے بھی زیادہ رہا ہے۔ ان دنوں یہ غریب اور بیروزگار تھے۔ ان کے رشتے کو ٹھکرادیا گیا تھا۔ قسمت ساتھ دیتی تو آج میں ان کے گھر میں ہوتی۔“

پھر وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ”پڑوسن سے چائے کی پتی اور دودھ مانگ کر لاتی ہوں۔ ہوسکا تو ناشتے کا بھی انتظام کروں گی۔ کبھی کبھی تو ہم بالکل ہی ننگے بھوکے ہوجاتے ہیں۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ادھار مانگ کر لے آئی۔ جلال اکبر ایک گھنٹے بعد آیا تو موی مہنگے کھلونوں سے لدی ہوئی تھی۔ چاکلیٹ، بسکٹس اور جوس کے پیکٹس الگ تھے۔

سلیقہ نے کہا۔ ”آپ تو اس کے لیے بازار خرید کر لے آئے ہیں۔ ویسے اتنا خرچ نہیں کرنا چاہیے۔“

”میں نے یہ بچی کے لیے کیا ہے۔ کیا مجھے اتنا حق دو گی کہ تمہارے لیے بھی کچھ کرسکوں؟“

سلیقہ نے جھجکتے ہوئے حدیقہ کو دیکھا۔ حدیقہ کھلونوں کو اور کھانے کی چیزوں کو اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”آؤ موی! ہم اس کمرے میں چلیں، مجھے چائے بھی بنانی ہے۔“

وہ موی کے ساتھ چلی گئی۔ جلال اکبر نے کہا۔ ”حدیقہ بہت سمجھ دار ہے۔ اب میری بات کا جواب دے سکو گی۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کچھ بھی کریں گے تو کس رشتے سے کریں گے؟“

”اس رشتے سے جس سے عزت ملتی ہے۔ جس کی دین ہمیں اجازت دیتا ہے۔“

”کیا اس عمر میں شادی خانہ آبادی کی باتیں کرنا اچھا لگے گا؟ دنیا والے کیا کہیں گے؟“

”ہم جوان نہیں ہیں تو بوڑھے بھی نہیں ہیں۔ اپنی بہتری کے لیے اچھے ارادوں سے کسی بھی عمر میں گھر بسایا جاسکتا ہے۔ دنیا والوں کی پروا نہ کرو۔ آج میں غریب اور بیروزگار نہیں ہوں اور تم بزرگوں کی پابندیوں میں نہیں ہو۔ ہم دونوں آزاد ہیں۔ ہمیں شادی خانہ آبادی سے کوئی روک نہیں سکے گا۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔“

”تو پھر ہاں کہہ دو۔ نبیلہ کی رخصتی کے ایک آدھ ماہ بعد ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجائیں گے۔“

”آپ مجھے سوچنے دیں۔“

”تم سوچتی رہو۔ جب تک میرے گھر نہیں آؤ گی تب تک یہ گھر میرا ہے۔ میں یہاں کے تمام اخراجات پورے کرتا رہوں گا۔“

”نکاح سے پہلے یہ مناسب نہیں ہے۔“

”میں تم سے زیادہ جانتا ہوں کہ میری ہونے والی منکوحہ کے لیے کیا بہتر ہے۔“

وہ بولی۔ ”عورت کی بھی کیا مجبوری ہے، وہ مرد کے سہارے کے بغیر جی نہیں سکتی۔ میں چھ برسوں سے بیوگی کی زندگی گزارتے ہوئے محنت مزدوری کرتی رہی۔ سوچتی رہی کہ کوئی سہارا مل جائے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ جلال اکبر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اللہ تعالیٰ ایسی مہربانی فرما رہا ہے جس کے متعلق میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ آپ تو گم ہو گئے تھے معجزے کی طرح اچانک آ گئے ہیں۔“

وہ دونوں بڑی آسودگی محسوس کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے دلی جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ اس دن کے بعد جلال اکبر وہاں روز ہی آنے لگا۔ سلیقہ کی دال روٹی کے مسائل حل کر دیے۔ اس کے گھر کا حلیہ بھی درست کر دیا۔

اس نے کہا۔ ”میں فی الحال کاشف کو یہ بتاؤں گا کہ ایک خاتون سے شادی کرنے والا ہوں۔ لیکن یہ نہیں بتاؤں گا کہ تم حدیقہ کی خالہ ہو۔“

”اس سے کیا کہیں گے؟“

”یہی کہ میں دو بیٹیوں کی ماں سے شادی کر رہا ہوں۔ وہ بیٹیاں بھی ہمارے ساتھ رہا کریں گی۔“

”جب میں آپ کے گھر آؤں گی تو وہ حدیقہ کو دیکھ کر حیران رہ جائے گا۔“

”میں چاہتا ہوں ہماری شادی ہونے تک وہ حدیقہ کی طرف مائل ہو جائے۔ نہیں ہوگا، اسے دلہن بنا کر اپنی چھت کے نیچے نہیں لائے گا تو وہ اسی گھر میں میری بیٹی بن کر رہے گی۔“

سلیقہ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ ایک ہی چھت کے نیچے اس کے ساتھ رہے گا، اسے دن رات دیکھتا رہے گا تو اس کی خدمت گزاریوں سے متاثر ہو جائے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

وہ حدیقہ کو بہو بنانے کے لیے اچھی تدابیر سوچ رہا تھا لیکن بیٹا باپ کی ہی شادی کے خلاف تھا۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے باپ سے اور اولاد ہو۔

کاشف نے پچھلے دنوں کہا تھا۔ ”میں آپ کا ایک ہی لاڈلا بیٹا ہوں۔ یہ لاڈ پیار آپ کسی دوسری اولاد کو دیں گے تو مجھے تکلیف ہوگی۔ جائداد تقسیم ہو جائے کوئی بات نہیں، مجھے ملنے والا پیار تقسیم ہوگا تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

یہ دھمکی سن کر باپ کا کلیجا کانپنے لگا تھا۔ وہ ایک ہی بیٹا تھا۔ دوسرے تیسرے ہوتے تب بھی اس کی اہمیت کم نہ ہوتی۔ وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

اب تک تو یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ اولاد جائداد کی تقسیم پر جھگڑتی ہے وہ بیٹا محبت کی تقسیم پر باپ سے جھگڑ رہا تھا۔ کاشف کی محبت کے اس انداز نے جلال اکبر کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؟

کاشف کا کوئی سوتیلا بھائی یا بہن نہ ہو ان کی آمد کو روکنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ سلیقہ سے شادی نہ کرے۔

برسوں کی بچھڑی ہوئی محبت ملتے ملتے پھر گمشدہ ہو سکتی تھی اور یہ انتہائی نامناسب تھا کہ معجزے کے طور پر ملنے والی محبت سے انکار کر دے۔ نہ سلیقہ کو آباد کرے نہ حدیقہ کو اپنے گھر لائے۔ سارے منصوبے تہس نہس ہو رہے تھے۔

اس نے پریشان ہو کر سلیقہ سے پوچھا۔ ”میں کیا کروں؟“

اس نے کہا۔ ”پریشان ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے آپ ذرا صبر کریں۔ ہم سب سوچیں گے، کوئی ایسی تدبیر کریں گے کہ بگڑی بن جائے گی۔ اونٹ اسی کروٹ بیٹھے گا جس کروٹ ہم چاہتے ہیں۔“

☆☆☆

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دنیا سو رہی تھی اور اسی دنیا کے ساٹھ فیصد موبائل فون جاگ رہے تھے۔ کاشف رابطہ کرنے والیوں کے ساتھ مصروف تھا۔

موجودہ جوان نسل کے سونے اور جاگنے کا وقت بدل چکا تھا۔ بستر پر تنہا رہنے کے باوجود ایسی حرارت ملتی تھی جیسے وہ بولنے والی رگ جاں کے قریب آ گئی ہو۔

وہ کانوں میں گھس کر بولتے بولتے رات کی تنہائی میں دل کے اندر گھس آتی تھی۔ کمرے میں اندھیرا ہوتا تھا۔ ایسا ہی لگتا تھا کہ ایک ہی تکیہ پر اس کا بھی سر ہے۔

موبائل فون سے پہلے لڑکیاں دور کا نظارہ تھیں۔ اب وہ سب کی سب ننھی سی ڈبیا سے گزر کر بیڈ پر چلی آتی تھیں۔ ایسے وقت سب سے پہلے یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ اس آنے والی کی صورت کیسی ہے؟

اور جب کاشف کی تاریکی اور تنہائی میں بولنے والی کی صورت بنتی تھی تو وہ حیران رہ جاتا تھا۔

وہ صورت من موہنی مورت حدیقہ کی ہوتی تھی۔

وہ کیسے چلی آتی تھی جبکہ اسے نظر انداز کر چکا تھا؟

پہلی بار ایسا ہوا تو اس نے ذہن سے اسے جھٹک دیا تھا۔ اس کی صورت مٹ گئی تھی۔ اس نے خیالوں میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہا، صرف بولنے والی کی آوازیں سن کر ان سے بولتا رہا۔

پھر اس نے محسوس کیا کہ رات کو جب بھی تاریکی میں فون پر کوئی بولتی ہے تو اندھیرے میں حدیقہ کی صورت ابھر آتی ہے۔

سمجھنے کی بات یہ تھی کہ اس کی زندگی اب تک ایک حدیقہ ہی رات کو اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اس نے حدیقہ کی طرح راضیہ اور ثمینہ کو رات کی تاریکی میں روبرو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ بھی نہیں آتی تھیں۔

دن کی اور رات کی روشنی میں دوسری لڑکیوں کے چہرے خیالوں میں جھلکتے تھے لیکن رات تو جیسے صرف حدیقہ کے لیے ہی وقف ہو گئی تھی۔

حدیقہ کو دیکھے ہوئے پانچ ماہ گزر گئے تھے۔ وہ اس کے خیال سے مسلسل کترا تا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ گھوم پھر کر پھر تاریکی میں جھلکنے لگی تھی۔ اسے آنے جانے سے روکنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا کہ آتی ہے تو آتی رہے۔

بہ ظاہر تو کچھ نہیں کر رہی تھی لیکن یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اسے دیکھتے رہنے کا عادی ہو رہا ہے۔ یہ عادت نہیں تو اور کیا تھی کہ تاریکی میں جب بھی کوئی بولتی تھی تو وہی نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ بڑے ہی نامعلوم طریقے سے اس کی صورت، اس کی شخصیت ذہن میں نقش ہو رہی تھی۔ ایک رات تو وہ چونک گیا۔ کسی انجانے نمبر کی ٹون سنائی دی تھی اس نے بٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگایا تو دوسری طرف کی آواز سنتے ہی حدیقہ نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ کسی کی بھی رس بھری آواز ہو وہی نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ اس بار اسے لگا کہ حدیقہ بول رہی ہے۔

وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ پانچ ماہ پہلے اس نے روبرو اس سے باتیں کی تھیں اس کی آواز اور لہجے کو سنا تھا۔ کچھ بھول گیا تھا کچھ یاد آ رہا تھا کہ حدیقہ ایسے ہی بولتی تھی۔

وہ جھجکتے ہوئے بول رہی تھی۔ ”جی۔ میں بول رہی ہوں، آپ مجھے نہیں جانتے اور میں اپنا اصل نام بھی نہیں بتاؤں گی۔“

کاشف نے کہا۔ ”تمہاری مرضی ہے۔ میرے پاس آئی ہو۔ تمہیں دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔“

”میری سہیلی نے یہ نمبر دیا ہے۔ میں اس کا نام بھی نہیں بتاؤں گی۔ وہ کہہ رہی تھی، آپ بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”اچھی گفتگو کی جائے تو اچھا ماحول بن جاتا ہے اور اچھے دوست بھی بنتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے آج میری زندگی میں ایک اچھی دوست کا اضافہ ہو رہا ہے۔“

”ویسے آپ اب تک کتنی دوستیاں کر چکے ہیں؟“

”یاد نہیں ہے۔ فون پر تو یہی ہوتا ہے کہ آنے والیاں آتی ہیں پھر کوئی بات دوستی اور مزاج کے خلاف ہو جائے تو چلی جاتی ہیں۔ ویسے میرے مزاج کے خلاف بھی کوئی بات ہو تو میں بھی دوستی ختم کر دیتا ہوں۔“

”شاید ہمارے ساتھ ایسا نہ ہو۔“

”نہ ہو تو اچھا ہے۔ گپ شپ مہنگی نہیں پڑتی۔ ویسے میں نے آج تک فون کی دوستی کو پائیدار نہیں پایا۔“

”پھر ایسی دوستی کا حاصل کیا ہے؟“

”محض تفریح اور یہ کہ وقت اچھا گزرتا ہے۔ بعض دوستی توڑنے والے کسی نہ کسی وجہ سے یاد رہ جاتے ہیں۔ شاید کبھی بچھڑو گی تو تم بھی یاد رہ جاؤ گی۔“

”ابھی مجھے آئے ہوئے چند منٹ ہوئے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے کہ میں یاد رہ جاؤں گی؟“

”تمہاری آواز اور تمہارا لہجہ... میرا ذہن کہتا ہے کہ تم وہی ہو۔“

”وہی کون...؟“

”کوئی تھی۔ میری زندگی میں چند گھنٹوں کے لیے آئی تھی۔“

”زندگی میں آئی تھی یا صرف فون پر؟“

”فون سے باہر سچ مچ اس سے سامنا ہوا تھا۔“

”یہ تو بڑی بھید بھری بات ہے۔ آپ نے تو تجسس پیدا کر دیا ہے۔ کیسے سامنا ہوا تھا؟ کہاں ہوا تھا؟“

”مجھے افسوس ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔ اسے بھول چکا ہوں۔“

”میری آواز سن کر وہ یاد آ گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے بھلا نہیں پائے ہیں۔“

”چھوڑو اس کی بات۔ کوئی دوسری بات کرو۔“

”آپ کے کترانے کا انداز ایسا ہے جیسے وہ آپ کو بہت پریشان کرتی رہتی ہے۔“

”وہ کیا پریشان کرے گی؟ اور کیوں کرے گی؟ میرا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔“

”کیا میری دوستی آپ کو مہنگی پڑے گی...... کیا میری آواز آپ کو اس کی یاد دلاتی رہے گی۔“

وہ اس کی باتوں کا جواب دے تو رہا تھا لیکن اندر ہی اندر الجھ رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ حدیقہ بات کر رہی ہے۔

اب تک تو یہی تھا کہ کوئی بھی بولے وہ آ جاتی تھی۔ اس رات تو فون پر آواز بھی اسی کی تھی اور وہ اسے کھل کر بولنا نہیں چاہتا تھا کہ تم حدیقہ ہو۔

کانوں میں پھر جیسے حدیقہ بولی۔ ”آپ چپ ہو گئے۔ کیا سوچ رہے ہیں؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ خیالات سے چونک کر بولا۔ ”آں۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں سوچ رہا۔“

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دوسری طرف سے وہ چپ ہوجائے ابھی کچھ نہ بولے۔ وہ فون بند ہوجائے۔ کچھ ایسا ہوجائے کہ وہ نامعلوم سی الجھن سے نکل آئے۔

اس کی آواز سنائی دی۔ ”آپ پھر چپ ہوگئے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے آپ سے بولنا نہیں چاہیے۔ فی الحال فون بند کررہی ہوں۔ بعد میں آپ مناسب سمجھیں تو مجھے کال کریں۔ میں انتظار کروں گی۔“

دوسری طرف سے رابطہ ختم کردیا گیا۔ کاشف نے اطمینان کی ایک لمبی سانس کھینچی۔ جیسے کسی شکنجے سے نکل آیا ہو۔ جیسے حدیقہ نے اس کی رسیاں کھول دی ہوں۔

دوسری طرف حدیقہ خوشی سے کھل گئی۔ موی اس کے پاس گہری نیند سورہی تھی اس نے بیٹی سے لپٹ کر اسے پیار کیا۔ آج ایک عرصہ بعد معلوم ہوا تھا کہ اس نے جس پر اندھا اعتماد کیا تھا' وہ کاشف بے ضمیر نہیں ہے۔ وہ بہ ظاہر بے حس ہے لیکن اس کی آواز اس کے اندر گونجتی رہتی ہے۔

اس کا دل کہہ رہا تھا۔ ”وہ ضرور مجھے خیالوں میں دیکھتے ہوں گے۔ اب آنے والا وقت بتائے گا کہ میری طرف کیوں نہیں آرہے ہیں؟“

جلال اکبر نے سلیقہ سے کہا تھا۔ ”میرا بیٹا موبائل فون کے پھیلائے ہوئے جال سے نہیں نکل سکے گا۔ اس کے ساتھ فون پر کھیلا جانے والا کھیل ہی کھیلنا چاہیے۔“

سلیقہ نے پوچھا تھا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں حدیقہ فرضی نام سے فون پر اس سے فلرٹ کرے اور معلوم کرے کہ وہ کس حد تک بے حس اور بے ضمیر ہے۔“

جلال اکبر جانتا تھا کہ بیٹا رات کو سم بدل دیتا ہے۔ ایک رات جب وہ اپنا فون کمرے میں چھوڑ کر واش روم میں گیا تو باپ نے کمرے میں آکر اس فون سے اپنے فون پر ایک مس کال کی پھر وہ مس کال مٹادی۔ اپنے کمرے میں آکر اپنے فون پر آنے والی مس کال کا نمبر نوٹ کرلیا۔

اس نے دوسرے دن وہ نمبر سلیقہ کو دے کر کہا۔ ”لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ حدیقہ کو بھی فون کے ذریعے کاشف کی کمزوریوں کو اور اس کے کھیل کو سمجھنا چاہیے۔“

اتنی ساری پلاننگ کے بعد حدیقہ نے پہلی بار کاشف سے فون پر باتیں کی تھیں۔ اب اس حد تک معلوم کرلیا تھا کہ وہ اپنی بے حسی اور بے ضمیری کے باعث اس سے دور رہتا ہے لیکن خدا مہربان ہے' وہ اس کے اندر موجود رہتی ہے اور وہ ہے کہ اسے اپنے اندر سے نکال نہیں پارہا ہے۔

جلال اکبر اپنی سلیقہ کو گھر لانے کے لیے بے چین تھا۔ اُدھر باپ کی اپنی مجبوری تھی۔ بیٹے نے اسے چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے کر ایک ذرا کمزور بنادیا تھا۔

اب تو بات اسی طرح بن سکتی تھی کہ بیٹا حدیقہ سے راضی ہوجاتا، تب باپ اپنی سلیقہ کو بھی گھر لاسکتا تھا۔

اور بیٹا نئی الجھنوں میں گرفتار ہوگیا تھا۔ اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ تاریکی میں حدیقہ کا تصور آتا رہے گا اور وہ اسے اہمیت نہیں دے گا۔ اسے یونہی آنے دے گا تو وہ رفتہ رفتہ ذہن پر نقش ہوجائے گی۔

صورت حال یہ تھی کہ اندھیرے میں فون پر کوئی بھی بولتی تھی تو حدیقہ ہی خیالی آنکھوں میں آجاتی تھی۔ اس نے تصور میں آنے کی اس لیے چھوٹ دی تھی کہ صورت اچھی بھلی تھی۔ چھپ کر تاریکی میں آتی تھی اس لیے اور اچھی لگتی تھی۔

اتنی اچھی لگتی تھی کہ کئی بار اسے چھونے اور پکڑ لینے کی خواہش ہوئی۔ اس طرح یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ وہ لاحاصل ہے، اس کے گھر جاکر وہاں سے اسے لاکر ہی حاصل کرسکے گا۔

ان حالات میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ اس نے فون پر بولنے والی اس اجنبی لڑکی کو اس کی ہم آواز پایا۔ وہ بالکل حدیقہ کی طرح بول رہی تھی۔

اگرچہ حدیقہ سے ایک ہی بار مختصر سی باتیں کی تھیں اور اس بات کو پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ اس لیے حدیقہ کی آواز اور لہجہ مٹا مٹا سا اس کی یادداشت میں تھا۔

اب فون پر سننے کے بعد اک ذرا تازہ ہوگیا تھا۔ یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ حدیقہ بالکل اسی طرح بولتی تھی اس کے باوجود وہ لڑکی حدیقہ کی آواز اور لہجے کے بالکل قریب تھی اور یوں اسے بھولی ہوئی حدیقہ کے قریب لے آئی تھی۔

حقیقتاً وہ حدیقہ ہی تھی۔ پہلے تو صرف تصور میں آتی تھی۔ اب فون پر یوں لگا' سچ مچ تاریک کمرے میں آگئی ہے۔ پانچ ماہ سے کتراتے رہنے کے بعد پہلی بار آکر کہہ رہی تھی۔ کب تک بھاگو گے۔ لو آدھی آگئی، باقی بھی آتے آتے آہی جاؤں گی۔

حدیقہ نے پہلی رات اس کی اُلجھنوں کو سمجھتے ہوئے فون بند کردیا تھا۔ اسے کمرے کی تاریکی میں تنہا چھوڑ دیا تھا لیکن اپنے وجود کا سکہ جما گئی تھی۔

وہ بستر پر چاروں شانے چت پڑا رہا۔ گونگا فون ہاتھ کے پاس پڑا ہوا تھا اور وہ سینے کے اندر بول رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ پہلے تاریکی میں گونگی بن کر آیا کرتی تھی۔ اب بولنے بھی لگی تھی۔

وہ حیران ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ''یہ اپنے خیالی وجود کے ساتھ حاضر ہو جاتی ہے اور اب تو اس کی آواز بھی سنائی دیتی رہے گی۔

اس کے آتے جاتے رہنے سے میرا کچھ نہیں جاتا ہے۔ پتا نہیں کیوں بہت اچھی لگتی ہے۔''

اسے شبہ تھا کہ وہ فون پر بولنے والی اجنبی لڑکی حدیقہ ہوگی۔ اس نے کسی طرح اس کی بدلی ہوئی سم کا نمبر حاصل کیا ہوگا اور اجنبی بن کر اسے ٹریپ کرنے آئی ہے۔

اسے شبہ تھا یقین نہیں تھا اور وہ شبہ دور کرنا چاہتا تھا۔ نئی کال کے پیچھے کون ہے؟ واقعی اجنبی لڑکی ہے یا حدیقہ؟

یہ کیسے معلوم کرے؟

وہ تدبیر سوچتے سوچتے اچانک اٹھ بیٹھا۔ یہ بات ذہن میں آئی کہ اس کا فون پانچ ماہ سے حدیقہ کے پاس ہے۔ وہی فون وہ استعمال کرتی ہوگی۔

اگر اس نے میرے فون کی سم بدل کر ابھی مجھے کال کی ہے اور پھر میری کال کا انتظار کر رہی ہے تو ابھی اس فون میں پہلی والی سم نہیں ہوگی۔

اس نے فوراً ہی اپنے ہی فون پر اسے کال کی۔ نمبر پنچ کرنے کے بعد دوسری طرف بیل جانے لگی تو یقین ہو گیا حدیقہ نے اس فون کی سم نہیں بدلی ہے۔

اس نے سوچا۔ ''وہ فون ابھی حدیقہ کے پاس رکھا ہوگا۔ وہ کالنگ ٹون سن رہی ہوگی لیکن فون اٹینڈ نہیں کر رہی ہے۔''

ایسے ہی وقت دوسری طرف سے سنائی دینے والی ٹون بند ہو گئی۔ حدیقہ نے اسے اٹینڈ کیے بغیر بند کر دیا۔ سمجھ لیا تھا کہ کاشف کو شبہ ہو گیا ہے اور وہ شبہ دور کرنے کے لیے اپنے ہی فون پر اسے کال کر رہا ہے۔ حقیقتاً وہ اپنی خالہ کے فون سے اجنبی لڑکی بن کر فون کر رہی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے دوبارہ وہ نمبر پنچ کیے۔ دوسری بار رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ وہ نیند بھری آواز میں جھنجلا کر بولی۔ ''سوری میں کوئی انجانا نمبر اٹینڈ نہیں کرتی۔ پلیز میری نیند خراب نہ کریں۔''

وہ بھاری بھرکم آواز بنا کر بولا۔ ''جب اٹینڈ نہیں کرنا ہے تو فون کو آن کیوں رکھا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''میں اس فون پر صرف ایک ہی آواز سننا چاہتی ہوں۔ اس کے انتظار میں یہ دن رات آن رہتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ کاشف کو بڑی حد تک یقین ہو گیا کہ وہ اجنبی لڑکی حدیقہ نہیں ہے۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کس الجھن میں پڑا ہے؟

وہ اپنے طور پر ایسا سوچنے اور یقین کرنے کے باوجود مطمئن نہیں تھا۔ آئندہ کسی اور طرح اطمینان حاصل کرنا چاہتا تھا۔

یہ تو معلوم ہو گیا کہ حدیقہ سو رہی تھی۔ اس کی کال نے اسے جگایا تھا۔ کاشف نے سوچا ابھی وہ لڑکی جاگ رہی ہوگی۔ اس نے کہا تھا۔ ''میں فی الحال فون بند کر رہی ہوں۔ بعد میں آپ مناسب سمجھیں تو مجھے کال کریں۔ میں انتظار کروں گی۔''

کاشف نے اپنے فون کو دیکھ کر سوچا پھر اس کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہوتے ہی اس کی مسرتوں بھری آواز سنائی دی۔ ''مجھے یقین تھا۔ آپ مجھے کال کریں گے۔''

''ہاں، تمہاری آواز نے الجھا دیا تھا۔ اب کوئی ایسی بات نہیں ہے۔''

''یعنی اب کوئی الجھن نہیں ہے اور جب کوئی الجھن نہیں ہے تو پلیز بتائیں وہ کون ہے؟ میں پوچھنے کا حق رکھتی ہوں۔ کیونکہ اس نے آپ کو مجھ سے خوامخواہ دور کر دیا تھا۔''

''چھوڑو اسے۔ اپنی باتیں کرو۔''

''پلیز کچھ تو اس کے بارے میں بتائیں۔ میں زیادہ نہیں پوچھوں گی... پلیز!''

''میں کیا بتاؤں؟ بالکل تمہارے جیسی آواز تھی اس کی۔ تم خود ہی سوچو کہ تمہاری آواز میں کتنا رس اور کتنی کشش ہے۔ اسی لیے وہ یاد رہ گئی ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''ہائے! میری آواز اتنی اچھی ہے؟ اس کا مطلب ہے میں بھی آپ کو ہمیشہ یاد رہوں گی؟''

''ہاں۔ تمہیں بھی بھلا نہیں پاؤں گا۔''

''اپنی سہیلی سے آپ کے متعلق اتنا سن کر آئی ہوں کہ آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں۔ واقعی آپ باتوں سے دل جیت لیتے ہیں۔ یہ موبائل فون کی دنیا عجیب ہے۔ ہم چیٹنگ اسی لیے کرتے ہیں کہ مزے مزے کی باتیں سنتے اور سناتے رہیں۔''

وہ بولا۔ ''بے شک ایک انجانے ساتھی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزر جاتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''دیکھا جائے تو ہماری دوستی اندھوں کی دوستی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ انجانا ساتھی خوبرو ہوگا یا نہیں۔ وہ آئیڈیل بننے کے قابل ہوگا یا نہیں، ہم اسے خوش کر دیتے ہیں۔''

''اسی طرح ہم نہیں جانتے کہ ہم سے بولنے والی حسین مہ جبین ہے یا نہیں۔ ہم تصور میں اس کی تصویر بنا کر اسے دیکھتے رہتے ہیں اور فون پر بولتے رہتے ہیں۔''

ایسا بولتے وقت حدیقہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ کسی اور کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ فون پر کوئی بھی بولتی، حدیقہ ہی اس کے تصور میں آ جاتی۔

کاشف نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ۔ کیا دن کو بھی تم سے کسی وقت باتیں ہو سکتی ہیں؟''

''ہو سکتی ہیں لیکن میں گھر گرہستی کے کاموں میں مصروف رہتی ہوں۔ رات ہی کا وقت مناسب رہتا ہے۔''

''اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟''

''ہاں۔ دوستی کرنی ہے تو یہ سچ معلوم ہونا چاہیے کہ چھ ماہ پہلے میری شادی ہوئی تھی۔''

''یعنی اب شادی شدہ نہیں ہو؟''

''ہوں بھی اور نہیں بھی۔ ابھی طلاق نہیں ہوئی ہے۔ میں چاہتی ہوں' جلد ہو جائے۔ ویسے ہم ایک چھت کے نیچے نہیں رہتے ہیں۔''

''فون پر فرینڈشپ کا فائدہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کا سچ چھپا رہتا ہے۔ تم نے سچ کیوں کہہ دیا کہ شادی شدہ ہو۔ فون پر تو کنواری رہ سکتی تھیں؟''

''میں جھوٹ اور فریب سے بیزار ہو گئی ہوں۔ جب میکے میں تھی تو ماں باپ میرے سچ سے خوفزدہ رہتے تھے۔ جب شادی ہوئی اور میں نے میاں صاحب سے اُن کی ایک کمزوری بیان کر دی تو وہ ناراض ہو گئے۔ میں اپنے سسرالی مکان کے دو کمروں میں تنہا رہتی ہوں۔ میاں صاحب دبئی میں ملازمت کرتے ہیں۔ آپ اندازہ کریں میں اپنا میکا اور سسرال دونوں ہار چکی ہوں۔ اس کے باوجود سچائی سے مایوس نہیں ہوں۔''

''یہ بہت بڑی بات ہے۔ تم اپنا نقصان کرتی آ رہی ہو۔ میں کہتا ہوں دنیا جیسی ہے ویسا ہی اس کے ساتھ چلو۔''

''میں جھوٹ اور فریب کے ساتھ کبھی نہیں چلوں گی، اپنے آخر وقت تک سچائی کو آزماتی رہوں گی۔ کبھی تو اچھا صلہ ملے گا۔''

''تمہاری مرضی ہے۔ ویسے نیک خیالات سب کو اچھے لگتے ہیں۔ میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ ویسے تم یہ تو سوچتی ہوگی کہ کب تک شوہر کے بغیر تنہا رہ کر زندگی گزارو گی؟''

''ہاں، عورت تنہا نہیں رہ سکتی۔ ایک مرد کا سہارا ضروری ہے۔ ایک اور سچ کہہ دوں کہ یہ فون کال اسی لیے ہے کہ آئندہ زندگی گزارنے کے لیے کوئی اچھا ساتھی مجھے مل جائے۔''

''کیا مجھ سے توقع کرتی ہو کہ تمہارا سہارا بنوں گا؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ابھی تو نہ میں نے آپ کو سمجھا ہے اور نہ آپ مجھے جانتے ہیں کہ کون ہوں اور کیسی زندگی گزار رہی ہوں۔ ذرا وقت گزرنے دیں۔''

کاشف نے دل میں کہا۔ ''ایک بچے والی سے کترا رہا ہوں۔ دوسری شادی شدہ آ رہی ہے۔ یا خدا...! کیا میرے لیے کنواریاں مر گئی ہیں؟''

وہ بول رہی تھی۔ ''مجھے اپنے متعلق خوش فہمی ہے کہ میں کسی کا بھی دل جیت سکتی ہوں۔''

''تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے؟''

''بس ہے تو ہے۔ مجھ میں ایسی کوئی بات ہے جسے صرف میں ہی جانتی ہوں۔''

''بعض لڑکیاں خود فریبی کا شکار ہوتی ہیں۔''

''بے شک ہوتی ہیں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔''

''آزمائش ہونی چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ تم میرا دل نہیں جیت سکو گی۔ چلو جیت کر دکھاؤ۔''

''پہلے آپ کو دیکھوں گی' سمجھوں گی۔ پھر فیصلہ کروں گی کہ آپ کا دل جیتنا چاہیے یا نہیں؟''

''تم مجھے دیکھنے، سمجھنے کی بات کہہ رہی ہو پھر تو دیکھنے کے لیے ملاقاتیں ضروری ہیں۔''

''کبھی ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکوں گی۔ اب مجھے اجازت دیں۔ کل آدھی رات کے بعد پھر کسی وقت باتیں ہوں گی۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ پھر بستر پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ ایسی طویل گفتگو کرنے کے بعد اسے نیند آ جایا کرتی تھی۔ اس وقت وہ سو نہ سکا۔ تصور میں اس لڑکی کی خیالی تصویر بنانے لگا۔

امتحانات سر پر تھے۔ اس نے فرسٹ ایر میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی۔ اس سے بھی زیادہ مارکس اور کامیابی حاصل کر سکتا تھا لیکن موبائل فون جونک کی طرح چمٹ گیا تھا۔ وہ چھوڑتا تو زیادہ سے زیادہ نمایاں کارکردگی دکھا سکتا تھا۔

اب وہ عمر کے بیسویں سال میں پہنچ گیا تھا۔ اس عمر میں نوجوان خود کو بہت پہنچا ہوا سمجھتے ہیں۔ جوان عورت سے دوستی ہو جائے تو خود کو بہت ہی عمر رسیدہ، بالغ اور تجربہ کار سمجھنے لگتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ زمانہ گزر گیا جب عورتیں مردوں سے دور رہتی تھیں۔ لڑکی ہو یا لڑکا دوری کے باعث ابتدائی جوانی بڑی معصومیت اور شرافت سے گزارتے تھے۔

پہلے بھی چوری چھپے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر بہت کم ایسا دیکھنے یا سننے میں آتا تھا۔ آج موبائل فون نے ہر پانچویں گھر میں لڑکے کی تنہائی میں لڑکی کو اور لڑکی کے بیڈ روم میں لڑکے کو بلا روک ٹوک پہنچا دیا ہے۔

دن میں دس بار تمام نیٹ ورکس سے کچھ اس طرح جوانوں میں تحریک پیدا کی جاتی ہے۔

''اب دوست بنانا آسان۔ آپ کا یہ نیٹ ورک لایا ہے آپ کے لیے لمبی گپ شپ کے مواقع۔ اپنی پسند کے دوستوں سے صرف دو روپے پلس ٹیکس فی گھنٹا باتیں کریں۔''

یہ واضح طور پر چھپ کر ملنے ملانے کی ترغیب ہے۔

ہر نیٹ ورک سے ایسی سیکڑوں آفرز روزانہ دی جاتی ہیں۔ کسی نوجوان لڑکی کے ساتھ دلچسپیوں سے بھرپور اتنی سستی تفریح اور کہیں ہو ہی نہیں سکتی۔ کمال تو یہ ہے کہ لڑکی کے گھر میں لڑکا اور لڑکے کے گھر میں لڑکی پہنچائی جاتی ہے۔

جلال اکبر بیٹے کے موبائل فون سے پریشان تھا۔ اس کی طرح لاکھوں کروڑوں والدین پریشان ہوں گے، کوئی اپنی اولاد کو اس بیماری سے نجات نہیں دلا سکتا تھا۔

بیماری یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو فحش لطیفے سناتے تھے اور اخلاق سے گری ہوئی باتیں کرتے تھے۔ گناہ آلود ملاقاتوں کے لیے راہیں ہموار کرتے رہتے تھے۔

جرائم کی جت نئی راہیں کھلتی رہتی تھیں اور قانونی گرفت کا اندیشہ نہیں رہتا تھا۔ آج تک دنیا میں جتنی ایجادات ہوئیں وہ لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہوئیں۔ ان ہی ایجادات کو لوگ اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال کرنے لگے۔

جلال اکبر نے سلیقہ سے کہا۔ ''موبائل فون موجودہ دور کی بہترین ایجاد ہے۔ اس کے ذریعے کاروباری دنیا میں حیرت انگیز منافع بخش تیز رفتاری آئی ہے۔''

سلیقہ نے کہا۔ ''ہاں بیماروں کے لیے ایمرجنسی کے وقت یہ فون مسیحائی کا کام کرتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''جس کی آنکھ اذان سن کر نہ کھلتی ہو اسے موبائل فون جگا دیتا ہے۔ میرے ایک شناسا کا بیٹا اور بہو امریکا میں ہیں۔ ان کے گھر بیٹا ہوا تھا۔ ایسے وقت دادا چاہتا تھا کہ وہ اپنے پوتے کے کانوں میں اذان سنائے۔ یہ حقیقت کتنی ایمان افروز ہے کہ دادا نے امریکا میں پیدا ہونے والے پوتے کو یہاں سے اذان سنائی تھی۔ آہ اگر کیا، کیا جائے۔ موبائل فون اگر باعث رحمت ہے تو باعث زحمت بھی ہے۔ اس کے ذریعے ہماری آئندہ نسلیں اخلاقی پستیوں میں گرتی جا رہی ہیں۔ دراصل غلطی والدین کی ہے۔ ہم بچوں کو کمسنی میں ہی موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔''

سلیقہ نے کہا۔ ''یہ لعنت اتنی دور تک پھیل گئی ہے کہ موبائل فون جوان بچوں کے لیے فیشن بن گیا ہے۔ اس کے بغیر وہ خود کو ادھورا اور غریب سمجھتے ہیں۔''

سلیقہ نے جلال اکبر کو ہمدردی سے دیکھا پھر کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ کاشف کو جلد ہی عقل آئے گی۔ وہ راہ راست پر آجائے گا۔''

''وہ کیا خاک انسان بنے گا۔ حدیقہ سے کتراتا تھا۔ اب وہ ایک اجنبی لڑکی بن گئی ہے تو دوستی کر رہا ہے۔ پتا نہیں اور کتنی لڑکیوں سے دن رات باتیں کرتا رہتا ہے۔ ذرا سوچو جوانی کا یہ ابتدائی حصہ گھنٹوں کے حساب سے کس طرح ضائع ہو رہا ہے۔''

''آپ اچھے کی توقع رکھیں۔ انشاءاللہ اچھا ہی ہوگا۔''

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا اور کیا کر سکتا تھا۔ جب تک مسئلہ حل نہ ہوتا۔ اسے تو سوچتے ہی رہنا تھا۔

☆☆☆

اب تو رات ہوتے ہی اسے اجنبی لڑکی کا انتظار رہتا تھا۔ وہ رات بارہ بجے کے بعد اسے کال کرتی تھی اور وہ کال کم از کم دو گھنٹے جاری رہتی تھی۔

وہ کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ لائٹ آف کر کے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ حدیقہ کی کال سے پہلے کوئی دوسری تیسری لڑکی کال کرنے والی تھی۔ ایسا روز ہی ہوتا تھا۔ وہ کسی بھی آنے والی سے کہہ دیتا تھا کہ ایک گھنٹے بعد فون بند ہو جائے گا۔ کسی سے یہ نہیں کہتا تھا کہ بارہ کے بعد حدیقہ کا وقت شروع ہوتا ہے۔

ٹھیک گیارہ بجے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے ننھی سی اسکرین پر نمبرز دیکھے۔ کسی جانی پہچانی لڑکی کا نمبر نہیں تھا۔ کوئی نئی اجنبی آرہی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ پھر کہا۔ ''ہیلو فرمایئے؟''

دوسری طرف سے ایک مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ ''کیا تم تنہا ہو؟ میں بھی تنہا ہوں۔''

وہ چپ رہا کچھ نہ بولا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''میں نہیں جانتی' تم جوان ہو یا بوڑھے، بیمار ہو یا صحت مند۔۔۔؟ میری

ایک کال سے بوڑھے جوان اور بیمار صحت مند ہو جاتے ہیں۔''

کاشف نے پوچھا۔ ''کیا تم جادو جانتی ہو؟''

''دنیا کے تمام جادوؤں میں ایک جوانی کا جادو ایسا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کیا یقین کرو گے' میں ابھی پلک جھپکتے ہی تمہارے پاس آسکتی ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔ ''میں یہ کمال ضرور دیکھوں گا۔ چلی آؤ، تنہا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''کمرے کی لائٹ بجھا دو۔''

''یہاں لوڈشیڈنگ کا اندھیرا ہے۔''

وہ بڑی ہی رازدارانہ سرگوشی میں بولی۔ ''تکیے کو سینے سے لگالو۔''

سرگوشی کا انداز ایسا تھا جیسے پاس آگئی ہو اور سینے سے لگانے کو کہہ رہی ہو۔

وہ کوئی کمال کی اداکارہ ہوگی اس کی مدھم سی آواز میں بلا کی پُراسراریت اور جذباتیت بھری ہوئی تھی۔ جیسے جوانی برسوں فاقے کرنے کے بعد آئی ہو۔

وہ جیسا کہہ رہی تھی وہ ویسا ہی کر رہا تھا۔ اس نے گہری تاریکی میں تکیے کو سینے سے لگالیا تھا۔

اُدھر وہ فون پر اس انداز سے سانسیں لے رہی تھی جیسے پاس آکر ہانپ رہی ہو۔

بیس برس کے چھوکرے کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ سچ مچ محسوس کر رہا تھا کہ حدیقہ اس کے پاس آگئی ہے۔

ہاں حدیقہ کیونکہ وہ کسی دوسری کا تصور کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اس آنے والی کی صورت اور سراپا جیسا بھی ہوگا۔ وہ تو صرف حدیقہ کو جانتا تھا۔ یہ ایک نئی بات ہوگئی تھی۔ اس آنے والی کی جذباتی پیشکش نے پہلی بار حدیقہ کو قریب لاکر سینے سے لگا دیا تھا۔

اب تک وہ تصور میں جھلکتی رہی تھی۔ ان لمحات میں جیسے سچ مچ دھڑکنوں سے آلگی تھی۔

اچانک سحر ٹوٹ گیا فون سے آواز آئی۔ ''بس ابھی اتنا ہی۔۔۔ میں پورا کھیل کھیلوں گی تو دیوانے ہو جاؤ گے، لیکن میں مفت میں نہیں کھیلتی۔''

کاشف ایک بہت ہی جذبات سے بھرپور طلسمی ماحول سے نکل کر بے چین ہو گیا تھا۔ پھر وہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ بولی۔ ''میں صاف کہتی ہوں۔ جذبات کے سبز باغ میں پہنچانے کا معاوضہ لیتی ہوں۔ یہ میرا پیشہ ہے۔''

''تم فون پر کس طرح معاوضہ وصول کرو گی۔ میں کس طرح ادائیگی کروں گا؟''

''بہت آسان ہے۔ میں پندرہ منٹ تک جادو جگانے کے پانچ سو روپے لیتی ہوں۔ تم ابھی میرے فون میں پانچ سو کا بیلنس ڈالو گے، میں ابھی چلی آؤں گی۔ یاد رکھو، ہر پندرہ منٹ کے پانچ سو۔۔۔''

یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے پہلی بار بھرپور انداز میں حدیقہ کو اپنی سانسوں کے قریب پایا تھا۔

آواز کسی کی بھی تھی۔ حدیقہ حواس پر چھا گئی تھی۔ وہ اسے پھر سے پالینا چاہتا تھا اور آئندہ پندرہ منٹوں میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کتنی دور تک حاصل کر سکے گا؟

اس نے اپنے فون کا بیلنس چیک کیا۔ سات سو روپے تھے۔ وہ پندرہ منٹ کا ایک گیم کھیل سکتا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی بارہ بجنے والے تھے۔ پندرہ یا بیس منٹ میں حدیقہ کی آواز والی' اپنے روٹین کے مطابق اس فون سے بولنے والی تھی۔

اس نے میسج لکھا۔ ''میں پیپرز کی تیاری کر رہا ہوں۔ بہت مصروف ہوں۔ مجھے ایک بجے کال کرو۔''

اس نے یہ میسج بھیج کر اس کھلاڑی عورت کے فون پر پانچ سو کا بیلنس Send کیا۔ پھر انتظار کرنے لگا۔

موبائل فون پر بازاری عورتیں اور ان کے دلال بھی گاہکوں کو پھانسنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

جس عورت نے ابھی کاشف کو پھانسا تھا' وہ کوئی بازاری نہیں تھی اور نہ ہی کبھی اس کے روبرو آنے والی تھی۔ وہ صرف اپنی آواز کی کوالٹی اور کھیل کی تکنیک کے ذریعے اچھی خاصی رقم کما رہی تھی۔

ایک چھوٹے سے علاقے میں اس کے شوہر کی پرچون کی دکان تھی۔ مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ اب وہ دکان سے فون کا بیلنس فروخت کرنے لگا تھا۔

وہاں کے غریب لوگ پچیس یا پچاس روپے کا بیلنس لینے آتے تھے اور وہ اپنی بیوی کے فون سے ان کی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ اس عورت نے اب تک پانچ پانچ سو کے تقریباً بیس گاہک پھانس رکھے تھے۔ بیسواں گاہک وہ بیس برس کا کاشف تھا۔

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ پانچ سو وصول کرنے کے بعد آگئی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہاں، میں انتظار کر رہا ہوں۔''

وہ سرگوشی میں بولی۔ ''میں آرہی ہوں۔ تاریکی اور تنہائی شرط ہے۔ کوئی اور نہ دیکھے۔ میری شرم تمہارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھوں میں ہے۔"

ان لمحات میں وہ حدیقہ کو بالکل سانسوں کے قریب دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ بڑی رازداری سے وقت گزار رہا ہے۔

وہ فون پر بولنے والی بہت ہی ماہر، تجربہ کار کھلاڑی تھی۔ بیس برس کے بچے کو کھلا رہی تھی اور دیوانہ بنا رہی تھی۔

آواز کے اتار چڑھاؤ کے ذریعے گرما دینے والے فقروں کی آنچ میں اور الفاظ کے گرم مسالے میں اس نے پہلے کبھی ایسی کھچڑی نہیں کھائی تھی کہ کھا بھی رہا تھا اور بھوکا بھی تھا۔

اسے سچ مچ حاصل کرنے کے لیے باؤلا ہو رہا تھا۔ ایسے ہی وقت پندرہ منٹ ختم ہو گئے۔

وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ "جب بھی پانچ سو کا بیلنس آئے گا میں آجایا کروں گی۔"

وہ تلملا کر رہ گیا۔ کیونکہ گیم ادھورا رہ گیا تھا۔ کھیلنے والی بہت چالاک تھی۔ ایک لمبی اننگ کھیل کر اختتام سے دور رہی تھی۔ اسے کھیل کو آئندہ جاری رکھنے پر مجبور کر دیا تھا اور ابھی اس کے فون میں گیم کو جاری رکھنے کا بیلنس نہیں تھا۔

ویسے کاشف نے صرف اس کی آواز سنی تھی۔ کھیلنے والی حدیقہ تو اب بھی تاریکی میں موجود تھی۔ جب بھی اسے دیکھنا چاہتا تھا' وہ نظر آجاتی تھی۔ لیکن اس عورت کے جانے کے بعد وہ ایسے ٹھہر گئی تھی، ایسے تھم گئی تھی جیسے پھر سے چلنے کے لیے کھلونے کو چابی کی ضرورت ہو۔

اب تاریکی میں وہ تھا اور حدیقہ تھی۔ اب تک جو ہو چکا تھا اسے یاد کرنے لگا۔ اپنے طور پر اس سے دلچسپی لینے لگا۔

ان حالات میں اس نے پہلی بار اعتراف کیا کہ وہ بہت اچھی، بہت ہی پرکشش ہے۔ اس تاریک کمرے سے دور اس کا کہیں وجود ہے۔ وہ جب چاہے اسے اپنا سکتا ہے۔

فی الحال وہ مفت میں کھیل رہا تھا۔

ٹھیک ایک بجے اس اجنبی لڑکی نے کال کی، رابطہ ہونے پر بولی۔ "آپ کا میسج پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ پیپرز کی تیاریوں میں مصروف ہیں، کیا آپ اپنی تیاریوں سے مطمئن ہیں؟"

وہ حدیقہ کی آواز سن رہا تھا۔ پھر اسی رنگین اور جذباتی ماحول میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ابھی کتابوں سے سر کھپا کر فارغ ہوا ہوں۔ کچھ پیار بھری باتیں کرو۔"

وہ بولی۔ "پیار بھری بات یہ ہے کہ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"پھر تو میں بھی تمہیں دیکھ سکوں گا۔"

"ہاں مگر دور سے۔"

"دور سے کیوں؟ کیا ہم کسی ریسٹورنٹ میں کچھ وقت نہیں گزار سکیں گے؟"

"فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ شوہر سے علیحدگی ہے۔ وہ دبئی میں ہے لیکن گھر میں اس کے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں۔ جب کبھی باہر جاتی ہوں تو ان میں سے کوئی ایک میرے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔"

"تم باہر کہاں مل سکتی ہو؟"

"میں کل پاپوش مارکیٹ جاؤں گی۔ میرے ساتھ میری ساس کے علاوہ ایک سہیلی بھی ہوگی۔ وہ عبا اور نقاب میں رہتی ہے۔ آپ کے اطمینان کے لیے کہہ دوں کہ میں پردے کی پابند نہیں ہوں۔ آپ مجھے جی بھر کے دیکھ سکیں گے۔"

"وہاں تمہیں دیکھ کر فون پر بات کرنا چاہوں گا۔"

"میری ساس باہر فون پر باتیں کرنے سے منع کرتی ہیں۔ میرا فون گھر میں ہی رہے گا۔"

"پتا نہیں تم مارکیٹ میں کہاں رہو گی' میں تمہیں بے شمار لڑکیوں میں کیسے پہچانوں گا؟"

"میرا لباس انگوری کلر کا ہوگا۔ میرے پاس جو بیگ ہوگا اس پر میڈونا کی تصویر ہوگی۔ آپ آسانی سے پہچان لیں گے۔ اب بولیں۔ میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟"

"میں بلیو جینز اور لیمن کلر کی ٹی شرٹ میں رہوں گا۔ شرٹ کے سینے پر لکھا ہوگا۔ "I need you"

"پھر تو ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھتے رہیں گے۔"

"میں کسی وقت تمہارے قریب سے گزرتا ہوا تمہاری آواز سننا چاہوں گا۔"

"کیا بازار میں میری آواز سننا ضروری ہے؟"

"ہاں، اس سلسلے میں بحث نہ کرنا۔ ایک بار سہی تمہاری آواز سننا چاہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ ایک ہی بار میرے قریب آئیں گے۔ بار بار آئیں گے تو میری ساس بڑی شکی ہے، گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ایک بات ابھی سے کہہ دوں کہ واپسی میں تمہارے گھر تک پیچھا کروں گا۔ تمہاری ساس کو شبہ نہیں ہوگا۔"

"آپ میرا گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ ہر طرح سے اطمینان حاصل کریں اور جلد ہی اعتراف کر لیں کہ میں ہر معاملے

میں سچی اور کھری ہوں۔"

"اسی طرح اعتماد قائم ہوگا تو ہماری دوستی کبھی ختم نہیں ہوگی۔"

وہ بول رہا تھا اور نگاہوں کے سامنے حدیقہ تھی۔ کل اس اجنبی لڑکی کو دیکھنے کے بعد شاید حدیقہ کے بجائے اس کا تصور قائم ہونے والا تھا۔

☆☆☆

کاشف بہت محتاط تھا۔ ایک بار اسی طرح سابقہ گرل فرینڈ راضی کی صورت دیکھنے حیدری مارکیٹ گیا تھا اور اسے دھوکے سے حدیقہ کی صورت دکھا کر اس کے گھر پہنچا دیا گیا تھا۔

اس بار وہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس لڑکی کی صرف صورت ہی نہیں دیکھے گا۔ اس کا گھر بھی دیکھے گا اور وہاں رہنے والی کے متعلق بعد میں مزید معلومات حاصل کرے گا۔

دوسرے دن انہوں نے پاپوش مارکیٹ میں ایک دوسرے کو دیکھا اور پہچان کر مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی کیا۔ اس لڑکی کے ساتھ اس کی ساس تھی اور عبا اور نقاب میں حدیقہ چھپی ہوئی تھی۔

اس نے ایک بار حدیقہ پر نظر ڈالی پھر اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اس گوری چٹی حسینہ کا سراپا بھی پرکشش تھا۔ ایسی تھی کہ دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔

وہ ایک بار ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ذرا رک گیا۔ ایسے وقت حدیقہ نے نقاب کے پیچھے سے کہا۔ "بڑی پیاس لگ رہی ہے۔ ٹھنڈی بوتل پینا چاہیے۔"

دونوں کی پشت کاشف کی طرف تھی۔ اس نے سمجھا وہی فون والی بول رہی ہے۔ واقعی اس کی آواز بالکل حدیقہ جیسی ہے۔

وہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر ذرا دور جا کر اس حسینہ کو دیکھنے لگا۔ اس کے قریب جا کر اس کی آواز سن کر یقین ہو گیا کہ حدیقہ کی طرح بولنے والی وہ دوسری لڑکی ہے۔ اب اسے شبہ نہیں رہا کہ وہ دھوکا کھا رہا ہے۔

جب وہ اپنی ساس اور حدیقہ کے ساتھ واپس گھر جانے لگی تو اس نے اپنی موٹر سائیکل پر اس کا پیچھا کیا۔ اس کا مکان بھی دیکھ لیا۔ پھر شام تک معلوم کیا کہ وہ بوڑھے میاں بیوی کے ساتھ وہاں رہتی ہے اور اس کا شوہر دبئی میں ملازمت کرتا ہے۔

وہ گھر آکر سوچنے لگا۔ "پتا نہیں کیا نام ہے اس کا؟ آج رات پوچھوں گا۔ جب سامنے آچکی ہے اپنے گھر تک بھی پہنچا دیا ہے تو نام بھی بتا دے گی۔ ویسے بہت حسین اور دل نشین ہے۔ سراپا ایسا ہے کہ شادی شدہ نہیں لگتی ہے۔"

اس نے حدیقہ کے متعلق سوچا۔ "میں نے اسے بھی قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بھی کم سن ہے لیکن ایک بچی کی ماں بن چکی ہے۔ بعض لڑکیوں کی شادیاں کم عمری میں ہو جاتی ہیں۔ وہ مائیں بن کر بھی کنواری دکھائی دیتی ہیں۔"

اب اسے آدھی رات کا انتظار تھا۔ وہ معمول کے مطابق بارہ بجے کال کرنے والی تھی۔ وہ رات گیارہ بجے سے پہلے ہی بیڈ پر آگیا۔ اس عورت کے متعلق سوچنے لگا جسے جذبات کی آگ بھڑکانے میں مہارت حاصل تھی۔

اس نے اس حسین اور دل نشین لڑکی کو تصور میں دیکھنے کے لیے لائٹ بجھا دی۔ تاریکی میں اس کے ساتھ انہی جذباتی لمحات کو دہرانا چاہتا تھا لیکن ناکام ہو رہا تھا۔

وہ حسینہ ایک ذرا جھلکتی تھی پھر بجھ جاتی تھی۔ حدیقہ دکھائی دینے لگتی تھی۔ وہ پچھلے پانچ مہینوں سے مسلسل نظر آنے والی آسانی سے مٹ نہیں سکتی تھی۔

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ حدیقہ کے معاملے میں کس طرح الجھا ہوا ہے۔ بہ ظاہر اسے قبول نہیں کر رہا ہے۔ لیکن لاشعوری طور پر فون کے ذریعے ہر آنے والی سے حدیقہ کا مقابلہ کرتا تھا اور ہمیشہ حدیقہ کو ہی سب پر حاوی پاتا تھا۔ اس کے سوا دوسری کوئی تصور میں ٹھہرتی نہیں تھی۔

بارہ بجتے ہی اس نے فون پر مخاطب کیا پھر پوچھا۔ "مجھے دیکھ لیا؟"

کاشف نے پوچھا۔ "یہی سوال میرا ہے۔ مجھے دیکھ لیا؟"

"پہلے میں نے سوال کیا ہے' جواب دیں۔"

"دیکھا اور اپنے خیال سے زیادہ خوبصورت پایا۔ نظر بد سے بچا کرو۔"

"شکریہ۔ آپ میری توقع سے زیادہ تعریف کر رہے ہیں لیکن میں تعریف نہیں کروں گی۔"

"نہ کرو۔ کوئی بات نہیں۔"

"میری بات دل پر نہ لیں۔ مرد اپنی ذہانت سے اور قوت بازو سے قابل تعریف ہوتا ہے۔ جب آپ ذہانت اور قوت بازو کا مظاہرہ کریں گے تو بے اختیار واہ واہ کروں گی۔ فی الحال کہوں گی کہ آپ میں کچھ ہے۔ ظاہری شخصیت میں خاصی کشش ہے۔ اسی لیے ابھی کال کر رہی ہوں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کال نہ کرتیں۔"

"ہاں یہ سوچا تھا کہ آپ میں کوئی بات نہیں ہوگی تو یہ فون کا سلسلہ ختم کر دوں گی۔"

"چلو ختم نہیں کیا۔ اب یہ سلسلہ آگے بڑھ رہا ہی ہو تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

سب سے پہلے اپنا نام بتاؤ۔"
"میرا نام اسما جیلانی ہے۔"
"آگے کیا ارادہ ہے؟"
"اپنی بکھری ہوئی زندگی کو سنوارنا ہے۔ میں بہ ظاہر شادی شدہ ہوں لیکن نہیں ہوں۔"
"سہاگن ہو مگر نہیں ہو۔ اس کی وضاحتیں کروگی؟"
"کیسے وضاحت کروں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ ایک ناکام شوہر ہے۔ شادی کے تیسرے دن ہی دبئی بھاگ گیا۔ وہاں ملازمت کرنے کے بہانے منہ چھپا رہا ہے اور میں...."
وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "اور تم....؟"
"میں پچھلے چھ ماہ سے کنواری سہاگن ہوں۔ ہر رات سہاگ کی سیج پر سلگتی رہتی ہوں۔"
"یہ تو بہت دکھ پہنچانے والی بات ہے۔ یقین کرو مجھے سن کر دکھ ہو رہا ہے۔"
"میں خوامخواہ دکھ اٹھانے کے لیے پیدا نہیں ہوئی ہوں۔ بغاوت کر رہی ہوں۔ اس سے طلاق مانگ رہی ہوں۔"
"وہ کیا کہتا ہے؟"
"شرمندہ ہے۔ التجائیں کر رہا ہے کہ طلاق نہ مانگوں۔ اس کی کمزوری دوسروں پر ظاہر نہ کروں۔"
"یہ تو سراسر خود غرضی ہے۔ وہ اپنا بھرم رکھنے کے لیے نہ خود تمہاری آگ بجھائے گا اور نہ تمہیں دوسری شادی کرنے کے لیے آزاد کرے گا۔"
"چھ ماہ سے ہمارے درمیان بحث جاری ہے۔ وہ اپنی تمام کمائی میرے قدموں میں رکھتا ہے۔ میری خوشامدیں کرتا ہے کہ کسی پر اس کی کمزوری ظاہر نہ کروں۔ کوئی عارضی مجبوری ہوتی تو میں مان جاتی۔ ساری عمر تنہا جوانی کی آگ میں کب تک جلتی رہوں گی؟"
"یہ تمہارے نام نہاد شوہر کو سمجھنا چاہیے لیکن وہ اپنی نیک نامی کو اہمیت دے رہا ہے۔ جھوٹی مردانہ شہرت برقرار رکھنا چاہتا ہے۔"
"وہ کہتا ہے۔ میں اپنی بڑی سے بڑی باتیں اس سے منوالوں لیکن طلاق نہ لوں اور میں کہتی ہوں بڑی بات یہی ہے کہ میں جوانی کی فطری مسرتوں سے محروم نہ رہوں۔ میں ایک لائف پارٹنر چاہتی ہوں۔ وہ مجھے کیسے ملے گا؟ مجھے طلاق لے کر ہی دوسری شادی کرنی ہوگی۔ تب جانتے ہیں اس نے کیا کہا؟"
کاشف نے پوچھا۔ "کیا کہا؟"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ "کہتا ہے طلاق نہ لوں۔ دوسری شادی نہ کروں۔ کسی سے چھپ کر دوستی کرلوں۔"
جانے کیوں یہ سن کر کاشف کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئیں۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ وہ.....وہ شوہر ہوکر ایسا کہتا ہے؟"
وہ بولی۔ "صحیح معنوں میں شوہر ہوتا تو کبھی نہ کہتا۔ وہ اپنے ساتھ شوہر کا لیبل لگائے رکھنا چاہتا ہے۔ اگر میں پوری رازداری سے کسی کو دوست بنالوں اور اس سے اولاد بھی پیدا کروں تو دنیا والوں کو معلوم نہیں ہوگا۔ لوگ میرے شوہر کو ہی ان بچوں کا باپ سمجھتے رہیں گے اور جس سے دوستی کروں گی، جس کی اولاد پیدا کروں گی وہ ہمیشہ تاریکی میں رہے گا۔"
ہماری دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ بیس برس کے بچے کو یہ نئی بات معلوم ہو رہی تھی۔ وہ حیرانی سے بولا۔ "تمہارے شوہر نے اپنی نیک نامی قائم رکھنے کے لیے یہ عجیب سا راستہ نکالا ہے۔"
کاشف نے یہ نہیں کہا کہ یہ بے حیائی اور گناہ کا راستہ ہے۔ ایسا کہنے سے اس کا راستہ رک جاتا۔
اس نے کہا۔ "تمہارے شوہر کو بیچارہ کہوں گا۔ بیچارہ اپنی عزت رکھنے کے لیے تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ تمہیں فراخدلی سے آزادی دے رہا ہے کہ جو چاہو کرو۔"
"ہاں، اب یہ مجھ پر ہے کہ جو چاہوں وہ کروں۔"
وہ ذرا چپ ہوگئی۔ اس کی خاموشی دل کو دھڑکانے لگی۔
وہ سوچ رہی تھی۔ پھر بولی۔ "میں بہت الجھن میں ہوں۔"
"کیسی الجھن؟"
"یہی کہ کسی پر کیسے بھروسا کروں کہ جسے دوست بناؤں گی وہ میرا رازدار بن کر رہے گا۔ میری عزت رکھے گا۔ باہر دوستوں کو نہیں بتائے گا کہ میں اس سے تنہائی میں ملتی ہوں۔"
وہ بے اختیار بولا۔ "میں تمہاری عزت رکھوں گا۔ تمہیں دل و جان سے اپنی عزت سمجھتا رہوں گا۔ رات کے اندھیرے میں سایہ نہیں ہوتا میرا سایہ بھی مجھے تمہارے پاس آتے جاتے نہیں دیکھ سکے گا۔"
"میں نے آپ کو دیکھا۔ آپ بہت اچھے لگتے ہیں۔ دل کہتا ہے آپ پر بھروسا کروں۔ کسی پر تو کرنا ہوگا۔ بدنامی سے ڈرتی رہوں گی تو تنہائی میں سلگتی ہی رہوں گی۔"
"دل سے ڈر نکال دو ایک بار مجھ پر بھروسا کرو۔ مجھے خود اپنی عزت اور نیک نامی کا خیال ہے خدانخواستہ تمہاری

بدنامی ہوگی تو میں بھی نیک نام نہیں رہ سکوں گا۔"
"آپ درست کہتے ہیں۔ میں آپ پر بھروسا کروں گی۔"
کاشف کی زندگی میں وہ پہلی فون کال تھی جو سنسنی خیز ہوگئی تھی۔ وہ یکبارگی جذبات سے یوں بھر گیا تھا جیسے بارود بھر گئی ہو۔
ایسا چانس تو کسی نصیب والے کو ہی مل سکتا ہے۔ نہ دلہا نہ براتی، نہ نکاح، نہ قبولیت اور دلہن جب چاہو ملتی رہے گی۔
اس کا جی کر رہا تھا کہ ریکارڈر آن کر کے ناچنا شروع کردے۔ لیکن ابھی بہت کچھ سوچنا تھا۔ بہت سی باتیں سمجھنے کی تھیں۔ وہ اتنا بھی باؤلا نہیں ہوا تھا کہ پہلی بار کھائے ہوئے فریب کو بھول جاتا۔
ایسی ہی ایک گرل فرینڈ نے اسے رات کو اپنی تنہائی میں بلایا تھا اور جو زخم وہاں سے کھا کر آیا تھا اسے بھول نہیں سکتا تھا۔
اس نے بیڈ پر سے فون اٹھا کر کان سے لگا کر کہا۔ "سوری اسما! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ ابو جاگ گئے ہیں۔ میں ان کے کمرے میں دیکھنے گیا تھا۔ بہرحال وہ سو رہے ہیں۔
تم نے ایک بار کہا تھا کہ تمہیں خوش فہمی ہے جسے چاہو گی اسے جیت لوگی۔"
"اور آپ نے کہا تھا کہ آپ کو جیت نہیں سکوں گی۔ اب کیا خیال ہے؟"
"تم جیت گئیں میں ہار گیا۔"
"میں جانتی تھی کہ جس کو بھی خفیہ دوست بناؤں گی۔ اسے نکاح پڑھا کر قبول کرنے کو نہیں کہوں گی۔ میرے اخراجات پورے کرنے کو نہیں کہوں گی۔ اس پر کسی طرح کا بوجھ نہیں بنوں گی تو وہ دل و جان سے مجھے قبول کرنے آتا رہے گا اور میرا اعتماد دیکھ لیں کہ آپ مجھے نکاح کے بغیر قبول کرنے کو تیار ہیں۔"
"تم درست کہہ رہی ہو۔ تم نے مجھ پر کسی طرح کا بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ تمہیں اس کا صلہ یوں ملے گا کہ میں ہمیشہ تمہاری قدر کروں گا۔ اپنے کمرے کی دیواروں سے بھی نہیں کہوں گا کہ تم مجھ سے تنہائی میں ملا کرتی ہو۔ تمہاری عزت پر کبھی ہلکی سی آنچ نہیں آئے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ ہمارا ساتھ ہمیشہ رہے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کہاں ملیں گے اور کب ملیں گے؟"
"میرا گھر بہت محفوظ ہے۔ میرے ساس سسر رات کو کبھی میرے کمرے کی طرف نہیں آتے۔ کبھی آئیں گے تو انہیں باہر سے ہی ٹال دوں گی۔"
وہ بولا۔ "بے شک تمہارا گھر تمہارے لیے محفوظ ہوگا۔ میرے لیے نہیں ہوگا۔ عقل کہتی ہے کسی لڑکی کے گھر میں چوری سے جاؤ گے اور پکڑے جاؤ گے تو منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا جائے گا۔"
وہ بولی۔ "ایسی نوبت نہیں آئے گی۔"
"ہم نہیں جانتے کہ آئندہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ مجھے ذرا سوچنے دو۔ ہم ضرور ملیں گے۔ شاید کل ہی ملیں گے لیکن ایسی جگہ جہاں میرا دل مطمئن ہو۔"
"میں بحث نہیں کروں گی۔ آپ مجھے جہاں ملنے کو کہیں گے چلی آؤں گی۔"
"کل دن کو کسی وقت مس کال دوں تو بات کروگی؟"
"ضرور کروں گی۔"
"میں کل ہی بتاؤں گا کہ رات کو کہاں ملنا ہے۔ تم کل ہی کیا آسکوگی نا؟"
"میرے گھر سے زیادہ دور نہ ہو تو مجھے کسی طرح کا خوف یا اندیشہ نہیں رہے گا۔ میں چلی آؤں گی۔"
"میں تمہاری سہولتوں کا خیال رکھوں گا۔ تمہیں گھر سے لاؤں گا بھی اور واپس بخیریت پہنچاؤں گا بھی۔ تمہارے تمام اندیشے دور کردوں گا۔"
وہ تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر دوسرے دن رابطہ کرنے کا وعدہ کر کے فون بند کردیا۔
اس کے اندر کھلبلی پیدا ہوگئی تھی۔ اسے ایک جوان عورت کی محبت اور قربت حاصل ہونے والی تھی۔ ویسے تو وہ دعا مانگنے سے بھی نہ ملتی۔ موبائل فون کی کرامات سے مل رہی تھی اور وہ ایسا سنہری موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔
وہ کروٹیں بدلنے لگا۔ یہ سوال ستا رہا تھا کہ اسے کہاں حاصل کرے؟
ایک جوان لڑکی سے بے روک ٹوک ملنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ کسی بھی علاقے میں، کسی بھی رازدار دوست کے گھر میں چھپ کر اس سے نہیں مل سکتا تھا۔
اوّل تو کوئی ایسا گھر ہی نہ ملتا۔ کسی دوست کی مدد سے مل بھی جاتا تو یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کتے بھونکیں گے۔ نائٹ چوکیدار دیکھ لے گا یا گشتی پولیس والے پکڑ لیں گے۔
اپنے گھر میں آسانی تھی۔ جلال اکبر آدھی رات سے پہلے سو جاتا تھا لیکن کاشف نہ اپنے گھر میں نہ کسی لڑکی کے گھر میں ملنے کی غلطی کرنا چاہتا تھا اور کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ اسما سے ملتا تو سارے دیکھنے والے اندھے ہو جاتے اور اس کی مرادیں پوری ہو جاتیں۔ وہ مایوس ہو رہا تھا۔ سوچتے سوچتے تھک کر سو گیا۔ دوسرے دن دس بجے باپ نے جھنجوڑ کر جگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم کیسے کرایہ دار پکڑ کر لاتے ہو۔ قادر بخش نے دو مہینے کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ منہ چھپا کر کہیں چلا گیا ہے۔ پتا نہیں بیوی بچوں کو کہاں لے گیا ہے۔ گھر میں کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ اسے بیچ کر دو مہینے کا کرایہ وصول کروں۔“

وہ نیند سے اٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”میں کیا جانتا تھا کہ وہ بھگوڑا کرائے دار ہے۔ میں دیکھوں گا۔ آخر کہاں بھاگ کر جائے گا۔“

”اب وہ آئے گا۔ کرایہ ادا کرے گا تب بھی اسے وہ مکان نہ دینا۔ یہ لو چابیاں۔ میں نے تالا ڈال دیا ہے۔ نئے کرایہ دار آئیں تو انہیں دکھاتے رہو اور کسی اچھی فیملی کو کرائے پر دے دو۔“

وہ مکان کی چابیاں اس کے سامنے بیڈ پر پھینک کر چلا گیا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی لیکن جاگتے ہی اسما حواس پر سوار ہو گئی۔ اس نے فوراً ہی سوال ٹھونک دیا۔ ”کہاں مل رہے ہو؟“

وہ پریشان ہو گیا۔ ذہن کو دوڑانے لگا کہ کیا کرے؟ آرزوئیں تڑپ رہی تھیں۔ دل مچل رہا تھا۔ ملنا تو ہر حال میں تھا۔ ذہن میں یہ بات تھی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو اسے اپنے ہی گھر میں لے کر آئے گا۔ اس نے غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کیا۔ پھر بیڈ پر پڑی ہوئی چابیوں کو اٹھایا تو جیسے اچانک ہی دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ جگہ مل گئی۔

اس نے چابیوں کے گچھے کو دیکھا۔ کرائے کا مکان خالی تھا اور وہ اپنا ہی تھا۔ کوئی اسے وہاں جاتے آتے وقت ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اس سے اچھی اور محفوظ جگہ تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے غیبی مدد حاصل ہو گئی ہے۔ فوراً ہی اسما کو مس کال دی۔ پھر انتظار کرنے لگا۔ اس نے ایک منٹ کے اندر ہی رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ ”ہاں بولیں۔ میں لمبی باتیں نہیں کر سکوں گی۔“

”مختصر سی بات یہ ہے کہ ہم آج رات مل سکتے ہیں۔ پاپوش اور حیدری میں ہمارے دس مکانات ہیں۔ ان میں سے ایک خالی ہوا ہے۔ میں تمہیں اپنی بائیک پر اسی مکان میں لے جا سکتا ہوں۔“

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ”اگر پاپوش تک جانا ہے تو میرے گھر سے قریب ہے۔ وہ محفوظ جگہ ہے پھر بھی ڈر لگ رہا ہے۔ میں ہمت کروں گی۔“

”وہ تو کرنا ہی ہوگی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ میں رات کو ٹھیک ایک بجے تمہارے گھر کے قریب بائیک پر رہوں گا۔ تمہیں وہاں سے لے آؤں گا اور اسی طرح بحفاظت واپس پہنچا دوں گا۔“

”مجھے ذرا سوچنے دیں کہ یہاں سے کیسے نکلنا ہے اور اپنے ساس سسر کو کیسے مطمئن کرنا ہے۔ میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر تھوڑی دیر بعد فون کروں گی۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی باہر آ کر بائیک اسٹارٹ کی پھر فراٹے بھرتا ہوا کرائے کے اس خالی مکان میں پہنچ گیا جہاں رات گزارنی تھی' وہاں کا معائنہ کرنے دن کی روشنی میں آیا تا کہ آنے جانے اور خدانخواستہ فرار ہونے یا چھپنے کی جگہیں اچھی طرح دیکھ لی جائیں۔

اسما نے ایک گھنٹے بعد فون پر کہا۔ ”میں نے سیٹنگ کر لی ہے۔ ساس سسر سے کہہ دیا ہے کہ آج شام کو سہیلی کے گھر شادی میں جاؤں گی پھر صبح تک واپس آؤں گی۔“

”کیا وہ تمہیں تنہا جانے دیں گی؟“

”میری ایک سہیلی مجھے لینے آئے گی۔ ویسے بھی میرے شوہر نے اپنے ماں باپ کو تاکید کی ہے کہ میں کسی سہیلی یا رشتے دار کے ساتھ کہیں جانا چاہوں تو وہ کبھی اعتراض نہ کریں۔“

”ہاں، شوہر راز دار ہے۔ سیاں بھئے کوتوال تو پھر ڈر کا ہے کا؟ تم تمام رکاوٹوں سے نکل آؤ گی۔“

”آپ شام چھ بجے میرے گھر کے سامنے رہیں گے۔ میں سہیلی کے ساتھ اس کے گھر جاؤں گی، آپ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہ گھر دیکھیں گے۔ پھر رات کو جس وقت وہاں لینے آئیں گے، میں آپ کے ساتھ چلی آؤں گی۔“

اُدھر وہ اپنے تمام معاملات سے بخوبی نمٹنا جانتی تھی۔ اِدھر آج اُسے ایک لڑکی سر سے پاؤں تک ملنے والی تھی۔ وہ جذبوں اور مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ اس کے لیے وہ دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ شام کو چھ بجے اسما کے مکان سے کچھ دور آ کر رک گیا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد اسے ایک سہیلی کے ساتھ گھر سے نکلتے دیکھا۔ وہ دونوں سڑک کے کنارے پہنچ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر جانے لگیں۔

کاشف نے اس کی سہیلی کے گھر تک ان کا پیچھا کیا۔ واقعی وہاں شادی کی رونق تھی۔ مرد عورتیں، بچے

آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، مکان کو رنگین قمقموں سے سجایا گیا تھا۔

اسما نے ٹیکسی سے اتر کر دور کھڑے ہوئے کاشف پر ایک نظر ڈالی پھر مسکراتی ہوئی اس مکان کے اندر چلی گئی۔

آدھی رات سے پہلے کاشف نے فون پر پوچھا۔ ”کیا ابھی آسکو گی؟“

اس نے پوچھا۔ ”اتنی جلدی؟ ملن کی خوشی میں جلد بازی نہ دکھائیں۔ کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔“

”کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ سردی کا موسم ہے لوگ جلد ہی لحافوں میں دبک جاتے ہیں۔ اُدھر محلّے میں سناٹا اور ویرانی ہے۔ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ میں جو ہوں۔“

”ٹھیک ہے' آجائیں۔“

وہ آگیا۔ شادی والے گھر میں کچھ مہمان وہیں رہنے والے تھے کچھ رخصت ہو رہے تھے۔ عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ جا رہی تھیں۔ اسما بھی ایک چادر لپیٹے منہ چھپائے بائیک کے پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔ کاشف بہت محتاط تھا۔ اس نے اطمینان کر لیا کہ چادر میں اسما ہی ہے۔ راضی اور ثمینہ کی طرح سہیلیوں کا فراڈ نہیں ہے۔

اس نے کرائے کے خالی مکان کے سامنے پہنچ کر بائیک روک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھول کر اسما کو اندر جانے کے لیے کہا۔ وہ چلی گئی تو بائیک کو دھکیلتا ہوا آنگن میں لے آیا۔ چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھتا بھی جا رہا تھا۔ قسمت مہربان تھی۔ کوئی دیکھنے اور روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

اس نے بائیک کو لانے کے بعد دروازے کو اندر سے بند کیا۔ وہ تاریکی میں ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ کاشف نے موبائل فون کی ٹارچ کو روشن کرتے ہوئے کہا۔ ”اندر چلو زیرو پاور کا بلب آن کروں گا۔“

اس نے اندر جانے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ وہ ایکدم سے پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”پلیز ابھی نہیں... اندر چلیں۔“

اس نے آگے ٹارچ کی روشنی دکھائی۔ راہنمائی کرتا ہوا اسے ایک کمرے میں لے آیا۔ پھر ایک بٹن کو دبا کر زیرو پاور کے بلب کو روشن کر دیا۔

وہاں ایک پرانی کمزور سی چارپائی تھی اور کچھ ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا ہوا تھا۔ روشنی ہوتے ہی اسما تیزی سے چلتی ہوئی چارپائی کے دوسری طرف چلی گئی۔

کاشف نے کہا۔ ”یہ کیا ادا ہے؟ ہم قریب ہونے آئے ہیں اور تم دور ہو گئی ہو۔“

وہ بولی۔ ”میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ پہلے سن لیں۔“

وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”باتیں تو ہوتی رہیں گی قریب تو آؤ۔“

وہ قریب آنے لگا تو اسما تیزی سے دوسری طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”پلیز رک جائیں۔“

کاشف ایکدم سے ٹھٹک گیا۔ اس کا دھیان آواز کی طرف گیا۔ اس کی آواز حدیقہ جیسی نہیں تھی جبکہ وہ فون پر حدیقہ کی طرح ہی بولتی رہی تھی۔

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تمہاری آواز کیسے بدل گئی؟“

”میں یہی بتانا چاہتی ہوں۔ آپ ذرا دور رہیں۔ میں وہ نہیں ہوں' جو آپ اب تک سمجھتے آرہے ہیں۔ میں شادی شدہ نہیں ہوں' میرا کوئی شوہر دبئی میں ملازمت نہیں کرتا ہے۔“

وہ پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”میں نے ایک ناکام، بے غیرت شوہر کی جو کہانی سنائی تھی۔ وہ جھوٹی نہیں ہے۔ میری ایک سہیلی کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہماری دنیا میں ایسی نہ جانے کیسی کیسی بے غیرتی ہوتی رہتی ہے۔ میں نے ایسی ہی بے غیرتی کی روداد سنا کر آپ کو ٹریپ کیا ہے۔“

کاشف نے ناگواری سے پوچھا۔ ”تم نے مجھے ٹریپ کیا ہے؟ یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میں پھنسوں گا تو تم پر بھی لوگ تھوکیں گے۔ ویسے تمہاری بکواس کچھ سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ جب ہم یہاں راضی خوشی مل رہے ہیں تو مجھے پھانسنے والی بات کیوں کر رہی ہو؟“

”اس لیے کہ میں گناہگار نہیں بننا چاہتی۔ پہلے آپ سے نکاح پڑھواؤں گی پھر آپ کے قریب آؤں گی۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میرا جی چاہتا ہے زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ تم میرے گھر میں مجھے پھانس کر مجھ سے نکاح پڑھواؤ گی۔ کیا میں الو کا پٹھا ہوں کہ ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جو رات کو یاروں کے ساتھ گھر سے نکل کر منہ کالا کرتی رہتی ہے۔“

وہ بولی۔ ”اکیلے کسی کا منہ کالا نہیں ہوتا۔ یہاں لوگ آپ کے منہ پر بھی کالک دیکھیں گے۔“

”بکواس مت کرو۔ نہ کوئی یہاں ہے نہ ہمیں کوئی دیکھے گا۔ ویسے اب تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا، تم بہت خطرناک ہو۔ چلو نکلو یہاں سے جہاں کہو گی چھوڑ آؤں گا۔“

”میں تو شادی کرنے آئی ہوں۔ اب تو جہاں جانا ہے آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

وہ اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بولا۔ ''بڑے اعتماد سے کہہ رہی ہو۔ کیا نکاح پڑھوانے کے انتظامات تم کرو گی؟''

''وہ کر چکی ہوں۔ میرے بزرگ قاضی صاحب کے ساتھ باہر موجود ہیں۔''

وہ ایکدم سے گھبرا گیا۔ ''کیا بول رہی ہو؟ یہ مذاق ختم کرو۔''

وہ اپنے بیگ سے فون نکال کر اس کے بٹن دبانے لگی۔ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کسے کال کر رہی ہو؟''

وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ فوراً چارپائی کے دوسری طرف آ کر بولی۔ ''رک جائیں۔ اب ایک قدم بھی آگے بڑھائیں گے تو چیخنا شروع کر دوں گی۔''

وہ سہم کر رک گیا۔ اس کے چیخنے کا مطلب یہ ہوتا کہ پورا محلہ جاگ جاتا۔ وہ بولی۔ ''میں نے مس کال دی ہے۔ وہ سب باہر کھڑے ہیں۔ بہتر ہے آپ جا کر دروازہ کھول دیں۔''

اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ پریشان ہو کر کمرے کے باہر دیکھنے لگا۔ بے بسی سے بولا۔ ''یہ تم کیسی دشمنی کر رہی ہو؟ کیوں کر رہی ہو؟''

''میں دشمنی نہیں کر رہی ہوں۔ ساری عمر کی دوستی کرنے کے انتظامات کر کے آئی ہوں۔''

پھر دستک سنائی دی۔ وہ بولی۔ ''آپ فوراً جائیں اور دروازہ کھولیں۔ ورنہ وہ دروازہ پیٹنا اور شور مچانا شروع کر دیں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں ہمارا آپس میں سمجھوتا نہ ہو۔ محلے والے بھی مداخلت کریں؟''

وہ سر جھکا کر سوچتے ہوئے جانے لگا۔ پھر کمرے سے باہر آتے ہی اس نے اچانک دوڑ لگائی۔ سامنے دروازے کی طرف جانے کے بجائے مکان کے پچھلے دروازے کی طرف آیا۔

وہ دن کی روشنی میں ہی دیکھ چکا تھا اور یہ سوچ لیا تھا کہ برے وقت میں فرار ہونے کے لیے پچھلا دروازہ ہی کام آئے گا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی اس دروازے کو اندر سے کھولا تو ایکدم سے ٹھٹک گیا۔

باہر نیم تاریکی میں دو سائے کھڑے تھے۔ وہ چھلانگیں مارتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوسرا اس دروازے کو بند کر کے سامنے والے دروازے کو کھولنے چلا گیا۔

کاشف پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ دوسری بار پھر اسی طرح پھنس رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں بلب روشن ہو گئے۔ آنے والے دو بوڑھے اور دو جوان تھے۔ ایک کے حلیے سے پتا چل گیا کہ ایک نکاح پڑھانے والا قاضی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا رجسٹر تھا۔

ایک بزرگ نے کہا۔ ''برخوردار یہ دو نوجوان اسما کے بھائی ہیں اور میں اس بدنصیب لڑکی کا باپ ہوں۔ اس کی بدنصیبی یہ ہے کہ یہ خواہ مخواہ بدنام ہو گئی ہے۔ اسے بے حیا اور بدچلن کہا جاتا ہے۔ جبکہ ہم قسم کھا کر کہتے ہیں۔ یہ پاک دامن ہے لیکن اسے کچھ اس طرح بدنام کیا گیا ہے کہ وہ دشمن سچے اور ہم جھوٹے لگتے ہیں۔ ہمارے خاندان کا کوئی لڑکا اسے قبول نہیں کرتا ہے۔ خاندان سے باہر کہیں سے رشتہ آتا ہے تو بدنامی کی آگ ایسے بھڑکائی جاتی ہے کہ رشتہ مانگنے والے پھر پلٹ کر نہیں آتے۔''

ایک جوان بھائی نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''تب ہم نے یہ طے کر لیا کہ بدنام کیا جا رہا ہے تو ہم اسے بدنام کرتے ہوئے دلہن بنا کر رخصت کریں گے۔''

دوسرے نوجوان نے کہا۔ ''کیا نکاح ایسے نہیں پڑھا یا جا سکتا جیسا ابھی ہم پڑھوانے والے ہیں؟ پہلے اسما کو یہاں بدنام ہونے کے لیے تمہارے پاس بھیج دیا اب تمہیں مجبور کر دیا ہے کہ اسے قبول کرو۔''

اسما کے دوسرے بھائی نے کہا۔ ''نکاح اس طرح بھی پڑھایا جا سکتا ہے۔ شرافت سے رشتہ نہیں ہوا، بدمعاشی سے ہوگا۔ تم نے اس کے ساتھ نکاح قبول نہ کیا تو ہم الزام دیں گے کہ اسما کو بھگا کر یہاں لائے ہو۔ یا تو تم حوالات میں جاؤ گے یا منہ کالا ہوگا اور گدھے پر بیٹھو گے۔''

کاشف کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ چارپائی کے سرے پر بیٹھ گیا۔ اسما کے باپ نے کہا۔ ''چلو اپنے باپ کو اور بزرگوں کو فون کرو۔ انہیں یہاں بلاؤ۔''

اس نے سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''خدا کے لیے ابو کو نہ بلائیں۔ وہ شرم سے مر جائیں گے۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے کوئی ایسا راستہ نکالیں کہ ہماری عزت رہ جائے۔''

''میری بیٹی سے عزت اور شرافت سے نکاح پڑھوا کر اسے قبول کرو۔ ہماری تمہاری دونوں کی عزت رہ جائے گی۔''

ایک جوان بھائی نے کہا۔ ''وقت ضائع نہ کرو۔ ہم اس رات کی صبح ہونے سے پہلے پولیس کو کال کریں گے یا پھر اپنے باپ کا فون نمبر ہمیں دو۔ ہم ان سے بات کریں گے۔''

اسے یہی کرنا تھا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی جیب سے فون نکال کر نمبر پنچ کیے پھر اسے کان سے لگایا تو اسما کے باپ نے اسے چھین کر اپنے کان سے لگا

لیا۔ رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''کیا آپ کاشف کے والد ہیں۔''

پھر اس نے دوسری طرف سے جواب سن کر کہا۔ ''میں ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں۔ آپ کو ایک خوش خبری سنا رہا ہوں۔ ابھی آپ یہاں سے میری بیٹی کو بہو بنا کر لے جانے والے ہیں۔''

وہ فون پر بولتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کی آواز بھی دور ہوتی چلی گئی۔ کاشف چارپائی کے سرے پر بیٹھا تھا۔ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ باپ کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔

جب بندہ مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو ان سے نمٹنے کا حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کاشف کے اندر بھی حوصلہ پیدا ہو رہا تھا کہ اب جو ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی۔ سوچنے اور پریشان ہونے سے مصیبت نہیں ٹلے گی۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

اسما کے باپ نے کمرے میں آ کر اسے فون واپس دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔ تمہارا باپ بہت ہی شریف انسان ہے وہ یہاں آ رہا ہے۔''

قاضی صاحب نے کہا۔ ''میاں برخوردار...! جب ہمارا دین تہذیب اور شرافت سے لڑکی لڑکے کو قبولیت کی اجازت دیتا ہے تو پھر شرافت سے قبول کیوں نہیں کرتے؟ ایسی جگہ گناہ گار بننے کیوں چلے آتے ہو؟ اب ہم گناہ سے بچانے آئے ہیں اور تمہیں دین کے مطابق لڑکی کو قبول کرنا ہے تو تم دل سے قبول نہیں کرو گے۔ تم جوانوں کو گناہ کا راستہ کیوں اچھا لگتا ہے؟''

وہ چپ تھا۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا کہ جس لڑکی کو چھپ کر قبول کر رہے ہو۔ اسے دین اور دنیا کے احکامات کے مطابق قبول کیوں نہیں کرتے؟

آدھے گھنٹے بعد بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ اسما کے باپ نے بیٹوں سے کہا۔ ''یہاں کاشف کے پاس رہو۔ میں دروازہ کھولتا ہوں۔ آؤ بیٹی! میرے ساتھ چلو۔''

وہ باپ کے ساتھ کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے پر آئی۔ وہ دروازہ کھلا تو باہر جلال اکبر کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے سلیقہ اور حدیقہ تھیں۔

حدیقہ اندر آ کر اسما کے گلے لگ گئی۔ سلیقہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''خدا تمہیں سلامتی اور خوشیاں دے۔ تم نے ہمارے لیے بہت بڑا کام کیا ہے۔''

جلال اکبر نے اسما کے باپ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''سرفراز بھائی کی محبت اور تعاون سے یہ سب ہو رہا ہے۔''

سرفراز نے کہا۔ ''ہم اسے راہ راست پر لانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اللہ ہمیں کامیابی دے گا۔ آؤ اندر چلیں۔''

وہ سب اندر آئے۔ عورتیں دوسرے کمرے میں رک گئیں۔ چارپائی والے کمرے میں ان جوانوں نے ایک بڑی سی چادر فرش پر بچھا دی تھی۔ سب اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کاشف باپ کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جلال اکبر نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یوں سر جھکانے سے باپ کبھی یقین نہیں کرے گا کہ تمہیں شرم آ رہی ہے۔ تمہیں ذرا بھی شرم اور غیرت ہوتی تو دوسری بار بھی وہی شرمناک غلطی کرنے یہاں نہ آتے۔ اب میں یہاں آ کر لاکھ نصیحتیں کروں تو کیا حاصل ہوگا؟ نصیحتوں پر عمل کرنے کا وقت تو تم نے گزار دیا ہے۔ تم نے جزا کو ٹال دیا۔ سزا کے مستحق ہو گئے۔''

اس نے اسما کے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سرفراز صاحب' ان کی صاحبزادی اور صاحبزادے عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ موجودہ حالات میں یہ اپنی عزت رکھنے کے لیے کیا کریں گے؟ ہمارا دین ہمارا ایمان کہتا ہے کہ گمراہ بچوں کو گناہ سے باز رکھا جائے۔ نکاح کے دو بول پڑھا دینے سے لڑکی والوں کو اور لڑکے والوں کو عزت ملے گی۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''تمہارا نکاح صاحبزادی اسما سے پڑھایا جائے گا۔ یعنی وہی ہوگا جو اب سے پہلے حدیقہ کے ساتھ ہونے والا تھا۔ وہاں بھی تم اسی طرح جکڑے گئے تھے لیکن حدیقہ جیسی نیک سیرت بچی نے صاف کہہ دیا تھا کہ تم اسے دل سے قبول کرو گے تو وہ تمہارے نکاح میں آئے گی۔ پھر تم نے اس کی نیکی اور شرافت کا کیا صلہ دیا؟ اس سے جھوٹا وعدہ کیا۔ بعد میں اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب رہائی مل گئی تو تم نے حدیقہ میں سو طرح کے عیب نکالے، اسے بدچلن کہہ دیا۔''

کاشف کا سر گھوم رہا تھا۔ یہ بات پتھر کی طرح دماغ میں لگ رہی تھی کہ پھر اسی طرح پھنس گیا ہے۔

جلال اکبر نے کہا۔ ''تم نے رہائی پانے کے بعد حدیقہ کو بدچلن کہہ دیا۔ کیا اب اسما کو کہہ سکو گے؟ وہ تو حدیقہ کی طرح تم پر اندھا اعتماد نہیں کرے گی۔ تم نکاح میں اسے قبول کیے بغیر یہاں سے تنہا نہیں جا سکو گے۔ مجھے بہو کو ساتھ لے جانا ہوگا۔''

کاشف نے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ ان لمحات میں وہ شدید کرب میں مبتلا ہوگیا تھا۔

باپ نے کہا۔ ”رولو اور پچھتاتے رہو۔ اگر تمہارا ضمیر کہے تو یہ اعتراف کرو کہ حدیقہ کو دھوکا دے کر پچھتا رہے ہو۔“

سرفراز نے کہا۔ ”جلال صاحب! یہ سن کر مجھے دکھ ہو رہا ہے اور غصہ آرہا ہے کہ یہ آج سے پہلے کسی نیک سیرت لڑکی کو بھی دھوکا دے چکا ہے۔ مجھے اس معاملے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔“

”آپ کیا سوچیں گے۔ جوان بیٹی کے باپ ہیں۔ اس کے سر پر سہاگ کا آنچل رکھ کر ہی جائیں گے۔“

سرفراز نے کہا۔ ”وہ مظلوم حدیقہ بھی میری بیٹی ہے۔ پہلے اس کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔ اس نے پورے ایمان سے اس پر اعتماد کیا تھا کہ یہ اسے قبول کرنے آئے گا۔ آج حدیقہ کو اس کے ایمان اور نیکی کا صلہ ملنا چاہیے۔“

جلال اکبر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ اپنی بیٹی سے اس کا نکاح نہیں پڑھائیں گے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں، ایمان سے اور انصاف سے کہہ رہا ہوں۔ اس کا نکاح میری بیٹی سے نہیں حدیقہ سے ہوگا اور ابھی ہوگا۔“

”اور آپ کی بیٹی؟“

”میری بیٹی عزت آبرو سے ہے اور اللہ نے چاہا تو آئندہ بھی اسے عزت ملے گی۔“

پھر وہ کاشف سے بولا۔ ”میاں صاحبزادے! اللہ سے ڈرو۔ یہ بھی نہ سمجھو کہ ایک بار سزا سے بچ گئے تو دوسری بار بھی بچ جاؤ گے۔ کیا تم کبھی سوچ سکتے تھے کہ پھر اسی طرح جکڑے جاؤ گے۔“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”نہیں۔ میں مانتا ہوں، میں نے ایک نہیں دو بار بہت بڑی غلطی کی ہے۔“

”کیا یہ احساس اور ندامت ہے کہ حدیقہ کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے؟“

”ہاں، میں نادم ہوں۔ مجھے اس غلطی کی تلافی کرنی چاہیے۔“

”بے شک اسی طرح تلافی کر سکتے ہو کہ ابھی اس سے نکاح پڑھواؤ اور اسے دل سے قبول کرو۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کہا۔ ”جی میں ابھی اسے قبول کروں گا۔“

سرفراز نے کہا۔ ”جلال صاحب! آپ ابھی جائیں اور حدیقہ کو یہاں لے آئیں۔“

جلال اکبر نے کہا۔ ”وہ اسی محلے میں رہتی ہے۔ میں ابھی پندرہ منٹ میں اسے لے آؤں گا۔ آپ نکاح نامہ کی خانہ پری کرائیں۔“

وہ اس کمرے سے چلا گیا۔ کاشف یہ سوچ کر شرمندہ ہو رہا تھا کہ ابھی حدیقہ آئے گی اور وہ اس کا سامنا کرے گا۔ جسے دودھ کی مکھی کہہ کر نکال پھینکا تھا اسے دودھ میں مکھن مان کر قبول کرے گا۔

اب اس کا مزاج بدل گیا تھا۔ وہ دل سے اسے قبول کرنے والا تھا لیکن یہ بات گوارا نہیں تھی کہ اس وقت اسے مجبور اور بے بس بنا کر نکاح پڑھوایا جا رہا ہے۔

وہ بعد میں حدیقہ سے کہتا کہ اس نے راضی خوشی نکاح پڑھوایا تھا تو وہ کیا، اس کا باپ بھی نہ مانتا کہ کتے کی دم سیدھی ہوگئی تھی۔ یہ الزام ہمیشہ رہنے والا تھا کہ ایک قیدی نے مجبوراً اسے منکوحہ بنا کر رہائی حاصل کی تھی۔

جلال اکبر دوسرے کمرے میں اسما، سلیقہ اور حدیقہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ انہیں ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ کاشف نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے ابو کے پیچھے ایک خاتون تھیں۔ ان کے ساتھ حدیقہ اور اسما کھڑی ہوئی تھیں۔ کاشف نے فوراً ہی سر جھکا لیا۔

جلال اکبر نے کہا۔ ”بیٹے! تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جو خاتون میرے ساتھ ہیں، ان کا نام سلیقہ ہے...... جیسا کہ تم جانتے ہو، میں جلد ہی انہیں اپنی شریک حیات بنانے والا ہوں۔“

کاشف نے سر اٹھا کر سلیقہ کو نہیں دیکھا۔ یہ سوچ کر شرم سے گڑا جا رہا تھا کہ ہونے والی ماں کو ابھی سے اس کے کرتوت بتا دیے گئے ہیں۔

جلال اکبر نے کہا۔ ”تم یہ نہیں جانتے کہ تمہاری یہ ہونے والی امی حدیقہ کی خالہ جان ہیں۔ میں تمہیں شرمندہ کرنے کے لیے انہیں یہاں نہیں لایا ہوں۔ یہ شروع ہی سے تمہارے اور حدیقہ کے معاملات کو اچھی طرح جانتی ہیں۔“

سرفراز نے کہا۔ ”جلال صاحب! اب دیر نہ کی جائے نکاح پڑھا دیا جائے۔ آؤ بیٹی یہاں اپنی خالہ اور اسما کے ساتھ بیٹھو۔“

حدیقہ نے کہا۔ ”میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

سب اس کی طرف دیکھنے لگے، وہ بولی۔ ”آج بھی وہی ہو رہا ہے جو اس رات ہونے والا تھا۔ کاشف سے جبراً نکاح قبول کرایا جانے والا تھا۔ اور میں نے انکار کر دیا

تھا۔ کیا آج یہ مجبور نہیں ہیں؟ کیا مجھے راضی خوشی قبول کرنے بیٹھے ہیں۔“

کاشف نے کہا۔ ”ہاں۔ میں تمہیں دل سے قبول کروں گا۔“

”آپ نے اس رات بھی یہی کہا تھا۔ میری سچائی اور نیکی سے متاثر ہو کر گئے تھے پھر واپس نہیں آئے۔“

جلال اکبر نے کہا۔ ”بیٹی! اسے اچھی ٹھوکر لگی ہے۔ نصیحت حاصل ہوئی ہے۔ اب یہ اندر سے سچا ہے یا نہیں ہے، اس بحث میں نہ پڑو۔“

”میں آپ کی بات مان لوں اور ان کی شریک حیات بن جاؤں تو ساری زندگی میرے آگے ان کا سر جھکا رہے گا۔ وہ عورتیں اور ہوتی ہیں جو اپنے خاوند کا سر جھکائے رکھنا چاہتی ہیں۔ میں شادی کے بعد ان کا جھکا ہوا سر نہیں دیکھ سکوں گی۔ میں اپنے مجازی خدا کو ہمیشہ سر بلند دیکھنا چاہتی ہوں اس لیے ابھی یہ جبری نکاح قبول نہیں کروں گی۔“

سلیقہ نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ ”فضول باتیں نہ کرو۔“

”خالہ جان! میری بات کو سمجھیں۔ انہیں جانے دیں۔ انہیں قبول کرنا ہوگا تو یہ خود اپنے پیروں سے چل کر آئیں گے۔“

”کوئی احمق ہی ایک کے بعد پھر وہی غلطی دوبارہ کرے گا۔ تم تو احمق ہی نہیں پاگل بھی ہو۔“

جلال اکبر نے کہا۔ ”لیکن ہم پاگل نہیں ہیں۔ چپ چاپ یہاں بیٹھو اور نکاح قبول کرو۔ انکار کرو گی تو جانتی ہو کیا ہوگا۔“

حدیقہ نے اپنی خالہ کو دیکھا۔ جلال اکبر نے کہا۔ ”تم ابھی انکار کرو گی تو میں تمہاری خالہ کو شریک حیات بنانے سے انکار کر دوں گا۔“

”میری خالہ کو بیچ میں نہ لائیں۔“

”تم میری محنت کو مٹی میں نہ ملاؤ۔ تمہاری کوئی بات نہیں مانی جائے گی۔ سلیقہ! اسے یہاں بٹھاؤ۔“

حدیقہ نے جھکی جھکی نظروں سے کاشف کو دیکھا جیسے مجبور ہوگئی ہو۔ پھر وہ ایک طرف دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ سلیقہ نے اسے چادر کے گھونگٹ میں چھپا دیا۔

قاضی صاحب نکاح پڑھانے لگے۔ دونوں نے سر جھکا کر نکاح قبول کیا۔ حدیقہ ظاہر کر چکی تھی کہ یہ اس کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہے اور کاشف کے اندر کی بات تو سب ہی سمجھ رہے تھے کہ اس نے حالات کے آگے مجبوراً سر جھکا دیا ہے۔

وہ واقعی یہی محسوس کر رہا تھا کہ اسے رسیوں سے باندھ کر حدیقہ کو اس کے گلے کا ہار بنا دیا گیا ہے۔

اگرچہ وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے مطابق ہوا ہے۔ وہ خود اس پلاننگ میں شریک رہی تھی اور ایک اجنبی لڑکی اسما بن کر فون پر بولتی رہی تھی۔

بے شک وہ چاہتی تھی کہ کاشف کو پھر ویسی ہی ٹھوکر لگے اور اس کا ضمیر کچھ تو آنکھیں کھولے۔ یہاں تک وہ پلاننگ میں شامل تھی لیکن اس سے آگے زبردستی دلہن بن کر کاشف کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔

اب تو نکاح بھی ہو چکا تھا۔ اس نکاح کے پیچھے انکار

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

چھپ گیا تھا۔ اب اقرار ہی اقرار تھا۔

جلال اکبر نے سرفراز کے بیٹے سے کہا۔ ”بیٹے! تم جاؤ اور ایک ٹیکسی لے آؤ۔ یہ دلہا دلہن ٹیکسی میں جائیں گے۔“

کاشف نے کہا۔ ”ابو! آپ میری بائیک لے جائیں گے اس میں ایک معمولی سی خرابی ہے پہلے مجھے چیک کر لینے دیں۔“

وہ اپنے باپ اور سرفراز کے بیٹوں کے ساتھ صحن میں آیا۔ وہاں سے بائیک کو دھکیلتا ہوا باہر لے گیا۔ اسے اِدھر اُدھر سے چیک کرنے لگا۔ پھر اس پر بیٹھ کر ایک کک ماری۔ دوسری کک پر وہ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

سب دیکھ رہے تھے اس کی خرابی دور ہو گئی تھی۔ وہ اسے چلاتا ہوا دور لے گیا تھا۔ گاڑی ٹھیک چل رہی تھی۔ اتنی ٹھیک کہ اسے دور لے جا کر نظروں سے اوجھل کر دیا۔

وہ انتظار کرنے لگے۔ جانے والا پلٹ کر آنے والا تھا۔ ایک منٹ، دو منٹ پھر دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ جلال اکبر نے پریشان ہو کر کہا۔ ”کہاں رہ گیا ہے یہ؟ واپس کیوں نہیں آ رہا ہے؟“

اس نے فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بند ہو گئی۔ اس نے لائن کاٹ دی تھی۔

باپ نے پریشان ہو کر فون کو دیکھا۔ پھر ایک بار رابطہ کیا تو ٹیپ ریکارڈر کی آواز سنائی دی۔ ”آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ آپ تھوڑی دیر بعد...“

جلال اکبر نے غم و غصہ سے فون بند کر دیا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ پھر بھی دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ دھوکا دے کر چلا گیا ہے۔ اس نے بڑے کرب سے کہا۔ ”یہ واپس کیوں نہیں آ رہا ہے؟“

جو سڑک لے جاتی ہے۔ وہ واپس بھی لاتی ہے۔ اسے واپس نہیں لا رہی تھی۔ تب اس نے رونے کے انداز میں کہا۔ ”کاشف... ! میرے بچے... ! کہاں ہو...؟ باپ کو یوں ذلیل نہ کرو۔ آ جاؤ بیٹے، آ جاؤ...“

وہ رات کی تاریکی میں دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے پکار رہا تھا۔ سرفراز کے دونوں بیٹے سر جھکائے اندر آ گئے۔ وہاں یہ خبر سنائی کہ دلہا بھاگ گیا ہے۔

حدیقہ کے کلیجے پر جیسے گھونسا پڑا ہو۔ اس سے زیادہ ذلت اور کیا ہو گی۔ دلہا نکاح پڑھواتے ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

وہ چادر میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جلال اکبر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بہو کو روتے دیکھ کر دل رو رہا تھا۔

اسما، سرفراز اور وہ دونوں جوان بڑے دکھ سے انہیں ناکام و نامراد دیکھ رہے تھے۔ حقیقتاً وہ چاروں دراصل اسٹیج کے فن کار تھے۔ کبھی کبھی کسی ٹی وی ڈرامے میں بھی چھوٹے چھوٹے کردار ادا کرتے رہتے تھے۔

سرفراز اور جلال اکبر میں دوستی اور پرانی شناسائی تھی۔ سرفراز نے اس کے مسائل سن کر مشورہ دیا تھا۔ ”بیٹے کے ساتھ ڈراما کرو۔ جس طرح وہ حدیقہ کے گھر میں گھس کر شکنجے میں آ گیا تھا اور اس سے نکاح پڑھوانے کے لیے مجبور اور بے بس ہو گیا تھا، اسی طرح دوبارہ اسے شکنجے میں لاؤ۔“

یہ تدبیر اچھی تھی۔ اس پر عمل کرنے کے لیے اسما کی اداکاری اور حدیقہ کی آواز کو فون پر استعمال کیا گیا اور وہ سب اس حد تک کامیاب رہے کہ کاشف کو دوبارہ اسی شکنجے میں لے آئے۔

وہ جو حدیقہ سے کترا رہا تھا، اس نے دوسری بار مجبور ہو کر نکاح پڑھوا ہی لیا۔

پھر کیا ہوا؟

کیا نانک کرنے سے اور کاشف کو تماشا بنا کر جبر کرنے سے وہ مان گیا تھا؟

وہ تو ساری پلاننگ کو ٹھوکروں میں اُڑا کر چلا گیا تھا۔

زندگی بھر نباہے جانے والے ازدواجی رشتے نہ زبردستی ہوتے ہیں نہ فراڈ اور ڈراما بازی سے ہوتے ہیں اور نہ ہی پیار کی بھیک مانگ کر کہا جاتا ہے کہ ہمیں قبول کر لو۔

حدیقہ کا یہ اعتماد تھا کہ خدا کو منظور ہو گا تو وہ جبر سے نہیں صبر سے کاشف کو واپس لائے گی اور صبر بڑے اعتماد اور ایمان سے کیا جاتا ہے اور ایمان یہ ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

سرفراز نے کہا۔ ”جلال صاحب! ہمیں اجازت دیں۔ ہم اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔ اب دعا کریں گے کہ اللہ آپ کے بیٹے کو نیکی کی توفیق دے اور وہ واپس آ جائے۔“

وہ جلال اکبر کے شانے کو تسلی کے طور پر تھپک کر اپنے اسٹیج کے فنکاروں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ قاضی صاحب نے کہا۔ ”آپ پرسوں آ کر مہر شدہ نکاح نامہ لے جائیں۔“

وہ بھی مصافحہ کر کے چلا گیا۔ ساتھ دینے والے کب

تک رہتے ہیں۔ آخر چلے جاتے ہیں۔ بس مسائل رہ جاتے ہیں۔

جلال اکبر نے سلیقہ کو دیکھا پھر حدیقہ کے پاس آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میرے ساتھ چلو۔ آج سے تم میری بہو ہو۔ میرا گھر اور میرے گھر کے تمام معاملات آج سے تمہارے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔“

سلیقہ نے کہا۔ ”بیٹی! وہ آئے گا۔ وہ دین اور دنیاوی قوانین کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ رسّے کی لمبائی تک بھاگے گا پھر پلٹ کر آئے گا۔“

جلال اکبر نے کہا۔ ”نہیں آئے گا تو باپ کے رشتے سے، گھر سے اور تمام جائداد سے محروم رہے گا۔ وہ کمانا کھانا نہیں جانتا ہے۔ تھک ہار کر واپس آئے گا۔“

”یہی میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی بھی پہلو سے مجبور اور بے بس ہو کر آئیں۔“

”اب تو تم اس کی منکوحہ ہو۔ کیا اس کی زوجیت سے انکار کرو گی؟“

”نہیں، اب کیسا انکار؟ اب تو ان کے ہی نام سے زندگی گزاروں گی۔ لیکن ان کے دروازے پر نہیں جاؤں گی۔“

سلیقہ نے کہا۔ ”یہ کیسی احمقانہ باتیں کر رہی ہو؟ اب تو وہ تمہارا گھر ہے، تم کیوں نہیں جاؤ گی؟“

”اس لیے کہ دلہن ہمیشہ اپنے دلہا کے ساتھ اس کے دروازے پر پہلا قدم رکھتی ہے۔ بے شک میں ان کی ہوں۔ ان کی ہی رہوں گی۔ لیکن ان کے دروازے پر پہلا قدم ان کے ہی ساتھ رکھوں گی۔ آپ ایک دلہن کا مان رکھیں۔ میں نے پہلے بھی ان سے کہا تھا کہ وہ مجھے آ کر لے جائیں گے۔ آج بھی یہی کہتی ہوں۔“

جلال اکبر نے کہا۔ ”یہ درست کہتی ہے سلیقہ! جب تک وہ اسے لینے نہیں آئے گا، یہ تمہارے پاس ہی رہے گی۔ میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔“

وہ کمرے سے چلا گیا۔ حدیقہ سر جھکائے سلیقہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اب بھی مایوس نہیں تھی۔ اس کا دل اس کا ایمان کہہ رہا تھا کہ نیکی اور سچائی صلہ دیر سے دیتی ہے لیکن دیتی ضرور ہے۔

☆☆☆

وہ رات گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزرنے لگا۔ بیٹا جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ فون کا رابطہ بھی ختم کر چکا تھا۔ باپ کے دل کو دھڑکا رہا تھا کہ یوں کہیں غروب

عقل مند نصیحتیں

☆ کبھی اپنی بیوی کی چوائس پر نہ ہنسو کیونکہ آپ اس کی چوائس میں سے ہی ہوتے ہو۔

☆ کبھی اپنی چوائسز پر غرور نہ کرو کیونکہ ان میں سے ایک چوائس آپ کی بیوی ہے۔

جنید احمد۔ کراچی

ہونے کے بعد کبھی طلوع نہیں ہو گا۔

وہ ایک ہی بیٹا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں اور اس کا کوئی نہیں تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ یکسر خالی اور کھوکھلا ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ رات کے پچھلے پہر اپنے خالی مکان میں آیا تو وہاں بیٹے کو نہ پا کر یکبارگی رو پڑا۔ وہ کبھی آنسو نہیں بہاتا تھا۔ وہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اس لیے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”ہائے کاشف! کہاں ہو میرے بچے؟ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ آ جاؤ۔“

وہ بستر پر آ کر گر پڑا۔ بیٹا اس کی نیندیں لے گیا تھا۔ وہ سو نہیں سکتا تھا۔ اس نے کروٹیں بدلتے ہوئے صبح کر دی، فجر کی نماز سے فارغ ہو کر ایک ذرا کمر سیدھی کی تو آنکھ لگ گئی۔

اس نے بیٹے کو دیکھا۔ وہ حدیقہ کے پاس آیا تھا۔ اس سے مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ بہت ہی مختصر سا خواب تھا۔ رنگ ٹون کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے فون کو اٹھایا، بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیٹا نہیں تھا۔ رانگ کال تھی۔

اس نے فون کو بیڈ پر پھینک دیا۔ اب نیند آنے والی نہیں تھی۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر گھر سے نکل گیا۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں تھا۔ سمندر کے ساحل پر آ کر بیٹھ گیا۔

دن کے ایک بجے سلیقہ نے فون پر مخاطب کیا پھر کہا۔ ”آپ تنہا ہیں۔ یہاں آ جائیں۔ ہم کھانے پر انتظار کریں گے۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔“

حدیقہ کی آواز سنائی دی۔ ”ابو! میں جانتی ہوں۔ آپ کل سے جاگ رہے ہوں گے۔ کچھ کھایا بھی نہیں ہو گا۔ میں بھی نہیں کھاؤں گی، آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بیٹی! ضد نہ کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ بیٹے نے میرے مقدر میں تنہائی لکھ دی ہے۔ مجھے تنہا رہنے دو۔"

"نہیں ابو...! آپ کو یہاں آنا ہوگا، ابھی آنا ہوگا۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ آپ کو تنہا نہیں رہنے دوں گی۔ آپ یہاں آئیں گے۔ بیٹے کا غم بھلائیں گے، میرے ساتھ کھائیں گے تو آپ کے ساتھ چل کر گھر آباد کروں گی۔ آپ کی خدمت کروں گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "تم آؤ گی، میرے ساتھ میرے گھر آؤ گی۔ مجھ بوڑھے کو تنہا نہیں رہنے دو گی؟"

"ہاں ابو...! آپ آئیں تو سہی۔"

"ابھی آرہا ہوں۔"

وہ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ گیا۔ حدیقہ نے کہا۔ "ابو...! میں نے آپ کو اہمیت دیتے ہوئے سوچا ہے کہ دولہے کے ساتھ سسرال کی دہلیز پر قدم رکھنا اہم نہیں ہے۔ آپ کی تنہائی تقاضا کر رہی ہے کہ مجھے آپ کی خدمت کے لیے آپ کے سائے میں رہنا چاہیے۔"

اس نے بہو کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خوش رہو بیٹی! تم نے میرے آدھے صدمات کم کردیے ہیں۔ اب میں بیٹے کی جدائی برداشت کرسکوں گا۔"

تین برس کی موی نے آکر سلام کیا تو اس نے بازوؤں میں اٹھا کر چوم لیا۔ پھر کہا۔ "میں ٹوٹ بھی رہا ہوں اور جڑ بھی رہا ہوں۔ یہ گڑیا بھی میرے ساتھ رہے گی۔ میں جلد ہی سلیقہ کو شریک حیات بناؤں گا۔ پھر سے میرا گھر آباد ہوگا۔"

وہ خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ "میرے بیٹے! تم کتنے بدنصیب ہو۔ محبتیں کرنے والوں سے دور بھاگ رہے ہو۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے موی کو گود سے اتارتے ہوئے حدیقہ سے کہا۔ "اندر جاؤ۔ میں دروازہ کھولتا ہوں۔"

وہ بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر دروازے کو کھولا تو دنگ رہ گیا۔ سینے کے اندر دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں۔ نگاہوں کے سامنے بیٹا کھڑا ہوا تھا۔

باپ شدید حیرانی کے باعث بول نہیں پا رہا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا صحن میں آگیا۔ سلیقہ کمرے سے باہر آکر خوشی سے اس کی بلائیں لینے لگی۔ حدیقہ کمرے کے اندر دروازے کی آڑ میں تھی۔

کاشف نے ادھر ادھر سر گھما کر ان سب کو دیکھا۔ پھر باپ سے پوچھا۔ "آپ کیا سمجھے تھے' میرے گلے میں پھندا ڈالیں گے اور میں ایک عورت کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا رہ کر ساری عمر گزار دوں گا؟ حدیقہ کے بزرگوں نے بھی مجھے جکڑنا چاہا تھا۔ کل آپ نے بھی نکاح کی زنجیر میں اچھی طرح باندھ دیا تھا۔ ابھی میں آیا ہوں پھر یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ کون میرے پیروں میں کب تک زنجیریں ڈالتا رہے گا؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے کے قریب آیا جس کے پیچھے وہ کھڑی ہوئی تھی، وہ بولا۔ "میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ شکنجوں میں آنے والا مرد نہیں ہوں۔ یہاں اس وقت اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ میں نے اپنے دل سے اور دماغ سے تمہاری نیکی اور سچائی کو دیکھا ہے، پرکھا ہے، پھر قائل ہو کر قبول کرنے آیا ہوں۔ آج میں تمہیں دل سے اپنا رہا ہوں۔"

سبھی کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ وہ دروازے کے پیچھے خوشی سے رو رہی تھی۔ جلال اکبر خوشی سے نہال ہو رہا تھا، کہہ رہا تھا۔ "آج میں اپنے بیٹے پر جتنا بھی فخر کروں وہ کم ہوگا۔"

اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ کاشف نے دروازے کے قریب ہو کر کہا۔ "حدیقہ! تمہاری ایک بات نے میرا دل جیت لیا ہے۔ کل تم نے کہا تھا کہ بیوی وہ ہے جو اپنے سامنے خاوند کا سر نہیں جھکاتی۔ تم بھی میرا جھکا ہوا سر دیکھنا گوارا نہیں کرو گی۔"

وہ بولی۔ "آپ بہت اچھے ہیں۔ میری سوچ سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔ سینہ تان کر گردن اٹھا کر مجھے لینے آئے ہیں۔"

موی کہیں کھیل رہی تھی۔ وہاں سے دوڑتی ہوئی آئی تو حدیقہ نے اسے پکڑ کر کاشف سے کہا۔ "یہ میری بیٹی ہے۔"

اس نے مسکرا کر بچی کو دیکھا پھر اسے بازوؤں میں اٹھا کر پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"موی...!" وہ اسے بڑی معصومیت سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔ "میں کون ہوں' جانتی ہو؟"

موی نے انکار میں سر ہلایا، وہ بولا۔ "ابو ہوں... تمہارا ابو...!"

حدیقہ کی آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں۔ سلیقہ نے قریب آکر موی سے کہا۔ "بیٹی! انہیں ابو بولو۔"

موی نے کہا۔ "ابو...!"

کاشف نے اس کا منہ چوم لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM